انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

مستقل سلسلے

ستمبر 2016
جلد 31 شمارہ 1
قیمت 60 روپے

ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
بارش اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ انسانی زندگی کا دارومدار پانی پر ہے۔ کسان فصلیں بو کر منتظر نظروں سے آسمان کو دیکھتے ہیں۔
جب بارش ہوتی ہے تو پیاسی دھرتی سیراب ہوتی ہے۔ سبزہ اور پھول پتے دھل کر نکھر جاتے ہیں۔ شاعروں نے تو اس موسم کے بارے میں جانے کیا کچھ لکھا ہے۔ گزرے موسم دل پر دستک دیتے ہیں، بچھڑے دوستوں کی یاد دل میں کسک جگا دیتی ہے۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ادھر دو بوندیں پڑیں اور بجلی غائب۔ شہر کی گلیاں، کوچے، شاہراہیں، دریا اور تالاب کا منظر پیش کرنے لگتے ہیں۔ بجلی غائب ہونے کے ساتھ ساتھ پانی کی دستیابی کا مسئلہ بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ ادھر پڑوسی ملک بھی، ازلی دشمن جیسے ہی دریا کے رحمت جوش میں آیا، اس نے بہتے پانی کا رخ جناب کی سرزمین کی طرف کر دیا اور پھر سیلابی ریلے سے جو تباہی آتی ہے، مہینوں اس کا مداوا نہیں ہو پاتا۔
دنیا کتنی آگے بڑھ گئی ہے۔ سائنس نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ قدرتی آفات کے سامنے انسان بے بس ضرور ہے لیکن بہت کچھ ہمارے ہاتھ میں بھی ہے۔ صلاحیت اور وسائل کی کمی نہیں، بات صرف ترجیحات کی ہے۔
یہ شمارہ آپ کو عیدالاضحی سے پہلے ملے گا۔ قارئین کو ہماری جانب سے پیشگی عید مبارک۔
ہماری دعا ہے کہ عیدالاضحی آپ کے آنگن میں برکتوں اور خوشیوں کے ساتھ آئے۔ آمین۔

سانحۂ ارتحال

ہماری ساتھی امت الصبور کی بہن اسماء شعیب طویل علالت کے بعد اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن
اسماء نہایت صابر، خاموش طبع اور نیک طبیعت تھیں۔ انہوں نے اپنی تکلیف دہ بیماری کا بڑے صبر و تحمل سے مقابلہ کیا اور طویل علالت کے دوران بھی کبھی اپنی زبان سے تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔
ادارہ شعاع امت الصبور کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔
قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں

- پیال ساز۔ ایمل رضا کا مکمل ناول،
- شب آرزو۔ نور فاطمہ کا مکمل ناول،
- شہر خطا۔ نایاب جیلانی کا ناولٹ،
- عفت سحر طاہر اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- عمیرہ عارف، عشنا کوثر سردار اور بنت سحر کے ناولٹ،
- ہما علی سید، قرۃ العین خرم ہاشمی، عندلیب زہرا، میمونہ صدف، فرزانہ کھرل اور ام سعدی کے افسانے،
- ٹی وی فنکار علی عباس اور حمنہ علی کا بندھن،
- عیدالاضحی کے موقعے پر قارئین سے خصوصی سروے،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

ستمبر کا شمارہ آپ کو کیسا لگا۔۔۔؟ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

تُو ہی خالق تُو ہی مالک ہے میرا
تُو ہی کشتی کا میرے ہے ناخدا

تُو سہارا تُو ہمارا آسرا
اس جہاں میں کون ہے تیرے سوا

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما
قاضی الحاجات تُو مشکل کُشا

تُو نے پورا کر دیا ہر مدعا
غیر اللہ سے نہیں میں مانگتا

تجھ سے جو مانگا وہی تُو نے دیا
کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما

اے خدا اے مالکِ ارض و سما
ابتدا تُو اور تُو ہی انتہا

سن لے میری عرض میری التجا
دولت ایمان و دین کر دے عطا

سردار اے۔ ڈی۔ آدم

سلام اُس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا

سلام اس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے

سلام اس پر کہ جس کا ذکر ہے سارے صحائف میں
سلام اُس پر کہ جو زخمی ہوا بازارِ طائف میں

سلام اُس پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا
سلام اُس پر کہ جو خود بدر کے میدان میں آیا

سلام اس پر فضا جس نے زمانے کی بدل ڈالی
سلام اس پر کہ جس نے کفر کی قوت کچل ڈالی

سلام اُس پر کہ جس کا نام لے کر اُس کے شیدائی
اُلٹ دیتے ہیں تختِ قیصریت، تاجِ دارائی

سلام اس ذات پر جس کے پریشان حال دیوانے
سُنا سکتے ہیں اب بھی خالدؓ و حیدرؓ کے افسانے

دَرود اُس پر کہ جس کا نام تسکینِ دل و جاں ہے
درود اُس پر کہ جس کے خلق کی تفسیر قرآں ہے

ماہر القادری

سناکی اور سنوت

حضرت ابو ابی عبداللہ بن ام حرام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی ہے۔ انہوں نے بیان کیا : میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ نے فرمایا۔

''سنا اور سنوت اپناؤ' ان میں سام کے سوا ہر بیماری سے شفا ہے۔'' عرض کیا گیا۔

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! سام کیا ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ''موت۔''

(حاکم)

ابن ابی عبلہ رحمتہ اللہ نے فرمایا: سنوت سے مراد شبت (خوشبودار بیج جو کھانے میں ڈالے جاتے ہیں) ہے۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شہد ہے جو گھی کی مشکوں میں رکھا گیا ہو۔

فوائد و مسائل :

1۔ نواب وحید الزمان خاں نے سنوت کا ترجمہ ''سویہ'' کیا ہے۔ یہ ایک پودا ہے۔ بعض لوگ اسے ساگ میں شامل کرتے ہیں جب کہ اس روایت میں اس کا مطلب ''شہد'' بتایا گیا ہے۔

2۔ سناکی بھی ایک پودا ہے جس کی پتی دست آور ہوتی ہے۔

3۔ نباتات سے علاج بہتر طریقہ ہے۔

بری دوا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بری دوا سے منع فرمایا ہے۔ اس سے مراد زہر ہے۔'' (ابوداؤد)

خودکشی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جس نے زہر پی کر خودکشی کرلی' وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ ابد تک زہر پیتا رہے گا۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ خودکشی حرام ہے۔

2۔ خودکشی مرض کا علاج نہیں بلکہ جرم ہے۔

3۔ نقصان دہ اور مضر صحت اشیاء سے' نیز شراب اور اس سے مخلوط اشیاء سے علاج حرام ہے۔ مسلمان حکام' اداروں اور تنظیموں کا شرعی فریضہ ہے کہ اس میدان میں خالص حلال اور پاکیزہ ادویہ متعارف کرائیں اور عام مسلمان کو بھی صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے حرام اور مشکوک ادویہ کے استعمال سے بچنا چاہیے اور ان کے بجائے پاکیزہ اور غیر مشکوک ادویہ استعمال کرنی چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ''اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا' اللہ اس کے لیے (تنگی سے نکلنے کی) کوئی راہ پیدا فرمادے گا۔''

4۔ اور اگر کوئی مخلص طبیب کسی مرض میں اپنے عجز کا اظہار کرے اور شراب ہی کو علاج سمجھے تو جان بچانے کے لیے بشرطیکہ جان کا بچ جانا یقینی ہو' اس کا استعمال مباح ہوگا۔

گلے پڑنے کا علاج اور (انگلی سے) دبانے کی ممانعت

حضرت ام قیس (آمنہ) بنت محصن رضی اللہ عنہا سے روایت ہے 'انہوں نے کہا: میں اپنے ایک بچے کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کو گلے پڑ گئے تھے اور میں نے انہیں انگلی سے دبایا تھا (جو اس بیماری کا رائج علاج تھا)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم اس بیماری کا علاج بچوں کا گلا انگلی سے دبا کر کیوں کرتی ہو؟ عود ہندی استعمال کیا کرو۔ اس میں سات شفائیں ہیں۔ گلے پڑ جانے کی صورت میں ناک میں ٹپکایا جائے 'ذات الجنب کی صورت میں پلایا جائے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ عذرہ ایک بیماری ہے جو بچوں کو ہوتی ہے جس میں گلے کے غدود پھول جاتے ہیں اور بچہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کا علاج ان غدودوں کو انگلی سے دبا کر کر دیا جاتا ہے۔ جو ایک تکلیف دہ علاج ہے۔ حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ نے عذرہ کا مطلب لھاۃ بیان کیا ہے جو حلق میں اوپر کی طرف لٹکا ہوا گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے اور فرمایا : "اعلاق کا مطلب کوے کو انگلی سے دبانا ہے۔" (فتح الباری ۱۰/ ۲۰۷)

2۔ اگر آسان علاج ممکن ہو تو ایسے علاج سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے مریض کو زیادہ تکلیف ہو۔

3۔ عود ہندی (قسط) بہت سی بیماریوں کا علاج ہے۔

عرق النسا کا علاج

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عرق النسا کا علاج یہ ہے کہ جنگلی بھیڑ (یا جنگلی دنبے) کی چکتی کو لے کر پگھلا لیا جائے 'پھر اس کے تین حصے کرلیے جائیں 'پھر روزانہ ایک حصہ نہار منہ پی لیا جائے۔" (حاکم)

فوائد و مسائل :

1۔ عرق النسا ایک درد ہے جو سرین کے جوڑ سے شروع ہو کر ران کی پچھلی طرف نیچے کی طرف آتا ہے۔ بعض اوقات یہ درد ٹخنے تک بھی پہنچ جاتا ہے' مرض جتنا پرانا ہوجاتا ہے ٹانگ اتنی زیادہ متاثر ہوتی جاتی ہے۔

2۔ جنگلی بھیڑ کا تعین اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کی خوراک ایسے جنگلی پودے ہیں جو گرم تاثیر رکھتے ہیں۔

3۔ اس بیماری کا سبب گاڑھا چپکنے والا مادہ ہے۔ جو اس علاج کے نتیجے میں نرم ہوجاتا ہے۔

زخم کا علاج

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'انہوں نے فرمایا۔

"جنگ احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگئے۔ آپ کا سامنے والے دانتوں کے ساتھ والا دانت ٹوٹ گیا۔ آپ کے سر میں خود ٹوٹ کر گھس گیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے جسم مبارک سے خون کو دھو کر صاف کرنے لگیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال میں پانی لا کر ڈال رہے تھے۔ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ پانی ڈالنے سے خون اور زیادہ بہتا ہے تو انہوں نے ایک چٹائی کا ٹکڑا لے کر جلایا۔ جب اس کی راکھ بن گئی تو وہ زخم پر لگادی تب خون رک گیا۔

فوائد و مسائل :

1۔ حصیر (چٹائی) عرب میں کھجور کے پتوں سے بنائی جاتی تھی۔ راکھ کھجور کے پتوں کی ہو یا پٹ سن کے بوریے کی یا سوتی کپڑے کی 'خون بند کر دیتی ہے۔

2۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مشکلات کا آنا امت کے لیے سبق ہے کہ وہ حق کی راہ میں آنے والی تکلیفیں خندہ پیشانی سے برداشت کریں اور توحید کا سبق بھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مختار کل نہ تھے' ورنہ جہاد کی مشکلات برداشت کیے بغیر سب کو

ایک لمحے میں مسلمان کر لیتے۔

علاج

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"مجھے معلوم ہے کہ جنگ احد کے موقع پر کس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو زخمی کیا۔ اور کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کے زخم کا خون بند کر رہا تھا اور زخم کا علاج کر رہا تھا۔ اور کون ڈھال میں پانی لا رہا تھا۔ اور زخم کا علاج کس چیز سے کیا گیا کہ خون بند ہو گیا۔" پھر فرمایا۔

"ڈھال میں پانی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ لا رہے تھے۔ اور زخموں کا علاج حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کر رہی تھیں۔ جب خون بند نہ ہوا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پرانی چٹائی کا ایک ٹکڑا لے کر اس کی راکھ زخم پر رکھی تو زخم سے خون رک گیا۔"

1۔ پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے خواتین جہاد میں شریک ہوتی تھیں۔ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں عورتوں کے شریک ہونے کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی۔

2۔ غزوہ احد میں جب دشمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئے تھے' اس وقت عتبہ بن ابی وقاص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر مارا جس سے آپ پہلو کے بل گر گئے اور آپ کا نچلا درمیانی دانت ٹوٹ گیا۔ اور آپ کا نچلا ہونٹ زخمی ہو گیا۔ عبداللہ بن شہاب زہری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی زخمی کر دی۔ عبداللہ بن قمہ کی تلوار کے وار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خود کی دو کڑیاں چہرے کے اندر دھنس گئیں۔ (الرحیق المختوم' ص: ۳۶۵)

علم طب نہ جاننے کے باوجود علاج کرنے والا

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص علاج کرے' حالانکہ اس سے پہلے وہ طبیب کے طور پر معروف نہیں تو وہ ذمہ دار ہے۔"

(ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ طب کا پیشہ ایک اہم پیشہ ہے۔ چونکہ اس کا تعلق لوگوں کی زندگی اور صحت سے ہے' اس لیے اسے باقاعدہ سیکھنے کے بعد علاج کرنا شروع کرنا چاہیے۔

2۔ اناڑی حکیم کو لوگوں کی صحت سے کھیلنے سے روکنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

3۔ اناڑی ڈاکٹر یا طبیب کے غلط علاج کے نتیجے میں اگر کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اسے اس کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ اگر مریض ہلاک ہو جائے تو یہ طبیب قتل خطا کا مجرم قرار دیا جائے گا اور اس سے دیت وصول کر کے مریض کے وارثوں کو دی جائے گی۔

4۔ اسلام کی نظر میں ہر امیر غریب کی جان برابر قیمتی ہے۔

عود ہندی

حضرت ام قیس (آمنہ) بنت محصن رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عود ہندی (علاج کے لیے) اختیار کرو۔ اس میں سات شفائیں ہیں (سات امراض کی شفا ہے) ان میں سے ایک (بیماری) ذات الجنب (پسلی کا درد) ہے۔"

(بخاری)

ابن سمعان نے اپنی روایت میں بیان کیا ہے کہ عود ہندی میں سات بیماریوں کی شفا ہے۔ ان میں سے ایک (بیماری) ذات الجنب ہے۔

فوائد و مسائل :

1۔ قسط' کست اور عود ہندی ایک ہی دوا کے مختلف نام ہیں۔

2۔ اس دوا کو مختلف امراض میں مختلف انداز سے استعمال کیا جاتا ہے۔

3۔ ذات الجنب ایک بیماری ہے جو اندرونی ورم کی

وجہ سے پسلی کے قریب درد کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

4۔ علامہ زہیر شاویش بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک بڑا پھوڑا ہوتا ہے، جو پہلو میں اندر کی طرف ظاہر ہوتا ہے اور اندر ہی پھٹ جاتا ہے۔ اس کا مریض کم ہی جانبر ہوتا ہے۔ (حاشیہ ضعیف ابن ماجہ)

بخار کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بخار کا ذکر ہوا تو ایک آدمی نے اسے برا بھلا کہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس (بخار) کو برا نہ کہو۔ اس سے گناہ اس طرح دور ہو جاتے ہیں جس طرح آگ سے لوہے کی میل کچیل دور ہو جاتی ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ بیماری پر صبر کرنا چاہیے۔ برا بھلا کہنے کے بجائے دعا اور دوا کی طرف توجہ کی جائے۔

2۔ بیماری اور مصیبت پر صبر کرنے سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

بخار

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک بیمار کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے جسے بخار تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مریض سے) فرمایا:

"خوش ہو جاؤ! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بخار میری آگ ہے جسے میں دنیا میں اپنے مومن بندے پر مسلط کرتا ہوں تاکہ آخرت میں جہنم کے عذاب کے عوض اس کا حصہ اس (بخار) کو قرار دیا جائے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ مریض کی عیادت کرنا مسلمان کا مسلمان پر حق ہے۔

2۔ عیادت کا مقصد بیمار کو تسلی دینا اور اس کے غم اور فکر میں تخفیف کیا ہے۔

3۔ بیماری کی وجہ سے مسلمان کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

4۔ دنیا کی مصیبت پر صبر کرنے سے جہنم سے نجات ملتی ہے۔

بخار جہنم کی بھاپ سے ہے

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بخار جہنم کی بھاپ سے ہے، لہٰذا اسے پانی کے ذریعے سے ٹھنڈا کرو۔"

فوائد و مسائل:

1۔ بخار کا جہنم کی آگ سے تعلق غیبی اور روحانی ہے۔ اس کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی یا یہ مطلب ہے کہ اس سے جہنم کی یاد آتی ہے یا جس طرح دنیا کی خوشیاں اور راحتیں جنت کی نعمتوں سے ایک طرح کی نسبت رکھتی ہیں، اسی طرح غم اور دکھ کا جہنم سے ایک تعلق ہے۔

2۔ حرارت کا علاج پانی ہے۔ بخار کی اکثر قسموں میں پانی کے استعمال سے فائدہ ہوتا ہے۔

3۔ اس حدیث میں پانی کے استعمال کا طریقہ بیان نہیں کیا گیا۔ اس کے استعمال کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں، **مثلاً:** پانی پینا، یا جسم پر پانی کی پٹیاں رکھنا، یا غسل کرنا، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیات مبارکہ کے آخری ایام میں غسل فرمایا تاکہ حرارت کچھ کم ہو تو جماعت سے نماز پڑھ سکیں، خصوصاً" گرم علاقوں میں بخار عام طور پر گرمی کی شدت کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا اس کا علاج پانی سے مناسب ہے۔

4۔ حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا بخار کی مریض خاتون کے گریبان میں پانی ڈال دیا کرتی تھیں تاکہ جسم کو ٹھنڈک پہنچے اور فرماتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اسے

(بخار کو) پانی کے ذریعے سے ٹھنڈا کریں۔
(صحیح البخاری الطب باب الحمی من فیح جھنم حدیث: 5724)

پانی سے ٹھنڈا کرو

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"بخار کی شدت جہنم کی بھاپ میں سے (ایک قسم) ہے لہٰذا اسے پانی کے ذریعے سے ٹھنڈا کرو۔"
(مسلم)

دعا کرنا

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمان سنا: "بخار جہنم کی بھاپ سے ہے لہٰذا اسے پانی کے ذریعے سے ٹھنڈا کرو۔" پھر آپ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹے کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا۔
اکشف الباس رب الناس الہ الناس "تکلیف دور کردے اے لوگوں کے مالک! اے لوگوں کے معبود!"

فوائد و مسائل

1۔ دوا کے ساتھ دعا بھی ضروری ہے۔
2۔ شفا صرف اللہ سے مانگنی چاہیے۔
3۔ جو چیزیں بندوں کے دائرہ اختیار میں ہیں ان میں ان سے صرف اسی حد تک مدد مانگی جاسکتی ہے جس حد تک اسباب کی دنیا میں مدد ممکن ہے۔ اسباب سے ماورا مدد کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔
4۔ طبیب علاج کرسکتا ہے دوا دے سکتا ہے شفا اللہ ہی دیتا ہے۔

سینگی لگوانے کا بیان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جن چیزوں سے تم علاج کرتے ہو اگر ان میں سے کسی میں کوئی بھلائی (اور فائدہ) ہے تو وہ سینگی (لگانے میں) ہے۔" (ابوداود)

جھوٹا خواب بیان کرنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جس شخص نے ایسا خواب بیان کیا جو اس نے نہیں دیکھا تو اسے (قیامت والے دن) مجبور کیا جائے گا کہ وہ جو کے دو دانوں کے درمیان گرہ لگائے۔ اور وہ یہ ہرگز نہیں کرسکے گا۔ اور جو شخص ایسے لوگوں کی بات سننے کے لیے ان کی طرف کان لگائے جو اس کے لیے اس کو ناپسند کرتے ہوں تو قیامت والے دن اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔ اور جو شخص (کسی جاندار کی) تصویر بنائے تو اسے عذاب دیا جائے گا اور اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے جبکہ وہ اس میں روح نہیں پھونک سکے گا۔"
(بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں اپنی طرف سے گھڑ کر جھوٹے خواب بیان کرنے کی شدید وعید ہے۔ یہ بیماری عام طور پر ایسے لوگوں میں ہوتی ہے جو شہرت و نام وری کے بھوکے ہوتے یا اپنی پاکبازی کا پروپیگنڈہ کرنا چاہتے ہوں جیسے چند سال قبل ہمارے ملک میں ایک چرب زبان مقرر اور قائد بننے کے خبط میں مبتلا شخص نے بڑے بڑے عجیب و غریب خواب دیکھنے کے دعوے کیے تھے۔ وہ چونکہ سب بناوٹی تھے اس لیے بہت جلد بھانڈا پھوٹ گیا اور کسی نے بھی اس پر اعتبار نہیں کیا۔
2۔ اس میں ٹوہ میں رہنے یا ٹوہ لگانے کی بھی مذمت ہے۔
3۔ تصویر سازی پر سخت وعید ہے چاہے یہ تصویر ہاتھ کی بنی ہوئی ہو یا کیمرے کی کھینچی ہوئی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تصویر بہرحال تصویر ہے حتیٰ کہ موری تصاویر کی بھی یہی سزا ہوگی جس کو بہت سے لوگ تصویر ہی نہیں سمجھتے۔

عید خوشی اور شادمانی کا نام ہے۔ عیدالاضحیٰ ہمارا مذہبی تہوار ہے۔ سنت ابراہیمی کی پیروی کرتے ہوئے امت مسلمہ پورے جوش و خروش سے عیدالاضحیٰ مناتی ہے۔ میٹھی عید کی چاند رات اگر رنگ و نور اور تھکا دینے والی خریداری پر مشتمل ہوتی ہے تو بڑی عید کا چاند نظر آتے ہی گلیوں محلوں میں دس دن تک رونق لگی رہتی ہے۔ مویشی کی خریداری بھی ایک ذمہ داری ہے مگر آج کل اس میں تفریح کا عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ بقعہ نور بنی جانوروں کی منڈیوں میں خریداروں کا ہجوم چاند رات کی گہما گہمی سے کم نہیں ہوتا۔ پھر جانوروں کی خریداری کے بعد ان کی نمائش بھی ایک لازمی جز بن گئی ہے۔ بچوں کو تو ایک تفریح ہاتھ آجاتی ہے سر شام اپنی قربانی کے جانور کو ٹہلانے نکلتے ہیں۔ خود بھی دوڑتے پھرتے ہیں اور سجے سنورے جانور بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔

اس دفعہ عیدالاضحیٰ کے سروے کے سوالات بھی ہم نے اسی تناظر میں کیے ہیں۔ سوالات یہ ہیں۔

(1) کیا آپ قربانی کے جانور کی خریداری، اس کی دیکھ بھال اور کھلانے پلانے میں حصہ لیتی ہیں؟ عیدالاضحیٰ کے دن آپ کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں۔

(2) چونکہ گھر میں گوشت وافر مقدار میں ہوتا ہے اس لیے فرمائشیں بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہوتی ہیں۔ آپ سے کون سی ڈش بنانے کی سب سے زیادہ فرمائش کی جاتی ہے۔

(3) گوشت کی تقسیم کرتے ہوئے کن باتوں کو ملحوظ رکھتی ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں، ہمارے قارئین نے ان کے کیا جواب دیے ہیں۔

عیدالاضحیٰ اور آپ

ادارہ

ثمرہ احمد بٹ پتوکی

(1) بڑی عید، بڑی رونقیں اللہ کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امتحان میں کامیابی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے جذبہ و عمل کو یادگار بنا دیا۔ تمام اونٹ، بیل، بکرے، دنبے۔ جو ہم قربان کرتے ہیں، یاد دلاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اولاد جو انسان کو سب سے دنیا میں پیاری ہوتی ہے۔ اسے قربان کرنا پڑتا تو کیا ہوتا؟ تو جناب اس لیے اپنے قربانی کے جانور سے پیار کرنا، اسے کھلانا پلانا، بچے کی طرح ٹریٹ کرنا، سرتے جاگنے کا خیال رکھنا، صفائی ستھرائی، صحت بیماری سب ہی کچھ اس میں آجاتا ہے، ہماری فیملیز زیادہ تر بیل کی خریداری کرتی ہیں۔ صاحب استطاعت ساتھ میں بکرے بھی لیتے ہیں اور کچھ رشتہ دار کچھ بھی نہیں لیتے مگر دوسرے رشتہ داران کا عید کے روز بہت خیال کرتے اور اجر عظیم پاتے ہیں۔

ہمارے ہاں شادی سے پہلے ابو جان ہمیشہ دنبہ یا بکرا لاتے۔ ایک بار مادہ بیل لائے جس کا گوشت انتہائی لذیذ تھا۔

بکرے کے آنے پر اس کا نام رکھنا **مثلاً** "اس کی صورت بھولی ہو تو بھولا، شہزادے کی طرح لگے تو شہزادہ یا راجہ، اور کبھی کبھار ٹیپو سلطان بھی رکھا جاتا ہے اور پھر پورا مہینہ اگر جلدی بکرا لے لیا جائے تو اس کی شرارتیں، رونقیں، باہر سیر کرانے لے کر جانا، اسے توڑی ونڈا کھلانا، شہتوت کے پتے، بکائن کے پتے، گھاس سب اپنے ہاتھوں سے درختوں سے توڑ توڑ کر ہم سب کا مشترکہ فیورٹ کام ہے۔ پورا مہینہ ذی قعد

کا کتنی جلدی ختم ہوتا ہے پتا نہیں چلتا اور پیار جناب
بکرے سے پیار اس قدر زیادہ ہو جاتا ہے کہ یقین
کریں ۔۔۔۔ اس کی متوالی صورت بڑی بڑی
آنکھیں' پیارے پیارے سینگ' اس کے جھانجر والے
پاؤں' اس کا خوب صورت ماتھا' ناک' منہ' زبان' کان
لگتا ہے جیسے اپنا بچہ ہو۔
آپ پریشان' حیران نہ ہوں' پیار کی نظر ایسی ہی ہوتی
ہے۔
کبھی اسے پانی پلانا کبھی اپنے ہاتھوں سے بیٹھ کر
شاخیں پکڑ پکڑ کر تازہ پتے کھلانا' جتنا ہریالی جانور کھائے
اتنی اس کی اوجھڑی صاف ستھری رہتی ہے جب بکرا
ذبح ہوتا ہے تو اس کی اوجھڑی سے گندگی کے بجائے
ہریالی کی خوشبو آتی ہے۔
پھر بکرے یا لیلے' دنبے کو مہندی لگانا' خوب
صورت رنگ برنگے زیورات' ماتھا پٹی گلوبند جو نرم
اون کے بنے ہوتے ہیں۔ وہ پہنانا اسے سجانا' سنوارنا
بڑوں کا بھی' بچوں کے ساتھ بچہ بننے والی عید دراصل بقر
عید ہی ہے۔ البتہ قصائی کا انتظام ذبح کرنا تو ٹلی مردوں
کی ذمہ داری ہوتی ہے۔
ہمارے ہاں شروع سے یہ طریقہ ہے کہ قصائی صبح
صبح پہلے دن آتا ہے۔ صبح کے وقت ان کے ریٹ زیادہ
فکس ہوتے ہیں اور صبح صبح آنے کا فائدہ۔ خود بھی
آرام سے پکوان پکاؤ اور تقسیم بھی دوپہر سے پہلے پہلے
کر کے دوسروں کو بھی نفع پہنچاؤ۔ گھر میں بچے تو جو
روتے ہیں پھر قربانی کے وقت بڑے بھی ساتھ دیتے
ہیں۔ ہماری امی اور بہنیں جو سارا سال تو یوں لگتا ہے
سخت ہیں مگر قصائی نے جوں ہی تکبیر پڑھی اندر کے
آنسو امڈ امڈ کر باہر آنے لگے۔
پھر جناب غبارے' زیورات' تمام سجاوٹیں گھر میں
درخت پر لٹکا دیتے ہیں قصائی فٹافٹ اپنا کام کر کے
اگلے گھروں کو نپٹانے کے چکروں میں ہوتا ہے۔
عیدالاضحی کی رونقیں عروج پہ ہوتی ہیں۔ ہر گھر سے
گوشت کا آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔
تقسیم کے دوران ہی کلیجی سے پنجاب میں شروع
سے ہی مزیدار سالن بنایا جاتا ہے تین حصے کر کے
گوشت بانٹا جاتا ہے بالکل برابر۔ ساری بوٹیاں ایک
جیسی مکس خصوصی گھر کے لیے سوائے پاؤں کے کچھ
نہیں نکالا جاتا۔ ایک سائیڈ پہ کر دیا جاتا ہے۔
گھر کے بڑے پہلا کھانا کلیجی کی ڈش سے ہی شروع
کرتے ہیں۔
طریقے سلیقے سے کام کیے جائیں تو یہ مراحل بخوبی
طے ہو جاتے ہیں خاص طور پر جب قصائی عیدالاضحی
کی نماز پڑھتے ہی نمودار ہو جاتا ہے تو بکھیڑا شام تک
نہیں رہتا۔ ظہر سے قبل تمام کام مکمل ہو جاتے ہیں۔
بانٹنے کے مراحل غرباء کے تو جلد نمٹ جاتے ہیں'
رشتہ دار جو دور ہوتے ہیں شہر میں نہیں ہوتے' وہ
دوسرے' تیسرے' چوتھے دن پر چلے جاتے ہیں۔ فریزر
میں ان کا حصہ محفوظ ہوتا ہے۔ موقع ملنے پر پہنچا دیا
جاتا ہے اور ہمارے رشتہ دار بھی ہمارے حقوق کا بہت
خیال رکھتے ہیں۔ ہاں جو بچھڑ چکے ہیں' ان کے لیے
دعائے مغفرت کرنے سب عید کی صبح کو قبرستان جاتے
اور برائے ایصال ثواب کرتے ہیں۔
(2) مجھے گوشت والی ڈشز بہت پسند ہیں' چاہے
سبزی شامل ہو چاہے چاول یا پھر قیمہ بھرے کریلے'
کوفتے وغیرہ کچھ کھانے میں اور کچھ بنا کر سرو کرنے
میں مزا آتا ہے۔ فرمائشی پروگرام کبھی کبھار ہو گئے۔
پتوکی میں ایک دوست ہے جس کی رفاقت فخر کا باعث
ہے۔ وہ بغیر فرمائش کے ہی فرمائشیں بوجھ لیتی ہے اور
اکثر و بیشتر عید ہو یا نہ ہو' اپنی میزبانی سے خوش کرتی
رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم سات ستارے ہیں یعنی
الحمدللہ سات بہنیں ہیں تو بقرعید پر دوسرے تیسرے
دن کوئی نہ کوئی امی کے پاس سیالکوٹ پہنچی ہوتی ہے' وہ
اور ان کے بچے ہلا گلا کرتے ہیں۔ عید کی رات سے
پہلے پہلے لکڑیاں اکٹھی کر کے اینٹیں جوڑ کر کوئلے
جلانا' سلاخیں' گرل وہ اپنے گھروں سے لے آتی ہیں
پھر کوئی باربی کیو' تکہ بوٹی' قیمے کے کباب' پائے کڑاہی
گوشت' روسٹ غرضیکہ عید ملن پارٹیاں تین چار دن

جاری وساری رہتی ہیں اور اس پر مزا یہ کہ اگر بارش ہو جائے تو وارے نیارے۔

درمیان والی بہن آمنہ سے بیف کوفتے بنواتے ہیں سب فرمائش کر کے اور خوب اودھم مچاتے ہیں' یوں خوشی کے لمحے گزر جاتے ہیں۔ فوزیہ جمیل پتوکی اور آمنہ حفیظ سیالکوٹ بھئی آپ کا شکریہ فرمائشیں پورا کرنے پر اللہ آپ کو خوش رکھے۔ شعاع کے ذریعے تم دونوں کو خصوصی تھینکس۔ ایک اچھی سی چھوٹی سی ترکیب لکھ رہی ہوں جو مجھے بہت پسند ہے۔ پہلے خوراک زیادہ کھا سکتے تھے مگر اب عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ کم ہو رہا ہے یعنی کھانا شانا۔

بے شک کشمیری ہونے کی وجہ سے ہماری اڑھائی پسلیاں' سنا ہے کہ زیادہ ہوتی ہیں' ہو سکتا ہے سچ ہی ہو۔ ہم نے کون سا ایکسرے کروائے ہیں۔

فرمائشی پروگرام تو آپ کو ففٹی ففٹی بتا ڈالا۔ بنیادی طور اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا مجھے پسند ہے۔ بکرے کا گوشت' ہو تو ہانڈی گوشت' اونٹ کا ہو تو اس کے قیمے کے کباب وغیرہ بنانا پسند کرتی ہوں بقر عید کے دن تقسیم ہو جاتے ہیں۔

سسر اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں بلند مقام دے۔ حیات تھے تو نمک گوشت پسند کرتے تھے۔ وہ بہت بنا کر کھلایا اور میرا اپنے بارے میں تو یہ خیال ہے کہ اگر کوئی مجھے محبت سے زہر بھی دے تو میں کھالوں گی۔

ہنڈیا گوشت

ضروری اشیاء :

مٹن	1 کلو
دہی	1/2 کلو
نمک' مرچ' ہلدی	حسب منشاء
ہرا دھنیا' ہری مرچ	تھوڑا سا دونوں
زیرہ' کالی مرچ	دونوں ثابت
ڈالڈا آئل	1/2 کپ
خشک میتھی' دھنیا پسا	1 ٹیبل اسپون
ادرک کٹی ہوئی	1 چمچ
پیاز	3 عدد
لہسن	2 پوتھی
مٹی کی ہنڈیا	لیپ شدہ

ترکیب :

مٹن اچھی طرح دھو لیں (بکرا بو والا نہ ہو) بوٹیاں چھوٹی ہوں' دہی میں ڈبو کر ایک گھنٹہ مکمل رکھ دیں۔ ہنڈیا میں آئل ڈال کر پیاز باریک باریک کاٹ لیں اور لہسن بھی' دونوں کو ہلکی آنچ پر سرخ کر کے چھوڑ دیں۔ نمک مرچ' ادرک' ہری مرچ ڈال کر ایک گھنٹے بعد جب مٹن دہی اچھی طرح جذب کر چکا ہو' دہی سمیت اٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیں۔ درمیانی آنچ پر ڈھکن دے کر پکنے دیں۔ آدھے گھنٹے میں گل جائے گا پھر اسے بھونیں' جب گھی چھوڑنے لگے چولہا بند کریں۔ خشک میتھی' زیرہ' دھنیا اچھی طرح مسل کر ہنڈیا میں ڈالیں اور دم پر رکھ دیں۔ گھیلو نرم روٹی یا تندوری نان کے ساتھ سرو کریں لذت سے بھرپور مٹن تیار ہے۔

(3) ہمارا صوبہ پنج آب ہے' پانچ دریاؤں کی سرزمین اور اس خوب صورت سرزمین کے لوگ بھی بہت خوب صورت ذہن رکھتے ہیں۔ محبت بھرا' آرٹسٹک' لذت سے بھرپور کھانے' مہمان نوازیاں' البتہ ان کے غصے چڑھتے دریاؤں کی طرح ہوتے ہیں جلد اتر جانے والے۔

(4) گوشت تقسیم کرنے کا طریقہ بالکل انصاف پر مبنی ہے' ایک' دو' تین حصے' آپ کا اپنا یعنی گھر کا' رشتہ داروں کا' غریبوں کا۔ امی کے گھر پر ہوں تو بہنیں مل کر بناتی ہیں۔ قصائی کے جانے کے بعد حصے اور خصوصی خیال رکھتی ہیں کہ حق تلفی نہ ہو۔ تینوں برابر کر کے ان سب باتوں کا خیال رکھ کر اللہ کا حکم ہے رشتہ دار' غریب بلکہ بعض اوقات کسی کو وہ گوشت جو دوسروں کے گھروں سے آتا ہے وہ بھی تقسیم میں شامل کر کے غریبوں کو دیا جاتا ہے کہ خود تو انسان گوشت سارا سال کھاتا ہے' بقر عید پر فریزر بھرنے کے بجائے لوگوں کی

جھولی بھری جائے تو ایک دن آخرت کا بھی ہے۔

میرے شوہر احمد سعید چوتھے' پانچویں دن عید کا گوشت کھاتے ہی نہیں پھر آپ خود سوچیں۔ گھر میں رکھنے کا فائدہ؟ وہ کہتے ہیں کہ دوسروں کو وہ دو جو خود کھانا پسند کرو۔ اللہ کرے یہی ادا اللہ کو ان کی پسند آجائے۔ (آمین)

فائزہ خان حیدر آباد

"میں" گھر میں سب سے چھوٹی ہوں یعنی کہ بہن بھائیوں میں میرا نمبر آخر کا ہے تو چھوٹی ہونے کی وجہ سے میرے لیے عید صرف انجوائے کرنا ہے (اب چھوٹی ہونے کا کچھ تو فائدہ ہو) اسی لیے سروے کے سب نہیں تو کچھ سوالوں کے جوابات میں "پتا نہیں" تو لازمی ہوگا' پر کیا کریں یہ "شوق" کہ ہمارا نام بھی ڈائجسٹ کے سروے میں شامل ہو۔

(1) پہلا سوال چونکہ قربانی کے جانور اور قربانی کا ہے تو جانور تو بھائی وغیرہ ہی جا کے لاتے ہیں اور عید کے پہلے دن ہی قربانی کر دی جاتی ہے۔ اب قربانی وغیرہ کی مصروفیات کا تو مجھے "پتا نہیں" کیونکہ میں تو صبح تیار ہو کے بیٹھ جاتی ہوں بس پھر گوشت بنا اور میں گوشت بانٹنے نکل گئی ۔۔۔ یہی میری پیاری سی مصروفیات ہیں۔

(2) واہ! کیا سوال ہے بھئی پسندیدہ ڈش تو بہت ہیں پر "ہنٹر بیف" کی تو بات ہی الگ ہے جہاں تک بات ہے خود بنانے کی تو اتنی سگھڑ تو میں ہوں نہیں کہ خود بناؤں سو فرمائش ہی کر کے بنواتی ہوں۔

(3) بس جو بھی ڈش ہو مزے دار اور چٹ پٹی ہونا چاہیے' ویسے ہم باربی کیو بڑے اہتمام سے کرتے ہیں اور ہنٹر بیف بھی ضرور بنتا ہے۔

(4) گوشت کی تقسیم جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ میں گھر میں چھوٹی ہوں۔ اس لیے تقسیم کے کاموں میں نہیں گھستی۔ یہ کام امی اور بہن ہی انجام دیتی ہیں تو اس بار بھی مجھے "نہیں پتا" ویسے گوشت کی تقسیم کے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ رشتے داروں کے علاوہ غریبوں کو بھی یاد رکھا جائے اور کسی کو اتنا گوشت تو دینا چاہیے کہ ان کی اس سے دو وقت کی ہانڈی تو پک جائے۔

آخر میں آپ سب کو عید الاضحیٰ بہت مبارک ہو۔

اقراء ملک گوجرانوالہ

(1) قصائی تو ہمارے گھر کے ہوتے ہیں۔ اپنا راج ہوتا ہے جب جی چاہا قربانی کرلی لیکن ہمارے گھر ہمیشہ قربانی عید کے تیسرے دن صبح چھ بجے ہوتی ہے کیونکہ سب تقریباً" تیسرے دن فارغ ہوتے ہیں۔ پہلے دو دن تو نیند پوری ہوتی ہے یا ڈائجسٹ اور چائے اس کے علاوہ کوئی مصروفیت نہیں۔ بکرے کے ذبح ہونے سے لے کر پکانے تک میں کبھی اپنے قصائی چاچو کے ساتھ ہوتی ہوں اور کبھی ماما کے ساتھ (سب سے بڑی جو ہوں) کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر طرف بس اقراء یہ کرو' اقراء وہ کرو۔ تیسرا دن ایسے ہوتا ہے جیسے پہلا دن ہو۔ بڑا مزا آتا ہے لیکن ان سب میں میں اپنے آپ کو تیار کرنا نہیں بھولتی۔ آخر سال بعد عید آتی ہے حق تو بنتا ہے اور اب رہی قربانی کے جانور کی بات تو وہ سارا سال رہتا ہے' گھر میں پالتے ہیں۔

(2) گوشت کی پسندیدہ ڈش تو چانپیں ہیں۔ میں تو مہینہ پہلے ہی شور مچا دیتی ہوں کہ بکرے کی چانپیں میری ہیں' رافیہ کہتی ہے آپی باہر بکرا کھڑا ہے ابھی تو اس کو دیکھ کر دل بہلاؤ اور زبان کو ہونٹوں پر پھیر کر کام چلاؤ۔ خیر چانپ تو ماما سے بنواتی ہوں۔

ہمارے ہاں خاص موقعوں پر فرنی ضرور بنتی ہے۔ جو ہمارے گھر میں نمکین عید پہ تو ضرور ہی بنتی ہے۔

(3) گوشت کی تقسیم تو ماما' دادی کا ہی کام ہے' وہ کہتے ہیں نا کہ جس کا کام اسی کو ساجھے تو میں ان معاملات میں نہیں پڑتی۔ ہاں شاپر کھول دینا اور اس پر نام لکھنا میرا کام ہے۔

عائشہ جمیل بلدیہ ٹاؤن

(1) شکر ہے اس پاک ذات کا جس نے ہمیں بھی

سنت ابراہیمی پر عمل کرنے کی توفیق بخشی۔

عیدالضحیٰ پر قربانی کے لیے اس مرتبہ قربانی کا جانور (دنبہ) چھ سات مہینے پہلے بڑے بھائی جان خرید لائے۔ جسے سب نے کھلا پلا کر ماشاء اللہ اتنا بڑا کیا کہ پہچاننے میں ہی نہیں آتا کہ یہ گبھرو جوان وہی ہے جو پہلے چھوٹا سا ہوا کرتا تھا۔ ہر دوسرے دن اسے نہلانا' اس کی کٹنگ شٹنگ بھائی نے خود کرنی' اس کے کھانے پینے کا خیال اس طرح رکھا جاتا جیسے ماں باپ اپنے بچوں کا رکھتے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد اگر اس نے گھاس کو منہ نہ لگایا تو آخر کیوں؟

کبھی اسے ہاضمے کی دوا دی جاتی تو کبھی بوتل شوتل پلائی جاتی' غرض جتنے بندے اتنے ہی جتن۔ اس کی جگہ کی صفائی ستھرائی امی اور بہنیں کرتیں۔ سب ہی نے اپنے اپنے حصے کا ثواب کمایا (ہم بھی گوشت کھا کر اپنے حصے کا ثواب کمالیں گے)

دوسرا جانور گائے/بیل کی صورت میں عید سے ایک ہفتہ پہلے ہی خریدا جاتا ہے۔ جو ابو' چاچو' بھائی اور کزن وغیرہ لینے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں قصائی صاحب کا انتظار نہیں کرنا پڑتا کیونکہ اس کام کے لیے ہمارے گھر کے مرد ماشاء اللہ سب ہی ایکسپرٹ ہیں۔ خود ہی جانور حلال کرتے ہیں۔ کچن کی ذمہ داری امی اور بہنیں سنبھالتی ہیں اور دوپہر میں بڑے سے دو دسترخوان لگتے ہیں جس پہ خاندان کے سب ہی افراد جمع ہوتے ہیں۔ ان ہی مصروفیات میں تھوڑے بہت ہم بھی مصروف ہوتے ہیں۔

(2) بریانی + کباب اور بڑے بھائی جان کے ہاتھ سے بنی ہوئی کلیجی اور بھنا ہوا گوشت تو بہت ہی پسند ہے۔ پکانا نہیں آتا اس لیے تو صرف فرمائش ہی چلتی ہے۔ کوفتے اور بریانی ہمارے ہاں ضرور بنتی ہے۔

(4) گوشت کی تقسیم کا کام تو امی ہی کرتی ہیں اور تقسیم کے وقت وہ ہر طرح سے خیال رکھتی ہیں۔ سب سے پہلے محلے میں اور ان کے ہاں گوشت بھجواتی ہیں جن کا زیادہ حق ہوتا ہے پھر رشتہ داروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ام احمد ڈیرہ غازی خان

(1) ذی الحج کا چاند نظر آتے ہی واقعی رونق شروع ہو جاتی ہے لیکن گھر چھوٹا ہونے کے وجہ سے ہم آٹھ یا نو ذی الحج کو ہی قربانی کی بکریاں لاتے ہیں۔ اور جب بکری آجاتی ہے تو میرے دونوں بچے مجال ہے جو رات بارہ بجے تک سو جائیں۔ اس سے چمٹے بیٹھے رہتے ہیں۔ اپنے بسکٹ' چاکلیٹ سب بکریوں پہ نچھاور کرنے کو تیار۔ پچھلی عید پہ تو میری بچی قربانی والی بکری کو دینے کے لیے فیڈر اٹھا لائی اور ہم سب ہنسی سے لوٹ پوٹ۔

پچھلے سال ماشاء اللہ ہماری تین بکریاں تھیں اور پھر گھر بھی کافی گندا ہو جاتا ہے لیکن قربانی کی بکریوں کو مہمان سمجھ کر بار بار صفائی کرتے رہتے ہیں۔ قصائی کا بھی کافی مسئلہ ہوتا ہے۔ میرے ہسبنڈ بے چارے بہت بھاگ دوڑ کرتے ہیں اور اکثر صبح سویرے ہی قصائی ڈھونڈ لاتے ہیں۔

گیارہ بجے تک ہم قربانی کر لیتے ہیں۔ پھر اس کے بعد سرف ڈال کر رگڑ رگڑ کر فرش چمکاتے ہیں۔ اس کے بعد گوشت تقسیم کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو پہلے کہہ دیتے ہیں۔ وہ گھر سے آکر ہی لے جاتے ہیں۔ باقی ہمسایوں اور رشتے داروں کے گھر میرے ہسبنڈ اور بھائی دے کر آتے ہیں۔ باقی گوشت دھو کر فریز کر لیتے ہیں۔ گوشت بانٹتے بھی بہت ہیں اور ملتا بھی بہت ہے۔ اس سال نیا ریفریجریٹر ہے تو اپنا حصہ ان شاء اللہ آسانی سے سنبھال لیں گے۔

(2) ہمارا فرمائشیں کروا کر پکانے والا دور تو عرصہ ہوا ختم ہو گیا۔ اب تو اکثر کوکنگ خود ہی کرتی ہوں۔ ہم لوگ عید والے دن پلاؤ' کڑاہی گوشت اور نمکین گوشت بناتے ہیں اور دوسرے دن سری پائے پکائے جاتے ہیں۔ ہاں پہلے دن میں کلیجی ضرور پکاتی ہوں۔ مجھے اور میرے بچوں کو بہت پسند ہے۔ بکری کا مغز بھی

شام میں فرائی کر لیتے ہیں۔ پچھلے سال ران بھی روسٹ کروائی تھی۔ غرض ہر طرح کے کھانے پکا کے اور کھا کے عیدالاضحیٰ بھرپور طریقے سے انجوائے کرتے ہیں۔

ہمارے خاندان کی فرمائشی ڈش نمکین گوشت ہی سمجھ لیں۔ ترکیب میرا خیال ہے کہ لوگ مجھ سے اچھا پکا لیتے ہوں گے۔ کیونکہ میری شادی کم عمری میں ہوئی اور میں ابھی تک سب سے سیکھنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔

ویسے نمکین گوشت یہ ہوتا ہے کہ گوشت دھو کے ایک بڑے دیگچے میں ڈال لیتے ہیں۔ پانی کم ڈالتے ہیں۔ دھیمی آنچ پہ رکھتے ہیں اور اس کے اندر نمک، مرچ، لہسن، پیاز اور خشک دھنیا ڈالتے ہیں اور وہ اسی دھیمی آنچ پہ ہی پک جاتا ہے یہ کھانے میں لذیذ اور زود ہضم ہوتا ہے۔ زیادہ بھاری نہیں ہوتا۔

(3) گوشت تقسیم کرتے ہوئے یہی خیال رکھتے ہیں کہ ایسا گوشت ہو کہ اگر ویسا ہمارے گھر آجاتا تو پکانے کے قابل ہو۔ مطلب ساری ہڈیاں وغیرہ یا چربی ڈال کر شاپر نہیں بھرتے۔ بلکہ سارا گوشت مکس کر کے حصے بناتے ہیں۔ اور یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں کے گھر ضرور بھجوائیں جنہیں کہیں اور سے گوشت نہیں ملتا۔

شازیہ الطاف شجاع آباد

(1) بڑی عید کے بڑے مزے۔ بہت سارا گوشت اور بہت سارا لہسن، پیاز، ادرک وغیرہ وغیرہ۔ میں کسی کے گھر مدعو نہیں ہوتی کیونکہ میں جوائنٹ فیملی میں رہتی ہوں، ساس، سوچچا، تایا، تائی، چاچی، دادا، دادی سب کزنز اکٹھے رہتے ہیں تو پھر مل کے عید مناتے ہیں۔ تو کہیں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

صبح صبح اٹھ کر پہلے جھاڑو لگاتی ہوں پھر سارے برتن دھو چمکا کے اپنی جگہوں پہ۔ پھر کوئی میٹھا بنا لیتی ہوں میٹھے سے مراد کوئی سادہ سی دیہاتی ڈش سویوں کا زردہ یا پھر چاولوں کا زردہ وغیرہ۔ میاں صاحب کا منہ میٹھا کرا کے انہیں نماز پڑھنے روانہ کیا پھر جلدی جلدی خود تیار ہوتی ہوں۔ بچوں کو نہلا دھلا کے کپڑے پہناتی ہوں۔ اتنے میں میرے "وہ" قصائی سمیت آن وارد ہوتے ہیں تو میں ہوئی کمرے میں گوشہ نشین، کیونکہ باہر آدمی (صحن میں) بکرا ذبح کرتے ہیں۔ گوشت بناتے ہیں اور میں تقریباً" گیارہ بجے تک اندر بیٹھی رہتی ہوں۔ اسی دوران اپنی امی کو فون کھڑکاتی ہوں۔ ان سے گپ شپ چلتی ہے۔ اتنے میں الطاف کلیجی لے کے آجاتے ہیں۔ جلدی جلدی کلیجی کو بھونا، تھوڑا آٹا گوندھ کے ان کے لیے روٹیاں ڈالیں۔ میاں جی خوش ہو گئے (جلدی جلدی پکا لینے پر) کیونکہ صبح ہلکا پھلکا ناشتہ کرتے ہیں۔ میٹھے کا پھر ڈٹ کے کھانا کھاتے ہیں۔

اس کے بعد گوشت آجاتا ہے، میں گوشت کے حصے نہیں بناتی بلکہ تھوڑا سا رکھ کے باقی سارا بانٹ

دیتی ہوں۔ میری دو چھوٹی چھوٹی بیٹیاں ہیں پرنسس فاطمہ زہرا اور آمنہ الطاف تو ہم چاروں نے کتنا گوشت کھالینا ہوتا ہے سو میں بہت کم گوشت رکھتی ہوں' سری پائے سمیت بانٹ دیتی ہوں اور ڈشز وغیرہ کوئی خاص نہیں۔ بس گوشت بھون لیا اور میاں صاحب چونکہ روٹی شوق سے کھاتے ہیں۔ تھوڑا سا گوشت بھون کے رکھ دیتی ہوں جب کہیں گرم کر کے ساتھ دو روٹیاں ڈال دیں اور میں روایتی پلاؤ بہت اچھا بنالیتی ہوں جو جاننے والوں کے ہاں بھیجتی ہوں۔ شام کو گھر سے پھرنے نکل جاتے ہیں۔ بازار کا چکر لگاتے ہیں۔ بچوں کو مٹھائی کیک وغیرہ دلایا اور شام ہو گئی۔

(2) پچھلے سال قربانی کی وجہ سے میں میاں صاحب سے بے حد ناراض ہوئی ضد پکڑلی کہ اس دفعہ قربانی ضرور کریں اور وہ جواباً" سمجھانے بیٹھ جاتے کہ ان شاء اللہ اگلے سال "آپ کا اگلا سال کبھی نہیں آنے والا" میں کہہ کہہ کر تھک گئی۔ بالآخر خاموشی سے کپڑے لے آئی اپنے 'بچوں کے۔

عید سے ایک دن پہلے انہوں نے موٹر سائیکل نکالی اور مجھے پیچھے بیٹھنے کو کہا (کیونکہ دونوں بچیوں کو پہلے ہی بٹھا چکے تھے)

"کوئی بڑا برتن تو لے لو۔"

معصومیت تو دیکھو کہ قربانی ہماری ہے نہیں اور میں بڑے بڑے پتیلے سجا کر بیٹھ جاؤں میں نے کیا کرنے ہیں۔ انہوں نے خود ہی بڑا سا پتیلا پسند کیا اور دوسرا ضروری سامان لے کر گھر آئے۔ میں سمجھی میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ صبح صبح ہمارے صحن میں بکرا بندھا نظر آیا۔

"یہ کیا؟" میں خوشی سے چیخ پڑی اور وہ دھیما سا مسکرا کر بولے (بکرا خرید کر کسی کے گھر باندھ آئے تھے) "تمہارا ہے۔"

"تو پہلے کیوں نہ بتادیا؟"

"پھر سرپرائز تو نہ رہتا۔"

یہ ہے میری قربانی کا دلچسپ واقعہ۔

علی عباس ہمراہ حمنہ علی

شاہین رشید

شادی دو اجنبیوں کے ملاپ کا ایک خوب صورت طریقہ ہے کیوں کہ اس خوب صورت بندھن کی وجہ سے ایک خوب صورت فیملی جنم لیتی ہے۔ جس کے بعد زندگی مکمل مکمل سی نظر آتی ہے بلکہ زندگی مکمل ہوجاتی ہے۔ ایک فیملی کے لیے "اولاد" قدرت کا ایک بہترین تحفہ ہوتا ہے اور یہ تحفہ ہی میاں بیوی کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھتا ہے۔

"بندھن" کے اس سلسلے میں ملیے "علی عباس" اور "حمنہ علی" سے۔

علی عباس

"جی علی! کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"بندھن کے لیے ٹائم دینے کا شکریہ.... یہ بتائیں کہ ماشاء اللہ شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا اور بچے خیر سے کتنے ہیں؟"

"جی.... ہماری شادی کو ماشاء اللہ سے چار سال ہوگئے ہیں۔ یکم جولائی 2012ء میں ہماری شادی ہوئی اور ماشاء اللہ سے دو بچے ہیں۔ بڑی بیٹی ہے۔ نام "فاطمہ علی" ہے جو کہ پونے تین سال کی ہے اور ایک بیٹا ہے "محمد سالار علی" جو کہ ابھی ڈیڑھ مہینے کا ہے۔"

"حمنہ سے کہاں ملاقات ہوئی؟ اور کب دل نے دستک دی کہ حمنہ سے شادی کرلینی چاہیے؟ کیا آپس میں رشتے داری ہے؟"

"جی.... ہماری آپس میں کوئی رشتے داری نہیں ہے، نہ ہم کزن ہیں اور نہ ہی ویسے کوئی رشتے داری ہے.... حمنہ سے میری پہلی ملاقات ایک چینل کے آفس میں ہوئی تھی اور کچھ ہی عرصے کے بعد ہم دونوں بہت اچھے دوست بن گئے تھے اور میرے دل پہ دستک

میرے والد (وسیم عباس) نے دی تھی کہ حمنہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ کیوں کہ فیملی بھی ایک دوسرے سے مل چکی تھی تو والد کے کہنے کے بعد پھر ہم نے سوچا اور انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ ہوئی اور پھر شادی کا فیصلہ ہوا۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی اور کیا شادی دھوم دھام سے ہوئی؟ اور رسمیں.....؟"

"ہماری منگنی تقریباً" چھ ماہ رہی اور چونکہ ایک ہی آفس میں کام کرتے تھے تو ملاقات بھی روزانہ ہی ہوتی تھی.... اور ہاں جی.... شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی کہ ہماری فیملی میں پہلی شادی تھی.... لیکن ہم نے میڈیا کے بہت کم لوگوں کو بلایا تھا۔ بس جن سے بہت زیادہ قریب تھے۔ ان ہی کو بلایا جیسے کاشف محمود' علی عظمت اور نور الحسن.... اور ہماری شادی کو آپ ارینج + لو کہہ سکتی ہیں۔ رسمیں ہوئیں۔ ہم پنجابی ہیں۔ حمنہ اردو اسپیکنگ تو رسموں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔"

"ہنی مون کے لیے کہاں گئے اور کیا یہ ضروری ہے....؟ پہلی لڑائی کے بارے میں بھی بتائیے اور صلح کون کراتا ہے؟"

"جی ہنی مون پہ جانا بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ شروع دنوں کا بہت یادگار وقت ہوتا ہے جسے ہم ساری زندگی یاد رکھتے ہیں اور ہماری پہلی لڑائی بھی اسی بات پر ہوئی تھی کہ ہم ہنی مون پہ نہیں گئے تھے۔ حمنہ کافی ناراض ہوئی تھیں اور جہاں تک صلح کا تعلق ہے تو ہم گھر والوں کو کبھی محسوس ہی نہیں ہونے دیتے کہ ہماری لڑائی ہوئی ہے۔ اس لیے صلح بھی خود ہی کرنی پڑتی ہے اور زیادہ تر میں ہی صلح میں پہل کرتا ہوں۔"

"شادی کے بعد حمنہ کو مزاج کا کیسا پایا؟ اور کوئی خاص بات؟"

"حمنہ بہت سوئیٹ ہیں' خوش اخلاق ہیں اور میری فیملی میں حمنہ کے سب سے اچھے تعلقات ہیں۔ میری خالہ اور پھپھو وغیرہ سے مجھ سے زیادہ اچھے روابط حمنہ کے ہی ہیں اور خاص بات یہ کہ شادی کے بعد حمنہ نے اپنی جاب اور اپنے کیریئر کے لیے بہت کمپرومائز کیا۔ بچوں کی خاطر حالانکہ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی نہ ہی میری فیملی کی طرف سے' یہ حمنہ کا اپنا فیصلہ تھا کہ جب تک بچے تھوڑے بڑے نہیں ہو جاتے' وہ جاب نہیں کرے گی۔"

"کبھی خیال آیا کہ کاش حمنہ سے میری شادی نہ ہوئی ہوتی؟"

"میرے ذہن میں تو نہیں۔ البتہ حمنہ کے ذہن میں بہت مرتبہ آتا ہے کہ کاش انہوں نے مجھ سے شادی نہ کی ہوتی' لیکن میں تو بہت خوش ہوں کہ میری حمنہ سے شادی ہوئی ہے۔"

"شادی کے نقصانات ہیں یا فائدے....؟"

"شادی کے نقصانات بھی ہیں اور فائدے بھی.... فائدہ تو یہ ہے کہ آپ کی زندگی ایک "پٹری" پر رہتی ہے اور نقصان یہ ہے کہ جب کوئی خوب صورت ہیروئن یا لڑکی مجھ سے کچھ ذاتی سوال کرتی ہے تو مجھے اسے بتانا پڑتا ہے کہ میں شادی شدہ ہوں' یہ حیثیت ایک اداکار کے یہ کافی بڑا نقصان ہے جو مجھے فیس کرنا پڑتا ہے۔ (مسکراتے ہوئے)۔"

"حمنہ آپ کو سجی بنی اچھی لگتی ہیں یا سادگی میں؟ اور خیال رکھتی ہیں آپ کا....؟"

"حمنہ مجھے ہر حال میں اچھی لگتی ہیں.... بہت اچھی' سادہ طبیعت کی مالک ہے۔ بہت خیال رکھتی ہیں۔ میری چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی۔ میں بہت لاپرواہ بندہ ہوں اور مجھے حمنہ جیسی ہی لائف پارٹنر چاہیے تھی جو میرا خیال رکھ سکے۔"

"شادی کے بعد محبت میں اضافہ ہوتا ہے یا کمی ہو جاتی ہے؟"

"محبت میرا خیال ہے وقت کے ساتھ بڑھتی ہے اور اس کا انحصار خود آپ پر بھی ہوتا ہے کہ آپ کس طرح کے انسان ہیں۔ اگر آپ اچھے ہیں' اپنی فیملی لائف کو چلانا چاہتے ہیں' اسے قائم رکھنا چاہتے ہیں تو

پھر محبت میں اضافہ ہی ہوتا ہے اور محبت کے بھی درجے ہوتے ہیں شادی کے بعد۔۔۔ شروع کی محبت الگ ہوتی ہے شادی کے بعد کی الگ طرح کی ہوتی ہے اور بچوں کے بعد الگ طرح کی ہوتی ہے۔۔۔ ہم دونوں کی محبت میں تو اضافہ ہی ہوا ہے۔"

"شادی کی ناکامی اور طلاق کی وجہ کیا ہوتی ہے؟"

"آج کے دور میں ایسا ہو رہا ہے تو اس کی بنیادی وجہ میرے خیال میں مذہب سے دوری ہے۔ نئی جنریشن مذہب سے بہت دور ہوتی جا رہی ہے اللہ کا شکر ہے کہ ہم ایسے نہیں ہیں۔۔۔ کلچر ویلیوز ختم ہو چکی ہیں۔ روایات نہیں رہیں جو کہ ایک زمانے میں ہوا کرتی تھیں جو ہم بچپن میں دیکھا کرتے تھے' موبائل فون' فیس بک' انسٹا گرام ٹوئیٹر اور دیگر سہولتوں نے یا تو بہادر کر دیا ہے یا بہت ہی بزدل کہ وہ اچھے اور برے فیصلے خود کرنے لگے ہیں۔۔۔ جن میں بعض فیصلے صحیح بھی ہوتے ہیں اور بعض اوقات غلط بھی۔۔۔ غلط انسان کے ساتھ رہنا کہ اب آپ نے شادی کر لی ہے تو نبھانی بھی ہے اور اس نصیحت کو گرہ سے باندھ لینا کہ اب تمہارا جنازہ ہی آنا چاہیے شوہر کے گھر سے۔۔۔ تو میں اس بات کو نہیں مانتا۔ اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ جب میری بیٹی بڑی ہوگی اور خدانخواستہ خدانخواستہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں خوش نہیں ہوگی تو اسے سمجھاؤں گا اور پھر بھی کوئی بات نہ بنی تو اسے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار دوں گا۔"

"کیا بیوی کو کمانا چاہیے۔ اور سسرال سے تعلقات کیسے ہیں آپ کے؟"

"جتنی مہنگائی ہو گئی ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اور ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے ایک مناسب زندگی کے لیے پیسہ بہت ضروری ہے اور مجھے اس بات میں کوئی عار نظر نہیں آتا کہ آپ کی بیوی بھی کمائے۔ گھر میں بے شک خرچ نہ کرے مگر سیونگ ضرور کرے' کیونکہ آنے والے وقتوں میں آپ کے بچوں کے ہی کام آئیں گے۔۔۔ اور ہم نے یہی سوچا کہ جب بھی حمنہ دوبارہ اپنی جاب شروع کرے گی تو بچت کے پوائنٹ آف ویو سے اور گھر چلانا میری ذمہ داری ہوگی۔۔۔ سسرال سے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ میرے دو سالے اور ایک سالی ہے اور میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے اتنا اچھا سسرال ملا ہے۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔۔۔ مجھے بہت عزت دیتے ہیں۔"

"بہت شکریہ علی۔۔۔ اب کچھ باتیں حمنہ سے بھی ہو جائیں؟"

"کیوں نہیں۔۔۔"

حمنہ علی

"کیا حال ہیں جی؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"کچھ اپنے اور اپنی فیملی کے بارے میں بتایئے؟"

"جی ہمارا تعلق "لاہور" سے ہے۔ میری پیدائش بھی لاہور کی ہے۔۔۔ اور ہماری فیملی میں زیادہ تر بینکرز ہیں۔ میرے والد بھی بینکر تھے۔ اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ میرے بڑے بھائی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتے ہیں۔ چھوٹے بھائی نے بھی ابھی حال ہی میں ایک معروف کمپنی کو جوائن کیا ہے۔ میری بڑی بہن اور میرے بہنوئی بھی بینکرز ہیں۔۔۔ میری ایجوکیشن "ملٹی میڈیا" سائیڈ کی ہے۔ او لیول "ان الیکٹرونک جرنلزم" میں کیا ہے۔

"علی سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ اور پہلی نظر میں کہ آپ کو کیسے لگے؟ اور خیال آیا کہ اگر ان سے شادی ہو جائے تو کیا ہی بات ہے؟"

"میں اور علی "ہم ٹی وی" میں کام کرتے تھے۔ اور ایمان داری سے بتاؤں کہ جب میں علی سے پہلی بار ملی اور انہوں نے مجھے سلام کیا تو میں نے سلام کا جواب دیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ کافی عرصہ یہی ہوتا رہا پھر آہستہ آہستہ دیگر لوگوں کے ساتھ اور علی کے ساتھ تھوڑی مانوس ہوئی۔ پھر ایک اور چینل میں ہم لوگ چلے گئے تو وہاں پھر اچھی ورکنگ ریلیشن شپ
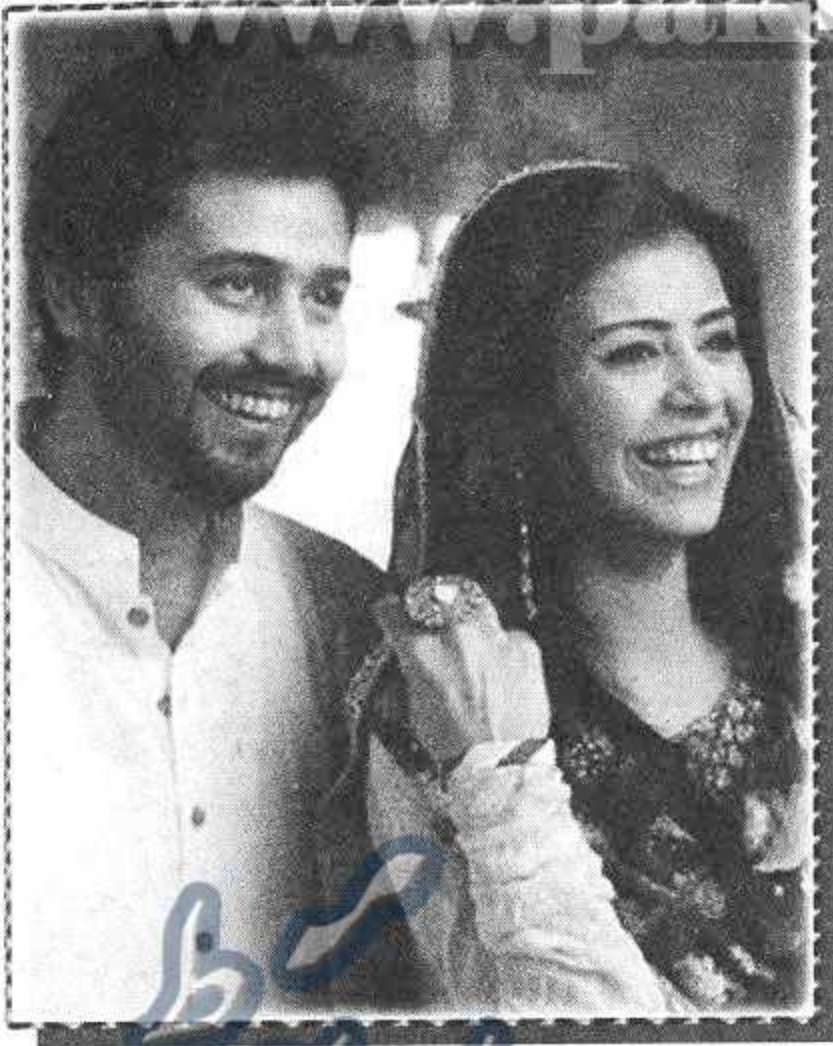
شروع ہوئی۔ اور بہت ٹائم کے بعد جب علی نے مجھے پرپوز کیا..... تو..... میں نے منع کردیا..... کیونکہ میں اپنے کام میں بہت فوکس تھی اور مجھے اور کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی..... پھر کچھ عرصے کے بعد علی کے فادر نے رابطہ کیا۔ اور پھر جب ان کے ذریعے سے پراپر رشتہ آیا..... تو والدین سے ذکر کیا اور پھر میری شادی کی عمر بھی ہوگئی تھی تو علی کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ

اس لیے کیا کہ ہم دونوں کی فیلڈ بھی ایک ہی تھی اور اگر کسی اور فیلڈ کے بندے سے شادی کروں گی تو شاید وہ میری فیلڈ کو' میری جاب کو انڈر اسٹینڈ نہ کرے' جس طرح علی کرے گا۔ تو بس اسی پوائنٹ کو سوچ کر میں نے علی سے شادی کی۔"

"شادی کے لیے ایک محاورہ مشہور ہے۔ کہ شادی بور کے لڈو کی طرح ہے' جو کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی۔ آپ کچھ کہیں گی..... کھا کے پچھتائیں؟"

"شادی ایک بہت اچھا ریلیشن ہے۔ اور میں بہت لکی ہوں کہ پارٹنر بہت اچھے ہیں اور ان کی وجہ سے میں اس ریلیشن کی خوب صورتی جان پا رہی ہوں۔ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ شادی نہ کی ہوتی' مگر وہ بھی بہت تھوڑے وقت کے لیے کہ جب آپ بہت زیادہ تھکی ہوئی ہوں۔ یا کچھ مسائل میں گھری ہوئی ہوں۔ بے شک سنگل لائف کے بھی اپنے مزے ہوتے ہیں۔ اچھے لمحات ہوتے ہیں 'اچھی یادیں ہوتی ہیں..... اگرچہ شادی شدہ لائف کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ مگر کچھ بھی ہو یہ بہت اچھا ریلیشن ہے' آپ کا لائف پارٹنر اچھا ہے تو شادی سے اچھا کوئی ریلیشن نہیں ہے' یہ بہت' بہت زیادہ خوب صورت ریلیشن ہے۔"

"شادی کے بعد اپنے گھر کے ماحول اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق پایا؟"

"میرے گھر کے ماحول اور سسرال کے ماحول میں کافی فرق تھا..... زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ فرق وہی

ہے جو اردو اسپیکنگ اور پنجابی فیملی میں ہوتا ہے۔ علی پنجابی اور ہم اردو اسپیکنگ ہیں اور ایک مزے کی بات بتاؤں کہ جب میں بیاہ کر آئی تو جوائنٹ فیملی میں آئی' جہاں ان کی والدہ ہیں' تین اور بہن بھائی ہیں۔ والد ہیں' اب تو بہن کی شادی ہوگئی۔ وہ لندن چلی گئیں۔ اور ہم کراچی آگئے..... تو ان کے گھر میں سب کو تیز اور اونچا بولنے کی عادت ہے جبکہ ہم اردو اسپیکنگ' بہت سافٹ اسپوکن ہوتے ہیں اور آہستہ

بات کرتے ہیں تو جب یہ لوگ بولتے تھے تو میری تو آواز ہی کسی کو سنائی نہیں دیتی تھی۔ تو یہ فرق مجھے بہت زیادہ لگا..... باقی ماشاء اللہ سب کچھ بہت اچھا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جب سو کر اٹھوں' کوئی کام کروں نہ کروں' کھانا پکاؤں نہ پکاؤں' مجھ پر کوئی پریشر نہیں ہے۔ میری ساس نندیں بالکل بھی روایتی نندوں کی طرح نہیں ہیں۔ اور میرے سسر تو بہت ہی فن لونگ انسان ہیں' بہت ہی سوئیٹ انسان ہیں۔ تو سسرال میں مجھے ایڈجسٹ ہونے میں ایک دن بھی نہیں لگا۔ اور ان کی پوری فیملی سے میرے' بہت اچھے تعلقات ہیں۔"

"علی کو آپ نے کیسا پایا؟"

"عموماً" کہا جاتا ہے کہ لوگ شادی کے بعد چینج ہو جاتے ہیں۔ علی بھی چینج ہوئے۔ پہلے یہ کافی امیچور اور ایگریسیو قسم کے انسان تھے چونکہ ساتھ کام کرتے تھے تو میں ان کی نیچر سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی...... شادی کے بعد ان میں پوزیٹو تبدیلیاں آئی ہیں۔ بہت مختلف انسان بن چکے ہیں۔ بہت ذمہ دار۔ خیال کرنے والے اور پیار کرنے والے انسان ہیں اور میرے آئیڈیل ہیں۔"

"نکاح کے وقت اور رخصتی کے وقت آپ کی کیا کیفیت تھی؟ رونا آیا تھا؟"

"نکاح ہمارا بادشاہی مسجد میں ہوا تھا اور نکاح کے وقت میں بالکل بھی نہیں روئی تھی۔ کیونکہ میں بہت خوش تھی اور میں نے اپنی شادی کی تیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بادشاہی مسجد میں نکاح ہونا ایک بہت ہی یونیک بات تھی...... تو فوٹو سیشن بھی کروائے...... خیر سائن کرتے وقت ہاتھ تھوڑے کانپے' میرے ساتھ میرے پاپا تھے تو پہلی بار ہاتھ کانپے تو میں نے سائن نہیں کیے پھر دوسری اور پھر تیسری بار بھی ایسا ہوا تو پاپا نے کہا کہ بیٹا آپ ٹھیک تو ہیں نا...... تو میں نے جلدی سے سائن کر دیے کہ یہ کچھ اور نہ سمجھ لیں تو نکاح کے بعد سسر جی کا فون آیا کہ بیٹا سب اتنے جذباتی ہو کر ایک دوسرے سے گلے لگ کر رو رہے تھے تو آپ بھی رسماً" رولیں۔ پھر انہوں نے میرا بہت مذاق بنایا کہ ہماری بہو تو اتنا روئی کہ بادشاہی مسجد آنسوؤں سے بھر گئی...... ہاں رخصتی کے وقت ماحول بہت جذباتی تھا' میری امی' میری بہن سب ہی رو رہے تھے۔ گانے بھی بہت سنجیدہ لگے ہوئے تھے تو مجھے احساس ہوا کہ یہ تو بہت بڑا واقعہ ہونے جا رہا ہے تو پھر مجھے بھی تھوڑا سا رونا آ گیا۔ تو جب گاڑی میں آ کر بیٹھی تو میرے سسر اور دیگر لوگوں نے میرا موڈ ٹھیک کیا...... صحیح معنوں میں جو مجھے رونا آیا یا میں جذباتی ہوئی' وہ شادی کی ویڈیو دیکھ کر تو شادی کی ویڈیو جتنی بار دیکھتی ہوں اتنی بار روتی ہوں۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟ پیار سے کیا بلاتے ہیں۔"

"گولڈ کا بریسلیٹ دیا تھا جو کہ ان کی والدہ نے بنوا کے رکھا ہوا تھا۔ علی نے خود سے کچھ نہیں دیا کیونکہ ان کو رسم و رواج کا پتا نہیں تھا۔ علی پیار سے "بی بی" کہتے ہیں جو مجھے شروع میں تو بہت عجیب لگتا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ عادت ہو گئی ہے۔"

"عموماً" نکاح نامہ لڑکی کو نہیں پڑھنے دیا جاتا...... کیا آپ نے نکاح نامہ پڑھا تھا...... اور لڑکیاں شادی کے بعد نام تبدیل کر لیتی ہیں۔ ایسا ہونا چاہیے۔"

"صرف نکاح نامہ ہی نہیں کوئی بھی دستاویز ہو بغیر پڑھے سائن نہیں کرنا چاہیے...... آپ کو پتا تو ہو کہ آپ نے کس دستاویز پر سائن کیے ہیں میں نے بھی پڑھا تھا۔ اور سب کو پڑھنا چاہیے اور جو پڑھنا نہیں جانتے انہیں پڑھ کر بتانا چاہیے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ میں نے تو پڑھ کر فل کروایا تھا...... کہا تو یہی گیا کہ مولوی بھر کر دے دے گا۔ آپ سائن کر دیں مگر میں نے اصرار کیا کہ اور کہا کہ اس میں "طلاق" کا حق لڑکی کو دیا گیا ہے اس کو کٹوانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اللہ نہ کرے۔ اچھے برے حالات کا کسی کو پتا نہیں ہو گا۔ تو پھر کیوں اپنے لیے مشکلات رکھ رہے ہیں۔ اگر آپ کا مذہب آپ کو اجازت دے رہا ہے تو آپ اس حق کو محفوظ رکھیں۔ فارم سے کٹوانے کا کوئی جواز نہیں...... جہاں تک نام کی تبدیلی کی بات ہے تو اس معاملے میں میں نے بہت زیادہ ریسرچ کی تھی' ہمارے مذہب میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ شادی کے بعد لڑکی اپنے شوہر کا نام لگائے...... میں نے شادی کے بعد علی کا نام اپنے نام کے ساتھ لگایا ضرور تھا لیکن میرے آفیشل ڈاکومنٹس میں میرے فادر کا نام ہی ہے۔ آپ کے والد کا نام آپ کی پہچان ہے...... اور میری بھی پہچان ہے' شادی کے بعد ٹیں بدل نہیں گئی نہ لڑکی بدل جاتی ہے...... تو نام نہیں بدلنا چاہیے۔ ماں باپ کی کوئی چیز تو اپنے ساتھ رکھ لو...... شادی کے وقت ہر چیز کے لیے تو

لڑکی کیوں اپ سیٹ کرتی ہے۔

"مشہور بندے سے شادی کے بعد کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"جب ہماری شادی ہوئی تو علی بالکل بھی پبلک فگر نہیں تھے، علی ایک چینل پہ جاب کررہے تھے، اور پروگرام منیجر کی حیثیت سے کام کررہے تھے، مگر وہ اپنی اس جاب سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ علی کو ہمیشہ سے اداکاری کا شوق ہے..... تو میں نے انہیں فورس کیا کہ آپ اداکاری کی طرف آئیں۔ میں نے ان کی جاب چھڑائی اور ان کو اداکاری کی طرف لے کر آئی۔ اب ماشاءاللہ ان کی ایک پہچان ہے۔ شہرت ہے اور جب لوگ علی کو پہچانتے ہیں۔ ان سے ملتے ہیں تو لمحہ میرے لیے بہت فخر کا ہوتا ہے اور مجھے فخر ہوتا ہے اپنی اور ان کی کامیابی پر اور جو لوگ کہتے ہیں کہ سیلفی لینی ہے یا تصویر بنوانی ہے تو میں فرمائش کرنے پر موبائل لے کر خود تصویر کھینچتی ہوں اور میں بالکل بھی برا نہیں مانتی بلکہ بہت بہت زیادہ فخر محسوس کرتی ہوں۔

"علی مزاج کے کیسے ہیں۔ رومانٹک ہیں؟ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں یا نہیں؟"

علی بہت رومانٹک ہیں۔ اور غصے والے ہوتے تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے آپ کو بہت تبدیل کیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ علی بہت لاپرواہ انسان تھے گھر کے کاموں کے معاملے میں مگر ہم جب سے کراچی شفٹ ہوئے ہیں گھر کے کاموں کے معاملے میں بھی علی بہت بدل گئے ہیں اور بچوں کے سلسلے میں گھر کے کاموں کے سلسلے میں یا کوئی بھی مسئلہ ہو۔ علی میرا بہت ساتھ دیتے ہیں۔ بہت مدد کرتے ہیں ورنہ علی تو ان لوگوں میں سے تھے جو خود اٹھ کر پانی بھی نہیں پیتے تھے مگر اب ایسا نہیں ہے۔ میں جب ضروری کام سے لاہور آئی تو علی نے کراچی میں رہ کر اکیلے ہی سب کچھ مینیج کیا اور بہت اچھے طریقے سے کیا۔"

"شادیاں کیوں ناکام ہوتی ہیں....."

"شادی کی ناکامی کی وجہ میاں بیوی خود ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک تو قوت برداشت کی کمی اور دوسرے ایک دوسرے پر بھروسہ نہ کرنا ہے..... کوئی تھرڈ پارٹی آپ کو تب تک نہیں اکسا سکتی یا غلط فہمیاں نہیں ڈال سکتی جب تک آپ ایک دوسرے پر بھروسا کرتے ہیں۔"

"اور اب اس سلسلے کا آخری سوال کہ علی نے کمرے میں آکر پہلی بات کیا کی تھی۔"

"ہنستے ہوئے..... جب یہ کمرے میں آئے تھے تو سب سے پہلی بات یہ کی تھی کہ کیا کھائیں۔ کیونکہ دولہا دلہن کی مصروفیات اتنی ہوتی ہیں کہ کھانے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔ تو چونکہ قیام ہمارا ہوٹل میں تھا تو ہم نے پہلے یہ ڈسکس کیا کہ کیا کھائیں کیونکہ ہم دونوں فوڈ لور ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اس خوب صورت جوڑے سے اجازت چاہی۔

مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق میں گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا بابل کا گھر چھوڑ کر پیا دیس جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے۔
غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں، کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک پڑھی لکھی، نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان پڑھ لوگ، گالم گلوچ، لڑائی جھگڑا، طعنے تشنے ہوں، اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور یہاں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی ٹھہرتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس ماہ ہم اسی حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

امید بخاری

1 ''شادی کب ہوئی؟''
''جولائی 2006ء میں۔''
2 ''شادی سے پہلے کے مشاغل؟''
''پڑھنا، پڑھنا اور بس پڑھنا۔ اردگرد کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے کچھ پتا نہیں، بس میں اسٹور روم میں ایک کرسی، اسٹول، پانی، کلاک اور کتاب لے کر گھس جاتی اور امتحانات کی تیاری کرتی رہتی۔ کلاس میں اچھی تھی۔ ٹیچرز بہت تعریف کرتے تھے۔''
3 ''رشتے میں مرضی؟''
''سخت ناپسندیدگی شامل تھی، مجھے میرے ''وہ'' اور ان کے گھر والے بالکل اچھے نہیں لگتے تھے۔ مجھے پڑھنا تھا اور کسی مقام پہ پہنچنا تھا۔''
4 ''جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟''
''میں چاہتی تھی کہ میرا شوہر سائنس میں ڈگری یافتہ ہو اور جاب ہمارے گاؤں سے باہر ہو (تاکہ میں بھی مزید پڑھ پاؤں) مگر سب کچھ اس کے الٹ ہو گیا۔''
5 ''منگنی کتنا عرصہ رہی؟''
''منگنی رہی جی ہماری کوئی آٹھ سال، اس دوران کئی دفعہ ٹوٹی اور کئی دفعہ جڑی، میں 6th میں تھی جب منگنی ہوگئی پھر فرسٹ ایئر میں نکاح ہو گیا اور سیکنڈ ایئر کے بعد شادی۔ چلو جی تعلیم کا اختتام ہوا۔''
6 ''شادی کے لیے قربانی...؟''
''جی۔ میری سب سے بڑی قربانی تعلیم کی تھی۔ میرے ٹیچرز کو جب پتا چلا کہ اس بچی کی شادی کر رہے ہیں تو تمام ٹیچرز ابو کے پاس گئے۔ بہتیرا سمجھایا کہ اس کی شادی نہ کریں۔ اس کا کیریئر زیادہ امپورٹنٹ ہے مگر ابو مان کر نہ دیے کہا کہ لڑکیوں کا کیریئر ان کی شادی ہوتا ہے بس اور زبردستی شادی کر دی۔ ایف ایس سی کے بعد میرا K.E میں ایڈمیشن ہوا مگر ابو نے جانے نہ دیا۔ ان کا کال لیٹر آج بھی میری دراز میں پڑا ہے جس کے لفافے پہ میں نے لکھ رکھا

ہے۔

حسرت ان غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے

میں بہت روئی۔ محلے والے سمجھے کہ خدانخواستہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے ان کے گھر اور عورتیں ہمارے گھر آ گئیں مگر ابو نہ مانے اور میری شادی کر دی۔"

7 "رسموں کے لین دین پہ کوئی جھگڑا؟"

"کافی جھگڑے ہوئے۔ سب سے زیادہ پھڈے تو خود میرے ابو نے ڈالے' یہ نہیں دینا' وہ نہیں دینا' بارات اگر رات آٹھ بجے سے لیٹ آئی تو رخصتی نہیں دوں گا' کھانے میں زردہ ہو گا' کھیر نہیں۔ خیر سسرال والا رول' ابو نے خوب نبھایا اور مجھے ایک بوجھ کی طرح سر سے اتار پھینکا۔ میں بھی سخت نالاں تھی۔ اس شادی سے اور اپنے "ان" سے اور ہاں بارات والے دن میں بہت بری لگ رہی تھی۔ سب کا مشترکہ خیال ہے۔ جب راضی نہیں تھی تو روپ کیا خاک آنا تھا؟ بھلا بتاؤ....."

8 "شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟"

"میں کمرے میں ہراساں بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے "وہ" اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا اور میں نے چور نظروں سے انہیں دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں شکوہ تھا (اچھا تو شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں؟)۔ میں نے بھی جواب شکوہ دیا نگاہوں ہی نگاہوں میں (تو آپ بھی تو کسی اور کو پسند کرتے تھے' سب پتا ہے مجھے)۔ میرے پاس آ کے بیڈ پہ بیٹھے' میں نے بستر سے نیچے چھلانگ ماری اور وہ چیخیں ماریں کہ الاماں۔ (جی ہاں اس میں کوئی مبالغہ نہیں) وہ ہونق ہو گئے اور جلدی سے اپنی باجی کو بلا لائے۔

ان کی باجی نے کہا" شرم کرو' باہر سب مہمان بیٹھے ہیں۔"

وہ میری قمیص میں چھپکلی ہے۔"

باجی مجھے سائڈ روم میں لے گئیں۔ زیور وغیرہ اتارا' کپڑے چینج کرائے اور منہ بھی دھلا دیا۔ میں تو ڈر گئی اپنی شکل دیکھ کے' پوری چڑیل لگ رہی تھی۔ میری کزن' کم بخت ماری نئی نئی پارلر کا کورس کر کے آئی تھی۔ اسے شوق چڑھا تھا مجھے دلہن بنانے کا' سارے کا سارا منہ پیلا کر کے رکھ دیا جیسے ملتانی مٹی کا لیپ۔ (اصل میں وہی تھی جو میرے شوہر سے..... جی۔ اس نے تو غصہ اتارنا ہی تھا مجھ پہ)

ارے ہاں وہ چھپکلی والی بات تو بیچ میں رہ گئی۔ میری امی صاحبہ بہت بڑی کہانی گو ہیں۔ بچپن میں مجھے کہانی سنا رکھی تھی کہ "ایک لڑکی کے بہت لمبے بال تھے جب اس کی شادی ہوئی تو جوڑے میں چھپکلی بھی بندھ گئی' وہ کاٹتی رہی' مگر جی دلہن تھی پرانے زمانے کی' مارے شرم کے بولی ہی نا' اور سسرال جاتے ہی مر گئی۔"

اب ہوا یوں کہ کوئی سیفٹی پن دوپٹے سے کھل گیا اور مجھے چبھنے لگا دو تین دفعہ جو چبھا تو میں نے برداشت کیا مگر جب چوتھی بار چبھا تو میں نے کہا کہ واقعی کوئی چھپکلی ہے' مرنے سے بہتر ہے' بول پڑو اور پورے کمرے میں ناچی میں۔ خیر بڑے مزے کا سین تھا وہ اور صبح میرے میاں کا بڑا ریکارڈ لگا۔"

9 "شادی کے بعد شوہر کا رویہ کیسا تھا؟"

"سچ بتاؤں تو میں بہت ڈری ہوئی تھی کہ یہ اب پتا نہیں کیا کرے گا میرے ساتھ۔ سارے بدلے لے گا گن گن کے' میں نے صاف منع جو کر دیا تھا شادی سے۔ مگر آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ شادی کے بعد میرے شوہر نے میرا ایڈمیشن کرایا ایف ایس سی میں کہا۔" جہاں ایڈمیشن لینا ہے لو۔" خود لے کے آتے خود چھوڑنے جاتے اور لڑکیاں حیرت اور رشک سے مجھے تکتیں کہ کتنا اچھا شوہر ہے جو دھوپ میں کھڑا رہتا ہے مجھے لینے کے لیے اور ہاں ایک بات میں اور بتانا چاہوں گی کہ (ہے تو بہت شرم کی بات مگر) میرے شوہر نے مجھ سے ازدواجی حقوق طلب نہیں کیے۔ شاید ہی کسی کو اتنا اچھا شوہر ملا ہو جتنا مجھے ملا ہے۔ میرے شوہر نے مجھے بہت پیار دیا۔ میری عمر تھی ساڑھے انیس سال اور میرے شوہر بائیس سال کے۔ ہم ہنستے بولتے باتیں کرتے۔ انہوں نے کہا۔

"سب تمہاری مرضی کے مطابق ہو گا' اگر تم کہو گی کہ تمہیں چھوڑ دوں تو چھوڑ دوں گا۔"

مگر میرے شوہر نے اپنی اچھائی' شرافت اور محبت سے

مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ ایسا ایک دم نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ ہوا۔ پھر تو میں ان کے پیار میں پاگل ہو گئی اور وہ لڑکیاں جو غیر شادی شدہ ہیں۔ ان سے کہوں گی کہ جو مزہ شادی کے بعد اپنے شوہر کو چاہنے میں ہے کسی اور چیز میں نہیں۔ سکون، خوشی، ثواب اور آخرت بھی۔ یہ میری سچ بیتی ہے کوئی افسانہ یا جھوٹ نہیں۔ کتاب لکھنا چاہوں تو لکھ سکتی ہوں۔

خیر مختصراً" میرے شوہر نے میری ساری غلط فہمیاں دور کیں اور کہا۔

"صرف تمہیں چاہتا ہوں اور کسی کو نہیں۔ یہ سب افواہیں ہیں۔"

"اور وہ پیار لڑوالی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو تمہیں جلانے کے لیے تھا۔"

خیر سچ بھی ہوتا تو سانوں کی.... اب تو وہ میرے ہیں ناں مکمل طور پر۔ جو کچھ بھی میرے دل میں ہے اسے میں پابند قلم نہیں کر سکتی۔ بس اتنا جان لیں کہ جی جان سے چاہا انہوں نے (اور میں نے بھی)

جسے چاہو اسے احساس خدائی دے دو
سلسلہ پیار کا رکھو تو عبادت جیسا

10 "پہلے بچے کی پیدائش....؟"

"پہلے بچے کی پیدائش پہ میں خود بچی بنی ہوئی تھی، کالج جاتی، وزن اٹھانا، کھانے پینے کا خیال نہ کرنا، میرے شوہر کی جاب کہیں اور تھی۔ وہ صرف مہینے میں ایک دن آتے، سو پہلے بیٹے کی پیدائش چھٹے مہینے ہو گئی اور اس کی ڈیتھ ہو گئی۔ میرے میاں اتنا روئے کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ میں بے ہوش تھی۔ میرے سامنے کچھ نہیں بولے۔ بس مجھے تسلی دیتے رہے۔ خیر پھر اللہ نے نو ماہ بعد مجھے چاند سا بیٹا دیا۔ خوب صورت اور صحت مند۔ اس کے بعد بیٹی جس کی ننھی ننھی شرارتوں نے ہمارے گھر کو مکمل کر دیا ہے۔ شکر ہزار اس ذات کا۔"

11 "کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟"

"کام تو کوئی آتا ہی نہ تھا۔ نہ کھانا پکانا، نہ بچہ سنبھالنا، جب میرا بیٹا پوٹی کر دیتا تو پہلے میں روتی اور پھر اس کی پوٹی دھوتی۔ بس میں چاہتی تھی کہ شوہر کے ساتھ گھومنے پھرنے میں ہی دن گزر جائیں۔ تھی ناں جھلی...."

12 "سسرال والوں سے توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟"

"سسرال والوں سے کب کوئی خوش رہا ہے، کوئی سو میں سے ایک ہوگی جو خوش ہوگی۔ خیر اب سوچتی ہوں تو اپنی خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مجھے کام کاج نہیں آتا تھا۔ چھوٹی سی عمر تھی۔ ساس کہتی تھیں کہ کام نہیں کرتی اور میں کہتی تھی۔ آپ کی بیٹی بھی تو نہیں کرتی۔ وہ بھی تو جاب کرتی ہے، آپ اس کا کام بھی تو کرتی ہیں۔ ماسی رکھ لیں یا جو بھی کریں۔ مجھے کام نہیں آتا۔ میں کیا کروں، مجھے پڑھنا ہے۔ خیر میری ساس نے مجھے الگ کر دیا کہ "لے مزہ پڑھنے کا...."

خیر وہ وقت بہت مشکل تھا۔ میں روتی اور کام بھی کرتی۔ مگر میرے میاں نے میرا بہت ساتھ نبھایا۔ یہ نہیں کہ وہ میرے ساتھ کام کرواتے تھے مگر انہوں نے بہت کمپرومائز کیا میرے ساتھ۔ کبھی گھر آتے تو روٹی نہ بنی ہوتی تو کبھی سالن جلا ہوتا۔ خیر انہوں نے کبھی پلٹ کر طعنہ نہ دیا، چپ چاپ بازار سے لے آتے اگر سالن برا بنا ہوتا تو کبھی نہ کہتے چپ کر کے کھا لیتے۔

میرے دونوں بچوں کی پیدائش پر نو ماہ میرا بیڈ ریسٹ رہا۔ میرا کھانا دونوں ٹائم کا بازار سے آتا۔ ناشتہ میرے میاں بناتے کپڑے دھلواتے اور سب سے بڑی بات کبھی میرے کام، کھانے پہ تنقید نہ کی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں آہستہ آہستہ سب سیکھ گئی اور اس میں بڑا حصہ شعاع اور خواتین کا ہے جس نے مجھے گھر داری میں اناڑی سے کھلاڑی بنا دیا۔ اور اب تو ماما ماسٹر شیف ہیں۔ (بچے)

13 "سسرال والوں سے تعلقات؟"

"سسرال والوں سے تعلقات بس پاک بھارت تعلقات کی طرح رہے۔ کبھی سیز فائر تو کبھی گولہ باری، کبھی مذاکرات تو کبھی حملے، ہاہاہا.... نرم گرم تو ہر جگہ چلتا ہے مگر مزے کی بات جو یہاں بتانا چاہوں گی وہ یہ ہے کہ اگر کبھی میری سسرال والوں سے لڑائی ہو جاتی تو میں غصے میں اپنی امی کے

گھر آجاتی (میکہ اس شہر میں ہے) ڈھیر سارا سامان۔ اب نہیں جانا۔ گھر آکے سب کو بتانا کہ انہوں نے ایسا ایسا کہا ہے۔

گھر میں بھی سب کو غصہ آجاتا کہ "رہو اب! کوئی نہیں جانا۔" بڑے بھائی خاص طور پر.....

"دیکھ لوں گا تمہارے میاں کو' اس کی امی کی اتنی جرات۔ کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔"

دن گزرتا۔ رات ہوتی۔ میرے میاں کا میسج آجاتا۔

"تمہاری بیٹھک کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوں' سامان لے کے آجاؤ۔"

اور میں امی کو بتا کے چپکے سے پچھلا دروازہ کھول اور اپنے میاں جی کے ساتھ بائیک پہ جا بیٹھتی اور ہم فرار ہو جاتے۔ کسی ڈیٹ میں اتنا مزہ نہ ہوگا جو ہمیں اس ڈیٹ میں آتا۔

صبح کو سب پوچھتے۔ "کہاں گئی؟"

امی مسکرا کے کہتیں "چلی گئی۔"

"اس سے کہہ دیں اب نہ آئے۔" بڑے بھائی غصے میں بڑبڑاتے اور ہم راتوں کو سڑکوں پہ گھومتے اور خوب ہنستے۔"

14 "شوہر سے تعلقات و توقعات.....؟"

"یہ نہ سمجھیں کہ شوہر سے کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔ بہت دفعہ ہوئی اور اب بھی ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جب شادی ہوئی تو ہم اس بات پہ بھی لڑ پڑتے کہ اچھا والا پر اٹھا تم نے لے لیا ہے' میں نے دیوار والی سائڈ پہ نہیں سونا..... خیر اب بھی ہم یاد کریں تو بہت ہنسی آتی ہے ان بچکانہ حرکتوں پہ۔ مگر ہم نے کبھی بھی لڑائی کو انا کا مسئلہ نہ بنایا۔ لڑائی کی اور دونوں میں سے کوئی ایک بھی ہنس پڑے تو چلو جی صلح۔

میرے شوہر نے زندگی کے ہر قدم پہ میرا ساتھ دیا۔ کوئی ایسی بات نہیں جو میں نے منہ سے نکالی ہو اور انہوں نے اسے پورا کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ میں نے تعلیم کی قربانی دی مگر مجھے کوئی افسوس نہیں۔ میرے اللہ نے میری ماں کی دعا یا میری کسی نیکی کا صلہ دیا ہے جو اتنا اچھا شوہر اور دو پیارے بچے دیے ہیں۔"
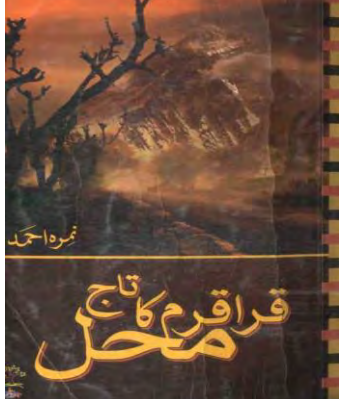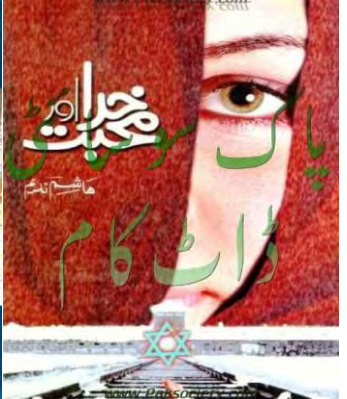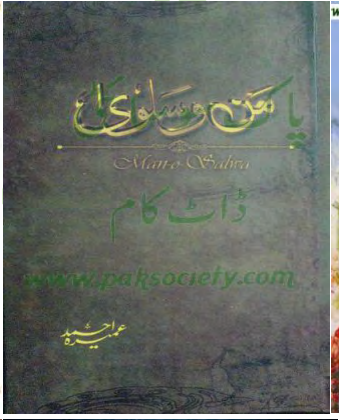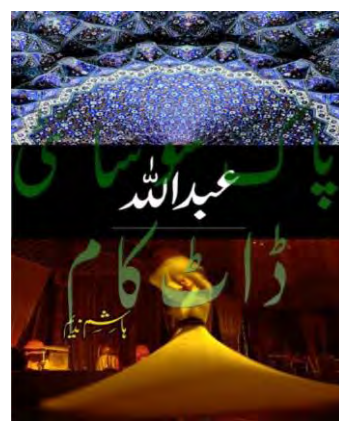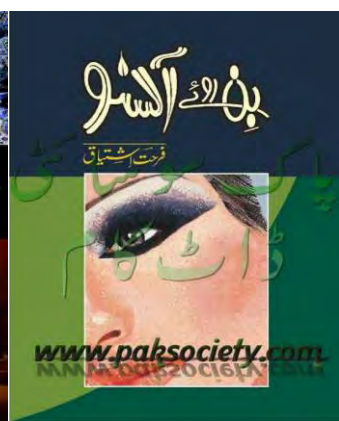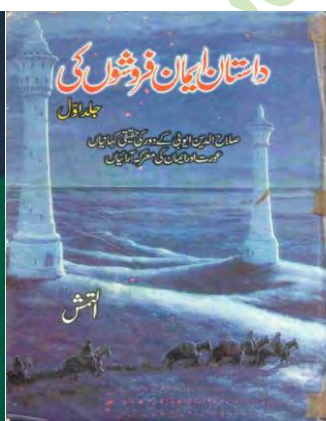
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

15 "کوئی حسرت یا خواہش....؟"

"میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا ایم ایس سی میں مگر میری بیٹی بیمار ہو گئی تو پڑھائی چھوڑ دی' بس ریگولر یونیورسٹی میں ایم ایس سی کرنے کی خواہش ہے۔ ایک دوبار جاب کرنے کا ابال بھی اٹھا ہے۔ میں نے اپنے شوہر سے بات کی تو انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا۔

"دیکھو۔" ایسے لگا جیسے دن اور رات۔ بولے "پتا ہے میرے ہاتھ اتنے کالے کیوں ہیں؟"

میں نے کہا "نہیں تو۔"

انہوں نے کہا "تاکہ کبھی یہ ہاتھ کالے نہ ہوں۔ (مطلب میرے) میں نہیں دیکھ سکتا کہ میری بیوی باہر محنت کرے' باہر کی دنیا بہت ظالم ہے۔"

"بس پھر میں نے ضد نہیں کی۔ (میرے شوہر باہر فیلڈ میں کام کرتے ہیں' اسی لیے ان کی رنگت جھلس گئی ہے ورنہ پہلے بہت گورے تھے۔)

میری نظر میں بے وقوف ہیں وہ عورتیں جو بنا کسی مجبوری کے جاب کرتی ہیں۔ عورت' عورت کم اور گدھا زیادہ بن جاتی ہے۔ گھر کا کام بھی کرے اور باہر کے بھی۔ باہر کی دنیا مردوں کے لیے ہے۔ عورت کا کام ہے گھر پہ رہے اور اپنے بچوں اور شوہر کے لیے سکون کا باعث ہو۔ شوہر کو گھر کا تازہ کھانا دے اور بچے صاف ستھرے ہوں۔ وہی عورت کامیاب ہے بس۔

ہم جب بھی کسی اجنبی سے ملیں' وہ مانتے ہی نہیں کہ ہم شادی شدہ ہیں اور کجا بچے۔ ایک دفعہ جب میں یونیورسٹی اپنے بیٹے کو لے گئی تو سر نے پوری کلاس کے سامنے مجھے کھڑا کر دیا۔

"آپ اپنے بھائی کو کیوں لے آئیں۔ یہ کوئی اسکول نہیں یونیورسٹی کیمپس ہے۔" میں نے سر کو جواب دیا۔

"سر یہ میرا بیٹا ہے' اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور گھر پہ کوئی نہیں ہوتا۔"

بیٹا....؟" ساری کلاس میں آواز گونجی اور سب نے پیچھے مڑ کے مجھے دیکھا' دیکھو اس لڑکی کا اتنا بڑا بیٹا۔

"گھر آکے اپنے میاں کو بتایا اور سب لڑکوں کی حیرانی بھی' کو کیمپس تھا۔ دو ایک لڑکوں نے تو لائن بھی ماری' مگر جب پتا چلا کہ شادی شدہ ہے اور بیٹا بھی ہے' تو ٹی گم۔ بڑے مزے کا سین تھا۔ پھر ہم روز کسی نہ کسی بات پہ ہنستے (یہ واقعات پھر کسی افسانے میں بیان کروں گی) بات بہت لمبی ہو گئی۔

خیر میرے دل میں کوئی شکوہ نہیں' نہ سسرال والوں کے لیے اور شوہر کے لیے تو محبت ہی محبت ہے۔ جب بھی مجھے گرمی لگے اور میں کمرے میں آکر پنکھا چلاؤں یا فریج سے ٹھنڈا پانی پیوں یا کوئی بھی نعمت استعمال کروں تو اپنے شوہر کی زندگی اور صحت کی دعا ضرور مانگتی ہوں کہ ان ہی کے دم سے یہ سب آسائشات مجھے مہیا ہیں اور اللہ ہمیشہ میرے میاں کا سایہ مجھ پہ اور میرے بچوں پہ قائم رکھے۔"

آخر میں قاری بہنوں کے نام ایک پیغام

"غیر شادی شدہ بہنیں؟"

"آپ کے لیے میری نصیحت ہے کہ محبت صرف وہی ہے جو اللہ نے میاں اور بیوی کے بیچ میں رکھی ہے' اس کے علاوہ کوئی بھی تعلق ہو' گناہ ہے۔ چاہے میسج ہوں' فیس بک' واٹس اپ اور موبائل۔ امانت ایسی کی ایسی امانت دار کو پہنچے اسی میں مزہ ہے۔ خائن لوگ اللہ کو پسند نہیں۔ امید ہے آپ سمجھ گئی ہوں گی میرا اشارہ۔

"شادی شدہ بہنیں؟"

"چھوٹی موٹی باتوں کو نظر انداز کر دیں' ہر بات پر اپنے شوہر کا شکریہ ادا کریں' ان کی لائی ہوئی چیزوں کی قدر کریں۔ ان کے لیے تیار ہوں۔"

ساری قاری بہنوں سے التماس ہے کہ میرے احوال پر تبصرہ ضرور کریں' کیسا لگا۔ اللہ آپ سب کو خوش اور ہنستا مسکراتا رکھے کیونکہ۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

تیز برستی بارش اور سماعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے' یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سہیل آفندی' ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہرماہ یونی ورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہرماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مبین آفندی' آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا جان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں' تائی جان' مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں' ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگار کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

آفندی ہاؤس میں بے چینی سے فاران کا انتظار ہو رہا ہوتا ہے لیکن وہ نہیں پہنچ پاتے ان کا فون بھی بند ہوتا ہے۔

تیسرے دن مبین آفندی کا فاران آفندی کے فون پر رابطہ ہوتا ہے تو وہ آغا جان کو بتاتے ہیں کہ فاران آفندی اب اس دنیا

میں نہیں رہا ہے۔
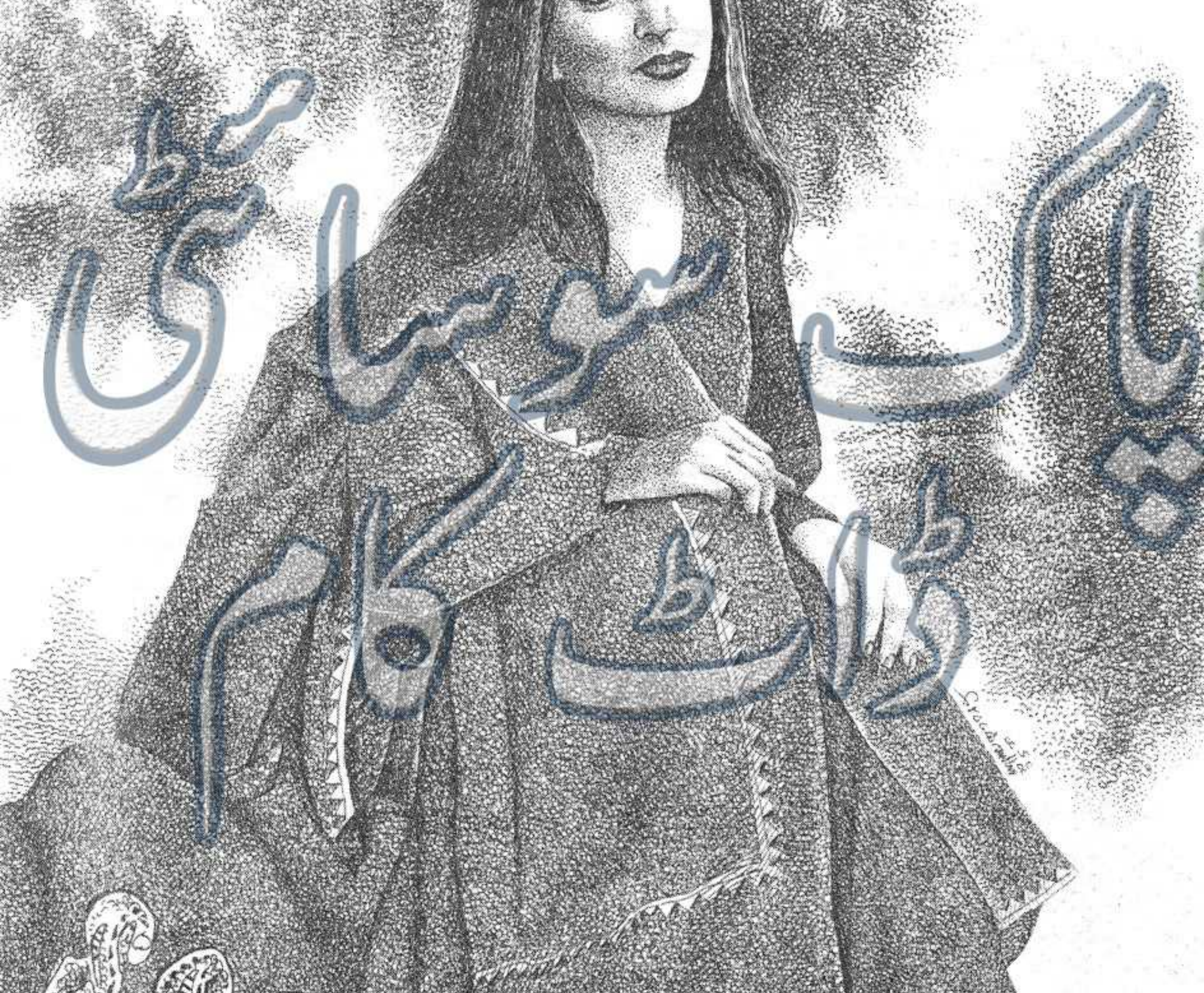
آغا جان یہ خبر سن کر ٹوٹ گئے۔ فاران آفندی کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین ان کے آبائی قبرستان میں کی گئی۔ ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد پاکستان آگئے۔ مہماہ کی منگنی طلال سے طے ہوچکی ہے' جس پر تزئین حسد کرتی ہے۔ موحد اور ثمرہ آفندی ہاؤس آجاتے ہیں۔ موحد بہت ہینڈسم اور خوبرو ہے۔ آغا جان اس سے محبت کا اظہار کرتے ہیں' لیکن موحد کو ان سب سے نفرت ہے۔ زر گل بائی کو قیمت دے کر وقار آفندی نے زرنگار سے شادی کرلی تھی' لیکن اس شادی کو آغا جان نے قبول نہیں کیا۔ ہاں نے کہا کہ وہ زرنگار کو طلاق دے دے۔ انہوں نے دوپٹا قیدموں میں رکھ دیا۔ گھر کے دیگر افراد بھی مخالف تھے۔ صرف ثمرہ بھابھی جو فاران آفندی کی بیوی تھیں۔ وہ وقار کے ساتھ تھیں۔ وقار آفندی کا بیٹا نمیر آفندی سومیہ کا دوست ہے۔ سومیہ اسے پسند کرتی ہے۔ ثمرہ اچانک یہ کہہ کر دھماکا کردیتی ہیں کہ مہماہ اور موحد کا رشتہ آغا جان نے بچپن میں طے کردیا تھا۔

چھٹی قسط

مہماہ کی دھڑکنیں جیسے بند ہونے کو تھیں۔

ایک تو یہ خوف کہ اب موحد کیا کرے گا' دوسرے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کی ذلت۔ سپید پڑتی رنگت اس کی دلی وذہنی کیفیت کی گواہ تھی۔

''بہت خوب مہماہ آفندی! تو یہ تم ہو۔'' وہ تلخی بھری سرد مہری سے بولا اور انگشت شہادت سے اس کی پیشانی کو چھو کر او نچا کیا۔

مہماہ نے اپنی پوری ہمت مجتمع کرکے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں میں! اور تم اسی قابل ہو کہ تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جائے۔'' وہ بھی اسی تلخی سے بولی جو موحد کے لب ولہجے کا حصہ تھی۔ موحد کی آنکھوں میں اس کی ہمت پر حیرت اتر آئی.... تو وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔

''بہت اچھے.... یعنی میں اس سلوک کے قابل ہوں۔'' دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر موحد نے تحیّر بھرے استہزاء سے کمرے کی حالت کی طرف اشارہ کیا پھر اسے گھور کر دیکھا۔

''اور تم.... ؟ تمہارے اس بدتمیزی بھرے انداز پر کون سی دفعہ لگتی ہے؟''

''ہر ایکشن کا ری ایکشن ہوتا ہے موحد آفندی۔'' وہ پھنکاری اور دروازے کی طرف بڑھی تو موحد پھرتی سے دروازے اور مہماہ کے بیچ میں آگیا۔ مہماہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''ہٹو سامنے سے....'' غصے سے بولی۔

''آہاں.... ایسے ہی؟'' وہ بھنویں اچکا تا جیسے اب اس صورت حال سے لطف لینے لگا تھا۔

''ابھی تو میں شور مچا کر سب گھر والوں کو جمع کروں گا۔'' مہماہ کی رنگت ایک دم سے بدلی۔

''فضول باتیں مت کرو۔ ورنہ تم تو کیا شور مچاؤ گے۔ میں خود چیخ چیخ کر سب کو بتاؤں گی کہ تم مجھے باہر نہیں جانے دے رہے۔'' وہ اپنے بے ترتیبی سے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے الٹا اسے ڈپٹتے ہوئے بولی۔

''بہت اچھی بات ہے۔ پھر یہ بھی سب کو تم ہی بتانا کہ تم میرے کمرے میں کر کیا رہی ہو۔'' موحد اطمینان سے گویا ہوا۔

مہماہ بھک سے اڑی۔

''یا بکواس ہے یہ....'' وہ غرائی۔ اپنی پوزیشن' شرمندگی' خوف' سب دور جا سویا تھا۔

''اگر ہاں.... معافی مانگ لو مجھ سے تو پھر میں جانے دے سکتا ہوں اور آغا جان کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہوگی اس بھتنی کی' جو اس کمرے میں ناچتی ہے۔'' وہ دروازے سے پشت ٹکا کر سینے پر بازو لپیٹے فرمائشی انداز میں کہتا مہماہ کو زہر کا پتلا لگا۔

''معافی....؟'' مہماہ کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔

اُف.... ''اور وہ جو تم نے کیا تھا طلال کے ساتھ' کیا وہ قابل معافی نہیں تھا....؟''

وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ موحد نے استفہامیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔

''طلا....ل....'' وہ اس کا نام کھینچ کر لیتے ہوئے طنزاً'' بولا۔

''وہ تو خود قابل معافی ہے.... ناقابل ذکر....''

مہماہ کا چہرہ مارے غصے واہانت کے تپ اٹھا۔

''اپنی حد میں رہو موحد....'' انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کیا تو اس کا بدن مارے غصے کے ہلکا ہلکا کپکپا رہا تھا۔ بس نہ چلتا تھا کہ اپنے ناخنوں سے اس کا چہرہ کھرونچ لے۔

''میری حد میں تو تم آئی ہو۔ میں تو اپنی حد میں ہی تھا۔ مگر میں اپنی حد میں بنا اجازت آنے والوں کو معاف نہیں کیا کرتا۔'' وہ مستقبلانہ انداز میں کہتا ہوا۔ اسے اشتعال دلا رہا تھا۔

''تم سے معافی مانگ ہی کون رہا ہے.... ہٹو میرے راستے سے۔'' وہ حقارت سے پر' سخت لہجے میں بولی۔ اندر سے اب دل پریشان بھی ہونے لگا تھا کہ وہ چٹان کی طرح دروازے کے آگے جم کے کھڑا تھا۔ سینے پہ بازو لپیٹے.... بڑے اطمینان کے ساتھ۔ گویا تمام بدلے آج ہی چکانے کا ارادہ ہو۔

''میں نے تمہیں یہاں سے ہٹنے کی قیمت بتا دی ہے۔ ایک نادم سی معافی اور بس.... معاملہ اسی کمرے میں ختم۔''

وہ رسان سے بولا تو اتنا سنجیدہ تھا کہ مہماہ کا دماغ گھومنے لگا۔

''آگے سے ہٹو ورنہ میں چیخنا شروع کروں۔'' مہماہ نے لہجہ سخت کرتے ہوئے اسے درپردہ دھمکایا۔

''بہت اچھی بات.... ابھی سب جمع ہوں گے تو یہ سارا سین دیکھ کر خود ہی سمجھ جائیں گے کہ تم یہاں کر کیا رہی تھیں۔'' وہ رسان سے بولا تو مہماہ بے بس ہونے لگی۔

دل ہی دل میں اس گھڑی کو کوسنے لگی جب وہ موحد کو غیر موجود سمجھ کر اس کے کمرے میں گھسی تھی۔

''اوکے.... سوری....'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ تو وہ چونک کر سیدھا کھڑا ہوا۔

''ہوں.... کیا کہا....؟'' یوں ظاہر کیا جیسے واقعی اپنے دھیان میں تھا اور سن نہ پایا ہو۔ مگر مہماہ جانتی تھی وہ محض اسے ذلیل کرنا چاہ رہا ہے۔

''سوری موحد.... ہٹو سامنے سے۔'' وہ بڑے ضبط سے بولی تو آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی۔ اور اسی وقت باہر گونجنے والی صدیقہ بیگم کی آواز۔ وہ مہماہ کو پکار رہی تھی۔

''ذرا اونچی اور صاف آواز میں بولو۔ اور کہو کہ تم اس حرکت پر شرمندہ ہو....'' وہ اسی اطمینان کے ساتھ اپنے بکھرے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

مہر ماہ سن رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

کام کے دوران وقار آفندی پر غشی طاری ہوئی تھی اور پھر بیہوشی طویل ہو گئی۔ دفتری گاڑی سے اسے چار بندوں کے ہمراہ گھر بھیجا گیا تھا۔ زرنگار تو بے اختیار سینہ پیٹ بیٹھی۔

"حوصلہ کریں بھابی! ابھی ڈاکٹر کے پاس سے ہو کے آ رہے ہیں۔ مکمل آرام بتایا ہے اس نے۔" زرنگار کی بگڑتی جذباتی کیفیت پر وقار کے دفتر کے کسی ساتھی نے جلدی سے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

اور وہ بیہوشی کا پہلا دورہ تھا۔

اس کے بعد تو کبھی ہلکا اور کبھی شدید سردرد.... کبھی بیٹھے بیٹھے ایک دم سے غنودگی کی کیفیت طاری ہو جانا۔

کمبخت سردرد تو مستقل ہی اس کا ساتھی بن گیا تھا۔ خرچے کم ہونے کے بجائے بڑھتے جا رہے تھے۔

نمیر اسکول جانے لگا تھا۔ زرنگار کا حوصلہ نہ پڑتا کہ سردرد میں مبتلا وقار کو دفتر بھیجے.... کبھی کبھار کا درد اب بار بار ہونے لگا تھا۔

"وقار.... غصہ نہ کریں تو ایک بات کہوں؟"

آج پھر وہ اسی شدید تکلیف کا شکار بنا ناشتہ کیے اوندھے منہ بستر پر پڑا تھا۔

"ہوں...."

"نہیں.... پہلے وعدہ کریں ناراض نہیں ہوں گے۔" مدھم مگر ہچکچایا ہوا سا لہجہ وقار کی سماعت سے ٹکرایا تو وہ بے اختیار اسے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

وہ اس سے نظریں چرائے، نمیر کے بیگ میں کتابیں ڈالنے لگی۔

"تم مجھے اچھی طرح سے جانتی ہو زری! میری پسند ناپسند سے تم سے زیادہ اور کون واقف ہو گا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں وعدہ کرنے کا۔" وہ پھیکا سا مسکرائی تو وقار نے اسے بغور دیکھا۔

"تم ایسی کوئی بات کیوں کرنا چاہتی ہو جو تمہیں پتا ہے کہ مجھے بری لگ سکتی ہے؟" وقار نے تحمل سے پوچھا۔

"حالات کو دیکھ کر لائحہ عمل طے کرنے پڑتے ہیں وقار۔" وہ بے اختیار بولی پھر بے ساختہ وقار کی طرف دیکھا۔ زرنگار کے الفاظ پر اس کی رنگت یکلخت بدلی تھی۔

"فکر مت کریں.... مر کر ہی آپ کا پیچھا چھوڑوں گی۔ جیتے جی تو کوئی الگ نہیں کر سکتا ہمیں۔" وہ جلدی سے بشاشت بھرے لہجے میں بولی۔

"کیا مسئلہ ہے زری۔ کھل کر بات کرو۔"

"میں سوچ رہی تھی کہ اب نمیر بھی اسکول جانے لگا ہے.... آپ کی طبیعت بھی خراب رہتی ہے۔ حالات بگڑ رہے ہیں وقار.... اگر آپ اجازت دیں تو.... مطلب اگر آپ کو برا نہ لگے تو...."

وہ لڑکھڑاتے لہجے میں کہتی جانے الجھن کا شکار تھی یا خوف کا، وقار چڑ گیا۔

"کھل کے بات کرو زری! کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔"

"میں ٹی وی پہ گانا گانے کا پروگرام کر لوں؟" اس نے ایک دم ہی کہہ دیا تھا۔

ایک تیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ وقار آفندی کے وجود پر سے ٹرین گزر گئی۔

"بڑے اچھے گھروں کی لڑکیاں آرہی ہیں اب تو ٹی وی' پر وقار اور عزت سے کام کررہی ہیں.... گانا گا کر اپنے پیسے لے کر گھر واپس.... کیسا؟" وہ اس کی خاموشی سے حوصلہ پاکر قدرے جوش سے بولی۔

"وہ تو تم زرگل بائی کے کوٹھے پر بھی یہی کررہی تھیں.... پھر وہاں کیوں اعزت عزت کی دہائی دے رہی تھیں۔"

سرد.... بے حد سرد منجمد کردینے والے لہجے میں کہتا وہ اٹھ بیٹھا تو واقعتاً "زرنگار ٹھٹھر سی گئی۔

"بڑے اچھے گھروں کی لڑکیاں گا رہی ہیں وقار.... عزت سے کام کررہی ہیں۔" اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"ہوں گی اچھے گھرانوں کی لڑکیاں مگر اسکرین کے پیچھے ان شریف زادیوں کو کیسی نظریں اور کیسی زبان برداشت کرنا پڑتی ہے' یہ تم نہیں جانتیں.... ایک مرد میک اپ کرے آپ کا.... دوسرا کیمرے کی آنکھ سے دور نزدیک کر کے ساری دلکشی کا جائزہ لے.... تمہارے نزدیک یہ باعزت روزگار ہے؟؟؟" اس کا لب ولہجہ برہم ہو گیا تھا۔

"اور تم.... تم نے سوچا بھی کیسے زرنگار.... میں مر تو نہیں گیا ہوں جو تم دوبارہ سے اس ذلت کی زندگی میں جانے کا سوچ رہی ہو۔" وہ شکوہ کناں ہوا تھا۔ زرنگار اس کے الفاظ پر تڑپ اٹھی۔

"اللہ کا واسطہ ہے وقار.... میں تو یوں ہی ایک بات پوچھ رہی تھی۔"

"میں نے بھی تو ایک بات ہی پوچھی ہے زری.... طوائف کے کوٹھے پر محض آواز ہی بیچ رہی تھیں تم۔ تب گا کر پیسہ کمانا بھی منظور نہ تھا تمہیں۔" وہ طنزیہ بولا۔

"ماحول کا فرق ہے وقار۔ ٹی وی کے تماشائی اس طرح کے ذہن کے نہیں ہوتے جیسے طوائف کے کوٹھے پر آتے ہیں۔"

"تمہارے خیال میں۔" وقار نے لقمہ دے کر اس کی بات مکمل کی۔

"ہر مرد تماشائی کی ایک ہی سوچ ہوتی ہے زرنگار۔ یہ بات یاد رکھنا۔ سامنے بیٹھا مرد محض عورت کا گانا نہیں سن رہا ہوتا' اس کی ہر ادا' اس کی رعنائی اور دلکشی کو اپنی نظروں سے جانچ رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اسی لذت کو حاصل کرنے وہاں آیا ہے۔ اسی بات کے پیسے دیے ہیں پروگرام کے ٹکٹ پر اس نے اور جس عورت کو دیکھنے پر ٹکٹ لگے.... وہ بھی کوئی عورت ہوئی بھلا۔" اس نے برہمی سے سر جھٹکا تھا۔ زرنگار نے کچھ کہنے کو لب کھولے مگر اس سے پہلے ہی وہ درشتی سے بولا۔

"ابھی میں زندہ ہوں زرنگار.... ابھی یہ راہیں مت کھوجو۔ جب مر جاؤں تو جو جی میں آئے کرلینا۔"

اور بس.... زرنگار آفندی نے آنسوؤں بھری آنکھوں کے ساتھ یہ موضوع ہمیشہ کے لیے دفن کردیا۔

☼ ☼ ☼

تزئین نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے موحد کے کمرے سے نکلتے فرد کے لہراتے کاسنی دوپٹے کی جھلک سی دیکھی تھی۔ وہ اپنی رو میں کمرے میں چلی گئی۔ مگر پھر فوراً" ہی ان ہی قدموں پر پلٹی' تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آئی اور ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھی۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔

کچن میں سے تائی جان کی اونچی آواز آرہی تھی۔

"کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ کہاں سوئی پڑی تھیں؟"

"نہیں تھی امی۔۔۔ کام بتائیں آپ۔۔۔؟" مہرو کا مصالحانہ انداز۔
تزئین اپنا شک دور کرنے کو ذرا سا کچن کے دروازے کی طرف ہوئی۔ پستہ کلر کا تائی جان کا سوٹ اور۔۔۔ ہاہ۔۔۔ تزئین کا چٹخارہ بھرنے کو جی چاہا۔ کاسنی رنگ کا مہماہ آفندی کا دوپٹہ تھا۔ تائی جان کوئی کام مہماہ کے حوالے کر کے نکلیں تو تزئین جیسے اپنے دھیان میں کچن میں داخل ہوئی۔
مہماہ کے ساتھ اس روز کی منہ ماری نے تزئین کو دن رات سلگتے کوئلوں پر لٹا رکھا تھا۔ (بھلا مجھے طلال سے اچھا نہیں مل سکتا کوئی)
مہماہ کوکنگ رینج پر ابل کر گرنے والے دودھ کو پہلے گیلے کپڑے سے صاف کرنے کے بعد اب وم اور اسفنج کے ساتھ رگڑ رہی تھی۔ تزئین نے فریج کھول کر یوں ہی چیزوں پر نظر دوڑائی۔
"تم ڈرتی ورتی تو ہو نہیں کسی سے۔۔۔ پھر تم نے تائی جان کو بتایا کیوں نہیں کہ تم موحد آفندی کے کمرے میں تھیں۔" کھنکھار کر تزئین نے اس قدر اطمینان سے بم پھینکا کہ مہماہ کو نہ تو سنبھلنے کا موقع مل سکا اور نہ اپنی اڑتی رنگت چھپانے کا۔ وہ معصومیت سے مہماہ کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اپنے الفاظ کی سنگینی سے ناواقف ہو۔
"کیا بکواس ہے یہ۔۔۔" بمشکل وہ اس کی بات رد کرنے کی ہمت اکٹھی کر پائی تھی۔
تزئین ہنسنے لگی۔ "چوری اور وہ بھی دودو 'مہرو! چہ۔۔۔ چہ۔۔۔ چہ۔" کیبنٹ سے ٹیک لگا کر کھڑی وہ بڑی فرصت سے اظہار خیال کر رہی تھی۔ مہماہ بھڑکی۔
"شٹ اپ تزئین! جس بات کے متعلق پتا نہ ہو اس کو موضوعِ گفتگو نہیں بناتے۔"
"تو تم کون سا درس کی کلاس لینے گئی تھیں وہاں۔ ابھی آغا جان نے تمہیں اس کے کمرے سے نکلتے دیکھا ہوتا تو۔۔۔" وہ کہتے کہتے رکی پھر کچھ سوچ کر ڈرامائی انداز میں بولی۔
"بلکہ یہ سوچو کہ میری بجائے اگر طلال نے دیکھا ہوتا تو انگوٹھی اتار کے تمہارے منہ پر مارتا۔" مزہ لیتا ہوا انداز۔۔۔ مہماہ کی رگوں میں شرارے دوڑ گئے۔
"اللہ کا شکر ہے تزئین! طلال کی ذہنیت اتنی گھٹیا نہیں اور نہ ہی وہ اتنا کم ظرف ہے کہ محض کسی گمان کو یقین سمجھ لے۔" بڑے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا تو تزئین منہ بنا کر سر جھٹکتی کچن سے نکل گئی۔
"اوہ میرے اللہ۔۔۔" مہماہ کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ ایک تو موحد آفندی سے جھڑپ۔۔۔ اوپر سے اس کا اپنے کہے الفاظ دہرانے پر مجبور کرنے اور کمرے کی حالت درست کرانے کے بعد کمرے سے نکلنے کی اجازت دینا اور وہ بھی یوں جیسے کوئی احسان عظیم کیا ہو۔۔۔ اوپر سے تزئین کا دیکھ لینا۔
اس نے آستین سے آنکھیں صاف کیں۔
درحقیقت اسے موحد آفندی سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی اور تزئین۔۔۔ وہ کینہ پرور کچھ بھی کر سکتی تھی۔ پہلے تو وہ شرما شرمی میں لحاظ کر جاتی تھی مگر اب جبکہ مہرو نے اس پر ظاہر کر دیا تھا کہ وہ طلال کے لیے اس کے دلی جذبات سے واقف ہے تو وہ اور کھل کر میدان میں اتر آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس بار گھر میں کسی کو بھی خبر نہیں ہوئی تھی کہ موحد کے کمرے کا پھر سے حشر نشر کیا گیا ہے۔

مگر ایک مستقل اہانت کا احساس مہماہ کو گھیرے ہوئے تھا۔ موحد کا شاہانہ انداز میں آغا خان کی کرسی پر مستقل قبضہ اور ماسوائے مہماہ کے باقی تینوں لڑکیوں سے دوستی اور ہنسی مذاق۔ سائرہ چچی بھی ان میں شریک ہوتیں۔ ثمرہ چچی مستقل مسکراتی رہتیں۔ اور مہماہ کا دل سلگتا رہتا۔

اور تائی جان.... وہ حسد کے مارے آدھی رہ گئی تھیں۔ موحد آفندی نے آتے ہی جیسے آغا جان کے حواس پر قبضہ کیا تھا' وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

پہلے مبین آفندی نے سمجھایا کہ گھر کی دولت دامادوں میں بٹ جائے گی تو انہیں تسلی ہوئی کہ آغا جان کا وارث آ رہا ہے۔ دولت گھر میں ہی رہے گی۔ لیکن اب احساس ہوا کہ موحد کا فقیری سے بادشاہی تک کا یہ سفر ان کے لیے بے چینی اور ناپسندیدگی کا باعث تھا۔

اور یہ ثمرہ.... زہر لگتی تھی انہیں.... ماضی میں بھی وقار آفندی کی ہر بار حمایت میں ثمرہ ان کے بالمقابل آتی رہی تھیں اور سب سے بڑی وجہ.... ایک بیٹے.... جائیداد کے وارث کی ماں ہونے کا عیب' وہ کبھی ان کے دل پر چڑھی ہی نہ تھی۔

''موحد پر نظر رکھیں مبین صاحب۔ آہستہ آہستہ وہ آغا جان کے حواس پر ہی نہیں بلکہ اس زمین و جائیداد پر بھی قبضہ کرلے گا۔''

انہوں نے اپنی بے چینی میاں سے بانٹ ہی لی تھی۔ انہوں نے بیوی کو قدرے گھور کر دیکھا۔

''ایک تو تم عورتوں کی نفسیات بڑی عجیب ہوتی ہے۔ پہلے یہ دھڑکا تھا کہ اتنی بڑی جائیداد کا بنے گا کیا؟ اور اب جبکہ وارث آچکا ہے تو وہ بھی برداشت نہیں تم سے۔''

''اوفوہ.... یہ مطلب تھوڑی تھا میرا....'' وہ کھسیائیں۔

''وارث ہے تو اپنے حصے کا۔ آپ اپنا حصہ اپنے ہاتھ میں ہی رکھیے گا۔'' وہ پھر بھی کہے بنا رہ نہیں پائی تھیں۔

''صدیقہ بیگم وہ کون سا کاغذات پہ انگوٹھے لگوا رہا ہے مجھ سے۔ حد ہوتی ہے....'' وہ تاسف سے انہیں دیکھتے سر جھٹک کر رہ گئے۔

''سائرہ کا ارادہ لگ رہا ہے مجھے تزئین اور موحد کے رشتے کا۔'' انہیں ایک اور فکر لگی۔

''ہاں تو اچھی بات ہے نا۔ تم تو دل سے چاہ رہی تھیں کہ وہ مہرو کے علاوہ جس سے مرضی رشتہ کرلے۔'' انہوں نے یاد دلایا تو وہ فوراً بولیں۔

''اللہ کا شکر ہے۔ ثمرہ سے لاکھ اچھے ہیں میرے سمدھی۔ اس تنک مزاج کو تو دور سے ہی سلام ہے بھئی۔'' دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر ماتھے سے لگایا۔

''تو پھر ہونے دو جو ہو رہا ہے.... سہیل نے بہتر ہی سوچا ہوگا۔ اس کا داماد اس کاروبار کا وارث ہوگا۔'' وہ سہل انداز میں بولے تو صدیقہ کے دل میں حسد کی نئی آگ بھڑک اٹھی۔

☆ ☆ ☆

وہ لاؤنج میں آئی تو ملاحہ اور فرحین کو موحد کے ساتھ بیٹھے لڈو کھیلتے پایا۔

''اف.... چیٹر موحد بھائی....'' ملاحہ نے غالباً ''اس کی کوئی بے ایمانی پکڑی تھی۔ اونچی آواز میں بولی۔

"اس صدی کے سب سے بڑے چیٹر ہیں آپ۔"

"ارے واہ... جلنے والے کا منہ کالا۔ اب جیت رہا ہوں تو سب ہی الزام لگائیں گے مجھ پر۔" وہ بڑی روانی سے بے تکلفانہ انداز میں گویا ہوا تھا۔ ان کی ہنسی۔

"ملاحہ..." مہماہ خود کو پرسکون رکھنا چاہتی تھی مگر ملاحہ کو اس دشمن اوّل کے ساتھ ہنستے مسکراتے دیکھ کر بے اختیار اونچے لہجے میں اسے پکار گئی۔ تینوں کی گردنیں ایک ساتھ مڑی تھیں۔

"یہ لو آگیا ہٹلر کا زنانہ ایڈیشن۔" وہ بڑبڑایا تو فرزین اور ملاحہ سے ہنسی کنٹرول کرنا مشکل ہونے لگا۔ سنا تو مہو نے بھی بخوبی تھا۔

"تم کیا یہاں جاہلوں والا گیم کھیلنے بیٹھی ہوئی ہو' اور کوئی کام نہیں تمہیں؟" تپے چہرے کے ساتھ اس نے فی الحال موحد کو نظرانداز کرتے ہوئے فقط ملاحہ کو لتاڑا۔

"اررے... ملاحہ جھوٹی! کیا یہ جاہلوں والا گیم ہے؟ اور تم بتا رہی تھیں کہ تم اور تمہاری آپی روزانہ کھیلتی ہو اور یہ کہ یہ ان کا موسٹ فیورٹ گیم ہے۔" ملاحہ کا رنگ اڑا۔

"شٹ اپ یو..." مہماہ کا خود پر اتنا ہی کنٹرول تھا۔

"کیا بات ہے؟ اچھے بھلے ہم گیم کھیل رہے تھے۔ بھارت بن کے تباہی مچانے آگئی ہو۔" وہ اکتا کر بولا۔

"اٹھو ملاحہ... چل کے کالج کا پڑھو۔" اس نے سردمہری سے کہا۔ تو وہ بے دلی سے اٹھ گئی۔ شرمندگی بھی حد سے سوا تھی۔ فرزین بھی معذرت خواہانہ نظروں سے موحد کو دیکھتی چلی گئی۔

"اپنی ان حرکتوں سے اگر تم میری نظروں میں آنا چاہتی ہو تو آئی ایم سوری... آئم ناٹ انٹرسٹڈ۔" وہ اٹھ کر اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بے زاری سے بولا تو مہماہ اس کا مطلب سمجھ کر سرتاپا جل اٹھی۔

"تمہیں میں جس قابل سمجھتی ہوں' وہ تم بھی جانتے ہو موحد آفندی! مجھے کوئی دبو یا ڈرپوک لڑکی مت سمجھنا... وقتی صورت حال تھی جس نے مجھے سرنڈر کرنے پر مجبور کر دیا ورنہ میں..." اس نے دانتوں پر دانت جمائے تو موحد کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"ورنہ کیا کر لیتیں تم...؟"

وہ جیسے دبی آواز میں غرّایا۔ پھر ایک دم آگے بڑھا اور لال ہوتی آنکھیں اس کی بے خوف آنکھوں میں گاڑتے ہوئے تنفر سے پُر لہجے میں بولا۔

"اس رات اگر تم سب کے سامنے میرے کمرے میں سے برآمد ہوتیں تب میں دیکھتا تمہارا غرور کیسے منہ کے بل گرتا ہے۔" مہماہ کا وجود سنسنا اٹھا۔

"مگر اللہ کا شکر ہے کہ مجھ میں تم سے زیادہ انسانیت اور تہذیب باقی ہے۔ اسی لیے صرف سزا دے کر چھوڑ دیا تمہیں۔" وہ احسان جتا رہا تھا یا مذاق کر رہا تھا؟ مہماہ کو شدید ہتک کا احساس ہوا۔

"ہنہ... سزا... تم تو خود سزا کے قابل ہو۔ دھوکے باز اور جھوٹے۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ موحد کا منہ نوچ لے۔

"آپی... کال آرہی ہے آپ کے موبائل پہ..." ملاحہ کی آواز نے اسے مجبوراً لڑائی ادھوری چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ تو شاید آج ہاتھا پائی بھی ہو ہی جاتی۔

موحد کی نگاہوں نے پُرسوچ انداز میں گلابی رنگت اور سیاہ آنکھوں والی اس حد درجہ متنفر لڑکی کا پیچھا کیا تھا۔

طلال کی آواز سن کر مہراہ کا دل بھر آنے لگا۔
"کیا ہوا مہو۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔۔۔؟" وہ اس کے نم لہجے سے اس کے اندر تک اترنے کی سعی کرنے لگا۔
"بس یوں ہی۔۔۔ تم یاد آرہے تھے۔" انگلی کی نوک سے آنسو کو اڑاتی وہ ہنس دی۔ کھنک دار شفاف سی ہنسی۔
"تو پھر مل لیتے ہیں ایک بار۔۔۔" وہ بے اختیار بولا۔ "مگر اس بار اس باڈی گارڈ کے بغیر۔"
"اونہوں۔۔۔" مہراہ کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔ فوراً "موضوع بدل دیا۔
"رابیل اور جنید کی شادی میں جارہے ہو؟ انوی ٹیشن آگیا ہے ہمارا تو۔" اس نے اپنے کلاس فیلوز کا تذکرہ کیا۔ جن کی لو میرج کامیاب ہوگئی تھی۔
"انوی ٹیشن تو مجھے بھی مل گیا ہے۔۔۔ چلو اچھا ہے۔ ملاقات کا کوئی تو بہانہ بنا۔۔۔ میں تو منگنی کرکے پچھتا رہا ہوں قسم سے۔" وہ بے بسی سے بولا۔
"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ غرائی۔
"مطلب یہ کہ جنید کی طرح سیدھے سبھاؤ شادی کرکے رخصت کرا کے لے جاتا تمہیں۔" وہ شرارت سے بولا تو مہراہ کا موڈ بہتر ہونے لگا۔
"ایسے ہی آغا جان نہیں ماننے والے۔ پہلے اپنے پیروں پہ تو کھڑے ہو جاؤ۔ ابا کا بزنس سنبھالو بچو۔ پھر ملے گی مہراہ آفندی۔" وہ شوخی سے بولی۔ تو طلال ہنس دیا۔
"تو میں پک کرلوں تمہیں پرسوں مہندی کا فنکشن ہے۔" طلال اس کا پروگرام پوچھ رہا تھا۔
"جوتے پڑیں گے دونوں کو آغا جان سے۔" وہ ہنسی۔
"تزئین بھی تو ہوگی ساتھ۔۔۔"
"اس کی رابیل سے بنی ہی کب ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ جائے گی اس نے تو انوی ٹیشن بھی نہیں دیکھا۔"
"چلو۔۔۔ ملنا تو طے ہوا نا۔ اتنا ہی غنیمت ہے۔" طلال نے قناعت پسندی کا مظاہرہ کیا تو وہ ہنستی ہی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

امی ابو تو رات گئے کے اس فنکشن کے لیے کسی طور رضامند نہیں تھے۔
"میں آغا جان سے اجازت لوں گی۔ اگر وہ مانے تو پھر کسی کی بھی نہیں سنوں گی۔" مہراہ نے اعلان کیا تھا۔
اور غیر متوقع طور پر آغا جان مان گئے۔ شاید رابیل کے فیملی بیگ گراؤنڈ سے واقف تھے اس لیے اور کچھ ویسے بھی ان دنوں آغا جان کا موڈ بہت اچھا رہنے لگا تھا۔ (چاہے وجہ موحد آفندی ہی کیوں نہ تھا)۔
وہ مہندی کے خوب صورت جوڑے میں ملبوس ایک ہاتھ میں ڈھیروں چوڑیاں پہنے دوسری کلائی پہ پہنے کڑے کا لاک لگاتی صدیقہ بیگم کو خدا حافظ کہتی آغا جان کے کمرے کی طرف بڑھی۔
"اتنی رات کو واپسی ہے تمہاری۔ ڈرائیور پہ بھروسا نہیں کر سکتا میں۔۔۔ موحد پک اینڈ ڈراپ کرے گا تمہیں۔" آغا جان نے تو گویا اس کے عین سر پہ بم پھوڑا تھا۔ مہراہ چکرا گئی۔
"آغا جان۔۔۔ آپ ابو سے کہیں۔۔۔ وہ لے جائیں گے مجھے۔" وہ بمشکل کہہ پائی۔
"تمہارا کیا خیال ہے میں نے صحیح بندہ نہیں چنا تمہارے لیے؟" وہ گرجے تھے۔
"نہیں آغا جان۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ٹھیک ہے۔ جانا تو ہے ہی۔ ڈرائیور چاہے کوئی بھی ہو۔" وہ بمشکل مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تو آغا جان تھوڑے ٹھنڈے پڑے۔

دروازہ کھلا۔ خوشبوؤں کے ایک ریلے کے ساتھ سفید ٹراؤزر اور نیلی اور سفید ٹی شرٹ میں ملبوس موحد آفندی، آغاجان کے کمرے میں داخل ہوا۔

تازہ تازہ شیو۔۔۔ ہونٹوں پر پُراطمینان سی مسکراہٹ' اف۔۔۔ مہماہ کا اگر وہ دشمن نہ ہوتا تو وہ اسے ہینڈسم اور ڈیشنگ کزن کا خطاب دیتی۔

"چلیں آغاجان۔۔۔" اس نے مہماہ کو یوں اگنور کیا جیسے وہ کمرے میں موجود ہی نہیں۔

"میں نہیں جارہا برخوردار۔۔۔" آغاجان نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر جمائے اور مسکرا کر کہا۔ ان کے ہر ہر انداز سے موحد کے لیے محبت محسوس ہوتی تھی۔

"مہو کی سہیلی کی شادی ہے۔ اب تم قابل اعتبار میرے لیے کوئی ہے نہیں۔ اس لیے اس کے پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری تمہاری ہے۔" مہماہ نے دلچسپی سے موحد کو دیکھا۔ ابھی وہ یہ فرمانبرداری کا ڈرامہ ختم کرتا اور مہماہ کی بھی جان چھوٹ جاتی۔

"اوکے آغاجان۔ جیسے آپ کا حکم۔۔۔" مہماہ کے ہاتھ سے کلچ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ اس نے بے یقینی سے موحد کو دیکھا۔ وہ اب مسکراتے ہوئے مہو کو ہی دیکھ رہا تھا۔

"چلیں۔۔۔؟"

مہو کو غش بھی آجاتا تو کم تھا۔ وہ مرے مرے لہجے میں آغاجان کو خدا حافظ کہتی باہر نکلی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھے ہی تھے جب طلال کی کال آگئی۔

"ہوں۔۔۔ ہاں۔ آرہی ہوں بس۔" وہ جان بوجھ کر موحد کو سنانے والے انداز میں بولی۔

"ہاں۔ ڈرائیور ساتھ ہی ہے۔ اتنی رات کو اکیلی تو نہیں آؤں گی نا۔ ڈونٹ وری طلال۔" خوامخواہ کی ہنسی۔ موحد نے ایک ترچھی نگاہ اس پر ڈالی اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

"ذرا جلدی کرو۔ سب پہنچ چکے ہیں وہاں۔" مہماہ کا تحکمانہ انداز گویا ڈرائیور کے لیے تھا۔

"سب سے مراد یقیناً" طلال ہوگا۔" وہ استہزائیہ بولا۔ مہماہ نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ سیٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے اثبات میں سرہلایا۔

"ظاہر ہے۔۔۔" وہ اسے اپنی یادداشت کے سہارے راستہ بتارہی تھی۔ اور ابھی وہ آدھے راستے میں ہی تھے کہ گھرر گھرر کی آوازیں نکال کر گاڑی بیچ سڑک میں ایک اندھیرے موڑ ــــ پر بند ہوگئی۔

"شٹ۔۔۔"

"اب کیا ہوا؟" مہماہ اکتا کر پوچھنے لگی۔

"ظاہر ہے گاڑی خراب ہوئی ہے۔" وہ گاڑی دوبارہ سے اسٹارٹ کرتے ہوئے تحمل سے بولا۔ مگر گاڑی کا انجن چند لایعنی آوازیں نکال کر بند ہوگیا۔

"جس رفتار سے تم گاڑی چلارہے تھے اس میں تو ہم فنکشن ختم ہونے کے بعد ہی پہنچتے۔۔۔ اتنا سلو چلا کر گاڑی کو بھی غصہ دلادیا تم نے۔" مہماہ کو غصہ آنے لگا تھا۔

"شٹ اپ۔۔۔" موحد کو بھی غصہ آیا۔ ایک تو سنسان راستے پر گاڑی خراب ہونا' دوسرے سجی سنوری مہماہ کا ساتھ۔

"یہ کون سی جگہ ہے۔۔۔؟" وہ موبائل نکالتے ہوئے مہماہ سے پوچھ رہا تھا۔

"مجھے کیا پتا۔۔۔ کالونی ہوتی تو نام بتادیتی۔ سنسان راستے کا کیا نام ہوگا بھلا۔" وہ خفا ہونے لگی۔

"اندھیرے راستے میں' مجھے تو لگتا ہے موڑ بھی غلط کاٹا ہے تم نے۔" اس نے موحد کی پریشانی میں مزید اضافہ

کیا۔

"اب بالفرض مدد کے لیے کسی کو بلائیں بھی تو کس جگہ کا ایڈریس دے کر......؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اترا اور بونٹ کھول کر موبائل ٹارچ سے انجن چیک کرنے لگا۔

مہماہ کا دل بھی ہول سا گیا۔

"واقعی اگر وہ راستہ بھول کر اس سنسان سڑک پر آنکلے تھے جس کے اطراف میں کھیتوں کا سلسلہ تھا تو پھر وہ کسی کو کیا نشانی بتا کر مدد کے لیے بلاتے......؟" وہ بھی پریشان سی نیچے اتر آئی۔

موحد نے موبائل اس کے ہاتھ میں پکڑایا اور خود اس کی روشنی میں مختلف تاروں کو چیک کرنے لگا۔

"تم نے مجھے راستہ ٹھیک نہیں بتایا۔ پچھلے موڑ سے غلط راستے پر آئے ہیں ہم...... شہر چھوڑ کر کسی قصبے کی طرف......" وہ اسے سنا رہا تھا۔ وہ کنفیوز ہونے لگی۔

"میں پہلے بھی ایک بار آچکی ہوں' اسی طرف ایک موڑ تھا...... یا شاید اگلا موڑ تھا وہ......"

اسی وقت کسی موٹر سائیکل کی آواز اس ویرانے میں خوفناک طریقے سے گونجنے لگی۔ کوئی مخالف سائیڈ سے ان کی طرف آرہا تھا۔

"مہماہ...... گاڑی میں بیٹھو۔" وہ بعجلت بولا۔

"کوئی آرہا ہے...... مدد ہی مانگ لو اس سے۔" وہ بحث کرنے کھڑی ہو گئی۔ موحد نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔ اسی وقت موٹر سائیکل ان کے پاس آکے رکی۔ دو آدمی تیزی سے نیچے اترے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر موحد نے مہماہ کو بے اختیار اپنی اوٹ میں کیا تھا۔

"ہم مسافر ہیں۔ گاڑی خراب ہو گئی ہے ہماری۔" موحد نے مصالحت آمیز انداز اپنایا۔ مہماہ کی رنگت اڑ گئی۔ موحد کی شرٹ کو مٹھیوں میں دبوچے وہ لرز رہی تھی۔

"موبائل نکالو اپنے...... اور کیش بھی......" دونوں' شلوار قمیص میں ملبوس' جوان لڑکے تھے۔ بے خوف اتنے کہ دونوں نے نقاب کر کے چہرہ چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

موحد نے فوراً" اپنا موبائل اور جیبوں میں موجود رقم نکال کر دے دی۔ ایک لڑکے نے گاڑی کا دروازہ کھول کر مہماہ کا کلچ پورے کا پورا ہی قبضے میں کر لیا اور یہ جا وہ جا۔

"اوہ گاڈ......" ان کے جانے کے بعد وہ بڑبڑایا اور پلٹ کر زرد پڑتی مہماہ کو دیکھا۔

"اب کیا ہو گا موحد...... گاڑی خراب ہے اور موبائل بھی نہیں......" اس کی آواز لرز رہی تھی۔ اور سیاہ آنکھوں میں موتیوں سے چمکتے آنسو۔ آسمان کے چاند کی تمام تر روشنی جیسے ان دو آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

موحد کے تاثرات میں عجیب سی تبدیلی دیکھ کر مہماہ کے حواس چوکنے سے ہو گئے۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹی اور گاڑی سے جا لگی۔ موحد کی نگاہ اس کے چہرے سے پھسلتی گردن اور پھر...... اس نے مہماہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

مارے خوف کے وہ گھگھیا کر رہ گئی۔ ویرانہ' تنہائی اور موحد کے بدلتے تاثرات نے اس کی آواز کو گلے میں ہی گھونٹ دیا تھا۔ وہ آگے بڑھ کے اس کے قریب آگیا۔ مہماہ کی سانس رک سی گئی۔ اس کا ہاتھ مہماہ کے شانے کو چھو رہا تھا۔

"یہ دیکھو...... گراس ہوپر......"

موحد کی آواز پر وہ ہول کر اسے دیکھنے لگی۔ جو کھیتوں میں اڑنے والے ٹڈے کو بڑی مہارت سے اس کے شانے پر سے پکڑ چکا تھا۔ آنسوؤں بھری آنکھوں سے اسے دیکھتی وہ تیزی سے پلٹ کر گاڑی میں جا بیٹھی اور

دروازہ لاک کرلیا۔

وہ شانے اچکا کر گراس ہوپر کو اڑانے کے بعد اپنی سیٹ پر آکر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ تاروں کو ہلانا جلانا شاید کام آگیا تھا۔ ایک دوبار کی کوشش کے بعد گاڑی کا انجن غرا کر اسٹارٹ ہو گیا تھا۔

"اسی لیے اسلام میں عورت کو بلا ضرورت یوں بن سنور کر رات کو گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا گیا ہے۔"

اس نے گاڑی واپسی کے راستے کی طرف موڑتے ہوئے پتا نہیں طنز کیا یا اس کی معلومات میں اضافہ.... وہ جو بھری بیٹھی تھی' دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے روتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

طلال نے مہماہ کے نمبر پر ان گنت کالز کرنے کے بعد بالآخر تنگ آکر تزئین کو کال کی تھی۔

"وہ تو کب کی جا چکی.... موحد کے ساتھ۔"

کب.... کو لمبا سا کھینچ کر اس نے طلال کا دل جلانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

"مگر یہاں تو نہیں پہنچی۔ فنکشن اسٹارٹ ہو چکا ہے۔" وہ پریشان تھا۔

"ہو سکتا ہے دونوں لانگ ڈرائیو پر نکل گئے ہوں۔" تزئین نے شرارت سے کہا تو وہ چپ ہو گیا۔ اس پر وہ جلدی سے بولی۔

"اوکے سوری یار۔ جسٹ کڈنگ۔" طلال نے لائن ہی ڈراپ کر دی تو تزئین کو غصہ آیا۔

"تمہارے ساتھ ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔" وہ موحد کا نمبر ملانے لگی مگر وہ بند تھا۔ یہی صورت حال مہماہ کے موبائل کی تھی۔

"چلو جی۔ خس کم جہاں پاک...." تزئین نے اپنا موبائل بستر پر پھینکتے ہوئے ہاتھ جھاڑے تھے۔

اسی وقت باہر گاڑی کے ہارن اور پھر گیٹ کھلنے کی آواز آئی تو اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ برآمدے کا دروازہ کھول کر وہ پورچ میں آئی تو گاڑی میں صرف موحد تھا۔

"مہرو کہاں ہے؟" موحد نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر دفعتاً اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیوں....؟"

"طلال کی بیسیوں کالز آچکی ہیں۔" تزئین نے اطمینان سے جھوٹ بولا۔

"چھوڑ آیا ہوں اسے.... یہاں تو آٹھ بجے ہی آدھی رات ہو جاتی ہے...." موحد چابی اچھال کر کیچ کرتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ تزئین پر سوچ نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

روئی آنکھوں اور دھلے دھلائے چہرے والی مہماہ فنکشن میں پہنچی.... موحد اسے باہر ہی اتار کے چلا گیا تھا۔

"اتنی لیٹ...." سب ہی کا شکوہ.... طلال کے ہاتھ وہ بہت دیر سے لگی۔

"کیا ہوا مہرو۔ اتنی دیر سے نکلی ہوئی تھیں۔ اتنی لیٹ کیوں پہنچیں؟"

وہ رابیل کو تیل اور مہندی لگا کر تصویریں بنوا آئی تھی۔ ایک میز کے گرد رکھی کرسیوں پر طلال کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"خیریت تو تھی نا.... وہ خبیث آدمی تھا تمہارے ساتھ؟" طلال کا لہجہ بدلا۔

مہماہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر کھنکھاری۔

"وہ مجھے ڈراپ کرنے آیا تھا۔ آغا جان کے حکم کے مطابق۔"

"اتنا طویل فاصلہ تو نہیں تمہارے گھر سے رابیل کے گھر کا مہرہ...!"

"راستے میں غلط موڑ کاٹ لیا۔ پھر گاڑی خراب ہو گئی تھی طلال...." وہ صفائی پیش کرتے کرتے یکبارگی رکی۔ بے یقینی سے طلال کو دیکھا۔

"تم مجھ پہ شک کر رہے ہو....؟"

"تم نے کال بھی اٹینڈ نہیں کی میری۔" وہ شکوہ کناں تھا۔ عجیب بے مہر.... بے التفات انداز۔

"حادثہ ہو گیا راستے میں۔ موبائل اور پرس چھین لیے چوروں نے...." مہرہ بے اختیار بولی۔ طلال نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا ہو گیا ہے مہرہ۔ کوئی موؤی دیکھ کر آئی ہو....؟" مہرہ نے لب بھینچے۔

دل تو چاہا کہے "نہیں طلال.... عزت بچا کر آئی ہوں۔"

"غلط موڑ کاٹ لیا۔ گاڑی خراب ہو گئی۔ موبائل چھن گئے۔ واٹ ربش؟"

وہ طنز و استہزاء سے بھرپور انداز میں بولا تھا۔ مہرہ کی سیاہ آنکھوں میں دکھ اور بے یقینی بھر گئی۔

"نہیں۔ ہم دونوں لانگ ڈرائیو پر گئے۔ وہاں گول گپے کھائے۔ اور اچھا سا ٹائم گزار کے یہاں چلے آئے۔ تمہاری کالز جان بوجھ کر اٹینڈ نہیں کیں میں نے.... اب خوش؟" وہ تلخی سے بھرپور لہجے میں بولی۔ تو طلال کو بہت کچھ غلط ہونے کا فوری احساس ہوا۔

"او کے، سوری مہرہ.... میں پریشان تھا بہت۔"

"کیوں.... اب پریشانی دور نہیں ہوئی۔ اپنی من مرضی کی کہانی سن کر۔" وہ طنز سے بولی تو آواز بھر آگئی۔

"تمہیں وہ پہلا شخص ہونا چاہیے طلال جسے میں کوئی بات کہوں اور وہ آنکھیں بند کر کے یقین کر لے۔ مگر تم نے تو مجھے ہی امتحان میں ڈال دیا۔"

اس کا شکوہ کناں لب و لہجہ اور سیاہ آنکھوں میں چمکتے آنسو طلال کے لیے امتحان بننے لگے۔ اس نے اپنی جذباتیت کو کوسا اور جلد بازی پر لعنت بھیجی۔

"سوسوری مہرہ.... بس پریشانی میں اول فول بک گیا میں.... مگر تم اس شخص کے ساتھ آئی ہی کیوں؟"

"اف...." مہرہ کا سر بھننے لگا۔

"پھر بھی...."

"او کے.... چلو۔ اس ٹاپک کو چھوڑ دو۔ اور ان خوب صورت لمحوں کو محسوس کرو جن میں ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

مہرہ بوجھل دل سے مسکرا دی۔ مگر در حقیقت طلال کی طرف سے اس کے دل میں ایک گرہ لگ گئی تھی۔

واپسی پر آغا جان کو اس نے رابیل کے پاپا سے فون کروا دیا۔ وہ خود اور رابیل اسے گھر چھوڑنے آئے تھے۔

اندر اپنے اے سی سے خنک ہوتے بیڈ روم میں موحد آفندی ایک بڑی بے چین نیند سو رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

بائٹل گرین اور اورنج کلر گاؤن میں ملبوس وہ اپنی تمام تر سج دھج سے تیار تھی۔ مگر خاموش.... بالکل چپ۔

"تایا جان کو بتایا موبائل چھننے کے متعلق؟" وہ گاڑی میں آکر بیٹھی تھی جب موحد نے اس سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"بتا دیتی تو آج گھر سے نکلنے ہی نہ دیتے۔"

"آج کدھر جانا ہے....؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"اسکائی ویز میرج ہال....." وہ ہال کا بتا کر اسے راستہ سمجھانے لگی۔

"مجھے اپنا نمبر دے دو تاکہ میں تمہاری سم بلاک کروا دوں۔" وہ میرج ہال کی پارکنگ میں اترتے اترتے پلٹی اور تحیر سے موحد کو دیکھا۔

اتنا نرم انداز!! وہ بھی مہماہ آفندی کے لیے؟ پھر یونہی سر ہلا کر گاڑی سے اتر گئی۔ پھر کچھ یاد آنے پر کھڑکی میں جھکی۔

"موبائل میں میری تصویریں بھی ہیں...."

"دوبارہ کھینچ لینا۔ جب نیا لوگی تو...." وہ بے نیازی سے کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ مہماہ اسے ہلکا سا گھور کر ایک ہاتھ سے دوپٹہ شانے پر سیٹ کرتی گولڈن کلچ دوسرے ہاتھ میں تھامے سہج قدمی سے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

اندر جاتے جاتے وہ بے خیالی میں اسی واقعہ کو سوچ رہی تھی۔ جب وہ موٹر سائیکل سوار آئے تو موحد آفندی نے کیسے اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے اسے اپنی اوٹ میں کر لیا تھا۔

صد شکر... اسے اپنے گھر کی عزت کی پرواہ تھی اور یہ بھی غنیمت تھا کہ آج اس کا لب و لہجہ پہلے سے بہتر تھا۔

"اے.... ہیلو...." وہ چٹکی بجانے کی آواز پہ ٹھٹکی تھی پھر طلال کو دیکھ کر جھینپ سی گئی۔

"مانا کہ میڈم آج صحیح معنوں میں "مادام" لگ رہی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ "یور ہائی نیس" کو توجہ ہی نہ دی جائے۔" وہ اپنے سر کو ہلکا سا خم کرتے ہوئے بولا تو ضبط کے باوجود مہماہ کو ہنسی آگئی۔

وہ دونوں اکٹھے اندر بڑھے تو کئی ستائشی نگاہوں نے اس جوڑی کو دیکھا تھا۔ آج کا فنکشن ہر لحاظ سے زبردست رہا تھا۔

"میں واپسی پر چھوڑ دوں گا تمہیں مہو...." طلال کو آج وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

"اونہوں...." اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"ڈرائیور کو ٹائم دیا ہوا ہے...."

"تو میں جو تا عمر تمہاری ڈرائیوری کا اعزاز لینے کو تیار ہوں' اس کا کیا؟" وہ بڑی معصومیت بھری شرارت سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ باہر کی طرف بڑھتی مہماہ کھلکھلا دی۔

"وہ دیکھو.... گاڑی آچکی ہے۔" مہماہ نے پارکنگ میں نگاہ دوڑا کر تھوڑی بہت تگ و دو کے بعد گاڑی تلاش کر ہی لی تھی۔

"اب تم جاؤ.... پھر میں جاؤں گی۔" وہ مسکرائی۔ اندر سے دل مضطرب بھی تھا۔ وہ جانتی تھی موحد کو دیکھ کر طلال کو اچھا نہیں لگے گا۔

"کم آن مہو! میں تمہیں گاڑی تک چھوڑ کر آتا ہوں۔" وہ مصر تھا۔

اور ابھی وہ اسی پس و پیش میں مبتلا تھے کہ موحد کی آواز نے دونوں کو گڑبڑا دیا۔

"میں کب سے تمہارا ویٹ کر رہا ہوں مہماہ...." وہ طلال کو قطعی طور پر نظرانداز کیے مہماہ سے مخاطب تھا۔

"وہ.... میں آ ہی رہی تھی بس۔" اس نے معذرتی نگاہ لب بھینچے کھڑے طلال پر ڈالتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"او کے طلال.... کل ان شاء اللہ...." وہ ہونٹ پھیلا کر مسکراہٹ کا تاثر دیتی موحد کے ساتھ قدم آگے بڑھا گئی۔

"اتنی لیٹ... میں تو تمہارے دیے ہوئے وقت سے پون گھنٹہ پہلے سے ویٹ کر رہا ہوں...." موحد کی آواز طلال کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی' اپنی گاڑی کی طرف بڑھتا وہ لب بھینچ گیا تھا۔

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی جب موحد نے اس کی گود میں کوئی چیز رکھی۔

"یہ کیا ہے...؟" اس نے ڈبہ اٹھایا... ایپل کا آئی فون سکس۔ لمبا، خوب صورت۔ وہ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اپنے لیے نیا لیا تو تمہارے لیے بھی لے لیا..." وہ بے نیازی سے سامنے دیکھتا کہہ رہا تھا۔

اب اس نے یکلخت اپنا انداز بدلا تو مہماہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ واقعی اندر سے "بدلا" تھا۔ یا یہ بھی کوئی "بدلہ" تھا؟ وہ کنفیوز سی ہونے لگی۔

"اٹس اوکے۔ میں ابو سے کہہ کے لے لوں گی۔ یہ تم رکھ لو..." ڈبہ ڈیش بورڈ پہ رکھتے ہوئے وہ رسان سے بولی۔

"یہ بھی اسی بزنس کے پیسوں سے آیا ہے، ڈونٹ وری۔ اپنے پاس سے نہیں بنا کے دیا میں نے..." وہ مصروف انداز میں ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔

"میں پھر بھی نہیں لے سکتی۔ تھینکس فار یور گفٹ۔" مہماہ کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا اس "راہ و رسم" کو بڑھاوا دینے کا۔ دشمن اول تھا وہ... دوست اول کیسے بن سکتا تھا؟

"تو پھر اپنی طرف کی ونڈو کھولو اور اسے باہر پھینک دو۔" اب کی بار اس نے بڑی سرد مہری سے مشورہ دیا تھا۔

مہماہ خاموش ہو گئی۔ قدرے توقف کے بعد وہ خود ہی سنجیدگی سے بولا۔

"میرا تم سے نہ تو جائیداد کا جھگڑا ہے اور نہ ہی کوئی خاندانی دشمنی ہے ـــــ اس لیے میرے خیال میں اس بے اعتباری کی فضا کو ختم ہونا چاہیے اب... اور اس بے تکی دشمنی کو بھی..." وہ دل ہی دل میں جوڑ توڑ کر رہی تھی۔

بے اعتباری ختم ہوئی تو... اعتبار شروع... اور دشمنی ختم ہوئی تو دوستی کی شروعات... اسے درحقیقت موحد آفندی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ گھر پہنچ کر وہ گاڑی سے اترنے لگی تھی۔

"مہو..." موحد نے اسے روکا تو مہماہ کو جھٹکا سا لگا۔ مہماہ سے مہو...

"یہ لے جاؤ... واپس تو میں لوں گا نہیں۔ چاہو تو کوڑے میں پھینک دینا۔" وہ ڈیش بورڈ پہ پڑے ڈبہ پیک موبائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

چند ثانیوں تک کچھ سوچنے کے بعد مہماہ نے ہاتھ بڑھا کر وہ ڈبہ اٹھا لیا تھا۔

"تھینک یو..." وہ اندر چلی گئی۔ موحد کے ہونٹوں پر بہت آہستہ آہستہ ایک جانی پہچانی سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

✲ ✲ ✲

"نمیر... مجھے مل سکتے ہو ابھی؟" سومیہ نے کال کرتے ہی سوال پوچھا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"کیوں...؟"

"ضروری بات کرنی ہے تم سے... میں آجاؤں تمہارے آفس یا تم مجھے ہاسٹل سے لے لو گے؟" وہ سنجیدہ تھی۔

پچھلی بار کی لڑائی ان دونوں کے بیچ ایک دیوار سی کھڑی کر گئی تھی۔

جانے نمیر کو اس کا موحد آفندی کی طرف متوجہ ہونا اچھا نہیں لگا تھا یا پھر وہ ہی دل میں نمیر کی جگہ موحد آفندی کو دینا نہیں چاہتی تھی۔

"میں آتا ہوں..." چند لمحوں کے بعد اس نے کہہ کر کال ڈراپ کر دی تھی۔ سومیہ کے ہونٹوں پر زخمی سی

مسکراہٹ پھیل گئی۔
ایک عجیب طرح کی بے چینی اور کرب نے اسے گھیر رکھا تھا۔ اور کسی پل سکون نہیں ملتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اسے لینے آگیا تھا۔ وہ پژمردہ سی اس کے ساتھ قریبی ریسٹورنٹ میں چلی آئی۔
"کچھ کھاؤ گی....؟" وہ پوچھ رہا تھا۔
"آئس کریم منگوالو۔" دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے گویا ریسٹورنٹ میں بیٹھنے کا جواز تلاشا۔
"او کے...."
وہ ویٹر کو بلا کر آرڈر لکھوانے لگا۔ اپنے لیے بھی اس نے اپنے پسندیدہ فلیور کی آئس کریم ہی آرڈر کی تھی۔
"اب بتاؤ۔ کیا مسئلہ ہے؟" وہ اس کی طرف متوجہ تھا۔
اور جب وہ یوں اسے توجہ دیتا تو سومیہ ہواؤں میں اڑنے لگتی۔ اسے لگتا جیسے پوری کائنات اس کی طرف متوجہ ہے۔
"آئم سوری...." وہ مدھم لہجے میں بولی۔ نمیر نے استفہامیہ انداز میں ابرو اٹھائے۔
"وہ کس لیے....؟"
"پچھلی بار کی لڑائی کے لیے... میں نے بہت فضول بکواس کی تھی" وہ ایسی ہی تھی۔ اپنی غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی تسلیم کر لینے والی۔
"اٹس او کے.... میں تو کب کا بھول بھی چکا۔" وہ لاپروائی سے کہہ کر اپنا موبائل اٹھا کر چیک کرنے لگا۔
"خوش قسمت ہو.... جلدی بھول جاتے ہو۔ بندوں کو بھی اور باتوں کو بھی۔" وہ پھیکا سا مسکرائی تھی۔
وہ توجہ دیے بنا اپنا موبائل دیکھتا رہا۔ ویٹر ان کے درمیان آئس کریم کے بلوریں پیالے رکھ گیا تھا۔
خاموشی ان کے درمیان کسی راز کی طرح تھی۔ گویا "فاش" ہونے کی منتظر ہو۔
"ایک بات پوچھوں نمیر....؟" وہ بے دلی سے اپنی پیالے میں چمچہ ہلاتے ہوئے بولی۔
"ہوں...." وہ مکمل طور پر آئس کریم کی طرف متوجہ تھا۔ لحظہ بھر کو سومیہ کو آئس کریم پر رشک آیا... پھر وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔
"تم اپنا لائف اسٹائل بدل نہیں سکتے؟" ہار کر
"کیا مطلب....؟"
وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔
"مطلب یہ کہ.... سیدھے سادے انداز میں اپنی لائف نہیں گزار سکتے۔ عام آدمی کی طرح...." وہ محتاط انداز میں بات کر رہی تھی۔
"تم جس بات کے لیے مجھے یہاں لائی ہو وہ کرو سومیہ...." نمیر نے اسے سپاٹ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"پھپھو چاہتی ہیں کہ میری اور موحد کی شادی ہو جائے۔" اس نے ایک دم سے کہہ دیا۔
وہ آئس کریم کھانا بھول گیا۔ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔
"واٹ....؟" بڑی دیر بعد اس کے منہ سے نکلا تھا۔
"میں چاہتی ہوں کہ تم اس گھر کو تباہ کرنے کا فیصلہ بدل لو نمیر۔ یقین کرو۔ میں.... میں دلاؤں گی تمہیں اس گھر میں تمہاری حیثیت۔" وہ اسے یقین دلا رہی تھی۔
"یہ.... شادی والی بات.... کس نے کہی تم سے؟" وہ متوحش سا تھا۔
"موحد تو کہہ نہیں سکتا۔ ظاہر ہے پھپھو نے ہی اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔" وہ قدرے شوخی سے بولی۔

"اور تم..." وہ سر سراتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا۔
"تمہیں جو میں نے سمجھایا تھا۔ وہ سمجھ میں نہیں آیا تمہیں؟"
"کم آن نمیر۔ یہ فضول کی ضد' بے کار کی دشمنی کیا دے رہی ہے تمہیں.... میں تو تمہاری طرف سے بالکل نا امید ہو گئی ہوں۔ اس لیے مجھے یہ پرپوزل قبول کرنے میں ہی بھلائی نظر آرہی ہے۔" وہ اب قدرے اطمینان سے کہہ رہی تھی۔
"شٹ اپ سومیہ۔" وہ غصے میں آنے لگا۔
"ان سب کے ساتھ برباد ہونے کا شوق سما گیا ہے تمہارے دل میں اور کچھ نہیں۔"
"اور تم مجھے برباد ہونے دو گے کیا؟" وہ بڑی آس سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔
"تب ہی تو اس گھر سے دور رہنے کا کہہ رہا ہوں۔" نمیر نے زچ ہو کر کہا۔
"تو بس پھر ٹھیک ہے۔" وہ موج میں آتے ہوئے بولی۔
"میں موحد کا پرپوزل ایکسیپٹ کرلوں گی تاکہ میری وجہ سے وہاں کسی کی تو بچت ہو۔"
"فضول باتیں مت کرو سومی" اس نے جھڑکا۔
"تم آخر کرنا کیا چاہتے ہو نمیر۔ اس فضول اور لایعنی دشمنی کو کوئی تو رخ دو۔" وہ تھک کر بولی۔
"دے دیا ہے رخ مائی ڈیر..." اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری۔ سومیہ کا دل ہلکے سے خوف سے دھڑکا۔
"کیا مطلب...؟" وہ میز پر قدرے آگے کو جھکا۔
"مہرماہ آفندی...."
اس کی سرگوشی نے سومیہ کو اندر تک ہلا دیا۔ بے یقینی سے اس نے نمیر وقار آفندی کو دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو تم اسے کیسے جانتے ہو۔
"کیا مطلب؟" اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ نمیر کے ہونٹوں پر منتقمانہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔
"میں نے اس گھر میں اپنا ایک مہرہ چن لیا ہے سومیہ۔ اور وہ ہے مہرماہ بیبن آفندی... آغا ذوالفقار علی خان کی منہ چڑھی پوتی... اور اس منہ پھٹ اور زبان دراز عورت کی بیٹی جس نے میری ماں کی شرافت اور اس کے کردار پر رکیک جملے کسے۔ اس کی شرافت کو ایک سوالیہ نشان بنا دیا سب کے سامنے۔" وہ سرد مہری سے کہہ رہا تھا۔
"کیا کرو گے تم نمیر...؟" اس نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ نمیر کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔
"ڈونٹ وری۔ تم سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں رہے گا۔"
"میں موحد سے شادی کرلوں گی نمیر..." اس کی آواز بھرانے لگی۔
"تم ایسا کچھ نہیں کرو گی سومیہ' وہاں صرف تباہی ہے اور بس..." وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔ اشارے سے ویٹر کو بلایا اور بل منگوایا۔ سومیہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اس سنگ دل' بے مہر شخص کو دیکھ رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

شیطان کا کوئی ایک روپ نہیں.... وہ کئی بہروپ بدل کر انسان کو ورغلانے کی کوشش کرتا ہے۔
اور اس بار وہ زرگل بانی کے روپ میں زرنگار کے ٹوٹے پھوٹے در پر آیا۔
"اللہ.... اللہ..." اس نے اپنے سگلے پیٹ لیے۔

"آسمان کا ستارہ کہاں خاک ہوا پڑا ہے زرنگار۔ کیوں اپنے آپ کو مٹی میں مٹی کرلیا تونے۔" زرنگار کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اپنی بے کسی پر نہیں۔۔۔ وقار آفندی کی بے بسی پر۔۔۔ وہ اپنی بیماری اور شدید سردرد کے ہاتھوں بے حال ہوا جاتا تھا۔ آج گھر میں موجود اناج کا آخری دانہ تک ختم ہوگیا تھا اور نمیر کو اسکول والوں نے مسلسل فیس جمع نہ کروانے کی بنا پر گھر بھیج دیا تھا۔

"بابا کو مت بتانا نمیر۔ میں کچھ کرتی ہوں۔" اس نے دس سالہ پیارے سے نمیر کے ہونٹوں پر ششش کے انداز میں انگلی رکھی تو اس نے سمجھ داری سے سرہلا دیا۔

اور اب زرگل بائی اس کے دروازے پر صدا لگانے آکھڑی ہوئی تھی۔

(اللہ نے فرشتہ بنا کے بھیج دیا اماں کو) مرتے مرتے حرام کو حلال کرنے والوں کی طرح زرنگار نے بھی سوچا۔ مگر اگلے ہی پل اس نے خود پر نفرین بھیجی۔

"اماں۔۔۔ کہا تھا میں نے دوبارہ مت آنا میرے ہاں۔" آنسو پیتے ہوئے اس نے یاد دلایا۔

"اری کم بخت ماری۔۔۔ ابھی بھی وہی تیہا۔ اب تو سنبھل جا آسمان سے ٹوٹ کر گرا ستارہ ہے تو۔ نرا پتھر۔۔۔ سرد اور سیاہ، بے مول کردیا اپنا جوبن تونے زرنگار۔"

وہ بین کرنے والے انداز میں بولی۔ بوسیدہ لباس میں ملبوس شہزادوں جیسے نواسے کو زبردستی ساتھ لپٹا کر چٹاچٹ بوسے لیے۔

"لڑکی پید اکرلیتی تو بھوکی نہ مرتی کبھی زری۔" اس نے زبردستی دس کا نوٹ نمیر کی مٹھی میں تھما کر اسے باہر بھگاتے ہوئے تاسف سے کہا تو زرنگار لرز اٹھی۔

"کیا فضول باتیں کرتی ہو اماں۔ اور اللہ کے واسطے جاؤ یہاں سے وقار آگئے تو ناراض ہوں گے۔"

وہ اپنی عزت نفس ختم ہونے سے پہلے پہلے زرگل بائی کو وہاں سے رخصت کرنا چاہتی تھی۔

یہ نہ ہو شیطان بہکالے۔۔۔ بھوکے بچے اور بیمار شوہر کی تکلیف کچھ غلط نہ کروادے۔ زرگل بائی سے اس کی پسماندگی چھپی ہوئی نہ تھی۔ سوراخوں سے بھرا دوپٹا اوڑھے۔۔۔ یہ وہ خوش لباس زرنگار تو نہ تھی اس نے نوٹوں کی ایک گڈی پرس میں سے نکال کر زرنگار کی گود میں پھینکی۔

"یہ لے علاج کروالے اپنے خصم کا۔" اس نے بے نیازی سے کہا جیسے دو چار روپے دیے ہوں۔ زرنگار کی نگاہوں میں درد سے بے حال ہوتا وقار آفندی گھوم گیا۔ ڈاکٹروں نے برین ٹیومر بتایا تھا اسے۔۔۔ اور اب تو آپریشن لازمی قرار دے دیا تھا سب نے۔۔۔ اس کے ہاتھ اس گڈی کو پکڑنے کو بے تاب ہونے لگے۔

"بس۔۔۔ اس کے بدلے ایک بات مان لے میری۔۔۔" زرگل بائی نے پان چباتے ہوئے بیٹی کی بدلی نگاہ بھانپ لی تھی۔ اطمینان سے بولی تو زرنگار کا دل ڈوب سا گیا۔

اس نے یوں سختی سے رقم کو تھاما جیسے۔۔۔ جیسے زرگل بائی کی ہر بات ماننے کا تہیہ کرلیا ہو۔

(باقی آیندہ ماہ ان شاء اللہ)

میمونہ صدف

"اردشیر درجے" کی چار منزلہ عمارت..... اور چار کنبے..... وہاں کوئی درجہ نہ تھا' صرف ایک ہی درجہ تھا..... مرد کا۔ اس سے اونچے درجے والوں کے شملے نیچے تھے اور سنبھالنے والے سرپنچ تر..... پھر بھی وہ خود کو "خاندانی" کہلواتے' برملا کہلواتے' ڈنکے کی چوٹ پر کہلواتے۔"

اس خاندان کے سب ہی مرد کاہل تھے اور عورتیں کام میں ماہر.....

سب ہی مرد شیر بنتے اور عورتیں بنا بال و پر طائر.....

سب ہی مرد گھر میں رہتے اور عورتیں باہر.....

گلایل کو سب یاد رہا' ہمیشہ سے یاد تھا اور اچھی طرح سے تھا۔ اس نے ہمیشہ سے دل آسا کو اس منزل کا باغی دیکھا' باغی پایا..... اتنی بہت سی بڑی چھوٹی گونگی عورتوں میں وہ واحد تھی بولنے والی' لڑنے والی' پٹنے والی' رونے والی.....

وہی اس کی پیاری دل آسا پھپھو..... اس درجے کی سب سے حسین اور کماؤ عورت.....

وہ بند کمرے کی بند کھڑکیوں' کواڑوں کی باریک درزوں سے اندر جھانکتی..... سیلن زدہ کمرے کی پیلی دیواروں میں رنگے ہاتھوں' پیروں والی خوشبودار پھولوں میں بسی مایوں کی دلہن سی دل آسا کو..... جو کھلی الماری کے سارے کامدانی جوڑے نکال نکال کر ڈھیر کرتی کتابوں کے اوراق کو آگ دکھاتی اور کانچ کی چیزوں کو ہوا میں اڑاتی..... ان سب ہی ٹوٹی بکھری چیزوں پر ماتم کرتی وہ بہت سا روتی اور بہت سا ہنستی..... کبھی وہ ذہین لگتی' حسین لگتی اور کبھی خبطی..... اس کے بہت سے رنگ تھے' پھر بھی کوئی رنگ نہ تھا۔

گلایل کتنا بھی اس سے چھپ جاتی' وہ اسے پا لیتی' پاس بلاتی' گود میں بٹھاتی اور خاموش ہو جاتی.....

وہ بیٹھے بیٹھے اکڑنے لگتی تو اونگھنے لگ جاتی' اونگھ اونگھ کر گرنے لگتی تو سو جاتی اور جب سو سو کر تھکنے لگتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتی' مگر دل آسا اسی پہلو پر جمی اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہی ہوتی۔

کبھی کبھار وہ اپنا دوپٹا اسے اوڑھا دیتی' اس کے دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی جانب بلند کرتی اور اسے دعا کو کہتی۔

"دعا کرو گل..... میں یہاں سے چلی جاؤں.....؟"

"یہاں سے کہاں؟"

"دور کہیں..... جہاں مجھے کوئی نہ دیکھے' کوئی نہ پائے۔"

"اللہ کے پاس.....؟"

وہ ایسی دعا پر کانپ جاتی اور دل آسا مسکرا دیتی۔

"ہاں' وہاں بھی ٹھیک ہے۔" اسے ایسی بددعا' دعا لگتی۔

"نہ..... نہ..... وہاں نہیں....." وہ جڑے ہاتھ کھول دیتی۔

"پھر کہاں گل..... تم بتاؤ؟"

"دولہا کے گھر..... جیسے برابر والی رادی آپا گئی ہیں۔"

اور دل آسا بڑی دیر تک خاموش رہتی..... اتنی دیر کہ اسے لگتا اب وہ نہ کبھی بولے گی' نہ لڑے گی۔

"اور وہ ان سا نکلا تو..... پھر کہاں جاؤں گی؟"

"کن سا....." وہ ناسمجھی سے پیاری دل آسا پھپھو کی صورت تکتی۔

"بھائیوں سا، ابا سا، چاچا سا......"

"تم انہیں برا بول رہی ہو؟" اسے بڑا برا لگا۔

"میں کبھی انہیں اچھا نہیں بول سکتی۔"

"کسی نے بھی کبھی انہیں برا نہیں کہا۔" اس نے سر سے دوپٹا نوچ ڈالا۔

وہ چھلکتی آنکھوں کا پانی صاف کرتی ایسی مسکراہٹ سے مسکرائی جو کسی طور مسکراہٹ نہ تھی۔

"کوئی انہیں برا نہیں کہہ سکتا..... جو برا جانتے ہیں، وہ کہتے نہیں اور جو اچھا مانتے ہیں، وہ انہیں جانتے نہیں۔"

"انہیں برا نہیں کہو....." وہ غصے سے چلاتی گود سے اتر گئی۔

"ایک دن آئے گا جب تم بھی کہنے لگو گی گل...."

وہ تھک کر وہیں گر گئی۔

"وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔ میں کبھی انہیں برا نہیں کہوں گی۔"

"اللہ تم پر کبھی وہ دن نہ لائے..... کاش اللہ تم پر اس قدر مہربان ہو جائے۔" وہ آنکھیں موندے پڑی رہی۔

"وہ سب ہمیں پیار کرتے ہیں..... تم ایسے کیوں بول رہی ہو؟ تم کیسے ایسے بول رہی ہو؟"

"وہ سب پیار دے کر ایسی مار دیتے ہیں کہ کوئی بول نہیں سکتا۔"

"تم اس مار کے قابل ہو۔" اس نے نفرت سے اسے دیکھا۔

"کاش تم کبھی اس مار کے قابل نہ بنو۔" وہ اسی طرح گول مول سی پڑی رہی۔

گلائل نے غصہ سے دیکھا اور بھاگ گئی۔

بھلا کون اس "اردشیر درجے" میں اس سی نافرمان تھی، اس جیسی ناقص، اس جیسی ناسپاس....

گلایل نے خود کو بڑھتے اور اسے جھکتے پایا... چاندی سا تھال سر پر سجائے گہری مانگ نکالے وہ اب بھی لڑتی اور روتی۔

"تم اتنا لڑتی کیوں ہو؟ دل آسا پھپھو....؟" اس نے رنگے بالوں والی اس کریہہ صورت عورت کو تکا جو اسے اس درجے کی خوف ناک بدروح سی لگتی۔ موتیا آپا بھی اس جیسی تھیں۔ مگر اس کی متضاد... خاموش، صابر، کراماتی بھید بھری۔

"مجھے سب کے حصے کا لڑنا ہوتا ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"تم لڑلڑ کر ایسی مکروہ ہو گئی ہو کہ کوئی تم پر تھوکے بھی نا...."

"کیا واقعی...؟" وہ خوشی خوشی پوچھ رہی تھی۔

"تم ایسی ہی رہنا چاہتی ہو؟" وہ حیران ہوئی۔

"یہ میرے لیے محبوب ترین ہوگا۔"

وہ گول گول گھومتے، گھیرے دار فراک کو اٹھائے ملنگ سی بن گئی۔

"تم بہت جلد بوڑھی لگنے لگ گئی ہو دل آسا پھپھو....!" اور اس نے یک دم تھم کر تھکان سے اسے تکا اور دونوں بلند بازوؤں کو پہلو میں گرا ڈالا۔

"ایسی کمائی والیاں جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔"

"کیسی کمائی والیاں....؟"

اور دل آسا کو گویا چپ لگ گئی.... جس لمحے گلایل کو لگا وہ بیٹھے بیٹھے سفید برف کی سل میں بدلی اور مر گئی.... اسی لمحے وہ پگھلنے لگی.... قطرہ قطرہ.... بوند بوند....

"وہ جو آفاقی پاک پانی سے بھی پاک نہ ہو...." پھر وہ آسمان سے اترتے اس پاک پانی سے خود کو دھونے لگی، ملنے لگی، پاک کرنے لگی۔

"اتنی بے زار ہو تو چھوڑ کیوں نہ دیا۔" گلایل نے پاک پانی میں بھیگتی اس ناپاک عورت کو دیکھا۔

"حسرت رہی اس خواہش کی۔" اس نے آہ بھری۔ "کھانا ہو تو کمانا ہوتا ہے۔"

اسے اس بات سے نفرت ہوئی، غصہ آیا، کوفت ہوئی۔

"اس گھر میں سب ہی تو کماتے ہیں۔"

"ہاں سب ہی عورتیں...." اس نے دوپٹے کا پلو نچوڑا۔

اور اس سوال پر دل آسا بڑے زوروں کا ہنسی.... ہنس ہنس کر گویا پھٹنے لگی۔ اس کی آنکھ کا کاجل پھیل کر سارا بہہ گیا اور چہرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

اتنا ہنستی وہ گلایل کو بے حد بھیانک لگی.... دم کٹی لومڑی سی اچھلتی اور اندھیرے میں ڈوبتی....

پھر اس روز وہ اتنا لڑی تھی کہ ابا نے اس کے سر پر پلیٹ پھوڑ ڈالی تھی۔ وہ کچھ کچھ ابا سے خفا تھی اور کچھ دل آسا پھپھو سے....

"تم یہاں سے چلی جاؤ...." وہ لمبے بالوں میں موباف باندھتی عورت کا عکس آئینے میں دیکھ کر بولی۔

روز روز کی کل کل، چخ چخ سے وہ عاجز تھی۔ ماتھے پر بندھی پٹی پر اسے دکھ سا ہوا۔ مگر پھر سوچا کہ اچھا ہوا۔

"تم میرے لیے دعا کرو کہ وہ مجھے لے جائے۔"

اور گلایل سہم گئی۔ "کون....؟"

"اس نے بلانے کا وعدہ میرے جنم سے پہلے کیا تھا۔" وہ بھید بھری مسکراہٹ تھی جس نے گلایل کا اندر باہر سب ہلا ڈالا۔

"تم جیسی بھیانک کو کون لے جائے گا؟"

"وہ آتا نہیں ہے، بلاتا ہے اور جب وہ بلاتا ہے تو کوئی نہیں بلاتا۔" وہ سر ہلاتی اس کے لیے دعائیں کرنے لگی.... روز کرنے لگی.... ہر پل کرنے لگی۔ وہ دل سے اس کا جانا چاہنے لگی۔

آنا جی اس پندرہ برس کی گلایل کو رات ڈھلتے تیسری منزل سے دور رہنے کو کہتیں۔ پھر بھی اس رات وہ چھپ کر دل آسا کے کمرے میں دبک کر سو رہی جو خالی تھا۔ نہ جانے دل آسا کہاں گئی تھی۔ آدھی

رات کو اس کی سسکیوں سے گلایل کی آنکھ کھلی۔

"رات سونے کے لیے بنی ہے، رونے کے لیے نہیں۔"

"جن کی قسمت سو جائے وہ راتوں کو رونے کا کام کرتے ہیں۔" بالوں میں گندھے پھول وہ نوچ نوچ کر اتارتی رہی اور چہرے پر لگا پاؤڈر لالی مٹاتی رہی۔

"تم میرے لیے دعا کرو کہ....."

گلایل کو ایسی سجی سنوری دل آسا سے نفرت ہوئی اور وہ جلدی سے اس کمرے سے بھاگ گئی۔ پیچھے دل آسا بڑبڑاتی رہی۔

اور اس رات اس نے دل و جان سے ایسی دعا کی جو دل آسا کی جان کو آ گئی۔

"ارذ تیر درجے" کی تیسری منزل نے اس عورت کو نیچے دھکیلا جو پہلے ہی بلندی سے پستی میں پڑی تھی۔ مگر وہ اس روز بلند ہو گئی..... بہت بلند.....

سو دل آسا کا وہ کمرہ جو سیلن زدہ تھا اور چیزیں جو ٹوٹی بکھری تھیں وہ باقی رہ گئیں اور گلایل نے وہ ساری وراثت سنبھال لی اور آنا جی اسے اس کمرے میں آتے جاتے دیکھ کر بس روتی رہتیں۔ وہ پوچھتی بھی تھی۔

"آنا جی کیوں روتی ہو؟" وہ اسے کیا بتاتیں کہ وہ کیوں روتی ہیں۔

"دل آسا پھپھو ایسی کیوں تھی؟"

وہ پہلی بار آنا جی سے ہاتھ پیر رنگوا رہی تھی خوشبو میں نہا رہی تھی۔ سولہ سال میں پہلی مرتبہ.....

"کیسی.....؟"

"سب سے جدا....."

"سب سے جدا ہی سب سے پہلے وداع ہوتا ہے۔"

اور جلد ہی وہ لڑکی جو دل آسا سے نفرت کرتی، نہ محبت، وہ دل آسا سی ہو گئی۔ اس کا دل اور روپ دل آسا سا ہو گیا اور اس کی روح اس میں حلول کر گئی۔

جس روز آنا جی اسے سجانے آئیں، وہ بدک گئی۔

"میں کیوں کماؤں؟ میرا بھائی، باپ ہے نا۔" اور آنا جی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم نے کب اس درجے کے کسی مرد کو کماتے دیکھا؟"

اور وہ ہمیشہ کی نابینا بالکل ابھی ابھی بینا ہوئی تھی۔ انسان گر بینا ہو تو اس پہ حق ہے بینائی کا..... اس نے وہ حق ادا نہ کیا اور نابینا رہنے پر اکتفا کیا۔

"میں نے اس درجے کے ہر مرد کو کھاتے دیکھا اور بڑی دیر سے دیکھا۔"

آنا جی نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھاما۔ "اب دیکھا ہے تو غور سے دیکھو اور جان لو کہ وہ کون اور ہم کون.....؟"

اور اس نے پہلی بار دیکھا، پہلی بار جانا۔

دادا اور چھوٹے دادا..... دل کے عارضے میں بیک وقت مبتلا..... بستر پر پڑے پرانے ریکارڈ سننے والے..... حقے کی نے سے گڑگڑ کرتے مہربان بوڑھے۔

ابا اور چاچا ہر سے شطرنج کی بساط بچھائے، دل آسا کو دھمکاتے، پیٹتے..... سر پھوڑتے.....

بھائی اور افراسیاب کبوتر بازی کے شوق میں مبتلا، چھتیں پھلانگتے کودتے..... کبھی کبھار بازار سے سودا سلف ڈھوتے۔

"وہ زمینیں جن کے وہ ٹھیکے دار ہیں؟"

اور آنا جی ہنسیں، بڑی زور کا ہنسیں، دل آسا سا ہنسیں.....

اس درجے کی ہر عورت ایسا ہنسنا جانتی تھی..... اسے تعجب ہوا۔

"ان کی زن بھی ہم، زر بھی ہم، زمین بھی ہم....." انہوں نے اسے جھنجھوڑا.....

"کہاں رہی اتنے برس گل..... دل آسا پھپھو کو نہ دیکھا؟ موتیا آپا کو نہ جانا؟"

اس درجے کے سب ہی مرد، عورتیں تھے اور سب ہی عورتیں، مرد..... وہ ہر دن گھر پر مامور رہتے اور عورتیں گھر سے مجبور..... وہ جن کے ذمے دار تھے ان کے ذمے سب ذمہ کر کے بری الذمہ ہوئے۔ وہ سب تاجر بن گئے..... اور تجارت سیکھ لی۔ ذلالت کی، کالک کی.....

بدلے میں عزت کو جانے دیا، پھر بھی عزت دار بنے رہے۔

"میں ایسے نہیں کماؤں گی آنا جی! میں منزل سے باہر نہیں جاؤں گی۔"

"ایسے نہیں کماؤ گی تو ان سے مار کھاؤ گی اور اس منزل سے باہر کردی جاؤ گی۔"

"مجھے دل آسا بننے سے روک لو آنا جی۔۔۔"

اور وہ کیا بتاتیں؟ خود سے لپٹی روتی اس لڑکی کو کہ وہاں کی سب عورتیں دل آسا رہی ہیں۔ خاموش دل آسا۔۔۔ ظلم سہ کر محض مظلوم بنی دل آسا۔۔۔ صرف وہی تھی لڑنے، بولنے اور پٹنے والی اور پھر اس ساری صبح، ساری دوپہر اور ساری شام وہ دعا کا چولا چڑھائے محو التجا رہی۔۔۔ جس رات اسے جانا تھا۔

"مجھے بچالے ربا۔۔۔ بچالے۔"

وہ پہلا مرد جس نے خود کے لیے دار (گھر) اور عورت کے دار (تختہ) پسند کیا، وہ اس مرد کے لیے سراپا بددعا بنی۔

"مجھے بچالے ربا۔۔۔ مجھے بچالے۔"

وہ پہلی عورت جو الحاح کی دھول چاٹ کر بھی دھتکاری گئی اور دربدر ہوئی، اس نے اسے دعا دی۔

کانچ کے ٹوٹے ٹکڑوں میں اپنا روپ دیکھ کر اسے لگا وہ اسی روز بوڑھی ہوگئی ہے، کریہہ صورت، لعنت زدہ۔۔۔

"ایک دن آئے گا جب تم بھی کھوگی گل۔۔۔"

اسے وہ دل آسا یاد آئی، جس نے ساری زندگی ان پریوں کے اس درجے میں نہ اترنے کی دعائیں کی جنہیں کبھی وہاں اترنا اور مرنا تھا۔۔۔ وہ دل آسا اس پری کو بری طرح یاد آئی جیسے اب اترنے کے بعد مرنا ہی مرنا تھا۔

وہ دل آسا جس کے مرنے کے بعد اسے اس کریہہ صورت عورت سے محبت ہوگئی تھی، وہ اسے رلا گئی۔

"ہاں ہاں میں کہتی ہوں۔۔۔ آج کہتی ہوں۔۔۔ بہت سا کہتی ہوں۔۔۔ دل بھر بھر کر کہتی ہوں۔۔۔ تم سا کہتی ہوں۔۔۔" گھٹے گھٹے ماحول کے اس گھٹے گھٹے کمرے میں وہ گھٹا گھٹا سا روتی رہی۔

"مجھے بچالے ربا۔۔۔ بچالے۔"

"وہ بس کر گل۔۔۔ میری بات سن۔۔۔ تو اس تیسری منزل سے بچالی گئی تو افراسیاب سمیت چوتھی منزل پر ہوگی۔۔۔ باپ، بھائی سے بچے گی تو شوہر سے آگے کہاں جائے گی۔"

تو طے ہوا کہ اسے ہر صورت اسی درجے میں رہنا تھا۔

آنا جی اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر تیار کر رہی تھیں اور وہ ماتھا، سینہ پیٹ رہی تھی۔۔۔ وہ رہائی کو لپکتی اور سامنے اسیری کھڑی ملتی۔

اور پھر وہی دعا نکلی جو اس رات کی تھی، جب دل آسا تیسری منزل کو چھوڑ گئی تھی۔

"سن میرے ربا۔۔۔ اس درجے کے باہر کوئی مجھے نہیں لے جائے گا۔۔۔ تو مجھے اندر سے لے جا۔۔۔ آج ہی لے جا۔۔۔ ابھی کے ابھی لے جا۔"

"ایسی مناجات جنہیں اوپر اٹھنا، مستجاب الدعوات کو بلندی تک لے جانا اور پہنچنا تھا۔۔۔ وہ گول محرابوں میں بھٹکتی اسے جا لگی۔۔۔"

وہ تضرع آخرین
وہ تضرع اولین
اسے پالیا فرش پہ
اسے جالیا عرش پہ

رات کے آغاز پر ہی سیلن زدہ بوسیدہ کمرے کی وراثت لاوارث پڑی تھی۔

چند ٹوٹے کانچ۔۔۔
جلی کتابوں کے اوراق۔۔۔
پھٹے ادھڑے جوڑے۔۔۔

اور بکھری پڑی وہ۔۔۔ گلایل۔۔۔ سولہ سالہ ڈھیر گلایل۔۔۔

اس رات گلایل کے کمرے سے یوں بھاگ جانے پر دل آسا نے جھولی اٹھا کر اسے دعا دی تھی۔۔۔ آخری دعا۔۔۔

"خدا کرے کہ جس روز تم پر مجھ سا وقت آئے، اس سے پہلے تمہارا وقت آجائے۔"

دروازہ کھولتے ہوئے وہ خود کو تقریباً "گھسیٹتے" ہوئے اندر داخل ہوا۔ کمرہ' پھول' مہندی اور پرفیوم کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اس نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے بیڈ پر براجمان دلہن پر نظر ڈالی۔ نظریں جھکاتے ہوئے وہ اس کے قریب پہنچا اور کئی دنوں سے اپنے دماغ میں دہرائے جانے والے جملے گلا کھنکھارتے ہوئے بولنا شروع کیے۔

"بہت معذرت کے ساتھ میں آپ سے ایسی کوئی خوش کن بات نہیں کرپاؤں گا جس کا ارمان ایک دلہن کو ہوتا ہے۔" دلہن کے کان کھڑے ہوئے لیکن سر جھکا رہا۔

"کیوں' آپ کسی کی میت سے ہو کر آرہے ہیں۔"

دلہن صاحبہ آنکھوں میں اشتیاق لیے' باچھیں پھیلائے اس سے دریافت کررہی تھیں۔

"اور آپ خود کو اس لڑکی کی امانت سمجھتے ہیں' جس پہ اور کسی کا کوئی حق نہیں۔" اس نے اطمینان سے بیڈ پر چوکڑی مار کے بیٹھتے ہوئے شہادت کی انگلی ہلاتے کسی مزاج آشنا کی طرح کہا۔

"ارے واہ! کیا سین ہے یار! پتا ہے مجھے ہمیشہ سے ایسے ناولز بہت پسند تھے جن میں لڑکا کسی اور کو پسند کرتا ہو اور اس کی شادی زبردستی ایک اللہ میاں کی گائے سے کردی جاتی ہے۔ مگر وہ اپنے معصوم حسن' سگھڑاپے اور بے وقوفانہ حرکتوں سے اپنے شوہر کا دل جیت لیتی ہے۔" وہ اپنے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر پٹر پٹر بولتے

عمیرہ فاروق

ذرا ہٹ کے

اس نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ دل ہی دل میں ٹھٹھا لگایا۔ دولہا نے ایک نظر اس کے جھکے ہوئے سر پر ڈالی اور بات آگے بڑھائی۔

"میرا دل اس شادی سے خوش نہیں ہے.... میں دراصل ایسے کسی جھنجھٹ کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔" وہ رک رک کے بولا اور دلہن نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس نے فوراً" سے نظریں چرائیں۔ وہ اس کا دل توڑنے پر شدید شرمندہ ہوا۔

"اچھا! تو آپ کسی اور سے محبت کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کرسکتے.... ہے نا؟" دلہن کی جوش بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

شاہ میر نے جھٹکے سے سر اٹھا کر سامنے دیکھا جہاں

ہوئے اپنے دولہا کو مطلع کرنے لگی۔

"لیکن مجھے یہ گائے وائے بالکل نہ سمجھنا' میں آج کی لڑکی ہوں۔" دونوں ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے اس نے خبردار کیا۔

"جی....؟" ہونق بنا دولہا بمشکل بولا۔

"ویسے دکھی تو بہت ہوں گے آپ.... میں سمجھ سکتی ہوں اس وقت آپ پہ کیا گزر رہی ہے۔" چہرے کو تھوڑا غمگین بناتے ہوئے اس نے افسوس بھی کر ڈالا اور دوسری طرف وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے گیا۔

"خیر.... اب آگے کیا ارادہ ہے؟"

"ہیلو.... آپ سے بات کررہی ہوں۔" اس نے

دولہا کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی تو اس نے گڑبڑا کے اس پر سے اپنی نظریں ہٹائیں اور مڑ کر بیڈ سائیڈ پر رکھے جگ سے پانی ڈال کر غٹاغٹ چڑھایا۔

"اصولاً" تو آپ کو مجھے اب یہ کہنا چاہیے کہ محترمہ آپ کپڑے تبدیل کر کے سو جائیں میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں۔ اپنے افیئر کا بتانے کے بعد دوسرا ڈائیلاگ عموماً" یہ ہی ہوتا ہے۔" شاہ میر نے اس کی بات سنتے ہوئے گلاس واپس میز پر رکھا۔

"خود ہی اٹھنا پڑے گا یار....." وہ منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اپنا لہنگا سنبھالتی بیڈ سے نیچے اتری۔

"واش روم کہاں ہے؟" یہاں وہاں نظریں گھماتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"آپ کے پیچھے وارڈروب کے ساتھ....." وہ جیسے کسی شاک کی کیفیت میں بولا اور وہ جلدی سے باتھ روم میں ..... گھس گئی۔ شاہ میر نے اپنی رکی ہوئی سانس بحال کی اور شیروانی اتار کر صوفے پہ رکھی۔

"دلہن جی نے تو چیلنج کر لیا۔ بس اب نماز پڑھ کر سوؤں گی۔" تولیے سے چہرہ پونچھتی ہوئی وہ باہر نکلی۔ وہ شاید ایسے ہی بنا رکے بولنے کی عادی تھی۔

"آپ ایسا کریں اس صوفے پر سو جانا۔ چونکہ بیڈ میرے جہیز کا ہے تو اصولاً" اس پہ سونے کا حق بھی زیادہ میرا ہی بنتا ہے۔" تولیہ کرسی پر پھیلا کر رکھتے ہوئے اس نے سارے معاملات طے کیے۔

"کوئی مسئلہ نہیں، آپ بیڈ پر سو جائیں آرام سے....." وہ پہلے تو اس کی بات پر بھونچکا ہی رہ گیا، لیکن پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"جاء نماز مل جائے گی پلیز....." وہ دوپٹا سر پر لپیٹتے ہوئے بولی۔

"شیور....." اس نے دراز سے جاء نماز نکال کر اس کو تھمائی اور خود الماری سے نائٹ سوٹ نکال کر واش روم میں چلا گیا۔

"ویسے مائنڈ مت کرنا لیکن ہیں آپ ایک نمبر کے ناکام انسان....." نماز ختم کرتے ہی وہ دوبارہ اسی رفتار سے شروع ہو گئی۔ شاہ میر نے جواباً" گھور کے اسے دیکھا۔

"ارے مرد کے اندر اپنے حق کے لیے لڑنے مرنے کی ہمت ہونی چاہیے۔ جو اپنی محبت کے لیے ڈٹ کر کھڑا نہ ہو سکے، اپنی بات نہ منوا سکے، میں تو اس کو مرد ہی تسلیم نہیں کرتی۔" وہ جوش جذبات میں بنا سوچے سمجھے بولی۔

"ایکسکیوز می! ایک گھنٹہ نہیں ہوا آپ کو یہاں آئے اور آپ نے مجھے نامرد ہونے کا طعنہ بھی دے دیا۔" وہ بلبلا اٹھا۔

"ایک گھنٹہ کیا میں تو پہلے دو منٹ میں ہی سمجھ گئی تھی کہ آپ میں مردوں والی کوئی بات نہیں۔ اگر ہوتی تو میری جگہ وہ ہوتی۔ آپ کی دلہن کے روپ میں یہاں اور میں گھر میں سکون سے سو رہی ہوتی لیکن سات سلام ہیں آپ کی مردانگی کو جو....."

"ایک منٹ..... یہ کیا آپ بار بار میری مردانگی کو للکارے جا رہی ہیں۔ اب آپ نے ایک لفظ بھی کہا تو میں آپ کا بالکل لحاظ نہیں کروں گا۔" وہ طیش میں آیا۔

"ہونہہ..... لحاظ تو آپ نے اس غریب کا بھی نہیں کیا جس کو پتا نہیں کیسے کیسے خواب دکھائے ہوں گے اور آپ کی بزدلی کی وجہ سے وہ اس وقت بیٹھی اپنی قسمت کو رو رہی ہوگی۔" نائٹ کریم سے اپنے چہرے کا رگڑ رگڑ کے مساج کرتے ہوئے وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔ شاہ میر نے بے اختیار ہی اپنا سر پکڑا تھا۔

✡ ✡ ✡

دوپہر میں منعقد ہونے والی ولیمہ کی تقریب کے بعد وہ تھکے ہارے گھر پہنچے۔ عارفین بے پناہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ شاہ میر کپڑے تبدیل کر کے نڈھال سا بیڈ پر سوئی جاگی کیفیت میں لیٹا ہوا تھا اور وہ خود ہی اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی صدقے واری جا رہی تھی۔

"واہ..... آنکھیں ہوں تو اتنی حسین اتنی قاتل....." سنگھار میز کے سامنے بیٹھی وہ چہرے کو شیشے کے بالکل

قریب کرتے ہوئے اپنی آنکھوں کا معائنہ کر رہی تھی۔

موبائل کو سیدھا کرتے اور اپنے چہرے کو مختلف زاویوں میں اوپر نیچے کرتے وہ اب اپنی تصویریں لینے لگی کہ ساتھ ہی اس کے دروازے پر آہستہ مگر عجلت بھری دستک لگاتار ہونے لگی۔

"آجایئے....." اس نے موبائل میز پر رکھتے ہوئے کہا اور خود اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور اس کی ساس نے ہلکا سا منہ اندر کرتے ہوئے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

"ارے آنٹی اندر آ....." اس کی جوش بھری آواز کو اس کی ساس نے ہاتھ کے اشارے سے دبانے کو کہا اور اسے باہر بلایا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاموشی سے لہنگا سنبھالتی باہر آئی۔

"ڈرائیونگ آتی ہے نا آپ کو بیٹا؟" اس کو ہاتھ سے پکڑ کر کمرے سے دور لے جاکر انہوں نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے آنٹی! ووئی ایسی ویسی ون ڈیزل (انگلش فلم کا ہیرو) بھی پانی بھرتا نظر آتا ہے میرے سامنے۔" وہ گردن اکڑا کے بڑی شان سے بولی۔

"اچھا یہ لو پکڑو چابی اور چلو....." وہ جلدی سے اس کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی پکڑاتے ہوئے باہر کی طرف تیز تیز قدموں سے لپکیں اور وہ بھونچکی رہ گئی۔

"بیٹے کو کوئی اور پسند ہے تو مجھے گھر سے نکال رہی ہیں۔ تو پھر مجھے لانے کی آخر کیا مجبوری تھی۔ یعنی حد ہوگئی کوئی فلم ہے یہ کیا۔" وہ غصے سے بڑبڑاتی باہر پورچ تک پہنچی۔

"ابھی تو کہانی شروع بھی نہیں ہوئی آنٹی اور آپ اس کو ختم کرنے پہ آگئیں۔ ابھی تو ان کے پرانے زخم بھریں گے اور....." وہ گاڑی کے پاس آکے جھنجلاتے ہوئے بولی۔

"میری بچی! ڈراما واپس آکر دیکھ لینا' وہ تو سو بار ریپیٹ ہوگا لیکن یہ موقع بڑی مشکل سے ہاتھ آیا ہے۔ بس جلدی سے مجھے لے کر چلو۔ سمجھ لو تمہاری فاسٹ (تیز) ڈرائیونگ کا امتحان ہے آج....." زبیدہ بیگم گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولیں اور وہ لہنگا سنبھالتی ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھی۔ چوکیدار نے حیرت کے عالم میں گیٹ کے پٹ وا کیے تھے۔ وہ دلہن بنی گاڑی چلاتی عجیب مضحکہ خیز سی لگ رہی تھی۔ گیٹ سے باہر گاڑی نکالتے اس نے سوالیہ نظروں سے اپنی ساس کی طرف دیکھا۔

"دائیں طرف....." وہ اپنی طرف کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے بولیں اور اردگرد متلاشی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"آج تو اسے رنگے ہاتھوں پکڑ کے ہی دم لوں گی۔" وہ پرعزم تھیں۔

"مطلب ہم کسی کو پکڑنے جارہے ہیں' وہ بھی رنگے ہاتھوں..... واؤ....." خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"کون ہے وہ آنٹی! یقیناً" کسی پارک میں ملنے کا پروگرام ہوگا۔ وہیں جاکر پکڑتے ہیں اس کو رنگے ہاتھوں....." وہ مزا لیتے ہوئے بولی۔

"مل گیا..... وہ رہا سامنے بے ایمان انسان....." زبیدہ بیگم نے شیشے سے تقریباً" آدھا باہر نکل کر آگے جاتے ایک سائیکل سوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"گاڑی آہستہ کرلو بیٹا..... بس آہستہ آہستہ چلاتے اس کا پیچھا کرتی جاؤ۔ کہیں وہ ہمیں دیکھ نہ لے۔"

"جس مقدار میں آپ کھڑکی سے باہر ہیں جس نے نہیں بھی دیکھا وہ بھی مڑ کر دیکھے گا۔ پہلے ہی میں جس حلیے میں ڈرائیو کر رہی ہوں اسے دیکھ کر سب کی آنکھیں ابل ابل کر باہر آرہی ہیں۔" وہ ایک طرف کو لڑھکتے اپنے ٹیکے کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی تو آنٹی جلدی سے اندر کی طرف مڑیں۔

"ان مردوں کی تو عادت ہوتی ہے' عورت چاہے جس بھی حلیے میں ہو' اس کو گھورنا وہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ تم اپنا اعتماد بحال رکھو بیٹا۔ گردن اٹھا کے گاڑی چلاؤ' پورے اعتماد سے....." اس سے بات کرتے

ہوئے بھی ان کی نظریں مسلسل سائیکل والے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"اتنے وزنی دوپٹے کے ساتھ گردن کہاں سے اٹھتی ہے آنٹی اور کانفیڈنس کی تو آپ ٹینشن ہی نہ لیں' وہ ہمیشہ بحال رہتا ہے۔ میں تو ویسے اس سائیکل والے پہ حیران ہوں۔ بھلا ایسے حلیے میں بھی کوئی کسی سے ملنے جاتا ہے۔ ویسے آنٹی آپ میری فاسٹ ڈرائیونگ کا امتحان لے رہی ہیں یا میرے صبر کا۔ یہ آہستہ ترین گاڑی چلوا کر میرا نام گنیز بک آف ریکارڈ میں ڈلوانا ہے۔" وہ مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔ گاڑی سائیکل والے کے تعاقب میں تقریباً" رینگ رہی تھی۔

"اوئے! وہ دیکھو' کسی کی دلہن گھر سے بھاگ رہی ہے' وہ بھی جوں کی رفتار سے۔۔۔" کسی نے کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں ٹھٹھہ لگایا۔

"تھوڑی اسپیڈ پکڑیں بی بی۔۔۔ اگر اتنا بڑا قدم اٹھا ہی لیا ہے تو ایکسلیٹر پر پاؤں دبا کے رکھیں۔" ایک اور ہمدرد نے آگے بڑھ کر مشورہ دیا۔ عارفین نے جھٹکے سے رینگتی ہوئی گاڑی کو روکا اور اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا۔

"ارے چھوڑو بیٹا! ایسے لفنگوں کی تو عادت ہوتی ہے۔" زبیدہ بیگم نے اسے بازو سے پکڑ کر روکنے کی کوشش کی لیکن وہ ان سنی کرتے ہوئے سر باہر نکال کر شروع ہو گئی۔

"اچھا آپ کو بڑی ہمدردی ہو رہی ہے؟ میری فکر میں دبلا ہونے کے بجائے جا کے اپنے گھر کی خواتین کی خبر لیں اور گنتی کر لینا کہیں کوئی کم تو نہیں اور ہاں ان کو ایکسیلیٹر پہ پاؤں دبانا اور اٹھانا ضرور سکھا دیجیے گا' تاکہ کل کو انہیں ایسی صورت حال میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔" سامنے والے کا چہرہ اس کی بات سمجھ آنے پہ سرخ ہوا تھا لیکن تب تک گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی تھی۔

"شکر ہے میں تو سمجھی آج پھر گیا میرے ہاتھ سے۔۔۔" نظروں سے اوجھل ہوتے سائیکل سوار کو دوبارہ دیکھ کر زبیدہ بیگم نے سکون کا سانس لیا۔

"آخر یہ ہے کون آنٹی؟ عجیب سی جگہ پہ آگئے ہیں ہم۔ بڑا ہی کوئی ان رومانٹک بندہ ہے۔" وہ اکتا کے بولی۔

"ہمارے علاقے کا سبزی والا ہے بیٹا۔" آنٹی نے بالآخر بلی تھیلے سے باہر نکالی۔

"ہیں۔۔۔ سبزی والا۔۔۔ مطلب سبزی والا۔۔۔ یعنی ہم اتنی دیر سے سبزی والے کا پیچھا کر رہے تھے۔" اس پہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سبزی والا اپنی سائیکل کھڑی کر کے کندھے پہ رکھے کپڑے سے اپنا پسینہ صاف کرنے لگا۔

"بس گاڑی یہیں روک دو۔ اور یہ موبائل پکڑو۔۔۔" وہ موبائل اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولیں اور اپنی طرف کا دروازہ کھولا۔

"اس موبائل کا کیا کرنا ہے آنٹی؟" وہ موبائل کو گھورتے ہوئے بولی جس میں سگنل ندارد تھے۔

"اب نوجوان نسل کو بتانا پڑے گا کہ اس موبائل سے ایسے موقعوں پر کیا کرتے ہیں۔ ویڈیو بنانی ہے اس کے گھناؤنے فعل کی اور کیا کرنا ہے بھلا۔"

"ہائے آنٹی ایسا نہ کریں' مجھے شرم آتی ہے۔ پتا نہیں آگے کیا سین دیکھنے کو ملے۔"

"لو ہم کیوں شرم کریں' جس کو کرنی چاہیے وہ کیوں نہ کرے۔" آنٹی چمک کے بولیں اور گاڑی سے باہر نکل آئیں۔ دوسری طرف سے دلہن صاحبہ بھی لہنگا سنبھالتی چھن چھن کرتی باہر نکلیں اور گاڑی کا دروازہ لاک کیا۔

سبزی والا سائیکل کھڑی کرنے کے بعد ٹیڑھے میڑھے رستوں پر چلنے لگا اور وہ دونوں خاموشی سے اس کا پیچھا کرنے لگیں۔ اچانک ہی تیز بدبو کے بھبکے اٹھے اور بے اختیار ہی ان کے ہاتھ ناک کی طرف اٹھے۔

"ہائے سنا تھا شادی کے بعد زندگی بدل جاتی ہے اور

بہت کچھ سہنا پڑتا ہے لیکن کبھی نہ سوچا تھا وہ بدلاؤ ایسا ہوگا اور یہ سب سہنا پڑے گا۔" اس نے ادھر ادھر ڈولتے قدموں کے ساتھ دہائی دی۔ سامنے نظر آنے والے نالے کو دیکھ کر اسے اس بدبو کی وجہ سمجھ میں آئی تھی۔

"عارفین بیٹا! شروع کردو ویڈیو بنانا۔" انہوں نے پیچھے مڑ کر بے حال ہوتی بہو کو ہدایات دیں۔ شکر تھا کہ جگہ سنسان تھی اور کوئی بندہ بشر موجود نہ تھا سوائے ان دو خواتین اور سبزی والے کے.... ورنہ دلہن کو دیکھ کر ایک بار پھر تماشا لگ جاتا۔

"لڑکی تو شاید ابھی تک آئی ہی نہیں۔" وہ ویڈیو بناتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

سبزی والا اب نالے کے ساتھ لگے ہرے بھرے کھیت میں کھڑا تھا۔ آنٹی نے پیچھے مڑ کر اسے جلدی آنے کا اشارہ کیا اور خود اس کے سر پہ جا کر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے دونوں ہاتھ کمر پر تھے اور چہرہ غضب ناک ہو رہا تھا۔

"تو یہ ہے تمہارا صاف ستھرا کنواں جس کے پانی سے تم یہ سبزیاں اگاتے ہو۔" پالک کے پتوں پہ جھکا سبزی والا ہڑبڑا کر اٹھا۔

"خالہ جی! آپ یہاں؟" اس کا سانس خشک ہو گیا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

عارفین کی سمجھ میں ساری کہانی آ گئی تھی۔ اس نے سبزی والے کے پھڑپھڑاتے ہونٹوں اور پھر لرزتے ہاتھوں کو کسی ماہر ویڈیو میکر کی طرح قریب سے فلمبند کیا اور پھر کیمرے کا رخ سبزیوں کی طرف کیا۔

"یہ دیکھیں ناظرین! بظاہر ہری بھری نظر آنے والی یہ سبزیاں نالے کے گندے پانی سے پروان چڑھ رہی ہیں۔" اس نے نالے کی طرف کیمرہ لے جاتے ہوئے کمنٹری کی۔

"اور یہ ہے وہ درندہ صفت بھیڑیا جو ان سبزیوں کو آپ کے لیے.... جی ہاں آپ کے لیے تیار کر رہا ہے۔" کیمرے کا رخ اب سبزی والے کے چہرے کی طرف کیا گیا۔

"ارے میں تو تمہاری پالک کی گندی کالی جڑوں کو دیکھ کے ہی سمجھ گئی تھی کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔" زبیدہ بیگم بولیں۔

"خالہ جی میں غریب بندہ ہوں، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔" سبزی والا چہرے پر انتہا کی مظلومیت طاری کرتے ہوئے گڑگڑایا۔

"ہاں تو غریب ہو تو مطلب سرٹیفکیٹ مل گیا، تمہیں لوگوں کو زہر کھلانے کا؟" وہ اس کی بات سن کر تڑخ کر بولیں۔

"خالہ جی معاف کردیں مجھے.... قسم اٹھاتا ہوں ان سب سبزیوں کو اکھاڑ کے پھینک دوں گا اور آئندہ صاف پانی استعمال کروں گا۔"

"قسمیں تو تم اپنی سبزیوں کے بارے میں بھی بے تحاشا کھاتے ہو۔ اب تو جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں یقین نہ کروں گی۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے قطعی انداز میں بولیں۔

✡ ✡ ✡

"کہاں چلی گئیں وہ.... زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔" گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ان کی گمشدگی پر....

"بابا آنکھ لگنے سے پہلے اس کو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔"

"تو کیا شیشہ نگل گیا نئی نویلی دلہن کو؟ وہ گھر سے باہر نکل گئی اور تمہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ تم کیا خاک ذمہ داری اٹھاؤ گے اپنی بیوی کی....." سکندر صاحب غصے سے دھاڑے۔

"بیگم تو آپ کی بھی غائب ہیں....." وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"حد ہو گئی چوکیدار بھی غائب ہے.... آخر اس گھر میں ہو کیا رہا ہے۔" انہوں نے موبائل سے ان کے نمبر پہ دوبارہ کوشش کی جو کہ مسلسل بند جا رہا تھا۔ وہ دونوں باپ، بیٹا لان میں پریشان کھڑے تھے کہ گیٹ

کھول کر چوکیدار اندر داخل ہوا۔

"صاحب جی میری تو آنکھیں ہی پھٹ گئیں جب میں نے ان دونوں کو گاڑی میں جاتے دیکھا۔ دلہن بی بی فراٹے سے گاڑی دوڑاتی باہر نکل گئیں، بڑی بی بی کے ساتھ..." چوکیدار آنکھوں دیکھی روداد سنانے لگا۔

"تو آپ کم از کم پوچھ تو لیتے کہ جا کہاں رہی ہیں آخر..." شاہ میر جھنجلا کے بولا ہی تھا کہ گاڑی کا ہارن بجا اور چوکیدار نے بھاگ کر گیٹ کھولا۔

☼ ☼ ☼

"ایسے بے ضمیر لوگ ہیں توبہ اور! اوپر سے پکڑے جانے پر فوراً "مظلوم" بن جاتے ہیں۔" زبیدہ بیگم اب لاؤنج میں بیٹھی اپنا کارنامہ سنا رہی تھیں۔

"آپ مجھے نہیں کہہ سکتی تھیں مما۔ آپ اس کو ساتھ لے گئیں۔ وہ بھی اس حلیے میں..." وہ سوچ کے ہی شرمندہ ہو رہا تھا کہ باہر لوگوں نے اسے کس نظر سے دیکھا ہوگا۔

"پہلے کیا کم میری عزت کے جنازے نکالے جا چکے ہیں جو اب آپ نے اسے بھی ساتھ ملا لیا۔ میری عزت کو چار چاند لگانے کے لیے۔"

"واہ بیٹا واہ! عزت کی خوب کہی تم نے... انسانیت کا بھلا کرنے میں بھی تمہاری عزت کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اگر میں نہ ہوتی نا تو تم لوگ اب تک پتا نہیں کتنے گدھے گھوڑے کھا چکے ہوتے اور کتنے نالوں کا گندا پانی پی چکے ہوتے۔" زبیدہ بیگم نے اسے جھاڑا۔

"عارفین بیٹے! جاؤ تم کپڑے تبدیل کرکے آرام کرو، تھک گئی ہوگی۔" وہ دلہن کی طرف دیکھ کر پچکارتے ہوئے بولیں جسے شاہ میر کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو عارفین! میری امی کی باتوں میں آئندہ کبھی نہ آنا، نہ ان کے کہنے پر چلنا۔ بس تم ان سے ذرا فاصلے پہ ہی رہو۔" وہ بیڈ پر لیٹی اپنے موبائل میں گم تھی جب شاہ میر نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے دھیمے اور سنجیدہ لہجے میں اسے سمجھایا۔ وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنسی تھی۔

"آپ دنیا کے پہلے شوہر ہوں گے جو مجھے اپنی والدہ سے دور رہنے کی بلکہ صاف لفظوں میں ان سے بچنے کی تنبیہہ کر رہے ہیں۔" وہ اس کی بات کا مزا لیتے ہوئے بولی۔

"آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اس سوئی ہوئی قوم کا کوئی ایک فرد تو جاگ رہا ہے۔" اس نے صوفے کی طرف کروٹ لی جہاں وہ نیم دراز تھا۔

"خیر آپ کو تو اصل غصہ اس بات کا ہے کہ انہوں نے آپ کی زبردستی شادی کروادی... ظالم سماج تو وہ ہیں، دو دل جدا کردیے۔" وہ ہمدردی سے بولی تو شاہ میر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"کہیں سے تم ایک دن کی دلہن لگتی ہو؟ جب سے آئی ہو پٹر پٹر زبان چل رہی ہے۔ میں نے تو سنا تھا نویلی دلہنیں شرمائی لجائی پھرتی ہیں، لیکن تم... اوپر سے دوسرے ہی دن میری ناک بھی کٹوا کے آگئیں۔" وہ چڑتے ہوئے اس پر چڑھ دوڑا۔

"اچھا...؟ کس بات پر شرماؤں لجاؤں ہمیں ہاں؟؟" وہ اٹھ کے بیٹھی۔ "کون سی محبت کے ٹوکرے برسائے ہیں آپ نے مجھ پر جو میں شرم سے دہری ہوتی پھروں؟؟"

"بڑی بے شرم ہو یار... تم نے اپنے ناولز میں یہ نہیں پڑھا کہ دلہن منہ پھاڑ کر ایسی باتیں نہیں کرتی۔" اس نے چڑایا۔

"آپ کو کیسے پتا؟ یعنی آپ بھی پڑھتے ہیں ناولز۔" اس کے کان کھڑے ہوئے۔

"پاگل ہو گیا، میں کیوں پڑھنے لگا ایسی زنانہ چیزیں۔" وہ بلبلا کے بولا۔

"تو پھر کیسے پتا؟" اس نے اپنے گھٹنوں پہ ہاتھ مارتے ہوئے جرح کی۔

"مشاہدہ بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ خیر لائٹ بند کردیں پلیز... مجھے سونا ہے۔" اس نے صاف صاف ٹالا۔

"میں نہیں مانتی۔" وہ اٹھ کر لائٹ بند کرتے ہوئے پریقین لہجے میں بولی۔

"نہ مانو..." اس نے بازو آنکھوں پر رکھتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

عارفین نے کمر پر ہاتھ رکھے اسے کچھ دیر کڑی نظروں سے گھورا، پھر گہرے سانس لیتے ہوئے بیڈ پر آ لیٹی۔

☆ ☆ ☆

"تو کیسا لگ رہا ہے اپنے نئے گھر میں اور کیسا لگا میرا بھائی؟ پتا نہیں مما نے کون سی دشمنی نکالی میرے ایگزیمز کے دنوں میں شادی رکھ کے۔ مہمانوں کی طرح سب فنکشنز میں شرکت کی، وہ بھی کتاب ہاتھ میں پکڑ کر۔" نیہا شادی کے تیسرے روز امتحان دے کے فارغ ہوئی تھی اور پہلی بار اس کے ساتھ اطمینان سے بیٹھی۔

"ابھی تو نیا گھر نہ اچھا لگ رہا ہے، نہ برا، بس دماغ سن سا ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"اور بھائی کیسا ہے میرا۔"

"تمہیں نہیں پتا کیسا ہے؟" وہ حیران ہوئی۔

"اوہو... میرا مطلب ہے آپ کے ساتھ کیسا ہے؟" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"میرے ساتھ..." عارفین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور گلا بند ہونے لگا۔ اس نے آنکھیں زور سے بھینچ کے آنسوؤں کا ریلا باہر نکالا اور اس کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ نیہا کا منہ حیرت سے کھلا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، پھر اس کو کھینچتے ہوئے اپنے کمرے میں لے گئی۔

"اب بتاؤ کیا کیا بھائی نے۔" جب وہ رو دھو کے فارغ ہو گئی تو اس نے ہاتھ تھام کے ہمدردی سے پوچھا۔

"تم لوگوں نے زبردستی شادی کردی اس بے چاری کی میرے ساتھ۔ وہ کسی اور سے محبت کرتے تھے اور تم لوگوں نے الگ کردیا ان دونوں کو۔ ذرا دل نہیں کانپا تمہاری مما کا؟ اور وہ لڑکی بے چاری اس کے لیے تو یہ تین دن کسی قیامت سے کم نہ ہوں گے۔" اس کے تھمے ہوئے آنسو ایک بار پھر ابل کے باہر نکلے۔

"ایک منٹ، ایک منٹ، ذرا اسٹاپ لگاؤ ادھر ہی... کون سی محبت، کون سی لڑکی یار... اور یہ تم اتنی دیر سے ان کے غم میں رو رہی تھیں؟" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کے اس کی فرفر چلتی زبان کو روکتے ہوئے بولی۔ وہ بنا جواب دیے ٹشو سے اپنی ناک رگڑنے لگی۔

"اچھا مجھے شروع سے بتاؤ۔ کیا بھائی نے تم سے خود کہا کہ یہ شادی زبردستی ہوئی ہے اور وہ کسی اور سے...؟"

"ہاں تو اور کیا۔ خود سے کہانیاں گھڑنے والی محلے کی باجی لگتی ہوں میں تمہیں؟" وہ برا مانتے ہوئے بولی۔ "وہ غم سے نڈھال دیوداس بنے کمرے میں آئے اور مجھے یہ سب بتایا۔"

"تمہیں یقین ہے وہ بھائی ہی تھے؟" وہ الجھ کر بولی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو... حد ہو گئی اور کون آسکتا ہے میرے کمرے میں..." عارفین جھنجلائی، نیہا ماتھے پر بل ڈالے، منہ سکیڑے اسے مشکوک نظروں سے گھورنے لگی۔

"اب میرا اس طرح معائنہ کر کے تم کیا نکالنا چاہ رہی ہو؟" ڈبے سے ٹشو نکال کر رگڑتے ہوئے وہ چڑ کے بولی۔

"سنو تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ خود جا کے اپنے بھائی سے پوچھ لو۔ میری بات پر تو یقین ہے نہیں تمہیں۔" اس نے مشورہ دیا۔

"میں اپنے بڑے بھائی سے اس طرح کی بات پوچھوں؟ اور آپ کے خیال میں وہ فوراً ہی مجھے بیسٹ فرینڈ بنا کر اپنی ساری داستان سنا دیں گے... بھائی ہے وہ میرا بھائی..." بھائی پر زور دیتی وہ اس کو یاد دلانے والے انداز میں بولی۔

"ہاں تو بھائی ہی ہے، تمہیں اس کے دکھ کا احساس ہونا چاہیے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ مجھے اس بات پر یقین ہی نہیں .. دوسرا اگر یہ سچ بھی ہے تو ہمدردی مجھے ان سے نہیں تم سے ہونی چاہیے، بے وقوف لڑکی.... تمہاری زندگی برباد ہوگئی نا۔"

"تم اپنے سگے بھائی کی نہیں ہو تو میری کیا خاک ہوگی۔ بہن ہو کے تمہیں اس کے دل کی پروا نہیں اور چلیں بس مجھ سے ہمدردی کرنے....“ وہ بدلحاظی سے بولی۔

"حد ہوگئی، نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔ تمہاری دماغی حالت شروع سے ہی ایسی تھی یا بعد میں یہ عارضہ ہوا ہے؟"

"بھابھی ہوتی ہوں میں تمہاری، اپنی حد میں رہو۔" اس نے رعب جمایا۔

"شکر ہے خدا کا آپ کو یاد ہے کہ آپ میرے بھائی کی بیوی ہیں۔" وہ دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھا کر بولی۔

☆ ☆ ☆

"عارفین میں نے تمہارے مسئلے پہ بہت سوچا۔ بہت غور کیا۔ امی سے بھی باتوں باتوں میں اگلوانے کی کوشش کی.... لیکن کوئی سرا ہاتھ نہیں آ کے دے رہا۔" عارفین لاؤنج میں بیٹھی ناخنوں کو رنگ رہی تھی جب نیہا اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تم میرے "تم" کہنے پر مائنڈ تو نہیں کرتیں؟ عمر ہماری تقریباً ایک ہی جتنی ہے اور دیکھنے میں تو تم مجھ سے بھی چھوٹی لگتی ہو تو یہ آپ جناب مجھ سے نہیں ہوتا۔" وہ صوفے پر پاؤں اوپر کرتے ہوئے اطمینان سے بولی۔

"بڑی جلدی خیال آگیا پوچھنے کا بلکہ بتانے کا۔ خیر شوق تو بہت تھا مجھے کہ کوئی میری بھی عزت کرے لیکن چلو جیسے تمہاری مرضی....“ اس نے نیل پالش کی شیشی میز پر رکھی۔

"خیر تم سرے کی بات کر رہی تھی کہ ہاتھ نہیں آرہا۔" عارفین نے یاد دلایا۔

"ہاں سرا.... تو کچھ آئیڈیاز ہیں میرے پاس.... ہم باری باری آزما کے دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن ایک بات اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھالو۔ وہ جو کوئی بھی ہے ہم نے اسے بھائی سے ملانا نہیں، بلکہ اس کی زندگی سے نکالنا ہے۔"

"مطلب تمہیں میری بات پر یقین آگیا۔" وہ خوش ہوئی۔

"ہاں.... لیکن میں اکیلی کچھ نہیں کرسکتی، تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا، پھر ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکلے گا۔" نیہا سنجیدگی سے بولی۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔"

"اوکے.... اب سب سے پہلے تم نے کرنا یہ ہے کہ جب بھائی سو جائیں تو ان کے پاس جانا اور....“ وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔

"لاحول ولا.... دیکھو اگر میں نے تمہیں فری ہونے کی اجازت دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم یہ بھول جاؤ کہ تم ابھی کنواری ہو اور ایسی بے ہودہ باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔" وہ غصے اور شرم سے سرخ ہوئی۔

"بات تو پوری سن لیا کرو.... پہلے ہی پوری فلم تیار کر لیتی ہو۔" نیہا نے بدمزا ہوتے ہوئے اسے ڈپٹا۔

"تم ان کے پاس جانا اور خاموشی سے ان کا موبائل اٹھا کر میرے کمرے میں آجانا، ٹھیک ہے؟" عارفین نے اس کی بات سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

☆ ☆ ☆

وہ بیڈ پر بیٹھی زبردستی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی۔

"اگر نیند آرہی ہے تو سو کیوں نہیں جاتیں؟" کتاب پڑھتے ہوئے شاہ میر کی نظر اس کے جمائیاں لیتے چہرے پر پڑی۔ تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بول پڑا۔

"میری اماں کہتی ہیں کہ شوہر سے پہلے سو جانے

والی بیویوں پر فرشتے ساری رات لعنت بھیجتے ہیں۔"
اس نے بات بنانے کے چکر میں عجیب بات کہی۔
"ہیں... لیکن یہ تو... آہم خیر تم سو جاؤ۔ میں فرشتوں سے کہہ دوں گا کہ میری اجازت سے سوئی ہیں محترمہ..." وہ بول کے دوبارہ کتاب میں غرق ہو گیا۔ عارفین منہ دھو کر دوبارہ بستر پر آ بیٹھی اور ٹی وی لگا لیا۔ ایک گھنٹے کے تکلیف دہ انتظار کے بعد بھی اسے شاہ میر کے سونے کی کوئی امید نہ نظر آئی تو وہ بول پڑی۔
"آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ جائیں گے۔ کیوں اپنی فیس ویلیو خراب کر رہے ہیں' رات گئے جاگ کر..."
وہ ہمدردی سے بولی۔
"میرا ایگزام ہے صبح..." اس نے جواب دیا۔
"پھر بھی اتنی رات تک جاگنا تو اچھی بات نہیں۔ کیا آپ کی مما نے آپ کو رات جلدی سونے اور صبح جلدی اٹھنے کے فوائد نہیں بتائے کبھی؟"
"نہیں..." شاہ میر نے کتاب سے سر اٹھا کر اسے گھورا۔ پھر یک لفظی جواب دے کر دوبارہ کتاب میں گم ہو گیا۔ وہ جی بھر کر بدمزا ہوئی' لیکن ہمت نہ ہاری...
"ویسے تو ماں ہونے کے ناتے ان کا فرض بنتا تھا کہ زمانے کی اونچ نیچ' اچھا برا آپ کو بتاتیں' لیکن اگر وہ اپنے فرض سے غافل رہی ہیں تو میں آپ کو بتا دیتی ہوں کہ جلدی سونے سے زندگی میں کتنی برکت ہوتی ہے اور چہرہ کیسے کھلتے گلاب جیسا ہو جاتا ہے جیسے کہ میرا..." اس نے اٹھلا کے اپنے گال پر ہاتھ رکھا اور بات آگے بڑھائی۔
"اور رات کو دیر سے سونے والے کے چہرے پہ تو پھٹکار برستی رہتی ہے جیسے کہ..." اس نے بات ادھوری چھوڑی کہ عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔
"اس کے علاوہ صحت کے مسائل' ڈپریشن اور..." وہ انگلیوں پہ گنوا رہی تھی کہ شاہ میر نے زور سے کتاب بند کر کے اسے چپ کرایا۔
"بس... میں ڈر گیا... یہ رہی کتاب..." اس نے غصے سے کتاب میز پر پھینکی۔
"اب پلیز لائٹ آف کر کے خود بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سو کے اپنے چہرے پر نور لانے دو۔" وہ غصے پہ قابو پاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بول کر سر' منہ لپیٹ گیا۔
"غصہ تو دیکھو جیسے سلطان سلیمان ہو... ہونہہ..."

✲ ✲ ✲

موبائل والا ہاتھ دوپٹے میں چھپاتی وہ جلدی سے نیہا کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے بے سدھ سوتا دیکھ کر وہ غصے سے تلملائی۔
"اچھا تو مجھے کام پر لگا کے خود یہاں خراٹے لیے جا رہے ہیں۔" وہ تکیہ اس کے منہ پر مار کے بولی۔ نیہا ہڑبڑا کر اٹھی اور عارفین لائٹ جلانے مڑ گئی۔
"تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہ بال سمیٹتے ہوئے حیران ہو کر بولی تو جواباً" اس نے ہاتھ میں تھاما ہوا موبائل اس کے سامنے لہرایا۔
"ارے واہ... تم نے تو کمال کر دیا۔ لاؤ مجھے دو..." اس نے جلدی سے موبائل عارفین کے ہاتھ سے لیا اور کانٹیکٹ لسٹ کھنگالنے لگی۔
"اس میں تو کافی خواتین کے نمبرز ہیں۔ اب کیسے پتا چلے گا کہ وہ کون ہے۔" اس نے لسٹ آخر تک چھان لی۔
"میسجز چیک کرو نا۔" عارفین کہتے ہوئے اس کے پاس بیڈ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔
"سب مردوں کے ہی میسجز نظر آ رہے ہیں۔" وہ پیغامات کو باری باری دیکھتے ہوئے مایوس سی ہوئی تھی کہ اچانک ہی ایک پیغام پر اس کی نظر پڑی۔
"یہ پڑھو..." نیہا نے موبائل اسکرین اس کے قریب کی۔
"بہت پریشان ہوں' لیکن کیا کر سکتی ہوں... ہمارے نصیب میں شاید یہی لکھا تھا۔ لیکن میں ہار

نہیں مانوں گی۔ اپنا حق نہیں چھوڑوں گی۔ میں آخری سانس تک کوشش جاری رکھوں گی۔" پیغام پڑھ کر **نیہا** کو یقین آگیا کہ عارفین نے سب سچ کہا تھا۔ بھیجنے والی کا نام مس امتیاز تھا۔ **نیہا** نے جلدی سے اس کا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کیا۔

✡ ✡ ✡

نیہا کان سے موبائل لگائے لان میں ٹہل رہی تھی۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی' لیکن کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

"اوہو... فون کیوں نہیں اٹھا رہی یہ امتیاز بی بی..." اس نے جھنجلا کے موبائل کان سے ہٹایا تھا کہ ساتھ ہی فون کی بیل بج اٹھی۔

"ہیلو... آپ کے نمبر سے ابھی کال آئی تھی۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"پتا ہے مجھے... میں نے ہی کی تھی' مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔" وہ ڈپٹتے ہوئے بولی۔

"جی؟ کون ہیں آپ میں نے پہچانا نہیں۔"

"لیکن میں آپ جیسی عورتوں کو خوب پہچانتی ہوں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا اور ہیں کون آپ؟"

"وہی ہوں جس کی بھابھی بننے کے لیے آپ تڑپ رہی ہیں۔ کان کھول کے سن لو آج کے بعد میرے بھائی سے رابطہ کیا تو وہ حشر کروں گی کہ ایدھی سینٹر کے علاوہ کوئی رکھنے پہ تیار نہیں ہوگا۔" وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر لڑاکا عورتوں کی طرح بولی۔

"مجھے تو چلو وہ رکھ لیں گے' لیکن جتنی بدتمیز اور بدزبان لڑکی تم ہو' تمہیں تو تمہارے سگے بھی نہ رکھیں۔ جتنی لمبی زبان ہے تمہاری' جہاں بھی جاؤ گی جوتے ہی کھاؤ گی۔ حد ہوگئی آج کل کے بچوں کو لحاظ ہی نہیں کسی بڑے سے بات کرنے کا۔ بی بی بھرا پرا خاندان ہے میرا۔ آٹھ جوان بچوں کی ماں ہوں میں۔ تمہارے بھائی کو گود لینے کا کوئی شوق نہیں مجھے۔ تمہارا تو میں کچا چٹھا نکلواتی ہوں' ذرا صبر کرو۔ آٹھ بیٹے ہیں میرے آٹھ... اتنی پٹائی کرواؤں گی کہ یاد رکھو گی... بدتمیز' بے ہودہ۔" **نیہا** نے جلدی سے کال کاٹی۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ پاس پڑا جوس کا گلاس اس نے غٹاغٹ چڑھایا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ دونوں دروازے کے ساتھ کان لگائے کھڑی تھیں۔ اندر شاہ میر کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

"نہیں یار یہ کیسی بات کردی تم نے۔ تم سے بڑھ کے مجھے کوئی ہو سکتا ہے بھلا۔ جب تم کہو میں حاضر ہو جاؤں گا۔" عارفین نے فوراً **نیہا** کی طرف دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو دیکھا نا میں نا کہتی تھی۔

"میری جان کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم ٹینشن نہ لو۔" عارفین کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ اس کے طرز تخاطب پر اور ساتھ ہی اسے نیہا کی دل خراش چیخ سنائی دی۔

"چوہا' بھائی جلدی سے آئیں باہر..." وہ چیختے ہوئے زور سے بولی اور شاہ میر موبائل صوفے پر رکھ کر جلدی سے باہر نکلا۔

"کہاں ہے؟"

"وہ پردے کے پیچھے..." اس نے اشارہ کر کے بتایا اور فوراً" سے اس کمرے میں گھسی جہاں سے شاہ میر ابھی نکلا تھا۔ اس نے صوفے پہ دھرا موبائل اٹھایا اور آخری کال کرنے والا کا نمبر نوٹ کیا۔

"کیا ہوا بیٹا' کون چیخا ہے؟" زبیدہ بیگم بھی گھبرائی ہوئی باہر آئیں۔

"آنٹی چوہا..." عارفین دونوں پاؤں صوفے کے اوپر چڑھائے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"ہائے چوہا' یہ بدبخت کہاں سے آگیا میرا گھر ناپاک کرنے۔ اف! اب سارا گھر دھونا پڑے گا۔ شاہ میر گھر کا کونا کونا چھان مارو۔ بچنے نہ پائے وہ..." وہ اس کے ہاتھ میں جھاڑو پکڑاتے ہوئے بولیں۔ اتنی دیر میں نیہا اپنا

کام پورا کر کے باہر نکلی اور سب کی ہڑبونگ دیکھ کر اس کا ہنسی روکنا محال ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

نیہا چہرے پر ماسک لگائے ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔

"واہ جی' بڑی تیاریاں ہو رہی ہیں ہونے والی سسرال کو امپریس کرنے کی۔" عارفین نے اسے چھیڑا۔

"لیکن تمہیں ذرہ برابر فکر نہیں اپنی روکھی پھیکی زندگی کی۔ آخر تم بھائی سے بات کیوں نہیں کرتیں یا پھر میں مما کو صاف صاف سب بتاؤں؟" وہ اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

"مثلاً" کیا بات کروں تمہارے بھائی سے....؟" اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اپنی عزت نفس بہت پیاری ہے مجھے۔ خواہ مخواہ چھڑ ہونے کا شوق نہیں مجھے کسی سے۔ ویسے بھی میں نے اس طرح کی بہت کہانیاں سن رکھی ہیں۔ اینڈ میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے اور خبردار جو تم نے آنٹی کو بتا کر میری ویلیو ڈاؤن کرنے کی کوشش کی تو...." وہ آخر میں انگلی اٹھا کے اسے دھمکی دیتے ہوئے بولی۔

"ویسے تمہارے بھائی سے ہمدردی اپنی جگہ' لیکن اس طرح کے بزدل مردوں میں مجھے کوئی کشش نظر نہیں آتی۔"

"واہ لیڈی.... تم نے تو عورتوں کا سر اونچا کر دیا۔" نیہا اس کی بات پر عش عش کر اٹھی۔

"خیر یہ جو خاتون آ رہی ہیں نا' یہ بھی شاہ میر کی ہی جاننے والی ہیں۔ ٹھیک سے پتا کروا لینا' کہیں وہ بھی کوئی مجنوں نہ نکلے۔"

"میری بلا سے.... یہ مما کو پتا نہیں کیا شوق ہے' چھوٹے چھوٹے بچوں کی شادیاں کرنے کا۔" وہ سخت اکتائی ہوئی تھی۔ عارفین نے خود کو بچہ کہنے پر اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"اور یہ فیشل تو میں برتھ ڈے پارٹی پر جانے کے لیے کر رہی ہوں۔" اس نے آگے ہو کر رازداری سے بتایا۔

"نیہا ادھر کچن میں بھی جھانک لو۔ کبھی مجھے بھی فخر سے کہنے کا موقع دو کہ کھانا میری بیٹی نے بنایا ہے۔" زبیدہ بیگم کی آواز پر وہ دونوں بے اختیار ہنسی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"آنٹی یہ کباب لیں نا۔ آپ تو کچھ لے ہی نہیں رہیں۔" عارفین مہمان کی خوب خاطرداری کر رہی تھی۔

"بیٹا میں چائے لوں گی بس.... آپ اتنا تکلف مت کریں۔" مہمان خاتون شائستہ لہجے میں بولیں۔

"شاہ میر تو بالکل میرے بچوں کی طرح ہے.... میرے برے وقت میں اس نے میرے بیٹوں کے ساتھ برابر کھڑے ہو کر میرا ساتھ دیا۔ میرا حوصلہ بڑھایا۔ وہ نہ ہوتا تو ہماری ساری جائیداد وہ لالچی لوگ ہڑپ کر چکے ہوتے۔" خاتون شاہ میر کی تعریفوں میں رطب اللسان اپنی کہانی سنا رہی تھیں کہ نیہا اندر داخل ہوئی۔ اسے ان کی آواز کچھ جانی پہچانی لگی تھی۔

"السلام علیکم...." وہ اعتماد سے سلام کرتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"وعلیکم السلام.... ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے آپ کی...." وہ اس کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"بس امتیاز بہن یہ ظاہری حسن تو خدا کی دین ہے اس میں ہمارا کیا کمال.... بس اللہ ان کو اندر سے خوب صورت بنائے۔" زبیدہ بیگم اپنی ازلی صاف گوئی سے بولیں تو نیہا نے پہلو بدلا اور ساتھ ہی اس کے کان کھڑے ہوئے۔

"امتیاز....!" اس نے جھٹکے سے گردن موڑ کر عارفین کی طرف دیکھا۔ عارفین کا رنگ بھی فق ہوا اور وہ اٹھ کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"آہم... آنٹی ماشاءاللہ کتنے بچے ہیں آپ کے؟" عارفین نے چہرے پہ زبردستی مسکراہٹ سجاتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ کے کرم سے آٹھ بچے ہیں میرے... خلدون کے علاوہ باقی سب ابھی پڑھ رہے ہیں۔" انہوں نے عاجزی سے بتایا اور نیہا کو اپنے چاروں طرف بم پھٹتے دکھائی دیے۔

☆ ☆ ☆

"یہ ایسا فلمی اتفاق میرے ساتھ ہی ہونا تھا۔ اف انہوں نے تو صاف دھمکی دی تھی مجھے اپنے بیٹوں سے پٹوانے کی۔" اس نے خوف سے جھرجھری لی اور عارفین قل قل کرتی ہنسی، جس پر نیہا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ان کو کیسے پتا چلے گا کہ تم وہی لڑکی ہو۔ وہ ایک رونگ نمبر تھا اور بس... وہ کون سا ابھی تک تمہیں تلاش کر رہی ہوں گی۔" عارفین نے تسلی دی۔

"برے وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا لیڈی... انہوں نے کہا تھا تمہارا کچا چٹھا نکلواؤں گی... نمبر بھی میرے نام پر ہے۔"

"چھوڑو یار وہ بھول بھی چکی ہوں گی۔ اتنی فارغ نہیں ہیں وہ کہ ایک رانگ نمبر پر کسی کا شجرہ نسب کھنگالنے نکل پڑیں۔ تم اٹھو جا کر پارٹی پر جانے کی تیاری کرو۔"

"ہاں ویسے بھی میں نے کون سا یہاں شادی کرنی ہے۔" وہ نتیجے تک پہنچتی اطمینان سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆ ☆ ☆

"شاہ میر! یہ آفس سے چھٹیاں تم نے لاؤنج کا صوفہ توڑنے کے لیے لی تھیں؟" سکندر صاحب گھر داخل ہوئے تو اسے صوفے پر لیٹا ہوا پایا۔ وہ فوراً اٹھ کر تمیز سے بیٹھا تھا۔

"شادی بھی ہوگئی اور ایگزامز بھی ختم ہوگئے تو کچھ دن آرام کرنے کا حق تو بنتا ہے بابا۔" وہ ریموٹ سے ٹی وی بند کرتے ہوئے بولا۔

"بہت ہی کوئی خشک مزاج آدمی ہو یار... میری جب نئی نئی شادی ہوئی تھی تو میں اڑا اڑا پھرتا تھا تمہاری ماں کو لے کر..." اندر آتی زبیدہ بیگم کو دیکھ کر وہ ماضی میں گم ہوئے۔

"بابا! آپ نے وہ پر سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں تو بھائی کو دے دیں نا۔" نیہا ملک شیک کا گلاس پکڑے ان کے پاس دھم سے بیٹھی۔

"ہاہاہا... بیٹا اس عمر میں پر خود بخود ہی نکل آتے ہیں۔ باپ، دادا سے لینے نہیں پڑتے۔" شاہ میران کی بات پر جزبز ہوا۔

"برخوردار... بیوی کو پکڑو اور گھومو پھرو، عیش کرو۔ ویسے بھی تمہیں شکایت رہتی ہے کہ تم پر ذمہ داریوں کے پہاڑ لاد رکھے ہیں۔ جاؤ عیش کرو اور بیوی کو بھی کراؤ..." وہ کھلے دل سے بولے۔

"ہونہہ... بیوی بھی تو ایک ذمہ داری ہی ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور سر جھٹکا۔

"اونچا بولا کرو... منہ ہی منہ میں بڑبڑانے سے دل کا غبار بڑھ جاتا ہے۔" زبیدہ بیگم نے اس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں اور منہ کے بگڑتے زاویوں کو دیکھ کر تنبیہہ کی۔

"جی بہتر..." وہ کہتا ہوا اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

"اٹھیے... تیار ہو جائیں... آپ کو گھمانے لے کر جانا ہے۔" وہ ٹھا مارتے انداز میں بولتا الماری سے شرٹ نکالنے لگا۔

"وعدے کسی اور سے اور گھمانا کسی اور کو..." وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب... کون سے وعدے؟" اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

"اف معصومیت تو دیکھو ذرا..." وہ ماتھے پہ بل ڈال کر دل ہی دل میں بولی اور تیار ہونے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

"نام کیا ہے تمہارا؟ اتنے دن ہوگئے، لیکن تم نے

ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔"

"چاند۔۔۔"

"اف یہ چاند کیسے میری جھولی میں آن گرا۔۔۔"

"بس تمہارے نصیب جاگ گئے۔"

☆ ☆ ☆

"اف یہ اتنی تپتی دوپہر میں مجھے اس سنسان پارک میں ٹہلا کر کون سی دشمنی نکال رہے ہیں۔" ایک گھنٹے سے پارک میں ادھر ادھر ٹہلتے اس کا حشر بگڑ گیا۔ سر پر تپتا سورج اور پہلو میں تپتا ہوا سرتاج۔۔۔ اسے لگا وہ دوزخ میں ڈال دی گئی ہے۔

"عیش کرو۔۔۔ گھومو پھرو۔۔۔ مزے کرو میرے ساتھ۔۔۔ آخر کو نئی نئی شادی ہوئی ہے ہماری۔۔۔" وہ جو گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر آگے کو جھکی اپنا سانس بحال کر رہی تھی۔ شاہ میر زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ گھسیٹنے لگا۔

"اوہو چھوڑیں میرا ہاتھ' دماغ تو نہیں چل گیا آپ کا۔۔۔" اس نے ساتھ گھسٹتے ہوئے دہائی دی۔

"چلو آؤ جھولے لیتے ہیں۔" وہ بولا تو عارفین نے چہرہ اوپر اٹھا کر اس نیم پاگل انسان کو دیکھا۔

"ہاں جھولے لیتے ہیں اور اس کے بعد لولی پاپ کھائیں گے ٹھیک ہے۔" وہ پھنکاری۔

"میں تمہیں لے کر اڑنا چاہتا ہوں مائی ڈیئر وائف' جھولوں میں بیٹھ کر اڑتے ہیں دونوں۔۔۔" وہ ٹکٹس لیتے ہوئے ترنگ میں بولا۔

"میں نہیں بیٹھی کبھی جھولوں میں۔۔۔ دیکھیں مجھے فوبیا ہے۔۔۔ ہیلو۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔" وہ بوکھلاتے ہوئے بولی' لیکن وہ کان لپیٹے اسے زبردستی رولر کوسٹر پر بٹھانے لگا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہو رہا ہے جان من؟" نیہا نے میسج ٹائپ کر کے بھیجا۔

"تمہاری یاد نے کچھ کرنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا ہے جاناں۔۔۔" جواب فوراً ہی موصول ہوا۔

"مجھ سے مل لو اب پلیز..." ایک اور پیغام آیا۔
"دفعتی ہے میری جوتی۔" وہ دل ہی دل میں تلملائی۔
"ہر وقت تمہارے پاس ہی ہوں۔ ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ آنکھیں بند کرو اور مجھ سے مل لو۔"
اس نے انگریزی میں جواب ارسال کیا اور جھرجھری لی۔
"اف کبھی نہیں سوچا تھا۔ ایسی گھٹیا لائنیں بھی بولنا پڑیں گی زندگی میں... ویسے بہت ہی بولڈ لڑکی ہے۔ کیسے منہ پھاڑ کر ملنے کا کہہ رہی ہے۔ پتا نہیں بھائی کو کیا نظر آیا اس میں..." شاہ میر کے موبائل سے اس لڑکی کا نمبر نکالنے کے بعد وہ کافی دنوں سے اس سے لڑکا بن کر میسجز کر رہی تھی۔ مشن یہ تھا کہ اسے پتا کر بھائی سے دور کیا جائے اور اس کے بھائی کے ساتھ تعلقات کے بارے میں معلومات بھی لی جائیں۔
"اچھا تم اپنے بارے میں بتاؤ نا۔ تمہارے قریبی دوست کون ہیں اور کس کے ساتھ سب سے زیادہ اٹیچمنٹ (لگاؤ) ہے؟" نیہا اصل بات پر آئی۔
"دوست تو بہت سارے ہیں میرے لیکن سب سے قریب شاہ میر ہے۔ بہت پرانی دوستی ہے میری اس کے ساتھ... اکٹھے کھانا، ہنسنا کھیلنا، کام کرنا اور کبھی اسے وقت ملے تو میرے فلیٹ پہ آ کے سو بھی جاتا ہے، لیکن اب اس سے بھی زیادہ قریب تم ہو میرے دل کے... ابھی نہ تمہاری آواز سنی ہے نہ دیکھا ہے تو یہ حال ہو گیا ہے میرا..." تفصیل بھرا پیغام اس کے سر پر بم کی طرح گرا تھا اور اس سے بھی زیادہ تیزی سے شاہ میر اس کی نظروں سے گرا۔ نیہا اس پیغام کو کوئی دسویں بار پڑھ رہی تھی کہ دروازہ زور سے کھلنے کی آواز آئی اور پھر سر کو تھامے ادھر ادھر ڈولتی عارفین اندر آتی دکھائی دی۔ اس نے بھاگ کر اسے سہارا دیا تھا۔
"تمہیں کیا ہوا؟ تم تو گھومنے گئی تھیں۔ سب ٹھیک تو ہے، کیا ہوا؟" وہ اس کو بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔
"اچھا تم بیٹھو میں پانی لاتی ہوں۔" جواب نہ پا کر وہ بھاگ کر پانی لے کر آئی اور اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگایا۔ پانی کا گھونٹ لے کر وہ صوفے پر نڈھال سی لیٹ گئی۔ اس کا ایک بازو نیچے لٹک رہا تھا۔ نیہا نے اس کے ماتھے کو چھوا تو وہ برف کی طرف ٹھنڈا اور بھیگا ہوا تھا۔
"اف تمہارا تو شاید بی پی لو ہے۔ کچھ بولو تو... کوئی بات ہوئی ہے کیا؟ بھائی کہاں ہیں؟"
"مجھے اپنا ہوش نہیں کہ میں کہاں ہوں۔ تمہیں بھائی کی پڑی ہے۔" وہ پھٹی ہوئی آواز میں رک رک کر بولی۔
"اف میرا دل گھبرا رہا ہے۔ نیہا! مجھے قے آ رہی ہے۔ پلیز مجھے واش روم لے کر چلو۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کے اٹھتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔
اسے باتھ روم تک چھوڑ کر وہ فکرمندی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگی۔
"اچھا اپنی تصویر ہی بھیج دو۔ کچھ تو آسرا ہو مجھے۔" اس کے موبائل پہ پیغام ابھرا تو اس نے غصے سے موبائل بیڈ پر پٹخا۔
"بے ہودہ لڑکی..."
تھوڑی دیر بعد ہی وہ تولیے سے چہرہ پونچھتے ہوئے باہر نکلی تھی۔ اس کی حالت اب کچھ سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔
"تمہارے اس پاگل خانے سے بھاگے ہوئے بھائی نے پارک کا کوئی جھولا نہیں چھوڑا جس پہ مجھے نہ بٹھایا ہو۔ میں روتی رہی، چلاتی رہی، لیکن اس درندے کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ اوپر سے کہتا ہے دیکھو اڑتی پھر رہی ہو تم میرے ساتھ..." وہ اسی کے انداز میں نقل اتارتے ہوئے بولی اور بیڈ پر ڈھے گئی۔ اس کی آواز مسلسل چلانے کی وجہ سے بیٹھی ہوئی تھی۔
"وہ اس گرم دوپہر میں تمہیں پارک لے کر گیا تھا؟" وہ حیرت سے مرہی تو گئی۔
"پورا ڈیڑھ گھنٹہ... پورا... ڈیڑھ گھنٹہ میں جھولوں میں چکراتی اپنی زندگی بچنے کی دعائیں مانگتی رہی۔" ڈولتے ہوئے سر کو سنبھالتے ہوئے وہ تھوڑا سا اوپر اٹھی اور پھر ڈھے گئی۔
"اف میرے خدا! تم لیٹی رہو بس میں تمہارے

لیے کافی بنا کے لاتی ہوں۔ حد ہو گئی' بتاتی ہوں میں مما کو ان کے بیٹے کی حرکتیں۔" وہ غصے سے بڑبڑاتی ہوئی باہر نکلی تھی کہ آگے سے شاہ میر ہاتھ میں دودھ کی بالٹی پکڑے آتا دکھائی دیا۔

"بھائی آپ بھری دوپہر میں پارک میں گھومنے گئے تھے۔"

"پہلے شکایت تھی کہ کہیں جاتا نہیں' گھر میں بیٹھا فرنیچر خراب کر رہا ہوں۔ اب گیا ہوں تو اس پر بھی مسئلہ....." وہ غصے سے غرایا۔

"نہیں میرا مطلب تھا شام کو لے کر چلے جاتے۔" وہ آگے سے منمنائی۔ اس پہ غصہ اپنی جگہ' لیکن اس کے منہ پر کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی اس میں....

"دودھ لینے جانا ہوتا ہے مجھے شام کو' بہت سی ذمہ داریاں ہیں مجھ پہ....." وہ پانی سے بھری دودھ والی بالٹی اس کے آگے کرتے ہوئے بولا۔

"تو جی اب دودھ لے کر آنا بھی ذمہ داری ہو گئی' کوئی بھاری بھرکم....." اندر کمرے میں ان کی گفتگو سنتی عارفین اس کی بات پر تلملائی۔

"عجیب پاگل انسان ہے۔ میں خواہ مخواہ اس کے غم میں دبلی ہو رہی تھی۔ ابھی مما کو فون کر کے کہتی ہوں کہ لے کر جائیں مجھے یہاں سے۔ بہت بن چکی میں صبر کی دیوی....." نیہا کا موبائل بجا تو اس نے پیغام کھول کر دیکھا۔

"جانو کہاں گم ہو؟" وہ جی بھر کے بدمزہ ہوئی۔

"ایک تو یہ مصیبت جو میں نے پیچھے لگالی ہے' فائدہ تو کچھ بھی نہیں ہو رہا۔"

"یہیں ہوں میری جان' تمہارے آس پاس....." اس نے منہ بناتے ہوئے جواب بھیجا۔

"ملنا نہیں ہے تو کم از کم اپنی خوب صورت آواز ہی سنا دو۔ ایسے کب تک چلے گا ظالم....." آگے سے فرمائش آ گئی۔

"پہلے تم میرے علاوہ اپنے سب دوستوں کو اپنی زندگی سے نکال دو۔ خاص طور پر اس شاہ میر کو.... تمہیں کسی کے ساتھ شیئر (بانٹنا) کرنا میرے لیے

عذاب ہے۔ بس میں اور تم....." اس نے جواب دیا۔

"چھوڑ دیا.... اب خوش؟" انگریزی میں لکھا ہوا جواب فوراً" آیا تھا۔

"جواب پڑھتے ہوئے اسے باہر گاڑی کی آواز آئی تو وہ دروازہ کھول کر پورچ میں آئی تو وہاں عارفین کی والدہ اور والد گاڑی سے باہر نکل رہے تھے۔

"بہت ہی مایوس کیا ہے' بہن آپ کے بیٹے نے۔ میری بچی اتنے دن چپ چاپ یہ سب سہتی رہی۔ کسی کو ہوا تک نہ لگنے دی۔ اگر آپ کے بیٹے کی مرضی کہیں اور تھی تو آپ کو ضرورت کیا تھی زور زبردستی کرنے کی۔" ممتاز بیگم نے مقدمہ شروع کیا تو زبیدہ بیگم تو ہکا بکا رہ گئیں۔

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے' ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ سب کس نے کہہ دیا آپ کو....؟" وہ پریشانی سے بولیں۔

"یقین تو ہمیں بھی نہ آتا اگر یہ سب عارفین ہمیں خود نہ بتاتی۔" عارفین کے والد نے جواب دیا۔

"وہ تو بتا رہی تھی کہ دماغی حالت بھی درست نہیں لڑکے کی۔" ممتاز بیگم نے مزید انکشاف کیا۔

"آپ کی کئی بار ملاقات ہوئی ہے اس سے شادی سے پہلے' بھائی صاحب آپ سے تو خوب لمبی گپ شپ بھی رہی ہے۔ آپ کو کب ایسا لگا کہ اس کی دماغی حالت درست نہیں۔" انہوں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"کچے کا کیا پتا چلتا ہے۔ پکاؤ تو پھر ہی سب کھل کے سامنے آتا ہے۔" ممتاز بیگم نے آہ بھری۔

"مجھے تو آپ لوگوں کی کوئی بات' سمجھ میں نہیں آ رہی۔ میں ابھی دونوں کو بلاتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں اور نیہا کو آواز دی۔

"نیہا جاؤ جلدی سے بھائی بھابھی کو بلا کر لاؤ۔"

✡ ✡ ✡

تھوڑی دیر بعد ہی دونوں ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ عارفین اپنی والدہ کے ساتھ چپکی بے آواز رونے میں

مصروف تھی، جبکہ شاہ میر کے ہاتھوں کے توتے اڑ چکے تھے۔ وہ ہر طرف سے ہونے والے حملوں سے بوکھلا کر رہ گیا۔

"اگر کسی اور لڑکی کا معاملہ تھا تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ شرم آرہی ہے مجھے تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے۔" زبیدہ بیگم، عارفین کے منہ سے سب سن کر غصے سے پاگل ہو گئیں۔

"مما آپ میری بات تو سنیں۔ جو مطلب اس نے میری باتوں کا لیا ہے ویسا کچھ نہیں ہے۔"

"اچھا اگر ویسا کچھ نہیں ہے تو تم نے اس کی غلط فہمی دور کیوں نہیں کی؟" انہوں نے جرح کی۔

"پہلے تو آپ اس سے یہ پوچھیں کہ ایسی باتیں کی ہی کیوں اس نے....." مہناز بیگم نے لقمہ دیا۔

"میں نے اس کو کبھی نہیں کہا کہ میں کسی اور کے ساتھ..... مطلب ایسی کوئی بات نہیں کی میں نے اس سے۔ آپ میرا یقین کریں میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"میری بچی کو جھولے دلا دلا کر تم نے جان سے مارنے کی کوشش کی اور گردن اکڑا کر کہہ رہے ہو کہ تم نے کچھ نہیں کیا۔" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولیں۔

"کتنا ڈرتی ہے وہ جھولوں سے۔ اتنا نازک سا دل ہے اس کا اور تم گھٹنوں اسے....." ان کی آواز بھرا گئی تو وہ بات ادھوری چھوڑ کر عارفین سے لپٹ گئیں۔

"اٹھو عارفین..... میرے خیال میں ہمیں اب چلنا چاہیے۔" عارفین کے والد اٹھ کھڑے ہوئے۔

✡ ✡ ✡

"کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تم نے ہمیں۔ مٹی میں رول دی ہماری عزت....." زبیدہ بیگم رقت آمیز انداز میں بولیں۔

"اوپر سے تم اسے یہ کہتے رہے ہو کہ یہ شادی زبردستی ہوئی ہے۔ کیا گن پوائنٹ پر نکاح نامے پہ دستخط کیے تھے؟" سکندر صاحب گرجے۔

"میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ شادی زبردستی ہوئی ہے۔ میں نے تو بس اتنا کہا تھا کہ ابھی اس ذمہ داری کے لیے تیار نہیں تھا میں..... باقی کی کہانی اس کی اپنی گھڑی ہوئی ہے۔ ہاں جھولوں والی بات پر میں شرمندہ ہوں۔" وہ بات کو سمیٹتے ہوئے بولا۔

"بیٹا جی بات اتنی آسان نہیں رہی جو آپ کے اتنے سے بیان سے ختم ہو جائے گی۔ وہ اپنے گھر جا چکی ہے۔ تمہیں معاملے کی سنجیدگی کا اندازہ بھی ہے؟؟"

زبیدہ بیگم نے اسے لتاڑا۔

"اور تم نے پہلے ہی دن اپنی بیوی سے یہ کہہ دیا کہ تم اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ ایک پڑھی لکھی، باشعور لڑکی کو تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ تم پہ بوجھ ہے۔" وہ شدید مایوس ہوئیں۔

"مما میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ آپ میرا نقطہ نظر بھی سمجھیں..... میں تو بس ذمہ داری کی بات کر رہا تھا کہ....."

"ذمہ داری..... ذمہ داری..... کون سی ذمہ داری؟ کون سی سلطنت سنبھالی ہوئی ہے۔ تم نے؟" اس کی بات نے جلتی پہ تیل کا کام کیا تھا۔

"تمہارا میسج نہیں آتا تو میرا سانس بند ہونے لگتا ہے۔ کچھ تو بولو۔ رات تمہارے بنا کتنی سونی ہے، کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہے۔ بس اب اور نہیں رہا جاتا تمہارے بنا۔" جذبات سے بھرپور پیغام موصول ہوا تھا۔ اس کا چہرہ شرم اور غصے سے سرخ ہوا۔ منہ ہی منہ استغفار پڑھتے اس نے دھیان واپس ان کی بحث پر لگایا۔

"اگر آپ کو ابھی بھی لگتا ہے کہ مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں، تو پھر کوئی بات کرنا ہی فضول ہے۔ آپ کبھی نہیں سمجھیں گے۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں گم ہو گیا۔

"حد ہوتی ہے ڈھٹائی کی۔" وہ دونوں بھی بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔

"رات بھی کاٹ رہی ہے، تکیہ بھی کاٹ رہا ہے اور تم ہو کہ تم سے کچھ کاٹا نہیں جا رہا۔ کوئی اچھا سا منجن لگاؤ، دانت مضبوط کرو اور کاٹ ڈالو اس لمبی کالی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

رات کو۔۔۔" ایک ہاتھ سے ٹاپ کرتے ہوئے اس نے فریج سے پانی کی بوتل نکالی۔

"بے شرم لڑکی۔۔۔ ہماری صنف کی تو ناک ہی کٹوا دی اس نے۔۔۔" وہ سوچ کے تلملائی۔

☆ ☆ ☆

"میں عارفین سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" ڈرائنگ روم میں موجود مہناز بیگم سے اس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

"میں بلاتی ہوں' اگر وہ ملنے کے لیے تیار ہو گئی تو۔۔۔" وہ اس کو جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بے مروتی سے بولیں' تو اس نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔ چائے کے لوازمات اس کے سامنے سجائے جا رہے تھے۔

"السلام علیکم!" وہ نارمل سے لہجے میں بولتی ہوئی اس کے سامنے آکے بیٹھ گئی۔

"وعلیکم السلام!" چند گھڑیاں یوں ہی خاموشی سے گزریں' پھر اس نے سر اٹھا کر عارفین کو دیکھا جو ٹانگ پر ٹانگ جمائے اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

"آں۔۔۔ کیسی ہو؟" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"ٹھیک ٹھاک۔۔۔ خوش باش۔۔۔ کیوں آپ کو کیا لگا' غم میں ڈوبی ہوئی ملوں گی میں آپ کو؟"

"نہیں' ایسی انہونی کی تو کوئی امید نہیں تھی مجھے۔۔۔ میرا مطلب تھا اس دن۔۔۔ طبیعت۔۔۔ بہت خراب ہو گئی تھی تو۔۔۔ اس کا پوچھ رہا تھا۔" اس نے بمشکل بات مکمل کی۔

"ہاؤ سویٹ' کتنا خیال ہے آپ کو میرا۔" وہ طنزیہ مسکراتے ہوئے بولی۔ شاہ میر اپنی جگہ سے اٹھا اور ادھر ادھر دیکھتا دروازے تک پہنچا اور آگے بڑھ کر دروازے کو لاک کیا۔ عارفین کا دل لرزا لیکن پھر خود کو تسلی دی۔

"ماں' باپ کے گھر میں ہوں' ایک آواز پہ سب دروازہ توڑ کر پہنچ جائیں گے۔" دروازہ لاک کرنے کے بعد اس نے ایک کرسی کھینچ کر عارفین کے سامنے رکھی' پھر اس کے تاثرات دیکھے۔

عارفین نے پہلے سامنے رکھی کرسی کو دیکھا' پھر اس کی نظریں عین کرسی کے اوپر چھت سے لٹکتے پنکھے تک گئیں۔

"اب کیا پنکھے سے لٹکا کے جھلانے کا پروگرام ہے۔ مسٹر یہ پارک نہیں ہے۔ ایک چیخ ماروں گی تو سارا گھر اکٹھا ہو جائے گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی تو شاہ میر نے فوراً" اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر زبردستی بٹھایا' پھر خود سامنے رکھی گئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے گہری سانس لے کر توانائی بحال کی اور کہنیاں گھٹنوں پہ رکھ کر آگے جھکا۔

"میری زندگی میں میری بہن اور میری ماں کے علاوہ کوئی تیسری صنف نازک نہیں آئی۔ تم ہی میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہو۔ تو سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دور کر لو جو تمہیں پہلے دن سے ہے کہ میں کسی اور میں انوالو ہوں۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے بات شروع کی۔

"ہاں آپ نے کہا اور میں نے مان لیا۔ اتنی ہی ننھی کاکی ہوں نا میں۔ آج کی لڑکی اتنی بھولی نہیں رہی' مسٹر شاہ میر اور میں تو بالکل بھی نہیں ہوں۔ مجھے معاملے کی تہ تک جانا آتا ہے۔" وہ تڑاخ سے بولی تھی۔

"اچھا۔۔۔ مجھے بھی لے کر جائیں ذرا معاملے کی تہ میں۔۔۔ میں بھی دیکھوں آخر کیا چھپا کر رکھا ہوا ہے وہاں۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"وہ بھی دکھاؤں گی۔ گواہ سے بھی ملواؤں گی اور ثبوت بھی دکھاؤں گی۔" اس نے تڑی لگائی۔

"ٹھیک ہے' دیکھ لیں گے۔ آپ نے منہ توڑ جواب دے کر دل ٹھنڈا کر لیا ہو تو آگے چلیں؟"

"چلیں۔" اس نے گویا احسان کیا۔

"ساری زندگی میری فیملی نے مجھ پر ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ ڈالے رکھا کہ جوانی تک پہنچتے پہنچتے میری کمر ہی دہری ہو گئی۔"

"ہیں۔۔۔ دیکھنے میں تو سیدھی لگ رہی ہے۔" اس نے بغور اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"ساری زندگی میری لیب ٹیسٹ کرواتے گوشت والے کو وضو کرواتے اور دودھ والے کے ہاتھ دھلواتے گزر گئی۔" وہ رک رک کر بول رہا تھا' جیسے سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کون سے لفظوں میں بیان کرے۔

"کیوں؟ آپ نے ان سب کو گود لے رکھا تھا؟" وہ الجھی ہوئی سی بولی۔

"میری مما کو زندگی میں صفائی کا جنون رہا ہے اور ان کی زندگی میں پرفیکشن لاتے لاتے میری ساری انرجی ختم ہوتی گئی۔ تم سے شادی ہوئی تو یوں لگا جیسے کسی نے اضافی بوجھ لاد دیا ہو مجھ پر..... مجھے لگا مما کے ساتھ اب تم بھی....." اس کو مناسب الفاظ نہ ملے تو وہ بات ادھوری چھوڑ کر آگے بڑھا۔

"خیر ساری زندگی میں اپنے سرکل میں ایک مذاق بنا رہا۔" اس کی ہر بات عارفین کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھی۔

"کیوں؟ آپ ریچھ کی طرح گلی گلی ڈانس کرتے تھے۔" اس نے سوچا لیکن کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

"یہ لو صابن پکڑو اور اچھی طرح سے رگڑنا ہاتھ بھائی۔" چھوٹا سا شاہ میر انگلی تھامے اپنی والدہ کے ساتھ کھڑا تھا۔ زبیدہ بیگم نے صابن لگے ہاتھوں پر پانی ڈالا تو دور تماشا دیکھتے لوگ ہاتھ پر ہاتھ مار کے ہنسنے لگے۔ شاہ میر کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔ اب وہ بالٹی تھامے بھینس کے پاس کھڑی اس کے تھن دھلوا رہی تھیں۔ اپنے گھر سے لائے صاف پانی اور صابن سے.....

"یہ لو اب اس بالٹی میں ڈائریکٹ دودھ نکالو..... میں گھر جا کر ناپ کر باقی واپس بھجوا دوں گی۔ توبہ ہے تم لوگ تو ان ہی برتنوں میں کپڑے دھوتے ہو اور ان ہی میں دودھ ڈال کر بیچ رہے ہوتے ہو۔ صفائی نصف ایمان ہے لیکن تم سب کو کوئی کیسے سمجھائے۔" دودھ والے نے جواباً "منہ بنایا" لیکن بولا کچھ نہیں' کیونکہ وہ اس کو عام ریٹ سے کہیں زیادہ پیسے دے رہی تھیں اور شرط بس یہ تھی کہ ان کی ہدایات پر عمل کرنا ہے۔

"بے چاری بھری جوانی میں پاگل ہو گئی ہیں۔" کوئی اس کے آس پاس بولا تھا۔ "کل میں نے انہیں گوشت کی دکان پر دیکھا گوشت والے کو وضو کروا رہی تھیں۔ ان امیر لوگوں کے پاس ذہنی سکون نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو پاگل ہو جاتے ہیں' وہ کیا کہتے ہیں ان کی زبان میں..... نفسیاتی مریض....."

"مما پلیز آپ وہاں نہیں جایا کریں ـــ آپ بشیر انکل کو بھیج دیا کریں۔" وہ گھر آتے ہوئے بولا۔ وہ اب بڑا ہو رہا تھا' سب محسوس کرنے لگا تھا۔

"لو ایسے کیسے اعتبار کرلوں میں کسی پر' یہ لوگ صفائی کی اہمیت کو نہیں سمجھتے میری جان۔"

"ٹھیک ہے تو پھر میں ساتھ چلا جایا کروں گا بشیر انکل کے۔ آپ کو مجھ پہ تو ٹرسٹ ہے نا؟" پھر آہستہ آہستہ میں ایک ایک کر کے ایسے کاموں کی ایک لمبی لسٹ کو اپنے سر لیتا گیا۔ کالج پہنچنے تک میں سب کام اپنے ذمہ لے کر مما کو مکمل طور پر گھر بٹھا چکا تھا۔ یہ اور بات کہ وہ پھر بھی مجھ سے چھپ کر کبھی کبھار چھاپہ مارنے نکل کھڑی ہوتی ہیں جیسے کہ ولیمہ والے روز تمہارے ساتھ۔ جس کی وجہ سے میں تم سے مزید چڑ گیا تھا اور اپنے اندازوں پر مجھے مزید یقین ہو گیا تھا۔

"لیکن وہ ایسا کرتی کیوں تھیں' کیا واقعی کوئی نفسیاتی مسئلہ....." وہ الجھ کر بولی۔

"نہیں..... بس وہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت احتیاط پسند ہیں۔ دراصل بچپن میں میرے ایک کزن کا انتقال باہر کی کوئی ناقص چیز کھانے سے ہوا تو اس کے بعد ہی مما بہت خوف زدہ ہو گئیں اور ہر کھانے پینے والی چیز کی چھان بین کرنے لگیں اور صفائی کے معاملے میں تو وہ ہمیشہ سے جنونی رہی ہیں۔" اس نے صفائی دی۔

"بظاہر تو گھر کا سودا سلف لانا معمولی بات ہوتی ہے' لیکن مجھے ان سب کاموں کو نپٹاتے ہوئے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے وہ کسی فل ٹائم جاب سے کم نہیں اور جگہ ہنسائی الگ۔ مما کو لگتا ہے گوشت والے بنا تکبیر پڑھے ہی جانور ذبح کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے سامنے اس کو وضو کراتیں اور تکبیر پڑھوا کر مرغی ذبح کراتیں۔

"باجی قسم سے یہ ساری مرغیاں تکبیر پڑھ کر ذبح کی ہیں۔" صاف ستھری کھال اتری مرغیوں کو دکھاتا ہوا وہ بولا۔

"ارے جاؤ..... میں کیسے مان لوں کہ ذبح کی ہیں یا گردن دبوچ کے مارا ہے۔ دیکھو پیسے ڈبل دینے کو تیار ہوں میں، لیکن میرے سامنے وضو کرو اور بلند آواز میں تکبیر پڑھ کر مرغی ذبح کرو۔"

"مما کی جگہ یہ کام پھر میں کرنے لگا۔ گوشت کے لیے تو مجھے فجر پڑھ کر مذبح خانے جانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی چینی کو لیب میں ٹیسٹ کرانے جاتا ہوں تو کبھی کوئی اور چیز..... میری ماں کا کوئی مذاق نہ اڑائے اس کوشش میں گھن چکر بن کے رہ گیا ہوں۔"

"میں نے ایم فل کے امتحانات کی تیاری کے لیے آفس سے چھٹیاں لیں تو مما نے مزے سے ان چھٹیوں میں میری شادی طے کردی۔ روزمرہ کے ان بے شمار کاموں کا بوجھ، ایگزامز کی ٹینشن اور اضافی ذمہ داری شادی کی تیاریاں..... اس سب نے مل کر میری دماغی حالت عجیب سی کردی۔ تمہارے لیے خریدے گئے برانڈ نیو برائیڈل ڈریس کو کم وبیش دس بار ڈرائی کلین کروایا تو کہیں جا کر مما مطمئن ہوئیں۔" وہ بے اختیار ہنسی تھی، پھر اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے زبردستی ہنسی دبائی۔

"بس اور میں تمہیں کیا کیا بتاؤں..... تمہارے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں ایک اضافی ذمہ داری اور بوجھ سمجھنے لگا اور یہی وجہ ہے کہ شادی کی رات تم سے وہ سب کہا جس کا تم نے کچھ اور ہی مطلب نکالا اور میں اتنا اکتایا ہوا تھا کہ تمہاری غلط فہمی دور کرنا بھی گوارہ نہیں کیا۔" شاہ میر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور آگے ہو کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"میں بیوی کے رشتے کو سمجھ ہی نہیں پایا عارفین..... میں جان نہیں پایا کہ تم تو میرا بوجھ بانٹنے کے لیے مجھے عطا کی گئی ہو۔" وہ اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"ایک منٹ، ایک منٹ..... دیکھیں، مجھ سے زیادہ امیدیں نہ وابستہ کریں۔ اگر بوجھ بانٹنے سے آپ کا مطلب ہے کہ میں لوگوں کے ہاتھ پاؤں دھلواتی پھروں گی تو مجھ سے ایسی کوئی امید نہ رکھنا۔" اس نے ہاتھ چھڑا کر صاف صاف جواب دیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"لیکن کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی تو اس نے حیران ہو کر دیکھا۔

"آپ کو خود اپنے کانوں سے کسی لڑکی سے بات کرتے اور پیار برساتے سنا ہے میں نے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ٹھوس ثبوت ہیں میرے پاس۔" اس نے انکشاف کیا۔

"خدا کا خوف کرو یار..... کیسے کیسے الزام لگا رہی ہو۔" وہ بلبلایا۔

"نمبر بھی ہے میرے پاس اس کا اور میسج بھی، جس میں اس نے آپ کے ساتھ قریبی تعلقات کا اعتراف کیا ہے۔"

"لاؤ کہاں ہے نمبر دکھاؤ۔۔۔ مجھے بھی تو پتا چلے وہ کون ہے جس کی مجھے خود خبر نہیں۔" وہ مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

"عارفین نے موبائل سے نیہا کا بھیجا ہوا پیغام نکالا اور اسکرین اس کے سامنے کی۔"

"یہ دیکھیں اپنی نسیم کا میسج۔"

"میرے سب سے قریب شاہ میر ہے۔ بہت پرانی دوستی ہے ہماری۔" نیہا نے اس کو پورا پیغام نہیں بھیجا تھا کہ کہیں وہ صدمے سے فوت ہی نہ ہو جائے۔ شاہ میر نے آنکھیں سکیڑ کر انگریزی میں لکھا ہوا پیغام پڑھا۔

"اور یہ رہا اس کا نمبر۔۔۔ اب اس پر بھی لمبی سی عجیب و غریب سی کہانی گھڑ لیں۔" اس نے موبائل سامنے کرتے ہوئے طنز کیا۔

"یہ تو نسیم کا نمبر ہے۔ تمہارے پاس کیسے آیا؟" وہ حیرت سے بولا۔

"واہ بڑی جلدی مان گئے۔ یعنی وہ نسیم ہی ہے جس سے آپ شادی کرنا چاہتے تھے۔" وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

"استغفار۔۔۔ ابھی یہ نوبت نہیں آئی کہ میں کسی لڑکے سے شادی کرنا چاہوں۔۔۔ کچھ خدا کا خوف کرو یار۔ کیا کہنا چاہتی ہو تم، میں کیا ہوں؟" اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھے۔

"نسیم لڑکا ہے؟" اب کہ عارفین کی سٹی گم ہوئی تھی۔

"جی۔۔۔ لڑکا ہے۔ نسیم میرا بہت اچھا دوست تھا۔ اب تو خیر وہ دوست بھی نہیں رہا۔ زندگی میں پہلی بار اسے کسی لڑکی نے گھاس کیا ڈالی اس نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ اس لڑکی کی فرمائش پر برسوں کی دوستی ختم کر دی اس نے۔" عارفین کے سر پر اس کے الفاظ کسی ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔

"خیر لمبی کہانی ہے۔۔۔ تم بتاؤ تمہیں یہ میسج اور نمبر کس نے بھیجا؟" اس نے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ مجھے۔۔۔ آں۔۔۔ پتا نہیں کسی اجنبی نمبر سے آیا تھا۔ چھوڑیں میں ڈیلیٹ کر دیتی ہوں۔۔۔ یقیناً" کسی نے مذاق کیا ہو گا یا پھر ہم میں پھوٹ ڈلوانا چاہ رہا ہو گا۔" اس نے کانپتے ہاتھوں سے جلدی جلدی نیہا کا پیغام مٹایا تھا۔

"لاؤ دکھاؤ تو۔۔۔ پتا تو چلے کون ہے وہ گھٹیا انسان۔۔۔" اس نے موبائل لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"چھوڑیں نا۔۔۔ اتنا خوب صورت وقت کیسی سڑی ہوئی باتوں میں برباد کر رہے ہیں۔ پہلے ہی کتنا وقت ضائع کر دیا ہم نے۔ اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا شاہ میر۔۔۔ میں آپ کی محبت میں ڈوب جانا چاہتی ہوں۔" وہ بات سنبھالنے کے چکر میں الٹا سیدھا بولنے لگی اور اس کی شرٹ پکڑ کر بالکل قریب ہو گئی۔

"بہت ہی بولڈ ہو تم یار۔۔۔ تھوڑی شرم کرلو' اپنے والدین کے گھر پر ہو۔" وہ جذبات پہ قابو پاتا کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا اور پھر دروازہ کھول کر باہر لاؤنج کی طرف چلا گیا۔ تاکہ اس کے گھر والوں سے معافی تلافی کر کے محبت بھری زندگی کا آغاز کر سکے۔

دوسری طرف عارفین نے جلدی سے نیہا کو میسج کر کے خبردار کیا کہ نسیم لڑکی نہیں لڑکا ہے۔ وہ پہلے تو الجھی کہ اگر نیہا' نسیم سے لڑکا بن کر بات کر رہی تھی تو وہ ایک لڑکے پر کیسے مرمٹا۔۔۔ پھر اس کو یاد آیا کہ ان کی زیادہ تر گفتگو انگریزی میں ہوتی رہی جس کی وجہ سے وہ دونوں ہی حقیقت سے انجان رہے اور نسیم کے مزے ہو گئے۔ وہ جانتی تھی کہ اب تک آسمان' چاند' تارے' سیارے اور کڑکتی ہوئی بجلیاں سب ایک ساتھ نیہا کے سر پر گر چکے ہوں گے اور اس کے ملبے سے نکالنے کے لیے اسے جلد از جلد واپس اپنے گھر پہنچنا تھا۔

ریما علی

عید مناؤ

شازیہ نے کھڑے ہو کر باورچی خانے کی کھڑکی سے جھانک کر صدر دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھے ارسل کو ایک نظر دیکھا اور خود کو آواز دینے سے اس بار بھی روک نہیں پائی۔

"ارسل بیٹا! کچھ کھالو..... میں آلو کے چپس بنا دیتی ہوں۔"

"ابھی نہیں امی!" ایک لمحے کے لیے اس نے گردن موڑ کر ماں کو دیکھا اور وہی جواب دہرایا تھا جو وہ اس سے قبل پانچ بار دہرا چکا تھا۔ اس نے دوبارہ گردن سیدھی کر کے نظریں راستے پر جما دی تھیں۔ وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر ہو کر بیٹھا تھا۔ خواہش تھی تو بس ایک کہ ابو جلدی سے گھر آجائیں۔

شازیہ نے ممتا سے بھرپور نگاہ بیٹے کی پشت پر ڈالی اور شکیل کے جلد لوٹ آنے کی دعا مانگتے ہوئے دوبارہ بیٹھ کر رات کے کھانے کے لیے آلو چھیلنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ رات دسترخوان پر آلو کی قتلیاں دیکھ کر شکیل کے چہرے نے ایسے رنگ بدلنے ہیں کہ وہ ان بدلتے ہوئے تیوروں کو سمجھنے۔ ماتھے کے بلوں کو گننے اور نتھنوں سے نکلتی ہوئی گرم سانسوں اور زبان کی "چپ" کے آگے چاروں شانے چت ہوتے ہی ایک نوالہ منہ میں لیے، شکیل کے لیے کھانے کا کوئی "مناسب" بندوبست کرنے باورچی خانے میں دوبارہ رونق افروز ہو گئی۔ ایسا ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔ شکیل مزاج کا تیز تھا اور اچھا کھانے پینے کا رسیا اور جب بھی رات کے کھانے میں کوئی ایسی چیز دسترخوان کی رونق بن جاتی جو شکیل کو ناپسند ہوتی تو شازیہ کی جان پر بن آتی تھی۔ اس پر ساس ثریا بیگم کے فقرے جلتی پر تیل کا کام کرتے تھے..... حالانکہ شادی کو نو سال ہو رہے تھے مگر ابھی تک شازیہ کا اس گھر میں اتنا اثر و رسوخ بھی قائم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ "رات کھانے میں کیا پکے گا؟" جیسے اہم مشکل اور معمولی نوعیت کے کام کے بارے میں بھی "از خود نوٹس" لے پاتی۔ چنانچہ گھر کے دیگر خارجی اور داخلی معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی ثریا بیگم کی مکمل اجارہ داری قائم تھی۔ کئی حوالوں سے اس مطلق العنانیت نے شازیہ کی کئی اہم مسئلوں سے خلاصی بھی کروا رکھی تھی، سب میں سرفہرست گھر کا بجٹ بنانا اور اخراجات کی مد میں اٹھنے والی رقوم کا حساب کتاب رکھنا تھا۔

ثریا بیگم کا پسندیدہ مشغلہ بجٹ بنانا تھا، اور پسندیدہ فقرہ "یا اللہ کتنی مہنگائی ہو گئی ہے" تھا۔ جس کا استعمال وہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ سے شروع کرتی تھیں اور جوں جوں تاریخیں چڑھتی جاتی تھیں توں توں ان کے شکووں اور..... "اس ماہ اتنے روپے لازمی بچاؤں گی۔" کے دعووں میں اضافہ ہوتا جاتا جو کہ آخری تاریخوں میں ایک ایسی غبارہ ثابت ہوتا جس کو لگنے والی مہنگائی کی ہلکی سی سوئی لمحے کے ہزارویں حصے میں پھاڑ ڈالتی اور جس کے پھٹنے پر وہ اگلے کئی دن سیاست دانوں اور منافع خوروں کی شان میں وہ وہ قصیدے پڑھتی تھیں کہ توبہ ہی بھلی۔

لیکن شازیہ کا خیال تھا کہ کم از کم اتنا تو رئیس کا حق تھا کہ وہ شوہر کی پسند اور ناپسند کو مدنظر رکھتے ہوئے رات کا "ون ڈش مینو" طے کر سکے۔ لیکن وائے ری قسمت کہ ایسا ہوتا نہیں تھا کیونکہ ساس بیگم کی شاید پالیسی ہی یہ تھی کہ وہ جان بوجھ کر چن چن کر وہ کھانے

بنواتی تھیں، جو شکیل کے حلق سے نہیں اترتے تھے
اور ظاہر ہے شازیہ جیسی مشرقی عورت کا نوالہ منہ میں
لے جاتا ہوا ہاتھ واپس دسترخوان پر پہنچ جاتا تھا اور اس
کی دوڑیں باورچی خانے تک لگنا شروع ہو جاتی
تھیں۔ اس دوران البتہ ثریا بیگم "دبھو کسی کام کی
نہیں" نامی سوپ سیریل ٹیلی کاسٹ کرنا شروع ہو جاتی
تھیں۔ حالاں کہ وہ بہترین کھانا بنانا جانتی تھی اور پھر
نت نئے کوکنگ چینلز کے مرہون منت اسے کئی
بدیسی کھانے بھی آتے تھے اور یہ بھی نہیں تھا کہ وہ
صرف دال سبزی ہی افورڈ کر سکتے تھے۔ اصل میں عید
کے فوراً" بعد ہی ان کے یہاں دال سبزی کا چاند نظر
آجاتا تھا اور شازیہ کے برے دن شروع ہو جاتے تھے۔
شکیل جس نے شازیہ کو اپنے بس میں کر رکھا تھا۔ ثریا
بیگم کے آگے بالکل بے بس تھا۔ ویسے وہ پانچویں گریڈ
کا سرکاری افسر تھا۔ ایک ایماندار فرض شناس سرکاری
افسر۔ جو روز ٹفن باکس میں لنچ لے کر اپنی بائیک پر صبح
مقررہ وقت پر آفس جاتا اور شام پانچ بجے مقررہ وقت پر
گھر واپس آتا۔ گھر میں قناعت بھی تھی اور خوش حالی
بھی......

بس آج وہ معمول سے لیٹ ہو گیا تھا۔ جس پر
شازیہ اور ثریا بیگم کو چنداں فکر نہیں تھی۔ یہ آٹھ
سالہ ارسل تھا جو شام ساڑھے پانچ بجے سے دہلیز پر
باپ کا منتظر بیٹھا تھا۔ خوشی اور جوش کا یہ عالم تھا کہ آج
ٹیوشن سے بھی چھٹی کر لی تھی حالانکہ شازیہ نے ایڑی
چوٹی کا زور لگایا' شکیل نے دس بجے سے پہلے نہیں لوٹنا

مگر ارسل صاحب آج خلاف توقع دادی پر چلے گئے تھے۔ اور پھر دادی خود بھی تو ہر وقت بروقت کی طرح "آڑے" آگئی تھیں۔ لاڈلے پوتے کو ظالم ماں ان کے جیتے جی ٹیوشن پڑھنے کے لیے بھیج رہی تھی..... جبکہ معلوم بھی ہے کہ کتنا اہم موقع ہے گھر میں.....!

چنانچہ ارسل نے جو ڈھائی گھنٹے سے دروازے پر بیٹھا باپ کی راہ تک رہا تھا' نہ کچھ کھایا پیا تھا' نہ ہوم ورک کیا تھا' نہ قرآن کا سبق دہرایا تھا اور نہ ہی محلے کے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے گیا تھا۔ آج واقعتاً اس کی زندگی کا سب سے یادگار دن ہونے والا تھا اس کی دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی لیکن شکیل کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اب تو ساڑھے آٹھ ہونے کو آئے تھے..... کتنا تکلیف دہ تھا انتظار..... یہ کوئی اس آٹھ سال کے بچے سے پوچھتا..... اور کتنا اذیت ناک تھا اپنی اولاد کو اس طرح بھوکا پیاسا دروازے پر بیٹھے دیکھنا..... یہ کوئی شازیہ سے پوچھتا..... لیکن.....!

آج کے اس دن کے لیے ارسل نے کتنا انتظار کیا تھا' کتنی مشکلیں کاٹی تھیں۔ وہ جانتی تھی۔ روز پاکٹ منی کے نام پر دس بیس روپے جو اسے ملتے تھے' پچھلے تین سالوں سے وہ ان میں سے آدھی سے زیادہ رقم روز ہی کی بنیاد پر دادی کے پاس بڑی خاموشی سے جمع کرواتا رہا تھا۔ اس دوران وہ ہر سال شکیل سے ایک وعدہ ضرور لیتا تھا۔ شکیل اس وقت اس کے معصومیت بھرے انداز پر نثار ہوتے ہوئے وعدہ تو کرلیتا تھا لیکن اس کا پورا کرنے کا اسے کوئی خاص یقین نہیں تھا۔ شکیل کا ماننا تھا کہ جب وقت آئے گا تب اللہ وہ وعدہ پورا کروادے گا لیکن یقیناً" سال بعد پرسوں رات جب ارسل نے دادی کے پاس اپنی تمام "جمع پونجی" باپ کے سامنے رکھتے ہوئے وہ وعدہ یاد دلایا تو سب ہی ٹھٹھک کر رہ گئے تھے۔

آٹھ سال کا وہ بچہ اور یقین کا یہ عالم..... اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے ایسی ثابت قدمی..... شازیہ تو رو ہی پڑی۔ تین سال سے اس کا بیٹا پائی پائی جمع کررہا تھا.....

کس لیے.....؟..... اس لیے کہ وہ چاہتا تھا کہ اس کے گھر بھی عید قربان کے موقع پر قربانی کا اہتمام ہو۔

"لیکن بیٹا تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟" شکیل نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ابو! میں نے اسلامیات کی کتاب میں پڑھا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہ قصہ اور ٹیچر نے بھی بتایا تھا کہ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا امتحان لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ جاننا چاہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اور وہ اس امتحان میں کامیاب رہے..... اور ابو ٹیچر کہتی ہیں کہ اس بار میں یہ قربانی ہم مسلمانوں پر واجب ہے تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی محبت کا امتحان لے سکیں۔" ارسل کے چہرے پر عجیب سی چمک تھی۔ شازیہ بیٹے پر نظریں نہ جما سکی۔

"اور ابو! ٹیچر نے یہ بھی بتایا تھا کہ اللہ نے جانور نہیں دیکھنا ہوتا..... اللہ نے تو جذبہ دیکھنا ہوتا ہے..... ابو..... یہ جذبہ کیا ہوتا ہے؟" بیٹے کے اس سوال کا جواب شکیل کے پاس نہیں تھا..... "جواب" تو خود سوال کررہا تھا.....!

ایسا نہیں تھا کہ وہ صاحب حیثیت نہیں تھے یا ان کے دلوں میں قربانی کا جذبہ نہیں تھا۔ شکیل اس فرض کی ادائیگی کرسکتا تھا لیکن ہر سال ہی کوئی نیا خرچہ نکل آتا تھا اور یہ بھی تھا کہ جو رقم وہ پس انداز کرتے بھی تھے تو اس کی نیت اور مقصد کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ شازیہ بھی کمیٹیاں ڈالتی تھی لیکن نکلنے والی ہر کمیٹی کی رقم وہ بیٹے کی بہتر تعلیمی اخراجات کے لیے بینک میں ہی جمع کروادیتی تھی۔ ثریا بیگم گو کہ ہر سال قربانی کا سوچتی ضرور تھیں لیکن نہ جانے کیوں پھر یہ خیال ان کے ذہن سے محو ہوجاتا تھا اور وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوجاتی تھیں کہ آس پڑوس اور رشتے داروں کے ہاں سے قربانی کا گوشت آتو جاتا ہے۔ "دال سبزی" کے چاند کی روایت بھی ان کے یہاں بقرعید سے پہلے اسی لیے

قائم تھی۔

جو کام وہ تین بڑے نہیں کر سکتے تھے وہ اس آٹھ سال کے بچے نے کر دکھایا تھا۔ تین سال میں ظاہر ہے وہ اتنی رقم جمع نہیں کر سکتا تھا کہ ایک "میمنا" بھی لایا جا سکتا لیکن اس کے "شوق" نے ان بڑوں کو "شرم" ضرور دلا دی تھی۔ چنانچہ ثریا بیگم، شکیل اور شازیہ نے اپنی اپنی "زنبیلوں" سے رقم برآمد کر کے جانور کے لیے روپے اکٹھے کر لیے تھے۔

"قصے داروں" کی تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے تینوں "بڑوں" کا یہ مشترکہ فیصلہ تھا کہ جب قربانی کر ہی رہے ہیں تو "چھوٹے" کی کیوں؟ "بڑے" کی کیوں نہیں..... ایک تو اس سے گوشت کی مقدار بڑھے گی، بانٹنے کے بعد بھی اچھا خاصا گوشت خود ان کے استعمال کے لیے بھی بچ جائے گا اور پھر آس پڑوس میں خوب واہ واہ بھی ہو گی۔

ثریا بیگم یہ سوچے بیٹھی تھیں کہ خواہ شکیل کتنا ہی سستا جانور کیوں نہ لائے۔ وہ اس کی قیمت دگنی تگنی کر کے ہی بتائیں گی۔ دوسری جانب شازیہ کا دماغ "میکے" میں کس کس کے ہاں گوشت جائے گا" سے زیادہ ساس سے نظر بچا کر امی ابو اور بہنوں کے گھر گوشت کا سب سے اچھا حصہ کیسے بھیجا جائے؟ کی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا۔ جبکہ شکیل کی اڑان مختلف تھی۔ کس افسر کے گھر کون سا اور کتنا گوشت بھیجوں کہ وہ "خوش" ہو کر اس کا "گریڈ" بڑھا دے..... اس کے نزدیک قربانی سے زیادہ بہتر موقع کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا..... لہٰذا ایک موٹے تازے، لنگڑے اور لحیم شحیم بچھڑے پر تینوں متفق تھے۔ رہا ارسل تو وہ "چھوٹا" تھا اتنی "بڑی بڑی" باتیں نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کے لیے یہ احساس کافی تھا کہ وہ اللہ کی راہ میں قربانی دینے والوں میں سے ہے اور وہ بس یہی دعا کر رہا تھا کہ اللہ کی قربانی قبول فرمائے..... ٹیچر نے یہ بھی تو بتایا تھا.....!

ساڑھے دس بجے کے قریب شکیل شہ زور پر حسب منشا بچھڑے کے ساتھ سوار گلی کے کونے پر نمودار ہوا تھا اور اپنے جلو میں محلے بھر کے رنگ برنگے "شور مچاتے" بچے بھی ساتھ لایا تھا۔ شہ زور گھر کے دروازے کے سامنے رکا تھا اور شور و غل کا ایک طوفان تھا جو کہیں سے پھوٹا تھا۔

اس اثناء میں شازیہ نے ثریا کے ساتھ مل کر جانور کے استقبال طعام و قیام کی مکمل تیاری کر لی تھی۔ صحن میں جس جگہ اسے باندھنا تھا وہاں سخت زمین کو گھاس پھوس بچھا کر نرم بستر کی شکل دے دی تھی۔ پانی اور چارے کے دو بڑے ٹب تیار کر لیے گئے تھے۔ دانہ، گلے سڑے سیب اور دوسرے پھل تو شکیل پہلے ہی منڈی سے لے آیا تھا۔

اس شور شرابے میں صرف ایک انسان تھا جو "خاموش" کھڑا تھا۔ آٹھ سال کا وہ بچہ دل سے اٹھتی ہوئی خوشی۔ جذبہ قربانی ایکسائٹمنٹ اور قربانی قبول ہو جانے کی دعا جیسے آپس میں مدغم ہو کر ایک خوبصورت ساز چھیڑے ہوئے تھی۔

بچھڑا بے حد خوبصورت اور تگڑا تھا وہاں کھڑے لوگ اس کے وزن اور نکلنے والے گوشت کے بارے میں اندازے لگانے کے ساتھ ساتھ اس کی قیمت کے بارے میں بھی قیاس آرائی کر رہے تھے۔ ہلکے براؤن اور سفید رنگت کے امتزاج والا بچھڑا اس طمطراق سے کھڑا تھا کہ جیسے اس کی تاج پوشی ہونے والی ہو۔ لیکن بھلا ہو شور مچانے والے ان "بچوں" کا جن کی عمریں سات سے بائیس سال تک تھیں جن کے شور و غل سے وہ بچھڑا اس طرح گھبرا رہا تھا کہ اب بدکا کہ تب.....

اگلے مرحلے میں شکیل نے شہ زور کے مالک کے ساتھ مل کر بچھڑے کو نیچے اتارنے کی کوشش شروع کی تھی۔ شکیل کی دانش مندی کی انتہا تھی کہ پک اپ سوزوکی کے بجائے شہہ زور پر جانور لے آیا تھا۔ جیسے شہہ زور پر چڑھانا۔ جان جوکھم تھا تو اتارنا کسی بھی طرح مشن امپاسبل سے کم نہیں تھا۔

رسیاں، چارہ، کھینچا تانی ہر ہنر آزمایا مگر بچھڑے صاحب ارادھی ہوئی مجبوبہ بنے کھڑے رہے۔ شہہ زور

کے مالک کو جلدی تھی اسے واپس منڈی پہنچ کر دوسری پارٹی بھی پکڑنی تھی اور یہاں روٹھی محبوبہ کو منانے میں سراسر وقت ضائع ہو رہا تھا۔ پھر شہہ زور کے مالک کے مشورے پر ہی شکیل دوسری جانب سے جنگلے پر چڑھا اور اس نے بچھڑے کے جبڑے کے گرد بندھی رسی کو پکڑ کر دوسرے رخ کی جانب موڑنے کی کوشش کی، بچھڑے صاحب نے ایک ہی جھٹکے سے خود کو چھڑایا تھا۔ اور ایسا کر کے اس نے "تماش بینوں" کے شوق کو مزید ہوا دی تھی۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی کہ "شکیل بھائی جو جانور لائے ہیں وہ بے حد اتھرا ہے، کسی طرح قابو میں نہیں آ رہا، کہیں اترتے ہی بھاگ نہ جائے۔"

کچھ پکی عمر کے تجربہ کار کسی ماہر تجزیہ کار کی طرح اس ساری کارروائی پر تبصرے کرنے کے ساتھ ساتھ شکیل کو جانور کو سدھارنے اور نیچے اتارنے کے مفت اور مفید مشورے بھی دے رہے تھے۔ ہر تدبیر ناکام ہو رہی تھی۔ جتنا زور لگایا جا رہا تھا بچھڑا اتنی اکڑ دکھا رہا تھا۔

شہہ زور کے مالک نے دوسری جانب بھرپور طاقت سے اس کی رسی کو کھینچا تھا۔ کچھ دیر بعد بچھڑا گاڑی سے اترنے پر آمادہ تھا۔ لیکن اسی لمحے آس پاس ہاہا کار کی "انسانی" آوازوں نے اس "جانور" کو ایسا ڈرایا تھا کہ وہ اترنے کے بجائے پچھاڑ کھا کر گر پڑا۔

ارسل کی سانسیں رکی تھیں اور مجمع کا شور تھما تھا۔ شکیل نے شہہ زور کے مالک اور محلے کے دو تین مردوں کے ساتھ مل کر اس بچھڑے کو اٹھایا تھا۔۔۔۔ جو اب لنگڑاتے ہوئے باقاعدہ کراہتے ہوئے چل رہا تھا۔

اسے ایک کھونٹے سے مضبوطی سے باندھا گیا۔ شکیل نے شہہ زور کے مالک کو کرائے کی ادائیگی کے ساتھ رخصت کیا۔ اور بے حد تھکے ہوئے ہونے کے باوجود اہل محلہ کے سوالوں کے جواب دینے لگا۔

"کتنے ہزار کا لیا؟۔۔۔۔ مہنگا لے آئے۔۔۔۔"

"کتنے کلو کا ہے؟۔۔۔۔ چربی زیادہ لگ رہی ہے۔"

"کتنے دانت کا ہے۔۔۔۔؟"

اس دوران شازیہ پانی کا ٹب بھر کر دروازے تک لے آئی تھی۔ ارسل ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے سن سا کھڑا تھا۔

شکیل نے وہ ٹب بچھڑے کے سامنے رکھ دیا تھا لیکن۔۔۔۔ بعض جانور بڑے "انا پرست" ہوتے ہیں یا شاید اس بچھڑے کی ٹانگ کو لگنے والی چوٹ بہت شدید تھی کہ اس نے پانی کی جانب دیکھا تک نہیں۔ یا شاید اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے وہ پانی کا ٹب دیکھ ہی نہیں سکتا تھا یا شاید۔۔۔۔ شاید وہ خدا کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ بتا رہا تھا۔۔۔۔ کوئی شکوہ۔۔۔۔ کوئی شکایت۔۔۔۔ کسے خبر۔۔۔۔ کون جانتا تھا۔

"یار شکیل! اسے تو کافی چوٹ آئی ہے۔۔۔۔ پتا نہیں اب اس کی قربانی جائز بھی ہے یا نہیں۔۔۔۔ مولوی صاحب سے فتویٰ لینا پڑے گا۔" ایک صاحب نے بچھڑے کی ٹانگ کا معائنہ کرتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا تھا۔

"ایسا نہ کہیں ثاقب بھائی۔۔۔۔! اٹھاون ہزار کا لایا ہوں۔۔۔۔ روپیہ ڈوب جائے گا میرا۔"

ارسل بھاگتا ہوا اس بچھڑے کے پاس آیا تھا۔۔۔۔ اس نے اس کی ٹانگ پر آنے والا زخم دیکھا تھا جس سے خون رس رہا تھا۔۔۔۔ تماشا دیکھنے والے غائب ہو چکے تھے۔۔۔۔ تماشے کے "اثرات" دیکھنے والے رہ گئے تھے۔۔۔۔ ان تماش بینوں کو اگر ان کی ماؤں نے اپنی تربیت کے ذریعے انسان بنایا ہوتا تو آج ایک جانور اس حال میں کہاں ہوتا۔۔۔۔

نہ جانے ارسل کو کیا ہوا تھا۔۔۔۔ وہ رویا نہیں تھا۔۔۔۔ اس نے بس ایک سوال پوچھا تھا۔۔۔۔ بے حد خاموشی سے۔۔۔۔

"اللہ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں نا۔۔۔۔ میں نے تو کوئی غلطی نہیں کی نا۔۔۔۔ پھر کیا آپ میری محبت قبول کر لیں گے؟"

اس وقت "بھید بھاؤ" میں مصروف شکیل اور محلے کے دوسرے مردوں اور اپنے گھروں سے جھانکتی عورتوں کو یہ خیال شاید نہیں آیا تھا۔

ایمل رضا

ایک بوڑھا وجود برگد کے ذریعے اپنے شکوے اپنے پیاروں تک پہنچا رہا ہے۔
نانو ہینڈی کرافٹ کا کام کرتی ہیں۔ انار کلی بازار میں وہ ایک دکان بڑی کامیابی سے چلا رہی ہیں۔ نانو یشار اور باسل دونوں بھائیوں کی سرپرست بھی ہیں۔ یشار نفسیات کا ڈاکٹر ہے اور اپنا کلینک چلاتا ہے۔ باسل اس کا چھوٹا بھائی اس کا اسسٹنٹ ہے۔ دونوں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے فرانس جاتے ہیں جہاں ان کی ملاقات زِمل سے ہوتی ہے۔ زِمل اپنے ڈیڈ کی نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ لاتعداد ڈاکٹرز سے علاج کروا چکی ہے اور اب یشار کو آخری امید سمجھ کر اس کے پاس آتی ہے۔ علاج کے دوران باسل اور زِمل کی کئی ملاقاتیں ہوتی ہیں، جس کے باعث دونوں میں محبت کا جذبہ پنپنے لگتا ہے۔
حال کی کھڑکی بند ہوتے ہی ماضی اپنا در وا کرتا ہے جہاں نگار ایک جرات مند اور نڈر لڑکی موجود ہے۔ یونی ورسٹی کے پہلے دن کے مذاق کی بدمزگی کے بعد اسے اپنے کلاس فیلوز زیان عالم اور اس کے گروپ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے جب زیان عالم یونین کے صدر کی حیثیت سے الیکشن لڑتا ہے تو نگار اس کے مخالف مصباح کو سپورٹ کرتی ہے۔ نگار کی نظر میں زیان عالم ایک برے کردار لڑکا ہے۔ جس کی والدہ گلناب عالم بھی متنازعہ شخصیت کی مالک ہیں۔ ہال میں ہوتی تقریر

کے دوران نگار زیان کو اس کی ماں کے گرے ہوئے کردار کا طعنہ دیتی ہے اور زیان بدلے کے طور پر نگار اور حسن کی تصویریں، یونی ورسٹی کے نوٹس بورڈ پر لگا دیتا ہے۔ نگار غصے میں گرم چائے کا کپ زیان کے منہ پر دے مارتی ہے۔ زیان غصے سے پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ نگار کو اغوا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پروفیسر صغیر ربانی کی وجہ سے ناکام ہو جاتا ہے۔

نگار گھر آتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے ایک رشتہ آیا ہے.... زیان عالم کا....

یثار زمل کو پاکستان آنے کے لیے کہتا ہے کہ وہ پاکستان آکر اپنے دادا، داد کی قبریں تلاش کرے۔ زمل پاکستان آچکی ہے۔ نانو زمل سے کہتی ہیں کہ وہ ان کے گھر رہ لے، جس پر زمل نانو کے گھر رہنے لگتی ہے۔ باسل اور زمل میں محبت بڑھنے لگتی ہے۔ باسل زمل کو شادی کے لیے پروپوز کر دیتا ہے۔

حسن نگار کو چھوڑ کر امریکہ جا چکا ہے۔ نگار یونی ورسٹی کے تمام واقعات اپنے باپ کو بتا دیتی، جسے سمجھ کر وہ گلناب عالم کو زیان عالم کے رشتے کے لیے انکار کر دیتے ہیں۔ نگار کے والد یار کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے، جہاں اتفاق سے زیان عالم موجود ہوتا ہے اور وہ خدایار کا بہت خیال رکھتا ہے۔ آخر کار نگار زیان سے شادی کے لیے مان جاتی ہے۔ شادی ہو چکی ہے۔ دونوں سیر کے لیے سیاحتی مقام پر آئے ہیں۔ نگار زیان کو پسند کرنے لگی ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں وہ زیان کے ساتھ یشب اور سدیم کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ زیان ان دونوں دوستوں کی موجودگی میں نگار کو طلاق دے کر اپنی اصلیت کا نقاب الٹ دیتا ہے۔ زیان کا چہرہ اس قدر بھیانک ہوگا۔ نگار کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس کی گردن دبوچ کر اس پر شراب الٹ دیتا ہے۔ تین شیطان صفت انسان حوا کی عزت پر غالب آجاتے ہیں۔

ایک ہفتے بعد نگار اس ریسٹ ہاؤس سے نکلنے میں کامیاب ہو پاتی ہے۔ وہ رحمٰن، رحیم، ہادی خدا سے اب "عادل" بننے کا تقاضا کرتی ہے لیکن زیان کی بچھائی بساط میں ابھی صرف مہرے ہی آگے کو کھسکے ہیں۔ نگار کی شکست کا لمبا کھیل باقی ہے۔ گلناب عالم بالآخر زیان کی سنائی کہانی پر یقین کر لیتی ہیں۔

نگار گھر آتی ہے تو ہمایوں بھیا اور زلیخا بی اس پر لعن طعن کرتے ہیں کہ وہ ریسٹ ہاؤس میں زیان کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ

مکمل ناول

بھاگ گئی تھی۔ ہمایوں نگار کو زبردستی گلناب عالم کے گھر لا کر ان کے پیروں میں پٹختا ہے۔ نگار کی کسی بات کا یقین نہیں کیا جارہا۔ اس کے آنسو بے فائدہ ہیں۔ زیان آتا ہے اور نگار پر یہ الزام ثابت کردیتا ہے کہ وہ اس سے شادی پر خوش نہیں تھی۔ اس نے خدا یار کے کہنے پر شادی کی۔ اور اب وہ اس سے طلاق چاہتی ہے۔ نگار زیان عالم کے منہ پر تھوک دیتی ہے۔ زیان طیش میں آجاتا ہے اور نگار سے زبردستی کرتا ہے۔

"اللہ کی ڈھیل کو اس کی کمزوری نہ سمجھو۔" صغیر ربانی عین موقع پر پہنچ کر زیان کے منہ پر تھپڑ مار کر کہتے ہیں۔

زمل باسل کو شادی کے لیے ہاں کہنے کے لیے شطرنج پر "یس" لکھواتی ہے۔ نانو باسل اور زمل کی محبت سے واقف ہیں۔ مصباح کا قتل یشب نے کیا تھا۔ زمل کو یہ بات معلوم ہوجاتی ہے۔ یہ خبر اس کے لیے حیران کن اور دل توڑ دینے والی ہے۔ اسے اپنے ڈیڈ کی معصومیت پر دکھ ہے کہ سب نے مل کر اس کے ڈیڈ کی زندگی میں زہر گھولا اور انہیں ذہنی مریض بنا دیا۔ نانو زمل کو نگار کو کھانا دے کر آنے کا کہتی ہیں۔ تب حال کی نگار، برگد کے سامنے بیٹھا بوڑھا وجود اپنے کمرے میں چلا رہا ہوتا ہے۔ "میری عزت کے ساتھ کھیلنے والے وہ تین تھے۔" "سدیم، یشب اور زیان عالم" زمل پر یہ لفظ بجلی بن کر گرتے ہیں۔

چوتھی قسط

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

"سدیم.... یشب.... اور زیان عالم۔" آواز پوری توت سے گونجتی ہوئی افق پار تک چلی گئی تھی۔ اور چھت پر بیٹھی نانو کا ہاتھ اس بری طرح کانپا تھا کہ پتی کا خاکہ ایک بار پھر سے خراب ہوگیا تھا۔ انہوں نے اپنا دل تھام لیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

وہ کس کس بات کا سوگ منائیں۔ اس لیمپ کو روشن دیکھنا اس قدر اذیت ناک کیوں ہوگیا تھا۔ کیا ان کی قسمت بھی ان لوگوں جیسی تھی جو ایک چراغ جلاتے جلاتے اپنا پورا گھر جلا لیتے ہیں اور انگلیاں بھی۔

انہیں مزید کیا کیا سننا پڑے گا اور آخر کب تک.... کاش وہ بہری ہوجائیں.... اگر نہیں تو وہ خود میں اتنا برداشت کا مادہ کہاں سے لائیں.... یہ مادہ تو وہ نایاب شے تھا جو ان کی دکان سمیت پورے بازار میں کسی کے پاس موجود نہیں تھا۔ نہ زرد میں نہ کاہی میں اور نہ ہی سیاہ میں.... اللہ ان کا یہ غم ختم کیوں نہیں کردیتا "ان کے سمیت".... انہوں نے اللہ سے شکوہ کیا۔ اور اپنے شکوے پر پھر خود ہی شرمندہ ہوگئیں.... اس گھر سے اللہ کے پاس آخر کتنے شکوے جائیں گے.... کیا بس نگار ہی اس کام کے لیے کافی نہیں ہے"

اٹھائیس سال گزر چکے تھے اور زندگی ابھی بھی اسی شاہراہ کی مانند تھی جس پر ہر دو میل کے بعد کانٹوں بھرا جنگل پار کرنا پڑتا ہے۔ نگار مستقل مزاج تھی.... برگد چپ.... ندائے سلطانی غیر حاضر.... کوئی ایک بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بجلی کی کڑک کے ساتھ انہیں اور بھی بہت کچھ سنائی دیتا تھا۔ ان کا کمرہ نگار کے کمرے کے ساتھ تھا.... قوسی سلاخ دار کھڑکی کے ساتھ.... وہ یہ کمرہ بشارا یا باسل کو کیسے دے سکتی تھیں۔ اپنے بنائے گھونسلے کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے نیچے گرا دینے کا حوصلہ تو بانجھ پرندوں میں بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو پھر ماں بننے کے تجربے سے گزر چکی تھیں۔

انہوں نے اپنے اوزار سمیٹنے شروع کردیے۔ اب وہ کام کرنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ کم از کم آج کے دن تو ہرگز نہیں.... چاندی کی سفید شیٹ پر خاکے کی سیاہ لکیریں بھی چھپ گئی تھیں۔ دھوپ نہیں دور جاسوئی تھی۔ اور کالے اودے بادل اُمڈ اُمڈ کر اکٹھے ہورہے تھے۔ نانو کی نظر تو ویسے بھی دن بدن کمزور ہورہی تھی۔ نفاست کی شرط کو وہ اتنی بھی ڈھیل نہیں

دینا چاہتی تھیں..... جہاں چیزوں کی کاملیت میں اللہ کی رحمت کارفرما ہوتی ہے۔ وہیں ادھورے پن میں بھی ہوتی ہے۔ کوئی انجانی قوت ہمیں وہ کام کرنے سے روک رہی ہوتی ہے۔ مگر جب ہم ضد باندھ کر اسے مکمل کرنا چاہتے ہیں تو نقصان چاندی کی خراب شیٹ کی طرح ہی دل پر گراں گزرتا ہے۔

نانو اٹھ کر چھت کی دیوار تک آئیں۔ ان کالے اودے بادلوں کو بھی پورے جہاں میں ایک ان کا گھر ہی نظر آتا تھا۔ جو وہ بار بار یہیں چلے آتے تھے۔ کوئی بلاتا تھا انہیں یا کوئی حکم دیتا تھا ادھر آنے کا۔ بجلی تھوڑی دیر کڑکتی رہی۔ پھر بادل پھٹ گئے اور آسمان کھل گیا۔ نانو کی نظریں افق پر ہی ٹکی رہیں۔ سرخ بنفشی لکیر کو دیکھتے دیکھتے وہ ماضی کے ماہ و سال میں گم ہونے لگیں۔

وہ ماضی اٹھائیس سالوں جتنا ہی لمبا تھا۔ عجلت اور جلدی میں اس کے ایک ایک جز کو پرکھا نہ جاسکتا تھا۔ اس کے لیے حوصلہ بھی وافر چاہیے تھا اور آنسو بھی۔

شاید اللہ ان سے ناراض ہوگیا تھا۔ جو نگار کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا۔ وہ جانے انجانے میں کوئی گناہ کر بیٹھی تھیں۔ جس کی سزا نگار کو بھگتنی پڑی۔ اور اب وہ معافی مانگیں تو کیسے؟ اس کرب کو کم کریں تو کیوں کر؟

وہ بے حس و حرکت کھڑی بڑی دیر تک اپنی آنکھوں سے نکلتے آنسو صاف کرتی رہیں۔ پھر ساری ہمت اور ساری چیزیں سمیٹ کر نیچے اتریں۔ نگار کے کمرے کے سامنے سے گزرتے وقت ان کی نظر دہلیز کے قریب گرے کھانے پر پڑی تو وہ رک گئیں۔

"لگتا ہے زمل نے بے دھیانی میں کھانا گرادیا ہے۔"

انہوں نے سوچا اور اپنا سارا سامان کمرے میں رکھ کر وہ نگار کے کمرے میں واپس آگئیں۔ دکھ بھری آنکھوں سے نگار کو دیکھتے ہوئے وہ کھانا اور ٹوٹے برتن سمیٹنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"میری عزت کے ساتھ کھیلنے والے وہ تین تھے..... تین۔"

سدیم..... یشب..... اور زیان عالم۔

آواز اس کے ساتھ ہی جیسے کمرے میں آئی تھی۔ اور اب دروازوں کھڑکیوں سے ٹکرا رہی تھی۔ زمل کا سر پھٹنے پر آگیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا سر مضبوطی سے تھام لیا۔ اعصاب وحشی گھوڑے کی مانند بے قابو ہو رہے تھے۔ اسے لگا آج اس کے دماغ کی ساری نسیں پھٹ جائیں گی۔ سرخ ہوتے چہرے سے نیچے اپنا وجود اسے بیگانہ بیگانہ سا لگنے لگا تھا۔ بے قراری سے چلتے چلتے جب وہ اپنے ہی کمرے میں میلوں کا سفر طے کر چکی اور پھر بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ بیڈ پر گر کر زار زار رونے لگی۔

سوچیں سمندر کی بپھری طوفانی لہروں کی مانند چوٹیوں تک جا پہنچیں۔ خیالات اس کی آنکھوں میں سنگریزوں جیسی چبھن دینے لگے۔ وہم، وسوسے، خدشے..... اس کے گرد ناچنے لگے۔ جیسے آگ کے الاؤ کے گرد آدم خور ناچتے ہیں۔ وہ اس وقت آگ کا الاؤ ہی تو تھی۔ اور کسی اور کو جلانے کے بجائے خود ہی جل رہی تھی۔

ایک ایک چیز اس کے ذہن کے پردے پر ہتھوڑی کی زوردار ضرب کے ساتھ نقش ہو کر ابھرنے لگی۔ اس کے ذہن کے بہت سے خوش رنگ پتوں کے خاکے، اوزار کی غلط چوٹ پڑنے سے بدصورت ہوگئے۔

"دعا کرو زمل..... میرے سامنے..... میرے لیے دعا کرو۔" سدیم انکل نے اپنی زندگی کی آخری رات اس سے کہا تھا۔

"میں آپ کے لیے روز دعا کرتی ہوں سدیم انکل۔"

"میری صحت کے لیے نہیں زمل..... میری بخشش کے لیے دعا کرو..... دعا کرو، اللہ مجھے بخش دے..... میرے گناہ معاف کردے....."

"آپ بہت نیک ہیں سدیم انکل۔"

"نہیں، میں بہت گناہ گار ہوں زمل.... دعا کرو، وہ میرے ساتھ انصاف نہ کرے.... رحم کرے۔"

یاد کر کے وہ مزید رونے لگی۔ سدیم انکل زندہ ضمیر کے اندھیروں سے ڈر جانے والے آدمی تھے۔ انہیں احساس گناہ کھا گیا تھا۔ ان کے ہر وقت کی عبادت، قرآن کی تلاوت میں غرق رہنے کی وجہ وہ اب جان پائی تھی۔ وہ اللہ کو خوش کر رہے تھے۔ اسے منا رہے تھے۔ اپنے گناہوں کی معافی چاہ رہے تھے۔ وہ موت کے آنے سے کسی قدر مطمئن تھے۔ انہیں کینسر ہو گیا تھا۔ ان کے خیال میں انہیں ان کے گناہ کی بیشتر سزا دنیا میں ہی دے دی گئی تھی۔ اور باقی سزا....؟

"تم رونا.... گڑگڑانا.... اللہ بچوں کی زبان سنتا ہے زمل.... وہ تمہاری دعا ضرور قبول کرے گا.... تم اللہ سے التجا کرنا کہ وہ مجھے آگ میں نہ ڈالے۔" وہ گڑگڑائے تھے۔

وہ جہنم کی آگ سے کس قدر خوف زدہ تھے۔ زمل اب ان کے لیے دعا کیسے کرے؟ کیا وہ کبھی ان کے لیے دل سے دعا کر پائے گی۔

"وہ مجھے معافی دلوا دے.... معاف کر دے۔"

"معافی دلوا دے.... معافی دلوا دے.... معافی دلوا دے...." تو کیا قدرت نے اس کے ساتھ کھیل کھیلا تھا۔ وہ یہاں قبریں نہیں معافیاں تلاش کرنے آئی تھی۔ اس کا استعمال کس قدر آسانی سے لیا گیا تھا۔ قدرت کے اس بدرنگ کھیل پر اسے مزید رونا آیا۔

یشب انکل اکثر غصے میں ڈیڈ سے جھگڑے کے دوران ان پر ذو معنی طنز کیا کرتے تھے۔ جسے سن کر ڈیڈ خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ وہ ان ذو معنی باتوں کو کبھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اور اب اس سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ ڈیڈ کی بیماری کی موجودہ صورت حال اس کی وجوہات بھی.... ڈیڈ کا بھی سدیم انکل کی طرح احساس گناہ سوا ہو گیا تھا۔

"میری پرانی چیزوں میں میرا ماضی نہیں ہے.... اور میرے ماضی میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

ڈیڈ نے جھوٹ بولا تھا۔ ان کے ماضی میں تو اتنا کچھ تھا کہ آنے والی سات نسلوں کو تباہ و برباد کر سکتا تھا۔

یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ اس کے پاس نہیں تھی۔ نانو وقتاً فوقتاً اداس چہرہ لیے زمل کو بتا چکی تھیں کہ نگار کی پہلی شادی کا تجربہ بہت برا رہا ہے۔ قدرت نے اس کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔

اس کے ڈیڈ کی پہلی شادی پاکستان میں ہوئی تھی اور یقیناً "نگار آنٹی" سے ہی ہوئی تھی۔ سدیم انکل کو معافی چاہیے تھی.... یونیورسٹی کے پروفیسر نے کہا تھا کہ۔

"وہ قتل زیان کے دوست نے کیا تھا.... یشب نام تھا اس کا۔" اور اب کمرے میں بند نگار آنٹی کہہ رہی تھیں کہ "میری عزت کے ساتھ کھیلنے والے وہ تین تھے۔ سدیم، یشب اور زیان عالم۔ اتنے بھیانک اتفاقات جھوٹے نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ جانتی تھی۔

وہ جن اسباب کو دریافت کرنے یہاں آئی تھی۔ جس مضبوط محرک کا کھوج اسے درکار تھا وہ اب اس کے سامنے تھا۔ اور اس طرح تھا جس طرح شفاف آئینہ ہوتا ہے۔ اس آئینے میں اسے سدیم انکل.... یشب انکل.... اور اپنے ڈیڈ کی صورتوں کے بھیانک عکس نظر آ رہے تھے۔ اور وہ اپنوں کے بدرنگ چہروں سے ہی خوف کھا رہی تھی۔ اس خوف سے بہتر تھا اسے موت آ جاتی۔ اس انکشاف سے بھلا تھا کہ غار کا دہانہ اس پر بند کر دیا جاتا۔ گھپ اندھیرے میں اپنی ذات کے وسوسے ہوتے "اپنوں کے نہیں۔

وہ اپنی بے قراری کا کوئی بھی حل نکالنے سے قاصر تھی۔ دماغ کے ساتھ ساتھ اب اس کا دل بھی پھٹا جا رہا تھا۔ آنسوؤں نے جب تکیے اور چادر کو خوب اچھی طرح سے بھگو دیا تو.... وہ جھٹکے سے بیڈ پر سے اٹھی۔ ایک حل اس نے جلد ہی نکال لیا تھا.... ذہن میں کوئی گھنٹی بجی تھی اور اس نے لبیک کہہ دیا تھا۔

"مجھے اس گھر سے بھاگ جانا چاہیے.... فوراً"....

ابھی..... اسی وقت..... کسی ایک کو بھی خبر ہوئے
بغیر..... یہ پتا چلے بغیر کہ میرا اسدیم 'یشب یا زبان عالم
نامی انسانوں سے گہرا تعلق ہے..... ورنہ پھر یہ مجھے قتل
کرنے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں لگائیں گے۔"

اس نے سوچا..... اپنی محدود استطاعت کے مطابق
بالکل ٹھیک سوچا اور پھر اپنی سوچ پر فوراً" ہی عمل در آمد
شروع کر دیا۔

سوٹ کیس کھول کر اس نے اپنا سارا سامان اور
لباس وغیرہ اس میں ڈالنے شروع کیے۔ جوتے' بیگز'
جو جو چیز اس کی نظروں کے سامنے آتی گئی' وہ بنا ترتیب
اسے سوٹ کیس میں ٹھونستی گئی۔ پھر اس نے ڈریسنگ
پر پڑی اپنی میک اپ کی چیزوں کو ایک ہی جھٹکے میں
دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور دونوں بھرے ہاتھ
سوٹ کیس میں الٹ دیے۔ کون سی چیز کہاں کہاں
پڑی ہے یا گھر کے کس کس کونے میں ہے اس نے اس
معاملے میں زیادہ نہیں سوچا۔ اس نے اپنے ذہن کو
زیادہ تھکنے نہیں دیا۔ اسے اب ان چیزوں کی ایسی کوئی
چاہت بھی نہیں رہی تھی۔ بس وہ اس گھر میں اپنی
موجودگی کے تمام نشانات ختم کرنا چاہتی تھی۔ ہینڈ بیگ
میں پڑے پاسپورٹ کو دیکھ کر اس نے تسلی کی اور تب
ہی اس کی انگلیوں سے شیشے کی ایک بوتل ٹکرا گئی۔
تیزی سے کام کرتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ دل
پر ایک دم سے پہاڑ جیسا بوجھ جو آپڑا تھا۔ اسی بوجھ کو
اٹھائے اٹھائے اس نے اس بوتل کو باہر نکال لیا۔
آنکھیں بند کر کے آنسوؤں کو ضبط کیا۔

"یا اللہ..... اگر اس امتحان میں ہر صورت ناکامی ہی
میرا مقدر تھی..... تو تو نے مجھے کامیابی کے خواب کیوں
دیکھنے دیے۔" اس نے گلہ کیا۔ وہ دوبارہ رونے بیٹھ
جاتی اگر چپکے سے اسے یہاں سے نکل جانا نہ ہوتا۔
لیکن ایک مسئلہ در پیش تھا۔ وہ اس بوتل کو ساتھ لے
جائے یا یہاں ہی چھوڑ دے..... لمحوں میں بہت زیادہ
سوچ لینے کے بعد اس نے بوتل کو ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ
دیا۔

"باسل خود ہی سمجھ گا۔" وہ ایک لمبا خط بھی ضرور

لکھ دیتی۔ اگر اس کے پاس اتنی ہمت ہوتی۔

جلدی جلدی ہاتھ چلاتی وہ اپنا سوٹ کیس بند کر رہی تھی۔ جب ایک ہاتھ اس کے کندھے پر پڑا۔ اور اس نے شدید خوف کے باعث ایک دل دوز چیخ ماری۔ اور پلٹی۔ باسل حیرت کی تصویر بنا اسے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا زمل؟" اس کی چیخ نے جیسے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

"خیریت.....؟"

"وہ..... وہ میں" وہ بری طرح گھبرا گئی۔ وہ باسل کی اتنی جلدی آمد کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔ باسل نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ پھر اس کے پیچھے سامان کو۔ زمل سوٹ کیسز کے آگے کھڑی ہو کر انہیں چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

"کہیں جا رہی ہو؟" اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں..... یہ تو۔"

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے زمل!"

"ہاں..... ہاں..... بالکل۔" وہ کچھ بھی صحیح طریقے سے بولنے سے قاصر تھی۔

"تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں....." باسل نے کہا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ ملنے لگی۔ باسل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تم رو رہی ہو؟" اور اس بار اس نے اپنی گردن جھکا لی۔

"تم بہت زیادہ رو چکی ہو زمل!" وہ کہہ رہا تھا۔ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

"مجھے بتاؤ۔ کیا ہوا ہے زمل! کسی نے کچھ کہا ہے۔" وہ بے چین ہوا۔

"نانو نے کچھ کہا ہے؟" وہ اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کے پوچھنے لگا۔ اس کی اس بے چینی نے زمل کو مزید بے چین کر دیا وہ مجرم سی بن گئی۔ اور زمل کا دل کیا کہ اس کے سینے کے ساتھ لگ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ دل کا سارا غبار نکال دے۔ اور اسے سب بتا دے۔ جو وہ پوچھ رہا ہے۔

"بتاؤ زمل! کیا ہوا ہے۔ کسی نے کیا کہا ہے تم سے؟" کس نے کہا ہے؟" ہاں کہا ہے۔ نگار آنٹی نے..... اور اس طرح کہا ہے کہ میرے سارے اثاثے ہی چھین لیے ہیں..... محبت بھی..... لیکن وہ نگار آنٹی کا نام کیسے لے کہ انہوں نے کیا کہا ہے وہ سب کیسے بتائے۔ زبان، روح، دل و دماغ، کیا اس کا ساتھ دیں گے۔ کیا وہ غش کھا کر گر نہیں جائے گی۔

"اپنے ڈیڈ کو مس کر رہی ہوں۔" اس نے جھوٹ بولتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔ ہر پریشانی۔ کا حل اس نے خوب نکال رکھا تھا "ڈیڈ"۔

"اوہ!" باسل نے گہرا ٹھنڈا سانس چھوڑا۔ جیسے اس کی جان میں جان آئی ہو۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا زمل..... تم بھی ناں..... بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہو۔"

وہ پیار سے اسے سمجھانے لگا۔ شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم بہت جلدی پریشان کر دیتی ہو۔

"نانو بتا رہی تھیں..... تم چند دن پہلے رات کو ڈر بھی گئی تھیں۔ بہت بری طرح سے اور پھر رونے لگی تھیں....." وہ تصدیق کر رہا تھا۔ اس کی بات کے ساتھ ہی زمل کو اس رات کا خواب بھی یاد آ گیا۔ تو وہ خواب اشارہ تھا۔ اور حقیقت بھی..... ایک درخت کی جٹاؤں نے اسے مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ وہ اپنا آپ چھڑاتی رہی لیکن مضبوط جٹائیں اس کے وجود کے گرد بل پر بل دیتی رہی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ زمل نہیں جانتی تھی کہ وہ سب کیا تھا۔ اور اب سمجھنے میں اسے کوئی دشواری نہیں تھی کہ وہ سب کیا تھا..... وہ بدلہ تھا..... مکافات عمل تھا اور وہ انجان درخت برگد کا تھا۔ اس خواب کی تعبیر کا ایک حصہ یہ تھا۔ بہت سے حصے ابھی باقی تھے۔ اور عنقریب پورے ہونے والے تھے۔ جو وہ یہ جان جاتی تو خودکشی کر لیتی۔

"تم بھی یشار سے اپنا علاج کروا لو..... نانو اس طرح اٹھ اٹھ کر راتوں کو تمہارے پاس آتی رہیں تو صبح شاپ پر نہیں جا سکیں گی۔" وہ ہنسا اور زمل بمشکل مسکرا سکی۔ وہ خاموشی سے اس معصوم فرشتے کی شکل

دیکھنے لگی۔

"زمل بیٹی! سارا کھانا فرش پر گرا ہوا تھا۔" نانو بھی وہیں آگئی تھیں۔

"باسل! تم آگئے؟"

"جی ابھی آیا ہوں..... یشار کو کہیں جانا تھا اس لیے میں گھر آگیا....."

"مجھے ٹھوکر لگی تھی نانو.....! اس لیے کھانا گر گیا۔" اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اسے ٹھوکر ہی تو لگی تھی۔ لیکن دہلیز کی نہیں..... قسمت کی..... اور یہ ٹھوکر بھی ایسی تھی کہ وہ سالوں اٹھ نہ سکتی تھی۔ کوئی زخم نہیں تھا..... پھر بھی وہ لہولہان تھی۔

"کوئی بات نہیں..... میں نے صاف کر دیا ہے..... اور نگار کو اور بھی دے دیا ہے..... تم فکر نہ کرو....." نانو کہتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

"تمہارا اس طرح روز امی کو کھانا دینا، امی کو بہت اچھا لگتا ہو گا۔" باسل نے اس سے کہا۔ "لیکن وہ ایسی باتوں کا اظہار نہیں کرتیں۔" افسردگی سے وہ خلاؤں میں دیکھنے لگا۔

"اور اگر اس کو علم ہو جائے کہ اس کی ماں کو زندہ درگور کرنے والوں میں سے ایک کی بیٹی اس وقت اس کے سامنے موجود ہے تو یہ میرے ساتھ کیا کرے۔" خوف سے وہ مزید کانپی۔

باسل خود کلامی کرتا ہوا اسے اپنی امی کے بارے میں چند اور بھی باتیں بتا رہا تھا۔ جسے زمل توجہ سے سن نہیں پا رہی تھی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ بس باسل کو دیکھ رہی تھی۔ بھیگی آنکھوں کے ساتھ۔

✡ ✡ ✡

بہار جیسے جوبن پر پہنچ کر جل گئی تھی۔ حبیب اللہ روڈ پر تپش بڑھنے لگی۔ پرانے مکان کی سرخ اینٹیں دہکتے دہکتے خاکستر ہو گئیں۔ کھڑکیوں کے رنگین شیشے بے رنگ ہونے لگے۔ اس ساری صورت حال نے نانو کے دل پر بڑی گہری اداسی طاری کر دی۔

پورا ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ زمل کا بخار اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ نانو اس کی حالت دیکھ دیکھ کر پریشان تھیں۔ ڈاکٹرز کی دوائیاں بے اثر جا رہی تھیں۔ اس کی حالت سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔ اور کمزوری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ پورا ایک ہفتہ نانو دکان پر بھی نہیں گئی تھیں۔ وہ زمل کے سرہانے بیٹھ کر اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی میں پٹیاں بھگو بھگو کر رکھتی رہی تھیں۔ باسل بھی پریشان ہو گیا تھا اور یشار بھی۔

معمولی بخار تھا جو بڑھتا ہی گیا۔ نانو روز ڈاکٹر سے اس کا معائنہ کروا رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ اس کے مرض کی تشخیص ڈاکٹروں کے بس میں نہیں ہے۔ اس کے مرض کی تشخیص تو ہو چکی ہے۔ "گھاٹا" ہر طرف سے محبت سے بھی..... اور جذبوں سے بھی..... "بے بسی" عہد گزشتہ میں جا کر سب ٹھیک کر آنے کی۔ اور "لاچاری" یادداشت کھو دینے کی۔

سدیم انکل..... اس کے بچپن کے دوست..... ان کا دامن داغ دار نکل آیا تھا۔ جس کی اسے ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس کے ڈیڈ..... جنہیں وہ آج سے پہلے تک فرشتہ سمجھتی آئی تھی..... شیطان کی صفوں میں کھڑے پائے گئے تھے..... یشب انکل..... اس کا سوتیلا باپ..... وہ ایک قاتل تھے..... اس کی محبت..... جو بے لوث تھی..... بے غرض اور مخلصانہ..... اس محبت کا گلا بس اب گھٹنے کے قریب ہی تھا۔ وہ بیمار نہ ہوتی، کیسے نہ ہوتی..... دن رات سوچ سوچ کر وہ اپنی حالت مزید بگاڑنے لگی۔ اس کا چہرہ بھی اپنا رنگ و روپ کھونے لگا۔

"بس کرو یار.....! ٹھیک ہو جاؤ اب..... بیمار رہنے کا ڈراما کر کے بہت پیار سمیٹ لیا تم نے نانو کا....."

باسل اس کے کمرے میں آکر اکثر اس طرح کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اسے ہنسانے کے لیے۔ اس کی مسکراہٹ دیکھنے کے لیے۔ اور وہ بخار سے اتنی بے ہمت ہو گئی تھی کہ اس کی خاطر بھی مسکرا نہیں سکتی تھی۔

نانو نے ایک دو بار اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ اس

کے ڈیڈ سے اس کی بات کرادیں۔ یا انہیں اس کی حالت کے بارے میں بتادیں۔ جواباً" زمل نے انکار کردیا تھا۔ فی الحال وہ ڈیڈ کی آواز سننا نہیں چاہتی تھی۔

٭ ٭ ٭

موسم نے بڑے دنوں کے بعد کروٹ بدلی تھی۔ اور وہ اجلا اجلا سا دن ہر طرف چھا گیا تھا۔ سردی ہو یا گرمی، بہار ہو یا خزاں... دھرتی پر زیادہ دن اپنا قیام رکھے تو اکتاہٹ کا باعث بن جاتا ہے۔ موسم کا وہ تسلسل اس دن اختتام پذیر ہوا تھا۔

باسل نے پیچھے پلٹ کر درختوں کے سائے میں گم صم بیٹھی زمل کو چلا کر پکارا۔

"دھوپ اتنی تیز بھی نہیں ہے... اور جتنی تیز ہے اس کی تمہیں ضرورت ہے۔" زمل باسل کی بات سن کر وہیں بیٹھے بیٹھے پھیکی مسکراہٹ سے مسکرائی۔ لیکن وہ اٹھ کر اس کے قریب نہیں آئی تھی۔

باسل مصنوعی جھیل کے قریب پیر لٹکائے بیٹھا تھا اور جھیل کے پانی میں مچھلی پکڑنے کی ڈوری کا کانٹا ڈالے انتظار کی کوفت سے دوچار ہو رہا تھا۔

آج زمل کی طبیعت بڑے دنوں کے بعد نانو کو کچھ بہتر محسوس ہوئی تو انہوں نے باسل سے کہا تھا کہ وہ اسے کہیں لے جائے۔ اس طرح اس کا دھیان بھی بٹے گا اور تازہ ہوا بھی ملے گی... دو ہفتوں سے کمرے میں بند ہے... باسل کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا بھلا... لیکن زمل نے انکار کردیا تھا۔

"میری طبیعت ابھی اتنی بہتر نہیں ہوئی نانو کہ میں کہیں آجا سکوں۔" اس نے جواز پیش کیا۔

"بیماری کی نقاہت ہے تمہیں اور کچھ بھی نہیں... عارضی بیماری کو حاوی کرلیا ہے تم نے خود پر... باہر نکلو گی تو بہتر محسوس کرو گی۔"

نانو نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور زبردستی اسے غسل خانے میں بھیج دیا۔ خود نانو اس کی وارڈ روب کھول کر اس کے لیے ایک اجلے رنگوں والی فراک پریس کرتی رہیں... نہا کر اور نئے کپڑے پہن کر وہ فریش ہوگئی تھی... لیکن پارک میں آکر اس کی حالت پھر ویسی ہی ہوگئی۔

جھیل کا پانی گدلا تھا۔ جو اسے سیاہ لگا۔ درخت سرسبز تھے اور سارے کے سارے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی جٹائیں نہیں تھیں۔ اور شاخیں ہلاتے جلاتے ہوئے جیسے وہ اسے کوئی دھمکی دے رہے تھے۔ بڑے ضبط سے اس نے اپنی بے ساختہ چیخوں کو روکا۔ خود کو یہ باور کرواتے ہوئے کہ یہ اس کا وہم ہے۔ صرف وہم بھلا درخت بھی کسی کا گلا گھونٹ سکتے ہیں... کسی کو قتل کرسکتے ہیں... خود کو سمجھاتے ہانپتی کانپتی وہ درخت کی ہی چھاؤں تلے نصب سنگی بینچ پر بیٹھ گئی۔ اسے اب ایک ایک چیز سے ڈر لگنے لگا تھا... دیواروں سے، دروازوں سے، کھڑکیوں سے...

یہ صورت حال ڈراؤنے خوابوں سے بھی زیادہ اذیت ناک تھی... پہلے وہ نیند سے ڈرتی تھی اور اب بے دار رہنے سے...

"یہاں لکھا ہے اگر مچھلی کانٹے میں نہ آرہی ہو اور آپ بور ہو رہے ہوں تو کسی اپنے سے بات چیت شروع کردیں۔" باسل نے بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر دوبارہ چلاتے ہوئے کہا۔ وہ اس سے کافی فاصلے پر بیٹھی تھی۔ اپنی بات اس تک پہنچانے کے لیے اسے چلانا پڑ رہا تھا۔ بات سن کر زمل مسکرائی۔ اور چار و ناچار بینچ پر سے اٹھی۔ وہ بھلا باسل کو کیوں بور کر رہی تھی۔ آہستگی سے چلتی ہوئی وہ باسل کے قریب آنے لگی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ۔

"میں جھیل کے پانی کے قریب نہیں جاؤں گی... پھر پانی مجھے کیسے ڈبوئے گا... ہاں جھیل میں کوئی جن بھی نہیں ہے۔ جو باہر نکل کر میری گردن مروڑ دے گا... سب سوچ ہے میری... ایسا صرف کہانیوں میں ہوتا ہے۔"

ڈرتے ڈرتے وہ باسل کے پاس سرسبز نرم گھاس پر بیٹھ گئی۔ پہلے تو وہ بڑی دیر تک پتھر آنکھوں سے جھیل کے پانی کو دیکھتی رہی اور جب کافی وقت گزر جانے کے بعد بھی وہاں سے کوئی جن برآمد نہ ہوا اور

اس کی تسلی ہوگئی تو گھٹنوں پر چہرہ ٹکا کر وہ گھاس میں اپنی انگلیاں گھمانے لگی۔ باسل ٹیڑھی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

"کوئی بات کرو۔" اس نے کہا۔

"کیسی بات؟" اس نے چہرہ اوپر نہ اٹھایا۔

"کوئی بھی، جو یہاں کے ماحول سے مطابقت رکھتی ہو۔"

"میرے پاس تو اب کال کوٹھڑیوں سے مطابقت رکھنے والی باتیں ہیں۔ وہ تمہیں کہاں اچھی لگیں گی۔ اور تم کیا سمجھو گے انہیں....." دکھ سے وہ سوچ کر رہ گئی۔

"جب میں نے تمہیں ہوٹل کی لابی میں پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے لگا تھا کہ یہ کوئی چھوٹی سی بچی ہے جو میگزین پڑھ رہی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اگر تم قد میں بڑی نہ ہوتیں تو میں واقعی تمہیں کوئی ننھی سی بچی ہی سمجھتا۔" وہ خود ہی بولا اور بتا کر پھر خود ہی ہنسنے لگا۔

"حیران تو میں بھی ہوئی تھی تمہیں دیکھ کر..... تمہاری شکل ایثار بھائی سے ملتی ہے نا۔ تب ان سے میں تھوڑی دیر پہلے ہی ملی تھی۔"

"ہاں میری شکل ایثار بھائی سے بہت ملتی ہے....." اس نے اس کی بات کی تصدیق کی۔

"اور یہاں آکر معلوم ہوا کہ تم دونوں بھائیوں کی شکل نگار آنٹی سے ملتی ہے۔"

"ہاں..... ہم دونوں کی شکل امی سے ملتی ہے۔" اس نے پھر تصدیق کی۔ لیکن اس بار بڑھے دھیمے لہجے میں۔ اور اتنے دھیمے کہ زمل کو بڑا دھیان لگا کر سننا پڑا۔

"نگار آنٹی.....!" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔

"اوہ شاید مچھلی آگئی کانٹے میں۔" اس نے اس کی بات کاٹی۔ اور ایسا کم و بیش تیسری بار ہوا تھا۔ اس کے منہ سے جب بھی نگار آنٹی کا لفظ ادا ہوا۔ باسل نے ایسا ہی کیا..... وہ خود سے بتا دیتا تھا۔ جو وہ چاہتا تھا یا جو بے اختیار اس کے لبوں پر آتا تھا۔ لیکن زمل کے تشویش زدہ جملوں کی تسلی شاید اس کے پاس نہیں تھی۔ یا وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"باسل!" اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ یہ آنکھ مچولی کا کھیل کافی دن سے چل رہا تھا۔ زمل تنگ آچکی تھی..... اپنے کندھے پر زمل کے نازک ہاتھ کا لمس پا کر باسل چونکا۔

"کہو۔"

"میں نگار آنٹی کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔" اس نے دو ٹوک کہا حالانکہ اسے یاد تھا کہ جب وہ نئی نئی اس گھر میں آئی تھی اور نگار آنٹی سے بھی واقف ہوئی تھی تو تب نانو نے اس سے کہا تھا کہ وہ ایثار یا باسل سے کبھی بھی نگار کے حوالے سے کوئی بات نہ پوچھے۔ اس نے نانو کی بات مان لی تھی۔ اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی..... اور اب..... اف یہ حالات..... کتنی جلدی پلٹا کھاتے ہیں..... اب وہ ان سوالوں کے جوابوں کی محتاج بنی گھوم رہی تھی۔

"کہو..... کیا تم نے نانو سے کبھی کچھ نہیں پوچھا؟" اس نے اسے لاجواب کیا۔

"پوچھا ہے۔" اس نے بھی اعتراف کیا۔ "اور انہوں نے بتایا بھی ہے۔"

"پھر میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ نانو جھوٹ نہیں بولتیں۔ انہوں نے تم سے غلط بیانی نہیں کی ہوگی۔"

"لیکن میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"میرے حوصلے کو اتنا مت آزماؤ زمل.....! میں تمہارے جتنا باہمت نہیں ہوں۔ ہم دونوں بھائی اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ نانو نے ہمیں جوڑنے کے لیے ہم پر بہت ساری گوند لگائی ہوئی ہے۔ لاکھ کی پالش کی ہوئی ہے نانو نے ہم دونوں پر..... تاکہ ہم اس دنیا میں رہتے ہوئے دنیا والوں سے الگ نہ نظر آئیں۔ اور تم چاہتی ہو کہ نانو کی ساری محنت اکارت جائے..... میں ٹوٹ جاؤں..... خوش رنگ جوٹ جو نانو نے مجھ پر پلیٹ رکھی ہے۔ تم اس کے بل کیوں کھولنا چاہتی ہو آخر.....؟" اس کی آواز بھیگ سی گئی۔ وہ بولتا رہا اور زمل کا دل پھٹنے پر آگیا۔

"آئی ایم سوری باسل.....! میرا مقصد تمہیں ہرٹ

کرنا نہیں تھا۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ اسے واقعی شدید دکھ ہوا تھا۔

"امی کے ساتھ ان کی قسمت نے کچھ برا کیا۔۔۔ کیا برا کیا۔ یہ نانو نے ہمیں کبھی نہیں بتایا۔ شروع شروع میں وہ ٹال دیا کرتی تھیں۔ پھر جب ہم بڑے ہوئے اور زیادہ سوال پوچھنے لگے' خاص کہ بیشار تو نانو نے اپنے سر کی قسم دے کر ہم سے وعدہ لے لیا کہ ہم آئندہ کبھی امی کے بارے میں ان سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ ورنہ پھر وہ ہمیں چھوڑ کر کہیں بھی چلی جائیں گی۔ ظاہر ہے اس دن کے بعد ہم نے نانو سے پھر کبھی بھی کچھ نہیں پوچھا اور نہ ہی ہمایوں ماموں سے۔۔۔۔"

زمل کو اس موضوع کو چھیڑنا ہی حماقت لگی۔ وہ جو درد کی ایک خاص حد میں جی رہی تھی اب باسل کے اپنی امی کے بارے میں احساسات جان کر وہ حد پھلانگ چکی تھی۔ مزید پوچھنے اور جاننے پر وہ درد کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں کرپائے گی۔ اسے اندازہ ہوا تھا۔ پر دیر سے ہوا تھا۔ باسل اب بہت دنوں تک بہتر موڈ میں آنے والا نہیں تھا۔

دوپہر آہستہ آہستہ دونوں کی خاموشی کی طرح ڈھلنے لگی تھی اور ہشام کی اداسی لحہ بہ لحہ باسل کی آنکھوں میں اترتی جارہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"زمل میڈم کا فون آیا تھا۔" ڈیوڈ نے ان کے کمرے میں آکر انہیں بتایا۔ "تب آپ سو رہے تھے۔" اس نے مزید کہا۔ وہ اب بھی سو رہے تھے۔ آنکھیں تو کھلی تھیں، لیکن حواس ابھی بھی خوابیدہ تھے۔

"کیا کہہ رہی تھی زمل؟"

"انہوں نے کہا میں آپ کے پاکستان جانے کی ٹکٹ کنفرم کرواؤں۔"

"ایسا کیوں کہا زمل نے؟" انہیں تعجب ہوا۔

"وہ آپ کو پاکستان بلانا چاہتی ہیں۔"

"لیکن مجھے پاکستان نہیں جانا۔"

"زمل میڈم نے کہا کہ میں آپ کو ان کی بات ماننے پر راضی کروں۔"

"زمل پاگل ہوگئی ہے پاکستان جاکر۔" ان کی آواز یک لخت تیز ہوئی۔ ڈیوڈ سہم کر پیچھے ہوگیا۔

"زمل کو فون کرو۔" انہوں نے ڈیوڈ سے کہا۔ ڈیوڈ نے زمل کا نمبر ملا دیا۔

"کیا کرنا چاہ رہی ہو تم؟" انہوں نے چلاتے ہوئے زمل سے پوچھا۔ "کیا کہا ہے تم نے ڈیوڈ سے۔۔۔۔"

"میں آپ کو پاکستان بلانا چاہتی ہوں اور یہ ہی کہا ہے میں نے ڈیوڈ سے۔۔۔۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"اور یہ کچھ ایسی انوکھی بات بھی نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں کچھ تھا۔ زیان عالم حیران سے رہ گئے۔

"تم واپس کب آرہی ہو۔" انہوں نے اس سے سوال کیا۔

"کیا آپ میری بات نہیں سن رہے۔" وہ بولی۔

"مجھے اس ملک میں نہیں آنا۔۔۔۔ میں وہاں سے اپنے سارے تعلق توڑ چکا ہوں۔"

"اور آپ کی صحت یابی کے سارے علاج یہاں موجود ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ روہانسی ہوگئی۔ وہ ڈیڈ کے سامنے اس بار کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

"ڈاکٹر بیشار نے نہ جانے تم سے کیا کیا کہا ہے؟"

"انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ پلیز ڈیڈ! میری خاطر آپ یہاں آجائیے۔"

"تم جو مرضی کہہ لو۔۔۔۔ میں وہاں نہیں آنے والا۔" ان کا فیصلہ جیسے اٹل تھا۔

"تو جب تک آپ یہاں نہیں آئیں گے۔ میں بھی فرانس واپس نہیں آؤں گی۔" اس نے دو ٹوک بات کر کے فون بند کردیا اور تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

ڈیڈ کے انکار نے اس کا حوصلہ مزید پست کردیا۔ ٹوٹ تو وہ پہلے ہی چکی تھی۔ اب ذرہ ذرہ بکھرنے لگی۔ ہر طرف سے ناکامی جیسے اس کا مقدر بن چکی تھی۔ اس نے بہت ہمت سے کام لیتے ہوئے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ڈیڈ کو پاکستان بلائے گی۔ مگر انہوں نے یہاں نہ

آنے کی جیسے قسم کھائی تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ ڈیڈ کو نانو، نگار آنٹی، یشار بھائی اور باسل کے روبرو کردے گی اور پھر۔۔۔ پھر اس گھر میں ایک طوفان آئے گا۔ جو شاید اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی بہا کر لے جائے یا خاموشی سے اس کے قدموں تلے سے بنا آہٹ کیے نکل جائے۔ فیصلہ اس نے اپنی تقدیر کے سپرد کردیا تھا، لیکن ڈیڈ کی ضد۔۔۔ خاموش ہوتے ہوتے وہ پھر سے رونے لگی۔

رات میں نانو نے اس سے کہا تھا کہ وہ نگار آنٹی کو کھانا دے آئے۔ وہ انکار کردیتی اگر نانو ٹرے اس کے ہاتھ میں نہ تھمادیتیں۔ اس دن کے بعد وہ دوبارہ کبھی نگار آنٹی کے کمرے میں نہیں گئی تھی۔ وہ وہاں جانے سے ڈرنے لگی تھی۔

"اگر انہوں نے میرے چہرے سے کچھ پڑھ لیا تو انہیں اندازہ ہوگیا کہ میں زیان عالم کی بیٹی ہوں تو۔۔۔؟" وہ خوف سے سوچتی رہتی۔

بڑی آہستگی سے وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ نگار کھڑکی کی سلاخوں سے چہرہ جوڑے باہر دیکھ رہی تھی۔ ایک ایک قدم کو بڑی مشکلوں سے اٹھاتی وہ تخت تک آئی اور ٹرے کو اس نے تخت کے کنارے پر رکھ دیا۔ نگار نے تب ہی چہرہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا اور زمل کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ انجانے خوف کے باعث وہ پیچھے ہوئی۔۔۔ نگار نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ پھر بھی اسے ایسا لگا جیسے آنکھوں سے وہ اسے بہت کچھ کہہ رہی ہو۔ یا وہ برگد کی جٹاؤں کو حکم دے رہی ہو کہ اس لڑکی کی گردن سے لپٹ کر اس کی سانسیں ختم کردو۔ حلق تک آئے دل کو وہ مشکلوں سے سنبھالتے باہر نکلی۔

اور اپنے کمرے کی دہلیز پار کرنے سے پہلے پہلے وہ ایک فیصلہ اور کرچکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نانو، میں باسل سے ملنے جارہی ہوں۔"

برآمدے کے فرش پر جائے نماز بچھائے نانو نماز پڑھ رہی تھیں اور وہ کب سے ان کے پیچھے کھڑی ان کی نماز کے ختم ہوجانے کا انتظار کررہی تھی۔ نانو نے سلام پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو زمل نے انہیں مطلع کیا۔ دعا ختم کرکے نانو نے پیچھے پلٹ کر زمل کی طرف دیکھا اور مسکرادیں۔

"کوئی خاص بات کرنی ہے آج اس سے؟" انہوں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا اور اٹھ کر جائے نماز تہ کرنے لگیں۔

"جی۔۔۔ بہت ضروری۔۔۔ وہ اسلام آباد جارہا ہے نا آج۔ تو مجھے اس کے جانے سے پہلے ہی یہ بات کرنی ہے۔"

"تمہاری تیاری میں مجھے آج کچھ خاص اہتمام بھی نظر آرہا ہے میری جان!" وہ اس کے سراپے کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ زمل نے تاسف سے گردن ہلادی۔ شاید وہ بیماری سے اٹھی تھی اس لیے نانو کو بہتر نظر آرہی تھی۔ ورنہ تیاری تو ساری اس نے ذہنی کی تھی جو نانو کو نظر نہیں آسکتی تھی۔

"آپ سب جانتی ہیں نانو!" وہ پھیکی مسکراہٹ سمیت گویا ہوئی۔

"آپ میری ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی وہ آرائشی بوتل دیکھ چکی ہیں اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ وہ بوتل مجھے باسل نے دی ہے۔"

"ہاں، میں جانتی ہوں۔" نانو نے اعتراف کیا۔

"اس بوتل کو بھی اور باسل کی محبت کو بھی۔"

"آج اسی کا جواب دینے جارہی ہوں۔" اس نے بنا جھجکے انہیں بتایا۔ نانو کا روشن چہرہ چمکا اور پھر یک لخت بے چین بھی ہوگیا۔ زمل کے ہاتھ میں موجود ہینڈ بیگ کافی چھوٹا تھا۔ اس میں وہ یس (yes) کے حرفوں والی شطرنج نہیں آسکتی تھی۔ تو کیا زمل ارادہ بدل چکی تھی۔ نانو پریشان سی ہوگئیں۔

"کیا جواب دوگی زمل تم۔۔۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں؟" نانو نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جواب۔۔۔ جواب تو وہ دے گا نانو!" وہ خلاؤں میں دیکھنے لگی۔

وہ باسل کو سب کچھ بتانے جارہی تھی۔ سب کچھ... جو نانو اسے نہیں بتا سکتی تھیں وہ اسے وہ سب بتانے جارہی تھی... بہت سے جان لیوا لمحوں کی کشمکش کے بعد یہ فیصلہ ہوا تھا وہ ماضی کی عینی شاہد نہیں تھی۔ وہ ایک ایک جز کے ساتھ تمام واقعات نہ بتا سکتی تھی تاہم وہ یہ ضرور بتا سکتی تھی کہ اس کی ماں کے گناہ گاروں میں سے ایک اس کا باپ ہے۔

یہ راز تو جب سے اس پر آشکار ہوا تھا اسے لمحہ بہ لمحہ مار رہا تھا۔ اس راز کے فاش ہونے نے اس کے بچپن کے دوست سدیم انکل کی خوش گوار یادوں کو اس سے چھین لیا تھا۔ اپنے ڈیڈ کے لیے اپنائیت سے بھرے جذبے کو بھی۔ اور یہ راز ابھی اور بھی بہت کچھ چھیننے کی طاقت رکھتا تھا۔ اسے ایک دم سے سب کھو دینے کا خوف لاحق ہوگیا تھا اور اب وہ ڈر کر چیخ مارنے یا بھاگ کر کسی کے کمرے میں جانے والی نہیں تھی۔ اس نے اس خوف کا سامنا کرنے کی ٹھان لی تھی۔

وہ باسل کو اپنے باپ کے گناہ کے بارے میں بتائے گی اور... اور پھر یہ باسل پر منحصر ہوگا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرنے والوں میں سے ایک مجرم کی بیٹی کو اپناتا ہے یا دھتکار دیتا ہے۔

دوسرے پہلو پر غور کرتے ہوئے زمل کی روح فنا ہوجاتی تھی۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ کر رہ جاتی۔

"کیا کہہ رہی ہو زمل؟" نانو نے اسے چونکایا۔

"کچھ نہیں نانو!" وہ افسردگی سے بولی۔ نانو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ تخت پر بیٹھا لیا۔

"وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے زمل!" نانو اداس ہوگئیں۔ انہیں سو فیصد یقین ہوگیا تھا کہ زمل کسی وجہ سے باسل کو انکار کرنے جارہی ہے۔

"وہ تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے' اس نے ہی مجھ سے اصرار کیا تھا کہ میں تمہیں اس گھر میں ہمارے ساتھ رہنے پر زور دوں۔" نانو آنسو صاف کرتے ہوئے اور ہنستے ہوئے اسے وہ سب بتا رہی تھیں جو اسے پہلے سے ہی معلوم تھا۔ محبت میں یہ کشف انسانوں کو خود بخود ہی حاصل ہوجاتا ہے۔ وہ دور بیٹھے محبوب کے دل کا حال جان لیتے ہیں۔ اس کی سوچوں اس کے ارادوں کا انہیں علم ہوجاتا ہے۔

"تمہارا انکار اسے دکھ دے گا زمل...! اس کا اسلام آباد کا ٹور خراب مت کرو میری جان..."

"میں اس سے انکار نہیں کروں گی نانو!" اس نے بتایا۔ "لیکن اسے سوچنا پڑے گا... نئے سرے سے..."

"وہ کیوں سوچے گا اب... وہ فیصلہ کرچکا ہے۔ بس تم اس کا دل مت دکھانا میری جان...!"

"میں اس کا دل ہی تو نہیں دکھانا چاہتی تھی... لیکن..."

"لیکن کیا زمل؟" نانو کو زمل کا دوہرا رویہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"بعض باتیں قدرت کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں نا نانو... انسان بارش سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کے گھر پر نہ برسے..." وہ مردہ آواز کے ساتھ بولی۔ جیسے انسان کی انتہائی بے بسی پر اسے رونا ہی تو آگیا ہو۔

"تم آج مجھے حیران کررہی ہو زمل!"

"حیران تو میں رہ گئی نانو... کیا دنیا ازل سے گول تھی۔"

"تم فرانس سے ہو زمل... وہاں کا ماحول یہاں کے ماحول سے مختلف ہے۔ باسل نے بتایا تھا کہ تمہارا گھر کس قدر خوب صورت ہے پر تم فکر نہ کرو زمل... ہم جلد ہی یہ گھر بدل لیں گے... یشار اور باسل..."

"نہیں نہیں نانو... یہ بات نہیں ہے۔ آپ کو اس گھر میں رہتے رہتے کافی عرصہ ہوچکا ہے۔ آپ نہیں سمجھ سکتیں کہ یہ گھر کس قدر فرحت بخش ہے۔"

"پھر کیا وجہ ہے زمل... تم مجھے خوش کیوں نہیں لگ رہیں اور وہ شطرنج..." نانو کی زبان سے پھسلا۔ زمل کی آنکھوں میں ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ تو نانو جانتی تھیں۔ وہ خاموش ہوگئی۔

"ہاں... مجھے علم ہے اس شطرنج کے بارے میں

بھی جو تم نے دکان کے کاریگر سے خاص بنوائی تھی۔"

"باسل بہت معصوم ہے نانو.... اپنی والدہ کی طرح.... میں سمجھتی ہوں کہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے اسے پھر سے سوچ بچار کر لینی چاہیے۔"

"نگار نے اپنی پوری زندگی بہت اذیت میں گزاری ہے۔ یشار اور باسل کو ماں کی تکلیف نے ہی حساس بنا دیا ہے۔" نانو اداس ہو گئیں۔

"اور آپ کو بھی۔" زمل نے کہا۔ نانو کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ نانو کی صورت دیکھنے لگی اور دل میں سوچنے لگی۔ "کس قدر بے خبر ہیں اس گھر کے مکین.... انہیں اندازہ تک نہیں کہ انہوں نے اپنے گھر میں کس کو پناہ دے رکھی ہے.... کس آتش گیر مادے کو.... جو ذرا سی چنگاری سے ان کا سارا گھر جلا کر راکھ کر سکتا ہے اور اب یہ راکھ ہونے کا کھیل بس شروع ہونے ہی والا ہے۔ یا یہ گھر جلے گا یا وہ خود.... کوئی معجزہ ہی ہو گا جو دونوں بچ جائیں گے۔"

"میں رات کے کھانے کے لیے بہت کچھ بناؤں گی زمل.... تمہاری اور باسل کی پسند کا.... تم دونوں نے آج مجھے خوش کر دیا ہے۔" نانو اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے خوشی سے کہنے لگیں۔ ان کے خیال میں زمل بلاوجہ کے خدشے پال رہی تھی۔ ورنہ باسل تو اسے حد درجہ چاہتا تھا اور نانو کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"میں آج فیصل آباد نامی شہر جا رہی ہوں نانو.... یہ ٹریٹ پھر کبھی سہی۔" اس نے انہیں آگاہ کیا۔

"وہاں کیوں جا رہی ہو زمل.... این جی او۔"

"نہیں.... میرے ڈیڈ کے دوست کی بہنیں رہتی ہیں وہاں.... مجھے ان سے ملنا ہے۔"

اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ سدیم انکل کی بہنوں سے ملنے جا رہی تھی۔ وہ انہیں ان کے آخری وقت کے لمحات کے بارے میں بتانا چاہتی تھی اور یہ بھی کہ وہ انہیں کس قدر یاد کیا کرتے تھے۔ وہ ان سے بھی ان کی مغفرت کی دعا کے لیے کہنے والی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ان کی بہنیں بھی ان کے لیے دعا کریں۔

جب سے نگار آنٹی کے ذریعے اسے تمام بات کا علم ہوا تھا۔ تب سے ہی سدیم انکل "آگ میں جلتے ہوئے" اس کے خواب میں آنے لگے تھے۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ... دیکھنا باسل یہ بات بتانے کے لیے مجھے فوراً "فون کرے...." نانو کہتے کہتے ایک دم سے رکیں۔

زمل کے ڈھیلے لباس کی آستین میں سے کوئی چیز لڑھکتی ہوئی نیچے آئی تھی اور اس کا ہاتھ تھامے اور سہلاتے سہلاتے نانو کے ہاتھ سے چھو گئی تھی۔ نانو ٹھٹکیں ایک پرانی زنجیر اور اس میں پرویا ہوا کانسی کا مکڑی والا لاکٹ.... نانو نے جیسے سانپ کو چھو لیا۔ وہ جھٹکے سے پرے ہوئیں۔ اس لاکٹ کو وہ جانتی تھیں۔ وہ اسے پہلے بھی دیکھ چکی تھیں۔ کہاں دیکھ چکی تھیں۔ انہیں یاد کرنے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا۔

"کافی پرانا ہے یہ نانو؟" زمل نے انہیں اس کی جانچ پڑتال کرتے دیکھ کر کہا۔ کاش وہ نانو کی پتھر آنکھوں کو بھی دیکھ سکتی۔

"کہاں سے لیا تم نے؟" سناٹے کے عالم میں وہ بولیں۔ ان کے چہرے پر سیاہ بادل لہرا رہے تھے۔

"میرے ڈیڈ کا ہے۔" اور سناٹے میں زوردار دھماکا ہوا۔ سیاہ بادلوں میں بجلی کڑکی اور کڑکتی ہی چلی گئی۔

"میرے ڈیڈ کا ہے.... میرے ڈیڈ کا ہے.... میرے ڈیڈ کا ہے۔" حبیب اللہ روڈ پر بازگشت ہوتی ہوئی بہت دور نکل گئی۔

"میرے ڈیڈ کا ہے۔" نانو کے چہرے کے سارے رنگ نچڑ گئے۔ انہیں موت کی نوید سنا دی جاتی، لیکن اس راز کا بھید ان پر نہ کھلتا۔

"آج میں اپنے ڈیڈ کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے آنسو سے بھری آواز کے ساتھ کہا۔ وہ اب خود لاکٹ کو چھوتے ہوئے خلاؤں میں گم تھی اور نانو لحہ بہ لحہ مزید پھٹتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ زمل بہت دیر تک ان کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔

"ٹھیک ہے نانو... اب میں چلتی ہوں۔" وہ تخت پر

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر:03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

سے اٹھی۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ نانو اسی طرح ساکت بیٹھی رہیں۔ زمل کو ایک گونہ حیرت ہوئی۔ اس نے نانو کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ اگر وہ اپنی ہی کسی ذہنی سوچ میں غرق نہ ہوتی تو نانو کی اس کیفیت کو جاننے کی ضرور کوشش کرتی یا زیادہ اہمیت دیتی، لیکن اس کے پاس فی الحال وقت نہیں تھا۔ باسل دو تین گھنٹے بعد اسلام آباد کے لیے نکلنے والا تھا۔ وہ آہستہ سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے اس چھوٹے سے مکڑی والے لاکٹ کے ظاہر ہونے نے نانو پر کیسی قیامت ڈھا دی ہے۔ وہ قیامت جو زماں و مکاں لپیٹ دیے جانے کے بغیر ہی برپا ہو جاتی ہے۔ نانو کی آنکھوں کے آگے نہ جانے کس کس دور کے مناظر گھوم گئے تھے۔

زمل کے کمرے میں آکر انہوں نے اس کی چیزوں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ وہ خدا سے دعا کر رہی تھیں کہ وہ جیسا سوچ رہی ہیں ویسا نہ ہو۔ یہ مکڑی والا لاکٹ صرف ایک اس نے خرید کر تھوڑی نا اپنے گلے میں پہنا ہوگا۔ وہ خدا سے التجا کرنے لگیں کہ زمل "اس" کی بیٹی نہ ہو۔

الماری کھول کر انہوں نے اس کے کپڑے الٹ پلٹ کیے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے دراز کھنگال ڈالے۔ پھر دروازے کی پشت پر لگی کھونٹی سے لٹکتے ہینڈ بیگز میں سے ایک میں سے انہیں زمل کا پاسپورٹ مل گیا۔ "سرپرست" کے خانے میں زیان عالم کا نام درج تھا۔ نانو زور سے بیڈ پر گریں۔ تو ان کی دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔

"زمل، زیان عالم کی بیٹی ہے۔" یہ بات انہوں نے نہیں سوچی تھی بلکہ جیسے ان کے سر پر کھڑے ملک الموت کے فرشتے نے انہیں یہ بتایا تھا۔

✡ ✡ ✡

دھوپ کی تپش سے قوسی کھڑکی کی پانچوں سلاخیں گرم ہو گئی تھیں۔ پھر بھی وہ ان پر اپنا چہرہ ڈالے بیٹھی تھی۔ جیسے کسی بد دعا کے نتیجے میں وہ احساسات سے محروم کر دی گئی ہو۔ دھتکار دی گئی ہو۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ ایک لمبے عرصے کی جگ ہنسائی کو جیسے اس نے سہا ہو...... رات تک کا انتظار کوفت زدہ تھا۔ بجلی کی کڑک، بادل کی گرج کا بھی۔ وہ تو بولنے کے لیے بے قرار تھی۔ پھر جوں ہی اس نے لب کھولے۔

رات اس کی بینائی میں بس گئی۔ بجلی لہجے میں سما گئی۔ اور بادل کی گرج آواز میں شامل ہو گئی۔

"صغیر ربانی!" وہ دکھ کی اذیت سے چلائی۔ "کیوں جھوٹ بولا تھا مجھ سے..... اب سچ بھی سن لیں۔ مکڑی نوزائیدہ شکار کے گرد تار بن دے تو بجلی بس آسمانوں میں ہی چمکتی رہتی ہے۔"

خاکستری پتے دائیں بائیں بکھر کر پھڑپھڑانے لگے۔

"زلیخا بی..... وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے، باری ہے۔ ہادی ہے، عادل ہے..... وہ درد قسام بھی ہے..... قہار بھی ہے۔ کاسر قلب بھی ہے اور وہ تو..... وہ تو....." چھاؤں دھوپ میں ایسے بدلی گویا عالم بدل رہی ہو۔

"وہ تو پیال ساز ہے۔" لہجے کی کڑک ایسی تھی جو دھرتی والوں نے کبھی نہیں سنی تھی اور آواز میں وہ گرج تھی کہ بادلوں پر اپنی کم مائیگی کا احساس غالب ہوا۔ ایک ایک کر کے ساتوں آسمانوں میں دراڑیں چڑھ گئیں۔ بارہ کے بارہ برج اپنے مداروں سے دائیں بائیں ہو گئے۔ مدتوں پرانی جنتریاں خون آلود ہو رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

"باسل! میری بات غور سے سنو۔" نانو نے باسل کو کال کی۔ دو منٹ لگے تھے انہیں سارے فیصلے کرنے میں۔ جس راز کو وہ پچھلے اٹھائیس سالوں سے اپنے سلگتے سینے میں لیے گھوم رہی تھیں۔ اب دنیا بھر کے ماہرین بھی آجاتے تو انہیں اس راز کو راز میں رکھنے کے گر نہیں بتا سکتے تھے۔

زمل، باسل سے ملنے جا رہی تھی۔ اور نانو چاہتی تھیں کہ باسل، زمل کے وہاں پہنچنے سے پہلے پہلے ہی

سب جان لے۔

"ساری بات سمجھنے کے لیے تمہیں تحمل سے کام لینا ہوگا باسل!" روہانسی آواز میں انہوں نے کہا۔

دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔

"خدا کے لیے درمیان میں کوئی سوال مت کرنا۔" انہوں نے کہا تو "ہونہہ" کی مدھم آواز کے ساتھ انہیں آمادگی دی گئی۔ نانو رو دینے کے قریب تھیں۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور محنت سے بنائے نوادرات کو اپنے ہی ہاتھوں توڑ دینے والی اذیت کے ساتھ بولنا شروع کیا۔

وہ غلط تھیں۔ انہیں لگا تھا نوادرات ٹوٹنے پر جو شور اٹھتا ہے وہ صرف انسان کو بہرہ ہی تو کرتا ہے۔ اذیت بس لمحاتی ہی تو ہوتی ہے۔ بولتے بولتے انہیں اندازہ ہوا کہ ٹوٹے نوادرات کے ٹکڑے چن چن کر اکٹھے کرنا انسان کو اندر تک توڑ دیتا ہے۔ پھر ان ٹکڑوں کو سنبھال کر رکھنا یا پھینک دینا اپنا گلا خود گھونٹ دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ نانو بولتی رہیں۔ بتاتی رہیں۔۔۔ اور آنسو بہتے رہے۔ بتانے والا ہر ہر حرف پر بکھر رہا تھا اور سننے والا۔۔۔؟

انہوں نے باسل کو وہ سب بتا دیا جو آج سے تیس سال پہلے سب پر بیتا تھا۔ اونچی موجوں کا سیلاب۔۔۔ جس نے سب کی زندگیوں کو نگل لیا تھا۔ نگار زیان عالم، سدیم، یشب، زلیخا بی، خدا یار، ہمایوں، گلناب عالم، صغیر ربانی۔ انہوں نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ اب کوئی بات چھپا کر رکھنا مزید گھاٹے کا سودا تھا۔ وہ سرخ اینٹوں سے بنے اس گھر کو سیاہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ یشار، باسل کو جو قسم انہوں نے دی تھی وہ انہوں نے خود ہی توڑ دی تھی اور اس کا کفارہ بھی وہ خود ہی ادا کر رہی تھیں۔ جھلتی روح اور سلگتی آنکھوں کے ساتھ۔

مزید ایک آخری بات ان سے بتائی ہی نہیں جا رہی تھی۔۔۔ بس کسی بھی صورت بتائی نہیں جا رہی تھی۔ بے چارگی سے انہوں نے فون بند کر دیا۔ بنا باسل کو کوئی سوال پوچھنے کی مہلت دیے بغیر۔ اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

وہ آنے والے وقت کے لیے تیار تھیں۔ باسل ان سے اس بات کا شکوہ ضرور کرے گا کہ انہوں نے اتنی دیر تک یہ باتیں ان سے کیوں چھپائے رکھیں۔ ہو سکتا ہے وہ ناراض بھی ہو جائے، لیکن وہ اسے منا لیں گی۔ وہ ان سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا تھا، لیکن آنے والا وقت ان کی سوچوں سے بڑھ کر بھیانک ہوگا۔ انہیں اس بات کا گمان تک نہیں تھا۔ اپنے طور پر ان کا فیصلہ درست تھا کہ وہ باسل سے اب کسی بات کو پوشیدہ نہیں رکھیں گی تاکہ وہ کبھی نانو سے شکایت نہ کر سکے۔ زمل کے ساتھ کوئی تعلق جوڑنے سے پہلے وہ سب جان جائے کہ وہ زیان عالم کی بیٹی ہے۔ جو اس کی ماں کو اس حالت میں پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔

تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے نانو نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ مزید تباہ کاریاں لانے والا تھا۔ پندرہ منٹ کی گفتگو میں نانو کو اس بات کا شک بھی نہیں ہوا تھا کہ آنسو بھری آواز کے ساتھ وہ جو کچھ بتا رہی ہیں وہ باسل نہیں بلکہ یشار سن رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

اسلام آباد کے ٹور کے لیے ہر چیز زیر بحث آ رہی تھی۔ سارے کام آخری مراحل میں تھے۔ اسی وجہ سے باسل، یشار کے آفس میں موجود تھا۔ باسل کو اپنے ساتھ لے کر جانے سے پہلے، ویسے بھی یشار کو اسے بہت سی ہدایات دینی پڑتی تھیں۔ تب ہی زمل کا فون آیا تھا۔

"ضروری بات کرنی ہے۔۔۔ ٹھیک ہے، آجاؤ۔۔۔ فلائٹ میں ابھی کافی ٹائم ہے۔" باسل نے فون بند کر کے یشار کی ٹیبل پر ہی رکھ دیا۔ پھر باقی ہر بات سمجھ کر وہ یشار کے آفس سے باہر نکل گیا اور اپنا سیل فون اس کی ٹیبل پر ہی بھول گیا۔ تھوڑی دیر بعد باسل کا موبائل پھر سے بجنے لگا۔ یشار اس کو بلوانا چاہتا تھا، لیکن اسکرین پر نانو کا نام اور تصویر دیکھ کر اس نے خود ہی فون ریسیو کر لیا۔

"جی!" فائلیں دیکھتے ہوئے اس نے نرمی سے کہا۔

"باسل! میری بات غور سے سنو۔" نانو کی آواز نے اس کا سارا بٹا ہوا دھیان اکٹھا کر دیا۔ ان کی آواز میں سات سمندروں اور چودہ دریاؤں کا شور تھا۔ یشار آگے سے ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ اور نہ ہی انہیں یہ بتا سکا کہ وہ باسل نہیں یشار ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خاموش ہو گیا۔

"ساری بات سمجھنے کے لیے تمہیں تحمل سے کام لینا ہو گا باسل!" نانو کا یہ لہجہ بالکل انجانا تھا۔ ڈرا دینے والا بھی۔ یشار کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا اور خوب زور سے بجایا۔

"خدا کے لیے درمیان میں کوئی سوال مت کرنا' میں تمہیں تمہاری ماں کے حوالے سے کچھ بتانا چاہتی ہوں۔" تیز تیز آواز میں کہا گیا۔ یشار کا دوران خون تیز ہو گیا۔ دوسری طرف چند ثانیوں کی خاموشی رہی اور یشار کے لیے ایک ایک سیکنڈ سالوں جتنا طویل ثابت ہوا۔

"نگار جب یونیورسٹی میں پڑھتی تھی تو اس کا ایک کلاس فیلو تھا... زیان..."

نانو نے جس بات کی تمہید باندھی تھی۔ اب اگر نانو کو پتا چل بھی جاتا کہ وہ سب باسل کو نہیں بلکہ یشار کو بتا رہی ہیں تو یشار ... بھی ہر صورت ان سے ہر بات اگلوا کر ہی رہتا' لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ نانو کو گمان بھی نہیں ہوا اور یشار سب سنتا رہا' سنتا رہا' سنتا رہا۔ اس کے چہرے کے تیور بگڑتے گئے' بگڑتے گئے' بگڑتے گئے۔ درمیان میں کی گئیں نانو کی بے تحاشا نصیحتوں کے باوجود بھی وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور بھرے ہوئے جام کی طرح چھلک گیا۔ اس جام میں تیزاب تھا۔

حبیب اللہ روڈ کے پرانے گھر میں ایک بوڑھی نانو رو رہی تھیں اور دور ایم عالم روڈ پر اپنے آفس میں بیٹھا یشار بھی۔ دونوں ایک ہی ہستی کے لیے رو رہے تھے' لیکن یشار نانو کے برعکس رو رہا تھا۔ بنا آواز کیے۔

نانو کے سارے دلاسے بے کار ثابت ہوئے۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کی ماں کے ساتھ اتنا سب کچھ ہو چکا تھا اور وہ آج تک بے خبر رہا تھا۔ نانو نے کیوں دونوں کو اپنی قسم دی۔ اور اب وہ خود ہی کیوں بتا رہی تھیں۔ یشار کو زیادہ دیر سوچنا نہیں پڑا۔ نانو نے یہ عقدہ جلد ہی کھول دیا تھا۔

"زمل اسی لڑکے زیان کی بیٹی ہے۔" وہ زمین کی آخری تہوں سے آخری آتش فشاں بھی باہر نکال لائی تھیں اور جو نکلتے ہی پھٹ پڑا۔ یشار کے چاراطراف لاوا ابلنے لگا اور اس کی تپش نے اسے اندر تک جلا ڈالا۔ اس کی سیاہ عجز بھری آنکھیں راکھ ہو گئیں۔

نانو نے روتے روتے کب فون بند کیا۔ اسے پتا نہیں چلا۔ وہ سیل فون کان کے ساتھ لگائے لگائے ہی پتھر کا ہو گیا تھا۔

"زمل اسی لڑکے زیان کی بیٹی ہے۔" یہ آواز اس کے کان میں ہی قید ہو گئی تھی اور اب سلاخیں جھنجھوڑ رہی تھی۔

"میرا موبائل یہاں...؟" باسل کہتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور یشار کو دیکھ کر ٹھٹک کر رکا۔

"یشار...!" اسے دوبارہ یشار کو تیز آواز میں مخاطب کرنا پڑا... یشار چونکا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں...؟" باسل نے پوچھا۔ یشار کوئی جواب نہ دے سکا۔ باسل دیکھ رہا تھا کہ کس طرح یشار کی آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو رہے ہیں۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اس نے بھنویں جوڑتے ہوئے پوچھا۔ اسے فکر ہونے لگی تھی۔ یشار کی آنکھ سے آنسو گرا۔

"یشار۔" باسل حیران ہوا... گھبرایا... یشار نے جلدی سے نظریں چرا لیں۔

"میری طبیعت تھوڑی ٹھیک نہیں ہے باسل۔" اس نے کہا۔

"زیادہ خراب ہے؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

"میں اسلام آباد نہیں جا سکوں گا۔" اس نے اپنا سر تھام لیا۔

"ڈاکٹر کو کال کروں؟" اس نے پھر پوچھا۔
"نہیں' اس کی ضرورت نہیں..... بس چکر ہیں..... ایسا کرو..... تم ایسا کرو' اکیلے ہی اسلام آباد چلے جاؤ۔"
"ہاں..... ٹھیک ہے۔ میں چلا جاتا ہوں' زیادہ پریشان مت ہو..... ہوا کیا ہے؟"
"کچھ نہیں..... بس..... تم ایسا کرو' ابھی ایرپورٹ کے لیے نکلو۔" یشار نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا۔
"ابھی تو فلائٹ میں کافی دیر ہے۔"
"میرے ایک پرانے کولیگ کو آنا ہے وہاں..... تم کو اسے گائیڈ کرنا ہے سیمینار کے حوالے سے..... اب میں تو جا نہیں رہا..... وہ دوسرے شہر سے آیا ہے۔ اس وقت ایرپورٹ پر ہی موجود ہے..... اس لیے تم جلدی وہاں پہنچ جاؤ۔"
"کچھ بہتر محسوس کر رہے ہو تو چلو..... میں وہاں لے کر تو تمہیں جا سکتا ہوں؟" اس نے جواز دیا۔
"لیکچر کے لیے میں ان سے معذرت کر لوں گا..... تمہاری موجودگی وہاں دعوت کی قبولیت ہو گی۔"
"ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر میں نکلتا ہوں..... زمل کا فون آیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے آ رہی ہے۔ کوئی ضروری بات کرنی ہے اس کو مجھ سے....." باسل نے کہا اور یشار اپنے ضبط کی انتہا پر پہنچ گیا۔
"زمل کو میں بتا دوں گا کہ باسل کو جلدی جانا پڑا ہے۔"
"ٹھیک ہے..... جیسے تم کہو۔" اس نے ٹیبل سے اپنا سیل فون اٹھایا اور باہر جانے لگا۔
"اپنے نمبر کو کسی صورت بزی مت رکھنا۔ میرا کولیگ تمہیں ہی کال کرے گا۔" اس نے ہدایت دی۔ جسے سن کر باسل ہاں میں سر ہلا کر باہر چلا گیا۔
یشار اٹھ کر کھڑکی تک آیا۔ چند لمحوں بعد اسے باسل کی کار بلڈنگ سے باہر نکلتی نظر آئی۔ تسلی ہو جانے کے بعد وہ واپس سیٹ پر بیٹھا۔ پہلے اس نے اپنے ایک دوست کو کال کی۔ پھر ملازم کو بلا کر اسے ڈسپنسری سے کلوروفام کی بوتل لانے کو کہا۔

☆ ☆ ☆

ٹیکسی سے اتر کر زمل نے ایک نظر اونچی بلڈنگ پر ڈالی اور گہری دکھ بھری سانس لی۔ مردہ ہمتوں کو مجتمع کرنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا۔
میں اسے یہ سب کچھ کیسے بتاؤں گی' سوچتے سوچتے اس کے دل کی دھڑکن رکنے لگی۔ اس نے فیصلہ تو بہت ہمت سے کر لیا تھا اور اب جب اس کام کا وقت آ گیا تھا تو اس پر وحشت حاوی ہونے لگی تھی۔ سفر کے دوران بھی اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ وہ واپس چلی جائے۔ حبیب اللہ روڈ..... اور پھر وہاں سے بھی واپس..... فرانس' اپنے گھر..... یہ راز راز ہی رہنے دے اور اپنی محبت دفن کر دے۔ خود کو حنوط کر کے' لیکن اگر اس صورت حال نے ایک جوئے کی صورت اختیار کر لی تھی اور اسے اس جوئے میں ہر صورت مات ہی ملنی تھی تو کیوں نہ وہ کھیل کا مزہ ہی لے لے۔
مردہ چال سے چلتی ہوئی وہ لفٹ تک آئی اور اس نے لفٹ کا باہری بٹن دبایا۔ خود وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔ چند ثانیوں بعد لفٹ کا دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔
عقب سے کسی نے نکل کر ایک بھیگا ہوا رومال بڑی مضبوطی سے اس کی ناک پر رکھا۔ وہ تڑپ کر رہ گئی اور سناٹے میں آ گئی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ وہ ایک آواز بھی نہیں نکال سکی تھی۔ اس کی سانس اس کے اندر ہی کہیں دب گئی۔ اس نے مضبوط ہاتھ کو اپنے منہ' ناک سے پرے کرنا چاہا' لیکن بے بس رہی۔ مزید وہ تھوڑی دیر ہی اور مزاحمت کر سکی تھی۔ نم رومال اپنا اثر دکھا رہا تھا اس کی مزاحمت ڈھیلی پڑتی گئی۔ وہ ہوش کھونے لگی اور اندھیرا اس کی آنکھوں تلے چھانے لگا۔
مدہوش ہوتے ذہن میں ایک بات واضح تھی کہ وہ اغوا کی جا رہی ہے۔ ایک آخری لفظ جو مکمل نیند میں جانے سے پہلے اس نے بولا۔ وہ یہ تھا۔
"ڈیڈ.....!"

☆ ☆ ☆

"زمل...." وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کھلی کھڑکی سے صبح کی روشن دھوپ اندر آرہی تھی۔

"ڈیوڈ!" انہوں نے پکارا۔ پھر سائیڈ ٹیبل پر پڑی بیل کا بٹن دبایا۔ خاموش گھر میں گھنٹی کی آواز گونجنے لگی۔ ڈیوڈ تھوڑی دیر میں ان کے پاس آگیا۔

"زمل آگئی ہے کیا؟"

"نہیں سر!"

"وہ آگئی ہے۔ دروازہ کھولو۔ دیکھو کھڑکی میں سے وہ مجھے پکار رہی ہے۔" انہوں نے کہا۔ ڈیوڈ حسب عادت وہیں کھڑا رہا۔

"کیا وہ واقعی نہیں آئی؟"

"بالکل نہیں سر!" جواب سن کر وہ خاموش ہوگئے۔ اس بار وہ ڈیوڈ پر نہیں چلائے تھے۔

"اس نے مجھے پکارا ہے ڈیوڈ.... میرا یقین کرو.... اس نے بہت کرب سے پکارا ہے مجھے...." وہ اداس ہوگئے۔

"آپ انہیں فون کرلیں۔" ڈیوڈ نے مشورہ دیا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔" وہ خوش ہوگئے۔ "نمبر ملاؤ زمل کا۔" ڈیوڈ نے انہیں نمبر ملادیا۔

"موبائل آف جارہا ہے زمل کا۔" وہ بے چین ہوئے۔

"وہ کہیں مصروف ہوں گی۔"

"نہیں۔" انہوں نے خود سے کہا۔ ڈیوڈ کوئی اور حکم نہ پاکر باہر چلا گیا۔ گھنٹے کے وقفے کے بعد زیان عالم نے اسے پھر بلایا۔ ان کی طبیعت بگڑ رہی تھی۔

"مجھے کسی پل چین نہیں آرہا ڈیوڈ.... زمل کسی مشکل میں ہے۔ اس کا موبائل کیوں مسلسل آف جارہا ہے۔" انہیں واقعی کسی پل چین نہیں آرہا تھا۔

"تم اس کی این جی او کے ہیڈ آفس فون کرو۔ وہ اس کے ہوٹل کا نمبر دے دیں گے۔" ڈیوڈ نے ایسا ہی کیا اور وہاں سے جو معلومات ملیں۔ وہ ان کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھیں۔

"این جی او کی طرف سے ہمارا کوئی گروپ پاکستان نہیں گیا۔" لڑکی کی نرم آواز نے ڈیوڈ کو بتایا اور ڈیوڈ نے زیان عالم کو۔

"مس زمل عالم این جی او کی ممبر ہیں.... لیکن انہیں پاکستان کسی سروے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔" مزید آگاہ کیا گیا۔ زیان عالم بدحواسی سے ڈیوڈ کو دیکھنے لگے۔

"پھر کہاں ہے زمل....؟ اتنے دنوں سے وہ کہاں ہے....؟ اس نے تو کہا تھا کہ وہ پاکستان جارہی ہے۔" انہوں نے چیختے ہوئے پوچھا۔ ڈیوڈ کے پاس ان کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش رہا۔

"میں پاکستان جارہی ہوں۔" زمل کا ان کے قریب بیٹھ کر ان کو اپنے پاکستان جانے کے بارے میں بتانے کا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ پھر اس کی الوداعی ملاقات کا بھی۔ انہیں وہ مکڑی والا لاکٹ یاد آیا۔ جسے زمل نے اس وقت پہن رکھا تھا۔

"یہ میرا ہے.... تم جانتی ہو.... تم میرے سامان کی تلاشی لیتی رہی ہونا۔" زمل نے سر جھکالیا تھا۔

"وہ ایسا کیوں کرتی رہی تھی۔" وہ خود سے بڑبڑائے۔

"میں آپ کے پرانے گھر گئی تھی۔ ماڈل ٹاؤن...." اس نے ایک رات انہیں بتایا تھا۔

"آپ کی صحت یابی کے سارے علاج یہاں موجود ہیں.... پلیز ڈیڈ! میری خاطر آپ یہاں آجائیے۔" وہ پچھلے ہی دنوں اصرار کررہی تھی۔

"وہ پاکستان ہی گئی ہے، لیکن این جی او کے لیے نہیں بلکہ میرے لیے۔" ان پر اسرار کھلا اور دونوں ہاتھوں سے انہوں نے اپنا سر تھام لیا۔

"اور اب زمل کسی مصیبت میں پھنس چکی ہے۔" انہیں سو فیصد یقین تھا۔

"کیوں کیا زمل تم نے ایسا.... کیوں کیا.... تمہیں مجھ سے اتنی محبت تھی کہ تم نے میری خاطر خود کو مشکل میں ڈال لیا۔" ان کی بے قراری ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

"میرے پاکستان جانے کا انتظام کرو ڈیوڈ.... جلد سے جلد۔" انہوں نے ڈیوڈ سے فیصلہ کن لہجے میں

کہا۔ خود سے کیا وعدہ وہ وقتی طور پر فراموش کر چکے تھے کہ وہ اب کبھی پاکستان نہیں جائیں گے۔ انہیں پاکستان سے نفرت تھی.... شدید نفرت.... وہ ملک کسی زمانے میں ان کی عزیز ہستی کو زندہ نگل گیا تھا۔ ان کی ماں کو۔

آنکھوں سے آنسو بہاتے بہاتے وہ بیک وقت دونوں کو یاد کرنے لگے۔ زمل کو.... اور گلناب عالم کو....

☼ ☼ ☼

گلناب عالم حسب معمول اپنی دوستوں کے ساتھ غیر ملکی دورے پر گئی ہوئی تھیں۔ گھر خالی تھا۔ اسی لیے سدیم اور یشب ہفتے بھر سے زیان کی طرف ہی رہ رہے تھے۔ روز پارٹی چل رہی ہوتی۔ ڈیک کی اونچی آواز۔ ہلا گلا' شور شرابا' ملازم بھی تنگ آئے ہوئے تھے۔

اس دن بھی تینوں دوست ٹی وی لاؤنج میں مستی میں بیٹھے تھے۔ جب یشب نے نگار کا ذکر چھیڑا اور زیان کے چہرے پر کمینی سی مسکراہٹ در آئی۔

"چیز تھی ویسے وہ بھی ایک۔" سدیم نے یشب کی بات کی تائید کی۔

"وہ بڈھا پروفیسر درمیان میں نہ آجاتا تو اس لڑکی نے ابھی تک میرے قدموں میں بیٹھے ہوتا تھا۔" زیان یاد کرتے ہوئے نخوت سے بولا۔

"اب تو غصہ تھوک دے جانی.... بدلہ لے تو لیا تو نے وہ بھی خوب دل سے۔" یشب کہہ کر ہنسنے لگا۔

"ہاں جو چاہیے تھا وہ تو مل ہی گیا تھا۔" وہ بھی ہنسا' ساتھ سدیم بھی۔

"وہ ایک ہفتہ.... ہائے وہ دل نشین ہفتہ.... دو سال گزر گئے' لیکن اس ایک ہفتے کی خماری ابھی بھی قائم ہے جیسے...." اپنے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ مستی سے کہتا ہوا صوفے کی پشت پر اتنا پیچھے ہو گیا کہ گرنے کے بالکل قریب ہو گیا۔

"کیا کہتی تھی کہ وہاں سدیم اور یشب بھی تھے۔" یشب نے ایسے پوچھا جیسے وہ سارے واقعے کو پھر سے سننا چاہتا ہو۔

"ہاں.... !" زیان دل کھول کر ہنسا۔ "اور ممی نے اس بات پر اس کے منہ پر ایک کس کے تھپڑ مارا تھا۔ اس کے اپنے ماں باپ اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ پاگل ہو۔" تینوں مشترکہ ہنسے۔ زیان صوفے پر سیدھا ہوا۔

"جب پہلی رات اس کا ہاتھ پکڑ کر میں نے کہا کہ.... میں اس وقت تک تمہارا انتظار کروں گا.... جب تک تم خود میرا ہاتھ نہ تھام لو.... تو کیا بتاؤں.... کتنی محبت سے وہ میری طرف دیکھنے لگی تھی۔ میں نے اپنی ہنسی کو بڑی مشکل سے روکا اور باتھ روم میں جا کر خوب ہنسا۔ تم دونوں سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو۔" وہ فحش گوئی کرتے کرتے پھر سے صوفے کی پشت پر پیچھے کو لڑھک گیا۔

"پھر اسے مجھ سے محبت ہو گئی.... اور میں یہ ہی چاہتا تھا۔ وہ چپکے چپکے مجھے دیکھتی.... میں ہاتھ پکڑتا تو شرما جاتی.... یہ غریب گھرانوں کی لڑکیاں بھی نا.... اسے لگنے لگا تھا کہ میں واقعی اس سے شدید محبت کرتا ہوں.... تھو.... یاد رکھے گی.... اس کی آنے والی نسلیں بھی کسی مرد سے اس طرح الجھنے کی جرأت نہیں کریں گی۔" زیان غصے سے اپنی ہی ترنگ میں بولتا چلا گیا۔ سدیم' یشب خاموش رہے اور ہال میں سناٹا گونجنے لگا۔ زیان صوفے کی پشت سے نیچے ہوا۔ پھر جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے سامنے گلناب عالم کھڑی تھیں اور تنور کی طرح تپتا چہرہ لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ سب کچھ سن چکی ہیں اور اب اس سے وضاحت طلب نہیں کریں گی۔ سدیم' یشب بھی اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

گلناب عالم' زیان کے قریب ہوئیں۔ چند لمحے اسے ایسے دیکھتی رہیں جیسے یقین کر رہی ہوں کہ وہ ان ہی کا بیٹا ہے کہ نہیں اور پھر ایک زناٹے دار تھپڑ انہوں نے زیان کے منہ پر دے مارا۔ تھپڑ کی ضرب اور آواز اس قدر تیز تھی کہ زیان کا سارا نشہ اتر گیا۔ چنگیزی اور دوسرے ملازم بھاگے بھاگے وہاں آئے۔ گلناب عالم کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پھر یہ خون آنسوؤں میں

ڈھلا۔ ان کا وجود اونچائی سے گرے مجسمے کی طرح ٹوٹ پھوٹ گیا۔

"لوگوں نے کہا۔ میں بدچلن ہوں۔ آوارہ ہوں۔ آزاد خیال ہوں اور مجھ پر الزام بھی لگایا کہ اپنے شوہر کو میں نے زہر دے کر مارا ہے۔۔۔ ساری زندگی میں لوگوں کو جھوٹا کہتی رہی۔۔۔ آج پھر کہتی ہوں۔ لوگ جھوٹے ہیں۔ میں تو اس سے زیادہ کی مستحق ہوں۔ بدچلنی کا لفظ میرے لیے چھوٹا ہے۔ میں تو اس سے زیادہ کی مستحق ہوں۔ بدچلنی کا لفظ میرے لیے چھوٹا ہے۔ میں آوارگی کی حدود سے باہر نکلی عورت ہوں۔ تب ہی تو۔۔۔ تب ہی تو۔۔۔ تم جیسی اولاد کو جنم دیا ہے میں نے۔۔۔" آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ زیان خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

"تم باپ کے بیٹے نہیں ہو۔ تم اس کے بیٹے ہو ہی نہیں سکتے۔۔۔ وہ تو بہت نیک تھا۔ اسے میری بے اعتنائی کا غم کھا گیا۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ اسے میں نے ہی زہر دیا۔ اپنی بے رخی کا۔ وہ حد سے زیادہ نیک تھا۔ مجھ سے اس کی نیکی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس کی نیکی کے آگے مجھے اپنا آپ بد لگتا۔ میں اس کے ساتھ نبھانہ کر سکی لیکن اس کی موت کے ساتھ سمجھوتا کر لیا میں نے۔" وہ باقاعدہ رونے لگیں۔

"تم نے میرا خود پر سے مان ختم کر دیا زیان۔ مجھے لگتا ہے۔ تمہاری دفعہ شاید میں نے واقعی کہیں منہ کالا کیا ہوگا۔ میری کوکھ گناہ آلودہ ہوگی۔۔۔ اسی لیے تو تم جیسا بیٹا میرے نصیب میں لکھا گیا۔۔۔" وہ مزید اونچی اونچی آواز سے رونے لگیں۔ چنگیزی سمیت گھر کے سارے ملازم غمگین ہو گئے۔

"وہ لڑکی روتی رہی۔ گڑگڑاتی رہی اور تمہیں اس پر بالکل بھی ترس نہ آیا' کس مٹی کے بنے ہو تم زیان۔۔۔ کس کا خون ہے تمہاری رگوں میں۔۔۔ کیا خدا نے میری بے وفائی کا بدلہ تمہاری ہی شکل میں لینا تھا مجھ سے؟" ان کے اس طرح رونے سے طے تھا کہ وہ مرتے دم تک چپ ہونے والی نہیں ہیں۔

"تم نے مجھے بھی بے خبر رکھا۔ مجھ سے گناہ کروایا۔ تم نے کہا تم اس سے محبت کرتے ہو۔ صرف تمہاری خوشی کی خاطر میں وہاں گئی۔ وہاں سے انکار ہوا تو تم نے کہا کہ یونیورسٹی میں تم دونوں کے درمیان بدمزگی ہوئی تھی۔ اسی باعث انکار ہوا ہے۔ تم شرمندہ تھے۔ نگار سے معافی مانگنا چاہتے تھے۔ میں خوش ہو گئی۔ میرا بیٹا اپنے باپ پر گیا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ وہ ساری رات میں خوشی سے پاگل ہوتی رہی۔ مجھے تم پر غرور ہوا تھا۔ دیکھو! اور خدا نے میرا غرور کیسے توڑا۔" ضبط کرتے کرتے وہ پھر سے رونے لگیں۔ آنسو اس قدر تیزی سے بہہ رہے تھے کہ ان کا خوش نما چہرہ چھپ ہی گیا تھا۔

"وہ بے چاری ٹھیک چلا رہی تھی وہاں سدیم اور یشب بھی تھے۔۔۔ تم تینوں نے۔۔۔ تم تینوں نے۔۔۔" ان کے دل کو جیسے قرار نہیں آ رہا تھا۔

"تمہیں شرم نہیں آئی زیان۔۔۔ تم اتنا گر گئے تھے اور اب تمہیں خود سے گھن نہیں آتی۔۔۔ بولو۔۔۔ میں نے تب تھپڑ مار کر اس کا منہ بند کروا دیا تھا۔"

"مجھے یقین تھا میرا بیٹا ایسا کام کبھی نہیں کر سکتا۔ میں نے اسے بدکار کہا تھا۔ حالانکہ بدکار تو میں خود ہوں۔ تم جیسے بیٹے کی ماں ہونا بدکار ہونے سے کم ہے کیا۔۔۔"

"بس کر دیں ممی۔۔۔ بس کر دیں۔۔۔ بہت ہو گئی۔" بالآخر خاموش زیان بھی چیخ اٹھا۔ ان ہی کی طرح۔

"مجھے گلٹی فیل مت کرائیں۔۔۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ وہ اسی کی مستحق تھی' یونیورسٹی میں اس نے سب کے سامنے مجھے گالی دی تھی۔ میرے منہ پر چائے کا کپ پھینکا تھا۔ اس کے ساتھ یہ سب نہ کرتا تو کیا کرتا۔" وہ چیختا چلا گیا۔

"تم اس کے منہ پر سو تھپڑ مار دیتے۔۔۔ تم مجھے بتاتے۔۔۔ مجھے بتاتے کہ تم انتقام کی آگ میں جل رہے ہو۔ میں اس لڑکی کو تمہارے روبرو کرتی۔ یونیورسٹی میں وہ سب کے سامنے تم سے معافی مانگ لیتی اور بس۔۔۔ لیکن اتنا سب کچھ۔ اتنا سب کچھ کرنے کی تمہیں کیا ضرورت تھی زیان۔۔۔ اتنی چھوٹی بات کا بدلہ

اتنا بڑا... اتنی بڑی سزا... تم نے تو اس کی ساری زندگی برباد کردی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی ماں کو بھی داغ دار کردیا۔"

"میں آپ کو بتاتا... ؟ کیسے بتاتا... ؟ کب بتاتا... ؟ آپ کو تو اپنے دوستوں یار... سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی میرے لیے... آپ نے تو کبھی یہ تک جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کس حال میں ہوں؟؟"

وہ بھی جواباً بولا... اور گلناب عالم اس کی بات سے لاجواب ہو گئیں... انہوں نے شوہر سے بے اعتنائی برتی... وہ جان سے گیا۔

انہوں نے بیٹے کے ساتھ بھی یہ ہی کیا... اور اس نے ان کی جان ہی لے لی۔

"بچپن سے لے کر اب تک میں یہ ہی سنتا آیا ہوں کہ میرا اصل باپ وہاب عالم نہیں تھا۔ اور اب تو آپ اپنے منہ سے اعتراف کر چکی ہیں۔ تو بتائیے ممی میرا اصل باپ کون ہے۔"

گلناب عالم حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

"بتائیے ممی! یا پھر اس وقت اب آپ کو یہ بھی یاد نہیں کہ..." یک لخت گلناب عالم نے ایک چانٹا مار کر اس کا منہ بند کردیا۔ اور پھر اس کے منہ پر چانٹوں کی بارش کردی۔ زیان ان کے تھپڑوں سے بچتا ہوا انہیں پرے کرنے لگا۔ لیکن گلناب عالم غصے میں آپے سے باہر ہو گئی تھیں۔ پے در پے وہ زیان کے گالوں پر تھپڑوں کی بارش کرتی رہیں کہ اچانک جھٹکے سے ان کے ہاتھ رک گئے۔

غصے میں زیان نے بھی ان کے منہ پر ایک چانٹا مارنا چاہا تھا۔ اور اس کا ہاتھ ہوا میں ہی ساکت ہو گیا۔ گلناب عالم اس کو اور اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو دیکھتی رہیں۔ ملازموں کی آنکھیں جو آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ چھلک گئیں۔

"رک کیوں گئے... مارو... اپنی ماں کے منہ پر تھپڑ مارو... تمہاری ماں اسی کی مستحق ہے۔" وہ پھر سے روتے روتے بولیں۔ زیان نے اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گرا لیا۔ کمرے کے سناٹے میں بدروحوں کی چیخ و پکار گونجتی رہی۔

گلناب عالم نے ساڑھی کے پلو کے ساتھ آنکھیں خشک کیں۔ پھر تن کر کھڑی ہو گئیں۔

"نکل جاؤ زیان... اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ... تمہاری ماں آج سے تمہارے لیے مر گئی... اور تم اپنی ماں کے لیے... دوبارہ ساری زندگی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔" وہ زیان کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر کہہ رہی تھیں۔

"یہ گھر میرا ہے۔ وصیت کے مطابق... آپ کو جانا ہے تو چلی جائیں۔" زیان نے الٹا انہیں جواب دیا۔ گلناب عالم کی رہی سہی جان اس ایک فقرے نے نکال دی۔ تن کر کھڑا ان کا وجود بھربھری مٹی بن گیا۔ وہ صرف ظاہری طور پر کھڑی تھیں ورنہ اندرونی طور پر وہ پاتال کی تہہ میں جا بیٹھی تھیں۔

تمام ملازم بے آواز رونے لگے۔

گلناب عالم وہ گھر چھوڑ کر اسی رات چلی گئی تھیں۔ اور ایسی گئی تھیں کہ واپس پلٹ کر نہیں آئی تھیں۔ دو ایک ماہ بعد جب زیان کا غصہ تھوڑا کم ہوا تو اس نے ان کی تلاش شروع کی۔ لیکن انہیں نہیں ملنا تھا۔ وہ نہیں ملیں۔ اس دوران وہ سب سے یہ ہی کہتا رہا تھا کہ وہ اپنی دوستوں کے ساتھ ورلڈ ٹور پر گئی ہوئی ہیں۔

گلناب عالم کہاں چلی گئی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ انہیں زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا اس بات کا پھر کبھی پتا نہ چل سکا۔ ان کی تلاش سے مایوس ہو کر ایک دن زیان نے اپنا گھر بار سب بیچ دیا۔ اور سدیم میشب کے ساتھ فرانس شفٹ ہو گیا۔ فرانس جا کر بھی اس نے اپنے پرانے اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے گلناب عالم کی تلاش ایک لمبے عرصے تک جاری رکھی۔ لیکن نامرادی کے سوا اس کے حصے میں اور کچھ نہ آیا۔ اس کی بربادیوں کا آغاز اسی دن سے ہو گیا تھا۔ وہ ہی بے خبر رہا۔

☼ ☼ ☼

"اللہ کی ڈھیل کو اس کی کمزوری مت سمجھو

زبان۔" پروفیسر صغیر ربانی نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اللہ نے جب ان پر سے اپنی ڈھیل ختم کی تو ان کے پاس کچھ بھی باقی نہ بچا سوائے پچھتاوے کے۔ سدیم پھر ہادیہ (بیوی) اور ریشب..... سب باری باری انہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ تنہا ہو گئے تھے۔ اس تنہائی میں انہیں ایک چہرہ پریشان کرنے لگا..... وہ اس چہرے کو بھولنے کی کوشش کرتے..... لیکن وہ چہرہ سوتے جاگتے ہر وقت ان کی نظروں کے سامنے ہوتا..... وہ چہرہ ان کی سوچوں میں تھا۔ ان کے گمانوں میں اور ان کی بیداری میں بھی..... وہ اسے بھولنے میں ناکام رہے۔ اسی ناکامی سے وہ رفتہ رفتہ ذہن پر اپنی گرفت کھونے لگے۔

زمل ان کی وجہ سے پریشان رہتی تھی۔ اور اب اس کی پریشانی کا کیا نتیجہ نکلا تھا..... وہ کہاں تھی..... وہ کہاں تھی..... کیا وہ بھی خاموشی سے انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

روتے روتے انہوں نے اللہ کو پکارنا چاہا۔ لیکن ان سے اللہ کو پکارا نہ گیا۔ انہیں تو ڈھنگ سے دعا مانگنی بھی نہیں آتی تھی..... زمل زمل کہتے وہ بس اللہ کے حضور گڑگڑاتے رہے۔

☆ ☆ ☆

زمل کے حواس بڑی دیر کے بعد جاگنے شروع ہوئے۔ غنودگی کا اثر ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کمرے میں رات کی کالک پھیلی ہوئی تھی۔ جس وقت اس کی آنکھ ذرا سی کھلی اور اس نے خود کو اس خوفناک اندھیرے میں پایا تو جو پہلا احساس جاگا وہ یہ تھا کہ وہ کسی قبر میں بند ہے۔ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے اور لوگوں نے اس زندہ کو مردہ سمجھ کر منوں مٹی تلے دفنا دیا ہے۔

اسے ایک جھرجھری سی آئی۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ مزید ہوش پکڑنے لگی۔ اس کے حواسوں نے مزید کام کرنا شروع کیا۔ ڈھلکا ہوا سر اس نے جسے بڑی مشکلوں سے اوپر اٹھایا۔ اور درد کی ایک لہر اس کے وجود کے آر پار ہو گئی۔ اس کی دونوں کلائیوں اور جبڑوں میں بڑے زور کا درد اٹھا تھا۔ وہ ایک آہ سی بھر کر رہ گئی۔

آئرن گولڈ کے بیڈ کی پشت پر اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں کر کے الگ الگ باندھے گئے تھے۔ اور رسی سے اتنی مضبوطی کے ساتھ باندھے گئے تھے کہ وہاں سے اس کے ہاتھ کے سفید حصے سرخ پڑ گئے تھے۔ ایک گندا میلا کپڑا اس کے منہ میں ڈال کر سر کی پشت کی طرف باندھ دیا گیا تھا۔ اسے اتنی تکلیف ہو رہی تھی کہ وہ ٹھیک سے سسک بھی نہیں سکتی تھی۔

کمرے میں چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گہرا اندھیرا..... بہت غور سے دیکھنا بھی بے کار ثابت ہوا۔ دوسرا آنکھوں کے آگے اس کے اپنے ہی بے ترتیب بال تھے..... جنہیں وہ پرے نہیں کر سکتی تھی..... اپنی بے بسی پر اسے رونا آ گیا۔

حسیات کے ساتھ ساتھ پھر یادداشت نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ وہ یہاں کیسے پہنچی تھی' وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ وہ باسل سے ملنے جارہی تھی۔ لفٹ میں کسی کے دو مضبوط ہاتھوں نے اسے تھام کر اس کے منہ پر گیلا رومال رکھا تھا۔ پھر وہ ہوش کھوتی چلی گئی۔ بعد میں کیا ہوا اسے پتا نہیں چلا۔ اب اس کے ساتھ کیا کیا ہو سکتا تھا' وہ بخوبی جانتی تھی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو بار بار جھٹکے دیئے۔ سوائے درد کے اسے کچھ نہ ملا۔ رسیوں کے ابھار اس کی کلائیوں کے اندر تک پیوست ہو چکے تھے۔ جلد ہی اس نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ منہ میں ٹھونسا کپڑا وہ باہر نہیں نکال سکتی تھی۔ اور اس کے ساتھ وہ چلا بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک آنسو تھے جو وہ بہا سکتی تھی۔ اس نے انہیں نہیں روکا..... بہہ جانے دیا..... اس کا اغوا کار کون تھا۔ اس کا کیا مقصد تھا۔ سوچتے سوچتے اس نے رات گزاری۔

ساری رات باہر سے خوفناک آوازیں آتی رہیں۔ اور وہ بے بسی کی تصویر بنی انہیں سنتی رہی۔ وہ رات سخت اذیت ناک تھی' مدتوں بعد ختم ہوئی تھی۔

صبح کا احساس اسے کمرے میں روشنی کے پھیلنے سے ہوا جو نجانے کہاں سے آرہی تھی۔ کمرہ تو چاروں

طرف سے بند تھا۔ واحد دروازہ بھی.... غور کرنے پر
اسے محسوس ہوا کہ اس کے سر کے عین پیچھے کوئی
کھڑکی ہے۔ جہاں سے دھوپ کمرے میں آرہی تھی۔
دوبارہ اس کی آنکھ دروازہ کھلنے کی آہٹ پر کھلی اور
لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ مکمل جاگ گئی۔ کسی نے
آہستہ سے دروازہ کھولا تھا اور اسے دیکھتے ہوئے بند کیا
تھا۔ وہ کون تھا؟ جس کا سارا چہرہ ماسوائے آنکھوں کے
سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا.... اور خباثت اس کی
آنکھوں سے ہی ٹپک رہی تھی۔ زمل نے کانپ کر
اپنے پاؤں سمیٹ لیے۔ وہ شخص اس کے قریب آرہا
تھا.... زمل تیزی سے گردن ہلانے لگی.... اپنا آپ
چھڑوانے کے لیے وہ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں
کرسکتی تھی۔ اس کے منہ میں ٹھونسا کپڑا ڈھیلا ہوگیا۔
سامنے والے کے ارادے اس کی آنکھوں سے
عیاں تھے۔ وہ بیڈ پہ جکڑی جکڑی مزاحمت کرنے لگی۔
ٹانگیں چلانے لگی۔ اسے لگا سامنے والا مسکرایا ہے۔ اسے
اس سب سے مزہ آرہا تھا.... زمل اس کی آنکھوں میں
دیکھ کر ساکت ہوگئی.... اور حیران بھی.... آخر اس کا
پاکستان میں ایسا کون سا دشمن تھا جو اس کے ساتھ یہ
سب کرکے خوش ہو رہا تھا؟

وہ اگر اس ساری صورت حال میں تحمل سے کام لیتی
تو سامنے والے کی آنکھوں سے ہی پہچان سکتی تھی کہ وہ
کوئی اور نہیں۔ یشار ہے۔

یشار نے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا۔ اور
وائس ریکارڈنگ کے بٹن کو آن کردیا۔ وہ زمل کی ایک
ایک پکار اس کے باپ کو سنانے والا تھا۔ اس کی آہ و
پکار.... مدد کی فریاد.... یہ یقیناً ”ایسی اذیت تھی جو اس
کے باپ کو موت سے ہم کنار نہ بھی کرتی تو بہرہ تو ضرور
کردینے والی تھی۔

آگے بڑھ کر اس نے زمل کے منہ پر بندھا کپڑا
کھولنا چاہا۔ زمل سہم کر پیچھے ہوئی۔ لیکن وہ کتنا پیچھے
ہوسکتی تھی؟ اس نے مایوسی سے آنکھیں موندلیں۔ وہ
کچھ بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں
سے بہنے لگے۔ اور دم گھٹتی آواز کے ساتھ روتے
ہوئے اس نے اللہ سے اپنی موت کی دعا مانگی۔

☼ ☼ ☼

اس دن کی شروعات ہی بڑے عجیب طریقے سے
ہوئی تھی۔ فجر کے بعد سے ہی جو دن چڑھنے لگا۔ اور نانو
کے دل پر طاری گھبراہٹ مزید بڑھنے لگی۔ دو دن سے
ان کا کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ اوپر سے
موسم کی یہ آنکھ مچولی.... کیا موسم کو بھی کوئی بے کلی
کھا رہی تھی.... ان کی طرح۔

زمل فیصل آباد جاچکی تھی۔ اور باسل اسلام
آباد... وہ دونوں سے ہی نہیں مل سکی تھیں۔ دونوں
کے تاثرات سے بے خبر تھیں.... باسل نے ساری
گفتگو ان کی ہدایت کے مطابق خاموشی سے سن لی
تھی۔ اس کے بعد وہ کیا سوچ رکھتا تھا نانو نہیں جانتی
تھیں.... انہیں باسل کو خاموش رہنے کا نہیں کہنا
چاہیے تھا۔ اور اگر انہوں نے ایسا کرہی لیا تھا تو کم از کم
آخر میں وہ اس کے کچھ بولنے کا انتظار تو کرلیتیں، وہ
یقیناً بہت کچھ کہنا چاہتا ہوگا۔ پوچھنا چاہتا ہوگا۔ یا رونا
ہی چاہتا ہوگا۔ نانو کے علاوہ اس کا اس دنیا میں جذباتی
آسرا اور کون تھا بھلا۔ نانو کا دل کٹنے لگا۔

وہ خاموشی سے اسلام آباد چلا گیا تھا۔ اور اب
نجانے وہاں کس حال میں تھا۔ اپنی ماں کے بارے میں
اتنا سب کچھ سننے کے بعد کون اپنے حواس میں رہ سکتا
ہے.... زمل سے اس نے کیا کہا ہوگا۔ اسے ٹال دیا ہوگا
یا وہ اس سے ملا ہی نہیں ہوگا۔ وہ اتنا ضبط خود میں کیسے
پیدا کرپایا.... کیا اس نے زمل کے باپ کو معاف کرکے
اسے اپنا لیا ہوگا یا دھتکار دیا ہوگا۔ زمل اب کبھی کیا
دوبارہ اس گھر میں آسکے گی۔ خدارا کوئی تو انہیں ان
سب باتوں کے جواب دے۔

نانو نے باتوں باتوں میں یشار سے پوچھا کہ کیا باسل
نے اس سے کوئی بات کی؟ یشار نے نفی میں گردن
ہلادی۔ باقی سب سوالوں سے بھی وہ اپنی لاعلمی ظاہر
کرتا رہا۔ نانو مزید دکھی ہوگئیں۔ انہوں نے جلتی آگ
میں باسل کو تن تنہا کھڑا کردیا تھا۔ انہوں نے بار ہا باسط

کو کال کرنا چاہی لیکن پھر خود ہی رک گئیں۔ ان میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی اب.....

دوسرا یشار نے انہیں اس کام کے لیے زیادہ فارغ نہیں رہنے دیا تھا..... سارا دن اور ساری رات وہ اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی میں پٹیاں بھگو بھگو کر رکھتی رہی تھیں۔ اسے تیز بخار نے آن لیا تھا..... اس کی طبیعت بہت خراب تھی..... دوائی اور نانو کی خدمت کے باوجود اس کا بخار نیچے نہیں آرہا تھا۔ نانو نے تہیہ کیا تھا کہ اب وہ یشار کو بھی سب کچھ بتادیں گی۔ جلتے کوئلوں پر وہ ایک آخری بار پھر سے چل لیں گی لیکن یشار کی خراب طبیعت نے انہیں فی الحال ایسا کرنے سے بعض رکھا۔ وہ نانو کی گود میں سر رکھ کر کسی چھوٹے بچے کی طرح رویا تھا۔ اور بہت رویا تھا۔

نانو کو حیرت ہوئی۔ بخار نے یشار کو حساس کر دیا تھا۔ وہ ایسا نہیں تھا۔ وہ تو بہت مضبوط تھا۔ نجانے کن آفتوں نے نانو کا گھر دیکھ لیا تھا جو یکے بعد دیگرے عجیب و غریب واقعات ہوتے چلے جارہے تھے۔ پہلے زمل کی بیماری..... پھر اس کی ذات کا انکشاف اور اب یشار..... پریشانی میں نانو ان وظیفوں کو بھی بھول گئیں جو ایسے موقعوں پر پڑھے جاتے ہیں۔

صبح وہ یشار کے کمرے میں آئیں تو وہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ حالانکہ انہوں نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ کہیں باہر نہ نکلے۔ نانو نے اسے کال کی تو اس کا نمبر بند ملا۔

"شاید بخار رات میں اتر گیا ہو....." یہ سوچ کر انہوں نے خود کو تسلی دی۔ اور بے دلی سے شیشے کے پیالے کا کام مکمل کرنے لگیں۔

اس پیالے کو وہ پچھلے دو سالوں سے وقتاً "فوقتاً" بنا رہی تھیں۔ شیشے کا تسلے جتنا بڑا پیالہ جس کے چار اطراف نارنجی، سبز اور پیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے شیشے کے ٹکڑے بڑی نفاست احتیاط اور خاص فارمولے کے تحت لگانے تھے۔ پھر اس کٹورے کو دھوپ میں رکھ کر پانی ڈالو تو اندر پانی میں ہی کانچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا عکس اس طرح منعکس ہوتا تھا کہ ننھی ننھی مچھلیاں تیرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

نانو نے کانچ کا آخری ٹکڑا بھی لگا دیا۔ "ماہی قدح" مکمل تھا۔ اور اسٹول پر رکھے اسے دیکھتے ہوئے نانو خوش ہونے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ یہ بنانا ان کا خواب تھا۔ اور خواب نجانے کن منحوس ساعتوں میں شرمندۂ تعبیر ہوا تھا۔ اپنی زندگی کے کتنے ہی قیمتی لمحے وہ اس پیالے کو دے چکی تھیں۔ اور اب مکمل ہو جانے کے بعد ان کا اس میں پانی ڈال کر مچھلیاں دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا..... اٹھ کر وہ پودوں کی کانٹ چھانٹ کرنے لگیں..... زمل بڑے دنوں سے یہ کام بڑے شوق سے کر رہی تھی۔ وہ تو جیسے اس کام کو بھول ہی گئی تھی۔ ان کا دل اداس ہو گیا۔

"زمل!" پکارتے ہوئے وہ بہت کچھ سوچنے لگیں۔ انہیں ایسا لگا جیسے زمل اب یہاں کبھی واپس نہیں آئے گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے فرانس جا چکی ہے۔ "زمل کا پاسپورٹ یہاں نہ پڑا ہوتا تو یقیناً" وہ اپنے گمان پر ایمان لے آتیں.....

وہ تب چونکیں جب اپنے پیچھے انہیں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نانو اس چاپ کے اسرار سے بخوبی واقف تھیں۔ انہوں نے اپنا دل تھام لیا۔ خراب ٹہنی ان کے ہاتھ میں جھول گئی۔ صد شکر کہ قینچی نے ان کی انگلی نہیں کاٹ دی تھی۔ انہوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ نگار برآمدے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔

وہ پچھلے اٹھائیس سالوں میں اپنے کمرے سے باہر اتنا کم نکلی تھی کہ نانو ان دنوں کو بہ آسانی گن کر بتا سکتی تھیں۔ اور اپنے کمرے سے باہر رہنے کا اس کا مجموعی وقت ان اٹھائیس سالوں میں آٹھ، دس گھنٹوں سے زیادہ کا نہیں رہا تھا۔ اب جب وہ پھر بڑے عرصے بعد باہر نکلی تو نانو کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس کا استقبال کس طرح کریں۔

"کچھ چاہیے نگار؟" قریب جا کر انہوں نے پیار سے پوچھا۔ جواباً نگار نے نفی میں گردن ہلا دی۔ زمین کو کھوجتے کھوجتے وہ اب سورج سے نظریں ملانے لگی

تھی، نانو تذبذب کا شکار ہوئیں۔ نگار انہیں کچھ بے چین نظر آرہی تھی۔

"کھانا لا دوں؟" انہوں نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے گاڑے اب کے انہیں سر کے اشارے سے بھی جواب نہ دیا گیا۔ نانو کا دل تو ویسے بھی پچھلے دنوں سے کمزور ہوتا جارہا تھا۔ ایسے میں نگار کی آمد اور اس طرح کا رویہ..... کرخت تاثرات اس کے پورے وجود سے لپٹے تھے۔ نانو اسے بولنے کے لیے اکسا نہ سکیں۔

"ادھر آؤ نگار..... دیکھو میں نے وہ "ماہی قدح" بنا لیا ہے۔ جسے میں سالوں سے بنانا چاہتی تھی۔" نگار کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے اسٹول تک لے آئیں۔ نگار خالی پیالے کو دیکھنے لگی۔

"ٹھہرو، میں اس میں پانی ڈالتی ہوں..... پھر دیکھنا....." نلکے سے پانی کا جگ بھر کر انہوں نے پیالے میں انڈیل دیا۔ پیالہ آدھے سے آدھا بھی نہ بھر سکا۔

"دیکھنا..... ابھی اس میں مچھلیاں تیرتی نظر آئیں گی۔" انہوں نے دوسرا جگ بھی پیالے میں ڈال دیا۔ پھر تیسرا اور چوتھا بھی۔

"دھوپ مزید تیز ہو لینے دو ذرا۔" اشتیاق سے بتاتی نانو پانچواں جگ بھر رہی تھیں۔ اور نگار بنا پلکیں جھپکائے پیالے میں جھانک رہی تھی۔ جہاں نارنجی سبز، پیلی اور سرخ ننھی منی بے روح اور لاتعداد مچھلیاں تیرنا شروع ہوگئی تھیں۔ وہ اس منظر سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکی۔

"اچھا لگا.....؟" نانو نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ انہوں نے نگار کو اس طرح یک ٹک پیالے کے پانی کو دیکھتے دیکھا تو خوش ہوگئیں۔ ان کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ انہیں نہ سہی نگار کو تو وہ پیالہ بھا گیا تھا۔

لیکن نگار اس پیالے کے اندر اب کچھ اور ہی دیکھ رہی تھی۔ دھوپ سے منعکس ہوتا دلکش منظر آہستہ آہستہ بدل رہا تھا۔ مچھلیاں تیرتی تیرتی نجانے کہاں جارہی تھیں۔ سادا شفاف پانی سیاہ ہو رہا تھا۔ اور اس کی سیاہی قبر کے اندھیرے سے ملنے لگی تھی۔ نگار کو خوف محسوس ہوا۔

سیاہی میں رفتہ رفتہ کسی چیز نے چمکنا شروع کیا..... دو آنسوؤں سے..... روتی ہوئی ایک لڑکی کے دو آنسوؤں نے..... اس لڑکی کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے منہ پر کپڑا کسا تھا..... اور اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پلنگ کی پشت پر کس کر باندھے گئے تھے۔ نگار کو یہ منظر جانا پہچانا سا لگا۔ خوف سے اس کے وجود پر کپکپی طاری ہوگئی..... اس کی آنکھیں پھٹتی چلی گئیں۔

منظر میں پھر وہاں ایک لڑکا نمودار ہوا۔ جس کا پورا چہرہ سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ ماسوائے آنکھوں کے اور جو اس لڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یک لخت نگار نے اس لڑکے کو پہچان لیا اور اس لڑکی کو بھی..... وہ لڑکا یشار تھا..... اور وہ لڑکی زمل۔

تیس سال پرانے بادل جیسے پھر سے گرجے..... سرخ آندھی چلی اور آنکھوں کو اندھا کر گئی..... بجلی کی گونج نے کانوں کو سماعت سے محروم کر دیا۔ اور منظر کی خوفناکی نے زبان کی ساری صلاحیتیں چھین لیں۔

"اس پیالے کو میں بیچوں گی نہیں..... اسے گھر میں ہی....." نانو پلٹیں اور تیزی سے اپنی طرف آتی نگار سے ٹکرا گئیں..... پانی سے بھرا شیشے کا جگ چھوٹ کر زمین پر آگرا۔ کرچیاں ان کے پاؤں کے اردگرد بکھر گئیں۔

"کیا ہوا نگار....." وہ نگار کی بے قراری سمجھ نہ سکیں۔

"وہ لڑکی..... وہ لڑکی....." وہ تیزی سے بول رہی تھی۔ اشارہ پیالے کی طرف تھا۔

"کون لڑکی....." نانو نے نہ سمجھتے ہوئے گردن ترچھی کر کے پیالے کی طرف دیکھا۔

"وہ لڑکی جو یہاں ہے؟"

"زمل کی بات کر رہی ہو۔" انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ کہیں نگار اس کی اصلیت جان تو نہیں گئی تھی۔ نانو میں زندگی کی رمق ختم ہو کر بس ان کی آنکھوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔

”ہاں..... اس لڑکی کو بچالیں آپ۔“
”کس سے بچالوں؟“
”ان دونوں کا رشتہ خونی ہے.....“ اس نے انکشاف کیا۔
”کن دونوں کا؟“ نانو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔
”بھائی ہے وہ اس کا۔“ وہ اپنی ہی لے میں بول رہی تھی۔
”کون کس کی بات کررہی ہو نگار؟“ نانو کی آواز ان کے وجود کی طرح کانپی۔
”نیشار.....“ نگار نے کہا..... اور زلزلے کی شدت سے پورا حبیب اللہ روڈ ہل گیا۔ نانو کی آنکھیں ایسے پھٹیں جیسے کبھی جھپکی ہی نہ ہوں۔
”نیشار بھائی ہے اس کا۔“ وہ چلائی۔
”کیا کہہ رہی ہو نگار.....“ نانو جگ کی طرح ہی ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گئیں۔ ان کی آواز میں آنسو گھلے ہوئے تھے۔ سوال میں جھوٹ کی التجا تھی اور لہجہ غلط بیانی کا محتاج۔ پچھلے دن سے رازوں کی ادائیگی کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا تو گیا وہ ابھی تک قائم تھا۔
”نیشار زیان کا بڑا ہے..... بھائی ہے اس لڑکی کا..... اسے روک لیں..... اسے روک لیں۔“ یہ ہی الفاظ دہراتی وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ سلاخ دار کھڑکی کی سلاخوں کو پکڑ کر اس نے جھنجوڑ ڈالا۔ اور پھر پوری قوت سے چلا اٹھی۔
”اسے روک لو جو..... اسے روک لو..... ان دونوں کا رشتہ خونی ہے۔ بہن ہے وہ اس کی.....“ سلاخوں پر اپنا سر گرا کر وہ رونے لگی۔
آواز بلند تر تھی۔ اور پستی میں کبھی ان سب کو اتنی بلندی کی عادت نہیں تھی۔ سالوں سے سوئے ہوئے برگد نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ پھر جھوم کر انگڑائی لی۔ اس کے ساتھ ساتھ جیسے سات آسمان بھی جھومے۔ شاخ شاخ پتا پتا بین کرنے لگا۔ ساری جٹائیں ہوا میں دائیں بائیں بکھر گئیں۔
وہ جانتا تھا۔ اس پیغام کی پیغام رسانی میں لمحے بھر کی بھی دیر نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ دلوں سے طوفانوں کا خوف نکل جائے گا۔
باہر صحن میں نانو ساکت و جامد کھڑی اپنے پیروں میں گرے کانچ کے نوکیلے ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔
”کیا آج کا سورج میری جان لے کر غروب ہوگا؟“

☼ ☼ ☼

پروفیسر صغیر ربانی نگار کو اپنے گھر لے آئے تھے۔ خوش دلی سے یا مجبوری سے ’انہیں ایسا کرنا پڑا تھا۔ وہاں عالم ہاؤس میں جو کچھ ہورہا تھا انہیں وہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہمایوں‘ زلیخابی‘ خدایار‘ گلناب عالم‘ زیان وہ کسی ایک کے بھی رویے کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ لیکن وہ نگار کی روتی آنکھوں کی التجا کو خوب سمجھے تھے۔ وہ تو درختوں‘ پہاڑوں‘ پتھروں تک کو جان چکے تھے۔ انہیں آزما چکے تھے۔ نگار تو پھر ان کی خاص اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ اسے کیسے نہ سمجھتے۔ جو بھی واقعہ ہوا تھا انہیں اس کا زیادہ علم نہیں ہوسکا تھا۔ لیکن انہیں اتنا اندازہ ضرور تھا کہ نگار کے ساتھ کچھ بہت برا ہوا ہے۔ وہ ان کے سینے کے ساتھ لگ کر روئے جارہی تھی۔ اور زیان نے وہیں بڑے ہال کے بڑے روشن فانوس کے نیچے کھڑے کھڑے اسے طلاق دی تھی۔
”میں غلطی پر تھا..... اس لڑکی کو اپنے گھر میں رکھنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔“ اس کی بات نے دونوں پر انگلی اٹھائی۔ دونوں کے روحانی رشتے پر تہمت لگائی۔ اور اردگرد کھڑے سب کچے ذہنوں نے اس کی بات پر یقین کرلیا۔ پروفیسر صغیر ربانی اس کی شکل دیکھتے رہ گئے تھے۔
”لے جائیے اسے اپنے ساتھ..... اگر یہ ایسا چاہتی ہے تو ایسا ہی سہی..... ہمارے گھر میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں.....“
ہمایوں نے کہہ دیا تھا۔ اسے اس بوڑھے پروفیسر پر ویسے بھی بہت غصہ تھا۔ اس کے خیال میں اس سٹھیائے پروفیسر نے نگار کا دماغ خراب کیا تھا اور نوبت

یہاں تک پہنچی تھی۔ خدایار۔۔۔ زلیخابی نے بھی اس سے منہ موڑلیا تو وہ چاروناچار نگار کو اپنے ساتھ حبیب اللہ روڈ اپنے گھرلے آئے۔ سب ابھی غصے میں تھے' گرم دماغ سے سوچ رہے تھے۔ جو وہ ہر طرف سے نگار کی ہی غلطی نکال رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ خود بخود ہی حل ہوجائے گا۔ اور وہ نگار کو اس کے گھرچھوڑ آئیں گے۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ کچھ بھی ٹھیک نہ ہوا۔ بلکہ مزید بگڑتا ہی چلا گیا۔ اور نگار کے لیے زمین تنگ ہوتی گئی۔

جس دن وہ نگار کو اپنے ساتھ گھر لائے اسی دن رات کو خدایار کا انتقال ہوگیا۔ رات میں نجانے وہ سو سکے تھے کہ نہیں البتہ صبح وہ اٹھ نہ سکے۔ ان کی موت کی وجہ سب کے سامنے تھی۔ ہمایوں نگار کو زندہ دفن کروینا چاہتا تھا۔ زلیخابی ساری زندگی اب اس کے منہ پر تھوکنے والی بھی نہیں تھیں۔

صغیر ربانی نے نگار کو اس کے بابا کی وفات کے بارے میں نہیں بتایا۔ وہ اس حالت میں بھی نہیں تھی کہ کوئی بات دھیان لگا کر سن سکتی۔ اس کے باوجود وہ ساری رات بابا' بابا کہہ کر روتی رہی تھی۔ اور ایسے روتی تھی جیسے تخیل میں کسی میت کی چارپائی کے پاس بیٹھ کر رویا جاتا ہے۔ صغیر ربانی کو دکھ ہوا تھا مگر وہ بے بس تھے۔

ہمایوں اور زلیخابی۔۔۔ خدایار کا سوگ پورا کر کے کراچی اپنے رشتے داروں کے پاس چلے گئے تھے۔ دنوں میں جو بدنامی نگار کی وجہ سے ان کی ہو چکی تھی وہ اسے مزید برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات زبان زدعام تھی کہ نگار اپنے پروفیسر کو پسند کرتی تھی۔ اسی وجہ سے زیان نے اسے طلاق دی ہے۔ کچھ دنوں بعد صغیر ربانی نے نگار کو اس کے بابا کی وفات کے بارے میں بتادیا تھا اور یہ بھی کہ ہمایوں اور زلیخابی کراچی جا چکے ہیں۔

سن کر نگار نے کوئی تاثر نہیں دیا۔ جیسے وہ پہلے سے سب جانتی ہو۔ وہ دنوں سے ایسی ہی حالت میں تھی۔

قوسی سلاخ دار کھڑکی سے ٹیک لگائے مردہ آنکھوں سے خلاؤں میں دیکھتی ہوئی۔ پروفیسر صغیر ربانی کے لیے اس کی حالت حیران کن نہیں تھی۔ تاہم انہیں ہمایوں اور زلیخابی کے اس طرح چلے جانے پر رنج ضرور ہوا تھا۔

ساری زندگی پروفیسر صغیر ربانی نے خود میں قید رہ کر گزاردی تھی۔ ان کے اس بڑے گھر میں ان کے علاوہ ڈھیروں کتابیں تھیں اور بس۔۔۔ ایسے میں نگار کی موجودگی وہ بھی اس حالت میں۔۔۔ ان کی ساکت زندگی منتشر ہونے لگی۔۔۔ ندی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں جیسے جوار بھاٹا آگیا۔ اور وہ پہلے سے بھی زیادہ بوڑھے لگنے لگے۔۔۔ انہیں پتا تھا اللہ اپنے پیاروں کو آزماتا ہے۔ اور انہیں اندازہ تھا کہ اللہ اب ان کو بھی آزما رہا ہے۔ نگار کی صورت میں۔۔۔ انہیں اس آزمائش میں ہر صورت پورا اترنا تھا۔

نگار آہستہ آہستہ اپنا ذہنی توازن کھو رہی تھی۔ وہ پہروں چلاتی اور دنوں خاموش رہتی۔ کبھی وہ خود سے باتیں کرتی' کبھی نفی کے انداز میں تیزی سے گردن ہلائے جاتی اور بولتی رہتی۔

"زیان! رحم کرو مجھ پر۔۔۔ اللہ کے لیے۔۔۔ سدیم' یشب۔۔۔" وہ تاریک دیواروں کے روبرو کہتی۔ ان سے سہمی سہمی بھاگتی۔

پروفیسر صغیر ربانی نے اس سے کبھی کچھ نہیں پوچھا' یہ الفاظ سب بتادینے کے لیے کافی تھے۔ ایسے لمحوں میں نگار کو دیکھنا انہیں ناگزیر لگتا۔ انہیں یہ وہ والی نگار لگتی ہی نہیں جو ان کی یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔۔۔ انہیں پسند کرتی تھی۔ تعلیم میں بہت آگے تھی اور جس نے اسکالرشپ پر یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا۔ یہ تو انہیں کسی دوسری دنیا سے آئی ہوئی نگار لگتی۔ جس کی ہر لگن ختم ہو چکی تھی۔

وہ اکثر و بیشتر نگار کے پاس بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اسے سمجھاتے' اس سے سوال کرتے' جواب طلب کرتے۔ انہوں نے نفسیات کی بہت سی کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ وہ نگار کو پہلے والی نگار بنانا چاہتے تھے۔ نجانے

انہوں نے اپنی قابلیت پر اتنا بھروسا کیونکر کرلیا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ مرتے دم تک اس کام میں ناکام رہے تھے۔

"اسے روک لیں۔ دیکھیں وہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔۔۔۔" وہ کبھی بند دروازے، کبھی کسی دیوار یا کبھی کھڑکی سے نظر آتے برگد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی۔

"اس کی منت کریں کہ وہ میری عزت کے ساتھ نہ کھیلے۔" وہ روتے روتے ان کے سینے میں چھپ جاتی اور ٹھوس دل کے مالک پروفیسر صغیر ربانی کا دل پگھل کر رہ جاتا۔

"تم اس سے ڈر گئیں نگار۔۔۔۔ یہ تو برگد ہے۔۔۔۔ درختوں میں درویش درخت۔۔۔۔ ان رازوں کا امین جو الوہیت کی طرف لے کر جاتے ہیں۔"

ہر معاملے میں ان کے اپنے فلسفوں کی عرق ریزی تھی جس سے کوئی سطحی سوچ والا متفق نہیں ہوسکتا تھا۔ اور نگار تو ان کے ہر فلسفے کی قدردان تھی۔ وہ متفق کیسے نہ ہوتی۔

پھر ایک روز۔۔۔۔ اس گھر میں زلیخابی کی آمد ہوئی۔ معجزاتی طور پر۔۔۔۔ وہ کراچی سے اکیلی ہی آئی تھیں نگار سے ملنے۔۔۔۔ لیکن نگار کی ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنی ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی۔ اسے تو شاید زلیخابی بھول ہی گئی تھیں۔ جب ہی تو زلیخابی کو روتے ہوئے بار بار اسے بتانا پڑ رہا تھا کہ۔

"نگار! مجھے پہچانو! میں ماں ہوں تمہاری۔"

خود زلیخابی بھی تو پہلی نظر میں اسے کہاں پہچان سکی تھیں۔ کیا یہ وہ ہی نگار تھی۔ ان کی بیٹی۔۔۔۔ جس کی وہ ہر روز بلائیں لیا کرتی تھیں اور یہ بھی انہیں کم لگا کرتا تھا۔۔۔۔ نگار کی حالت دیکھ کر ان کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔۔۔۔ اور جب انہیں یہ بات پتا چلی کہ نگار ماں بننے والی ہے تو ان پر گویا پہاڑوں کا پورا سلسلہ یکے بعد دیگرے ٹوٹا۔۔۔۔ سر کا سائبان تو پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔۔۔۔ خدا یار کی وفات پر۔۔۔۔ اب اس خبر نے پیروں تلے کی زمین بھی نکال لی۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی اماں۔۔۔۔! میری بات کا یقین کرو۔۔۔۔ وہاں سدیم اور یشب بھی تھے۔۔۔۔ ان تینوں نے۔۔۔۔" "ہائے اللہ" زلیخابی کے دل میں ہوک اٹھی۔

"ان تینوں نے۔۔۔۔ ان تینوں نے۔۔۔۔" لفظ ان کے ذہن میں کھب گئے۔ ان کی بیٹی ان سے چیخ چیخ کر کہتی رہی اور انہوں نے اپنی ہی بیٹی کا یقین نہ کیا۔

"طلاق دے دی ہے اس نے مجھے۔۔۔۔ پہلے طلاق دی ہے اس نے مجھے۔۔۔۔ اور اس کے بعد۔" زلیخابی کا جگر جلنے لگا۔

ایک ہفتے تک اس کے ساتھ کیا کچھ ہوتا رہا ہوگا۔۔۔۔ یہ خیال، یہ سوچ اس قدر اذیت ناک تھی جیسے ان کے وجود کو کوئی تیزاب سے بھرے ہوئے ڈرم میں ڈال دے۔

"تو مر کیوں نہ گئی بے غیرت۔۔۔۔ تو مر کیوں نہ گئی۔" انہیں یاد آیا۔ انہوں نے اسے بددعا دی تھی۔ اور ان کی بددعا اسی وقت قبول ہوگئی تھی۔ وہ مرچکی تھی۔ بس سانسیں ہی تو چل رہی تھیں اس کی۔۔۔۔ زلیخابی اسی مردہ وجود کے ساتھ لگ کر روتی رہیں۔۔۔۔ کراچی واپس جانے سے پہلے انہوں نے صغیر ربانی کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

"اب آپ ہی میری بیٹی سے شادی کرلیں۔۔۔۔ اس کی حالت ایسی نہیں کہ اس قصے کو ختم کیا جاسکے۔ آپ اس بچے کو اپنا نام دے دیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔۔۔۔" روتے روتے انہوں نے پروفیسر صغیر ربانی کی منت کی۔

یہ زلیخابی کے آخری الفاظ تھے۔ پھر وہ اس گھر سے چلی گئیں اور بدقسمتی سے کراچی بھی نہ پہنچ سکیں۔ ٹرین میں سفر کے دوران ہی انہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے لی تھیں۔ اور ان پر موت کی چادر تان دی گئی تھی۔ روگ نے۔۔۔۔ دکھ سے ان کا دل پھٹ گیا تھا یا کرب سے ان کی روح جھلس گئی تھی۔۔۔۔ ان باتوں کے سارے جواب وہ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھیں۔

پروفیسر صغیر ربانی نے ان سے وہ وعدہ کرلیا تھا جسے پورا کرنا ان کے بس میں ہوتا تو وہ اب تک ایک صحرا کی سی زندگی نہ گزار رہے ہوتے۔ اپنے فلسفوں میں گھری ان کی زندگی ایک غار تھی۔ وہ اس سے خوش تھے۔ روشنی میں جانے سے ڈرتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایک مرتے ہوئے انسان سے وعدہ کیا تھا۔ اب انہیں ہر حال میں اسے پورا کرنا تھا۔

خاموشی سے ایک دن انہوں نے نگار سے کورٹ میرج کرلی۔ پانچ ماہ بعد دونوں کے گھر یشار کی ولادت ہوئی۔ صغیر ربانی نے یشار کو اپنا نام دیا.... یشار ربانی.... نگار کی آمد سے ان کی زندگی میں جو بھونچال آیا تو اس نے پھر تھمنے کا نام نہ لیا.... یشار کی پیدائش ہوئی۔ وہ ایک بچے کے باپ بن گئے۔ کتنا کچھ ہو گیا ان کی زندگی میں اور نگار کی بھی۔

نگار کو دیکھتے ہوئے وہ سوچتے کہ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ.... اور ان کے سارے خیالات غلط ثابت ہوئے۔

نگار نے چپ رہنے کی بہت سی قسمیں اکٹھی اٹھالی تھیں۔ وہ نارمل زندگی کی طرف واپس نہیں آرہی تھی۔ وہ اسے لے کر مختلف ماہر نفسیات کے پاس جانے لگے۔ اگرچہ وہ جانتے تھے کہ یہ سب بے کار ہے۔ پھر بھی وہ اسے لے کر لاہور، کراچی، اسلام آباد کے چکر لگاتے رہے۔ انہیں جہاں سے امید کی ذرا سی بھی کرن نظر آتی۔ وہ وہاں سے کوتاہی نہ برتتے....

ساری زندگی وہ اسی بات سے خوف کھاتے رہے کہ وہ حد سے نکل جائیں گے۔ اور بہت سوں کو لے ڈوبیں گے۔ ان میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا کہ وہ کسی دوسرے کی زندگی خراب کرتے۔ انہیں یہ ہی لگتا رہا کہ وہ اس نازک ہستی کو ٹھیس پہنچادیں گے۔ اب جو مجبوری سے ہی سہی انہیں شادی کرنی پڑی تھی تو وہ اسی فکر میں گھل رہے تھے کہ وہ اس نازک ہستی کو "مزید" ٹھیس نہ پہنچادیں۔

ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی۔ اکیلا گھر.... یشار اور نگار کو ماں کی طرح سنبھالنا.... ان سے کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہیں ہو پا رہا تھا۔ اور ان کا دور و نزدیک میں ایسا کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا جو اس مشکل میں ان کا ساتھ دیتا۔ رشتوں کے معاملے میں بھی وہ تنہا رہے تھے اور اب ایک بیوی اور ایک بیٹے کی موجودگی میں بھی وہ تنہا ہی تو تھے۔ مزید ایک سال بعد وہ حرکت قلب بند ہوجانے کے باعث اپنی عمر فانی پوری کرچکے تھے۔ ترکے میں انہوں نے حبیب اللہ روڈ پر موجود یہ گھر کافی زیادہ بینک بیلنس اور نومولود باسل چھوڑا تھا۔

باسل کی پیدائش کچھ ان کی خواہش پر نہ ہوئی تھی۔ اس پیدائش میں نفسیاتی معالجوں کے مشوروں کا بہت زیادہ عمل دخل شامل تھا۔

"انہیں اپنی جذباتی وابستگی کا احساس دلائیں.... انہیں زندگی کی طرف لانے والی واحد کرن آپ ہی ہیں۔"

ڈاکٹروں نے انہیں نگار کی زندگی میں ان کی موجودگی کی اہمیت کا احساس دلادیا تھا۔ اور جس وقت انہیں احساس ہوا اللہ نے انہیں اپنے پاس بلالیا۔ وہ مطمئن تھے۔ ترکے میں چھوڑی رقم نگار اور اس کے دونوں بچوں کے لیے کافی تھی۔

زلیخابی اور پھر صغیر ربانی کے انتقال کے بعد ہمایوں ایک مدت گزار کر کراچی سے لاہور آیا تھا۔ اپنی بہن سے ملنے.... لیکن تب تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ نگار زندہ تھی اور اس کی آنکھوں میں ہمایوں کے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا۔ وہ نگار کو اور اس کے بچوں کو اپنے ساتھ کراچی لے کر جانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے خالی ہاتھ ہی جانا پڑا تھا۔

سال دو سال بعد وہ تین چار دنوں کے لیے آجایا کرتا۔ یشار اور باسل کے ساتھ وقت گزارتا اور پھر واپس چلا جاتا۔ اس دن کے بعد اس نے دوبارہ کبھی نگار یا بچوں کو کراچی لے جانے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ اندر کے احساس گناہ نے اسے ایسا کرنے ہی نہیں دیا۔ نگار کے قصور واروں میں سے ایک وہ بھی تھا۔ وہ جانتا تھا۔

ایک باہمت لڑکی نگار..... جو زندگی سے بھرپور تھی۔ جس کے کچھ خواب تھے۔ جو زندگی میں کچھ کرنا چاہتی تھی..... لیکن اسی زندگی نے اسے منہ کے بل گرایا۔ قسمت اس پر یاور نہ رہی۔ اور جس کی تقدیر سیاہ روشنائی سے لکھ دی گئی اور یہاں نگار کی کہانی اختتام کو پہنچتی ہے۔

✡ ✡ ✡

"زمل کہاں ہو تم؟" انہوں نے زمل کو پکارا لاچاری سے..... اس کا سیل فون بدستور بند تھا۔ وہ کہاں تھی کوئی جواب وہ نہیں تھا۔

بڑی دیر تک وہ اسی طرح ایئرپورٹ پر چاروں اطراف نظر دوڑاتے رہے..... ان کے یہاں پہنچنے کی خبر زمل کو خود بخود ہی ہو گئی ہو..... اور وہ انہیں لینے یہاں آ گئی ہو..... بالکل ویسے ہی جیسے انہیں فرانس میں بیٹھے خبر ہو گئی تھی کہ زمل کسی مشکل میں ہے۔ اور وہ اپنے سارے عہد ختم کر کے آ گئے تھے۔ اسے مشکل سے نکالنے۔ لیکن ایسا کوئی الہام زمل کو نہیں ہونے والا تھا' کیونکہ کشف کے بعض درجوں کو عمروں سے نسبت ہوتی ہے اور بعض کو رشتوں سے۔

جلد ہی وہ مایوس ہو گئے۔ انہیں علم تھا ایسا کوئی معجزہ نہیں ہو گا۔ ان کا دل بری طرح سے گھبرانے لگا۔ وہ اجنبی چہروں کے ہجوم میں کھڑے تھے۔ کوئی ایک بھی ان کا اپنا نہیں تھا۔ ان کا دل کیسے نہ گھبراتا۔ زمل ناراض ہو کر ان کا امتحان لے رہی تھی۔ کیا وہ اپنے ڈیڈ کی ذہنی کیفیت سے واقف نہیں تھی۔ اس سے زیادہ اب کون واقف تھا بھلا..... شاید وہ خود بھی نہیں.....

ہوٹل پہنچنے تک کے سفر کے دوران وہ عجیب کشمکش کا شکار رہے۔ تمام لوگوں کی آنکھیں جیسے انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔ "وہ آ گیا ہے..... بدکردار شخص..... گناہ گار آدمی....." وہ سب جیسے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ان کے دل کی دھڑکنیں کم زیادہ ہوتی رہیں۔

زمل کی تلاش مزید کڑا امتحان تھی۔ وہ پاکستان آتو گئے تھے پھر وہ اب تک کیوں ناراض تھی ان سے۔ انہوں نے زمل کی بات مان لی تھی اور اب بھی وہ ان کے سامنے نہیں آ رہی تھی۔

شہر کی بھول بھلیوں کو دیکھتے دیکھتے وہ مزید خوف زدہ ہونے لگے۔ شہر بدل چکا تھا۔ ان کے لیے تو پرایا بھی ہو چکا تھا۔ انہیں لگا یہ بھول بھلیاں انہیں نگل لیں گی۔ ان کا اندازہ درست ثابت ہونے والا تھا۔

اٹھائیس سال بعد اس شہر میں زمل کی پریشانی انہیں کھینچ کر نہیں لائی تھی بلکہ ان کی موت نے انہیں یہاں بلایا تھا۔

شام تک انہیں زمل کا پتا مل گیا۔ ہوٹل کے منیجر کی کوشش ضائع نہیں گئی تھی۔ زمل نے سفارت خانے جا کر اپنی شناختی معلومات حاصل کی تھیں۔ اسے پاکستانی قومیت کارڈ چاہیے تھا۔ کیوں چاہیے تھا' زیان عالم نے اس رخ پر زیادہ نہیں سوچا۔ فارم میں اس نے اپنی موجودہ رہائش جو لکھی تھی وہاں کا پتا انہیں ہوٹل کے نمبر پر فیکس کر دیا گیا۔ ویٹر کے دستک دینے کے بعد انہوں نے دروازہ کھولا تو ویٹر نے انہیں فائل سمیت ایک کاغذ تھما دیا اور مزید کوئی حکم نہ پا کر چلا گیا۔ اگر ویٹر کو ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ کاغذ پڑھتے پڑھتے سامنے والے کی حالت غیر ہونے والی ہے اور وہ بے ہوش ہو کر گرنے والا ہے تو وہ یقیناً وہیں کھڑا رہتا۔ ایڈریس کی پہلی سطر نے ہی ان کے پیروں تلے سے دس منزلہ ہوٹل بنیادوں سمیت اکھاڑ لیا۔ وہ ہوا میں معلق ہو گئے۔

"صغیر ربانی (مرحوم)..... ریٹائرڈ پروفیسر آف پنجاب یونیورسٹی' ہاؤس نمبر 15' اسٹریٹ نمبر 11..... حبیب اللہ روڈ..... لاہور۔"

ان کی حالت غیر نہ ہوتی تو کیا ہوتی..... وہ بے ہوش ہو کر کیسے نہ گرتے..... یہ نام اتنا غیر اہم نہیں تھا کہ ان کے ذہن کے پردے سے اتنی آسانی سے محو ہو جاتا۔ یہ نام تو ان کے انتقامی کھیل کے عین درمیان میں آیا تھا۔ وہ اس نام کو کیسے بھول سکتے تھے۔

"خدا کی ڈھیل کو اس کی کمزوری مت سمجھو زیان!"

بات کے ساتھ ہی ایک زناٹے دار تھپڑ ان کے منہ پر پڑا تھا۔ اور اب یہ نام پھر سے پڑھ کر ان کے جسم پر کوڑے برستے چلے گئے۔ کیا بھیانک دن تھا وہ۔ جس کی بھیانک خیزی کا اندازہ انہیں وقت گزرنے کے بعد ہوا تھا۔

"زمل یہاں کیا کر رہی ہے.... اس گھر میں...."

انہیں زیادہ سوچنا نہیں پڑا۔ چھٹی حس نے فوراً" ہی جواب دے دیا تھا۔ ان کے خیال میں زمل اتفاقاً"اس گھر میں نہیں پہنچ گئی تھی۔ بلکہ وہ یہ ہی کام کرنے یہاں آئی تھی۔ این جی او کا جھوٹ بول کر.... انہیں اندازہ تھا پرانے سامان کی تلاشی لیتے لیتے اور اپنے ڈیڈ کے ماضی میں جھانکتے نکلتے وہ اب تک سارے پردے چاک کر چکی ہے۔ اس طرح کہ اس کے باپ کا کردار اب اس کے سامنے برہنہ ہو گیا ہے۔ ان میں زمل کا سامنا کرنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔

نفرت نفرت کرتے وہ نفرتیں سمیٹنے سے ہی تو ڈرنے لگے تھے۔ زمل کی خوشی کی خاطر وہ ڈاکٹرز سے ملاقات پر آمادہ ہو جاتے، لیکن آج تک انہوں نے کسی ڈاکٹر کو اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا.... انہیں ڈر رہتا تھا۔ سب حالات جان کر ڈاکٹرز کی نظروں کے زاویے بدل لیں گے۔ جیسے ان کی ماں کے بدل گئے تھے۔ ان کی ماں تو ان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ڈاکٹرز تو صرف ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ پھر وہ ان سے دل ہی دل میں نفرت کیسے نہ کریں گے.... اور اگر زمل نے سب جان لیا تو.... یہ خیال ان کی روح فنا کر دیتا۔

اب بیڈ پر گرے ان کے تڑپتے وجود کی روح ہی فنا ہو رہی تھی۔ بس جان نہیں نکل رہی تھی۔

"بالآخر زمل تم نے وہ گھر ڈھونڈ ہی لیا جو سدیم کو مطلوب تھا.... اور مجھے.... نہیں مجھے وہ گھر مطلوب نہیں ہے۔ میں نے کبھی اس گھر میں جانے کی تمنا دل میں نہیں رکھی۔ اس لیے اب میں تمہارے پاس اس گھر میں نہیں آسکتا.... ہاں.... ہرگز نہیں آسکتا.... تم اس گھر میں اکیلی کہاں ہو گی.... وہاں اور بھی تو بہت سے

لوگ ہوں گے.... وہ بھی.... کیا وہ بھی....؟ انہیں اس بات سے آگاہی تھی کہ پروفیسر صغیر ربانی نے نگار سے شادی کر لی تھی۔

"آپ کی صحت یابی کے سارے علاج یہاں موجود ہیں۔" زمل کا فقرہ دس منزلہ ہوٹل کے ایک ایک کمرے میں گونجا۔

"یعنی وہ زندہ ہے.... اور اندر ہے.... نگار.... ان کے گناہ کو ابھی تک سمیٹے ہوئے.... وہ زندہ ہے.... کیسے زندہ ہے.... کس چیز نے اسے اس موت سے بچالیا جو میں نے اسے دی تھی.... شاید صغیر ربانی نے.... ان کے فلسفوں نے.... ورنہ اس کا موت کو گلے لگالینا تو طے شدہ تھا۔ ڈیوڈ نہیں تھا ان کے پاس نہ ہی زمل.... ان کی بگڑتی حالت کو کون سنبھالتا آخر....

"میں مر کر بھی وہاں نہیں آؤں گا زمل.... چاہے تم زندگی بھر مجھ سے ناراض رہو۔" وہ بھول گئے تھے کہ وہ زمل کو کسی الہامی مشکل سے نکالنے آئے ہیں، لیکن اب جو مشکل انہیں پڑ گئی تھی اس کے آگے انہیں دنیا کی تمام مشکلیں بے ضرر لگیں۔

رات ہوتے ہوتے ان کا ذہن مکمل ماؤف ہو چکا تھا اور اس ماؤف ذہن میں سدیم کے فقرے بازگشت کرنے لگے۔ اپنے آخری وقت میں وہ اکثر ان کا ہاتھ تھام کر کہا کرتا تھا۔

"میرا علاج نہ ڈھونڈو زیان....! اس لڑکی کو ڈھونڈو.... مجھے اس لڑکی سے ملنا ہے.... اس سے معافی مانگنی ہے۔ ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔"

وہ خاموش رہتے۔ یشب بھی۔ اور جھوٹ بول دیتے کہ وہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں، لیکن صغیر ربانی کے ساتھ ساتھ وہ بھی لاپتا ہو چکی ہے۔ یشب ان بیانات کی تصدیق کر دیا کرتا تھا۔ دونوں کا خیال تھا کہ بیماری سدیم کے دماغ پر چڑھ گئی ہے۔ جلد ہی سدیم نے دونوں کے رویوں کو جانچ لیا اور جب اسے نگار کے نہ ملنے کا اور اپنی موت کا یقین ہو گیا تو اس نے انہیں اپنا آخری پیغام دیا تھا۔

"اگر کبھی تم اس سے ملو.... تو میری طرف سے

ضرور معافی مانگنا زیان.... میری روح کو سکون تب ہی آئے گا.... تم اپنی طرف سے بے شک معافی مت مانگنا زیان، لیکن میری طرف سے اس سے میری بخشش کی بھیک ضرور مانگ لینا.... اور جب تک وہ معاف نہ کرے، اس سے مانگتے رہنا۔ تمہیں اللہ کی قسم زیان....'' روتے روتے سدیم نے انہیں اپنی آخری وصیت کی۔

''تم ایسا کرو گے نا زیان.... مجھ سے وعدہ کرو۔'' سدیم نے پوچھا۔

''ہاں میں ایسا کروں گا.... اگر اس سے ملا تو؟''

انہوں نے سدیم سے وعدہ اس پر ترس کھا کر کیا تھا۔ اس وعدے میں ایفا نہیں تھی۔ وہ تو بس اپنے دوست کو سکون سے مرتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اب تو وقت بدل چکا تھا اور بدلتے ہوئے وقت کی سوئیوں میں کانٹے نصب تھے۔ یہ وقت جوں جوں گزر رہا تھا۔ روحیں چھلنی کرتا ہوا گزر رہا تھا۔

تو کیا اب انہیں بھی اپنے آخری وقت میں یہ ہی وصیت کرنی پڑے گی زمل کا ہاتھ پکڑ کر۔

''تم اس سے میرے لیے معافی مانگ لینا زمل.... میرے مرنے کے بعد.... کیوں کہ جیتے جی مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ تم اس سے تب تک معافی مانگنا جب تک وہ معاف نہ کرے۔ وعدہ کرو مجھ سے۔'' اور زمل روتے ہوئے ان سے وعدہ کرے گی۔ وہ بے چاری کس کس کا ہاتھ تھام کر اسے رک جانے کے لیے کہے گی۔ آخر کس کس کے سینے پر سر رکھ کر روئے گی۔ اتنی سی عمر میں اس کے غم بے انت کیوں ہیں؟

اگلے دن صبح وہ حبیب اللہ روڈ.... صغیر ربانی مرحوم کے گھر کے باہر موجود تھے۔ زمل سے ان کا رابطہ ابھی تک نہ ہو پایا تھا۔ انہیں دستک ہی دینی پڑی۔ دروازہ نانو نے کھولا تھا۔

پرانی لکڑی کے دوپٹ وا ہوئے اور اندر سے ایک خزاں رسیدہ لہر نکل کر چار سو چھا گئی۔ زیان عالم کا ڈھے چکا وجود زردی میں بدل کر ہوا میں بکھر گیا۔

ہوا تیز تھی یا کچھ اور.... کھڑکی سے پیچھے ثناخواں درخت طائر بسمل کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ کوئلیں کوک رہی تھیں۔ ان کی کوک سے ان کی بے چینی عیاں تھی۔

نگار کی نظریں فرش پہ جمی تھیں۔ کھلے دروازے سے صحن کی دھوپ ٹیڑھی ہو کر اندر آتی ہوئی فرش پر پڑ رہی تھی۔ وہ اس دھوپ کی آغوش میں چمکتے سونے کے برادے کو دیکھتی رہی۔ پھر اس چوکور خانے میں ایک سایہ نمودار ہوا۔ وہ سایہ نانو کا تھا۔

''نگار!'' اندر داخل ہو کر انہوں نے اسے پکارا۔

''تم سے کوئی ملنے آیا ہے....'' ان کی آواز سے ظاہر تھا کہ وہ بہت زیادہ رو چکی ہیں اور ابھی بھی اسی کیفیت میں ہیں۔ نگار نے زمین سے نظریں نہ ہٹائیں۔ جہاں نانو کے سائے کے ساتھ ایک اور سایہ آکھڑا ہوا تھا۔

چھت میں نصب شیشوں میں تین عکس نمایاں تھے۔ ایک شخص کے انتقام کی سلگتی ہوئی آگ.... دو دوستوں کی سازش.... اور اس کے آنسو.... وہ عکس مر کر بھی اس کی آنکھوں سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں مٹ گیا تھا۔

کمرے کے باہر سرخ آندھی چلنا شروع ہوئی۔ بادل جی جان سے گرجے۔ شب یلدا میں بجلی کاملیت سے چمکی۔ گونج لحظہ بہ لحظہ تیز ہونے لگی۔ قدرت کے اشارے ایک بار پھر جاگے تھے.... لیکن بہت دیر سے.... اس نے اپنے بند ہوتے دل کو تھام لیا۔ اسے اللہ کی ضرورت اس کے ننانوے ناموں اور اس کی ننانوے صفات کے ساتھ آپڑی تھی.... ایک عرصہ پہلے....

نانو کے ساتھ جو سایہ کھڑا تھا وہ اسی عکس سے منسلک تھا۔ مکڑی والا لاکٹ ایک بار پھر اس کے منہ پر آ لگا۔ احساس قیامت خیز تھا۔ طوفان بلاخیز....

نگار نے جھٹکے سے گردن اٹھائی اور دروازے کی طرف دیکھا.... دھوپ دھوکے باز نہیں تھی.... وہ وہی تھا.... زیان عالم....

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بنت سحر

میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ مسکراتے ہوئے
میری ہنسی میں میرا ساتھ دے۔ میں تو بس یہ چاہتی
تھی کہ روتے ہوئے وہ میری "لاج" ضرور رکھ
لے......

وہ تین سالوں سے یہ بات سوچتی آرہی تھی اور آج
پھر سوچ رہی تھی..... یہ جیسے معمول بن چکا تھا..... جسے
وہ دہراتی..... دکھی ہوتی..... مگر تھکتی نہیں وہ دوسروں کے
سامنے کھوکھلے قہقہے لگاتی اور وہ کھوکھلے قہقہے اس کے
وجود میں بازگشت کرنے لگتے تھے۔

ناولٹ

اور کبھی وہ بی اماں کے ہتھے چڑھ جاتی تو نری
پریشانی.....

"ادھر میری طرف دیکھ، اتنی اجاڑ لگ رہی ہے.....
تھوڑی لیپا پوتی تو بھی کرلیا کر..... رک میں عینی کو کہتی
ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ عینی کو آوازیں دینے لگیں..... اور
خراماں خراماں چلتی عینی کی ہیل کی ٹک ٹک قریب
آئی..... بالوں کا گھونسلہ دروازے میں نمودار ہوا.....
"ولیں"..... گلابی چہرے پر بلا کی نخوت اور بے نیازی
تھی..... بی اماں جیسے دھاڑی تھیں۔

"بڑی آئی انگریزن..... اندر دفع ہو ورنہ اس گھونسلے
کو تیلی دکھادوں گی۔"

عینی قل قل ہنستی ہوئی اندر داخل ہوگئی تھی۔
اس نے لمبے بالوں کو انگریزی اسٹائل میں جوڑے
کی طرح باندھ رکھا تھا..... جینز کے اوپر لانگ شرٹ
پہنے ببل گم چباتی وہ بہت اسمارٹ لگ رہی تھی..... وہ
مہر کے قریب کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

"بائی داوے..... یہ دھمکی آپ مجھے پچھلے ایک
سال سے دے رہی ہیں..... اور ہوا کچھ بھی نہیں اب
تو میں بھی ڈھیٹ ہوچکی ہوں۔" مہر کی نظریں اس کی
مخروطی انگلیوں کے گولائی میں تراشیدہ ناخنوں کی طرف
تھیں۔

"مجھے ڈھیٹوں کو ٹھیک کرنا اچھی طرح آتا
ہے....." خشمگیں نظر ڈال کر کہا.....

مہر نے خود کو دیکھا تھا..... عام سے کاٹن کے

کپڑے..... سوفٹی چپل..... آنسوؤں کا گولہ حلق میں اٹکنے لگا تھا مگر ڈپٹ دیا.....

"خبردار جو آنکھوں کی باڑ پھلانگی' تمہارے ظہور کے لیے رات کا پہر ہے....." کھارے پانی نے راستہ بدل لیا... بی اماں نے عینی کو دیکھا تھا۔

"عینی بچے..... دو ہفتے رہ گئے ہیں'عید سر پر کھڑی ہے..... ذرا بھابھی کو بازار لے جا..... کپڑے لے دے اور ہاں پارلر سے بھی ہوتی آنا....." وہ تجوری سے پیسے نکال کر عینی کو تھمانے لگیں.....

مہر گھبرا گئی۔ "رہنے دیں بی اماں..... پلیز میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

"دادی کو پرایا کر رہی ہے....."

"ارے نہیں....."

"تو پھر جا عینی کے ساتھ۔" انہوں نے عینی کو اشارہ کیا..... عینی نے مہر کے کاندھے پر ہاتھ رکھا.....

"بھابی! میں آپ کو لے چلتی ہوں..... ڈونٹ وری۔" وہ دونوں ساتھ چلتی پورچ میں آگئیں۔

عینی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی..... پارلر تک کا راستہ خاموشی سے کٹا.....

وہ شیشے سے باہر نظر آتی زندگی دیکھنے لگی..... شور..... ہنگامہ..... قہقہے۔ وہ تلخی سے مسکرائی۔

پارلر میں بہت زیادہ رش تھا مگر انہیں جلدی جگہ مل گئی تھی کیونکہ عینی ان کی مستقل کلائنٹ (گاہک) تھی۔ بھانت بھانت کی آوازیں تھیں..... فیشن کی باتیں..... ماڈلنگ..... شوبز کے قصے.....

ورکر لڑکی اب مہر کی بھنویں بنا رہی تھی۔ کالی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا تھا.....

وہ اپنا عکس آئینے میں دیکھتی اردگرد کی آوازیں سنے گئی.....

"اوہ..... آمنہ الیاس'میری فیورٹ ہے..... فیشن انڈسٹری کی جان ہے وہ۔"

"ارے بھئی..... نتاشا کمال بھی بہت پیاری ہے....."

تب ہی ساری خواتین کی نظر آئینے میں نظر آتے مہر کے عکس پر پڑی۔ ان سب ہی کے منہ سے نکلا تھا..... "امیزنگ....."

لڑکی نے مہر کا دوپٹہ اسٹینڈ پر ٹکا رکھا تھا..... اب اس کے انتہائی لمبے بال کرسی کی پشت سے نیچے گر رہے تھے سلکی..... چمکدار..... اور بے تحاشا لمبے..... سب خواتین تو صیفی نظروں سے دیکھ رہی تھیں..... پوڈل ہیئر کٹ والی شائستہ نے آگے ہو کر مہر کے بال ہتھیلیوں پر پھیلائے اور حیرت آمیز چیخ ماری تھی۔

"دیز آر ریئل" (یہ اصلی ہیں)

اب وہ عینی کی طرف پلٹی تھی..... "عینی! کیا یہ آپ کی رشتہ دار ہیں۔"

عینی کیوٹکس لگے ہاتھوں کو دیکھتی ہوئی ہنسی "یہ میری بھابھی ہیں شائستہ"

"اوہ..... یس..... شاہ زر کی وائف.....؟" اس نے تصدیق چاہی تھی..... عینی نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا..... شائستہ نے ہمدردانہ نظروں سے مہر کی طرف دیکھا تھا.....

"پور سول..... بے چاری کو پہلے دن ہی چھوڑ کر شاہ زر سٹی چلا گیا..... سنا ہے کسی انگریز لڑکی سے محبت کرتا تھا..... سلیم صاحب نے بھی یتیم بھتیجی پلے باندھ دی تھی..... ویسے تو شکل کی اتنی بری بھی نہیں..... مگر صاحب کون جانے..... سارے کھیل تو دلوں کے ہوتے ہیں....."

مہر نے اپنے عکس کو دیکھا تھا..... آئینہ ٹوٹا تھا یا اس کی شبیہہ ٹوٹی بکھری نظر آرہی تھی..... دل سے ٹیس اٹھی تھی..... آہ نے لبوں تک رسائی کی سرتوڑ کوشش کی مگر بے سود..... بازگشت ڈوبی..... ابھری اور پھیل گئی.....

"مہر عالم! بہادری کا جو خول چڑھا رکھا ہے اس میں دراڑ نہ آنے پائے۔"

کھڑکی سے ہلکی روشنی آرہی تھی..... روشنی میں گرد کا غبار سا تھا.....

وہ "چپ" کی بکل مارے بیٹھی رہی..... مجسمہ..... ریت کا یا پتھر کا.....؟؟

واپسی پر عینی نے معذرت کی تھی "سوری بھابھی..... وہ سب.....؟"

مہر نے عینی کی بات کاٹ دی تھی..... "سچ ہی تو کہا شائستہ نے..... میں دھتکاری ہوئی ہوں..... مجھے دلوں میں اترنے کا فن نہیں آتا..... عینی..... میں نے بہت صبر کیا ہے..... توقع سے بھی زیادہ مگر اب..... اب میں ٹوٹ رہی ہوں عینی....." وہ روتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر بھاگ گئی تھی۔

تین سال پہلے کی شام کی بازگشت عینی کی سماعت پر دستک دے رہی تھی..... وہ الفاظ شاہ زر کے تھے۔

"میری بھی کوئی لائف ہے..... خواہشات ہیں..... میں ساری زندگی اس عقل وصورت سے پیدل لڑکی کے ساتھ نہیں گزار سکتا..... آپ نے نکاح کا کہا۔ میں نے کرلیا اور آپ کا مان رکھ لیا اور آگے کی زندگی کے فیصلے مجھے خود کرنے ہیں..... اوکے....."

یہ شاہ زر کا اپنے باپ کو جواب تھا..... ہاں..... وہ ان کا مان رکھ گیا تھا..... مگر کسی کی زندگی کے پرخچے اڑا گیا تھا..... رات بیتی اور صبح شاہ زر سلیم کے وجود سے بے خبر اتری جو گھر چھوڑ گیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ لو اپنا سامان اور دفع ہوجاؤ میری زندگی سے....."

کرسٹی نے ایک ایک کر کے ساری چیزیں فلیٹ کی کھڑکی سے اچھالنی شروع کردی تھیں..... بیگ..... جوتے..... کپڑے..... شاہ زر ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا..... جو اپنے آپے سے باہر لگ رہی تھی..... وہ ایک ایک چیز پھینکتی اسے بے شمار گالیوں سے نواز رہی تھی۔

لیپ ٹاپ اڑتا ہوا روڈ پر گرا تھا..... چھناکے کی آواز آئی تھی..... لیپ ٹاپ کے پارٹس ادھر ادھر بکھرے نظر آنے لگے تھے..... بٹن ٹوٹ گئے تھے.....

وہ بالکونی سے جھانکتی کہہ رہی تھی..... "مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے تم نے..... میں پاکی لڑکیوں کی طرح نہیں ہوں جو تمہاری ہر بات برداشت کرلوں گی، سمجھے..... یو باسٹرڈ....."

فائلز کا ہنڈل اڑتا ہوا باہر آیا تھا..... صفحات ادھر ادھر اڑنے لگے تھے۔

"اوہ مائی گاڈ!" شاہ زر نے سر تھام لیا تھا..... وہ وہیں سے چلایا تھا..... "آر یو کریزی؟ (کیا تم پاگل ہوگئی ہو؟)"

وہ جواباً اس سے زیادہ زور سے چلائی تھی۔

"میں نہیں۔ تم پاگل ہو اور یاد رکھو میں بے وقوف نہیں ہوں۔"

روز اف کیفے سے گاہک اٹھ کر باہر آگئے تھے اور اب مزے سے باہر آکر کافی کے ساتھ ساتھ لڑائی سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے..... نیگرو بیگی، شاہ زر کے قریب ہوا.....

"وہ اس طرح کیوں ری ایکٹ کررہی ہے۔ کیا بریک اپ ہوگیا؟" آواز میں ہمدردی کے خالص جذبات محسوس لیے جاسکتے تھے۔ شاہ زر کا دماغ پہلے ہی شل ہو رہا تھا وہ دھاڑا تھا۔

"گیٹ آؤٹ!"

بیگی نے اس کو دیکھا "دوست..... اسے ایک مہنگی اور پرسکون ڈیٹ کی ضرورت ہے..... لے جاؤ..... مان جائے گی۔"

شاہ زر کا دل چاہ رہا تھا اس کی گردن دبوچ لے..... اس سے پہلے کہ وہ کچھ ایسا کرتا..... بیگی بریسلٹ گھماتا۔ "ڈارک نائٹ" کی دھن بجاتا آگے بڑھ گیا تھا.....

شاہ زر لفٹ سے اوپر فلیٹ میں پہنچا تھا..... شکر ہے دروازہ کھلا ہوا تھا..... وہ تن فن کرتی کچن میں کافی میکر کو صاف کرتی نظر آرہی تھی.....

وہ کچن کی دہلیز پر کھڑا تھا..... "سوری ڈارلنگ....."

کرسٹی نے فرائنگ پین اس کی طرف اچھالا..... اور شاہ زر نے بمشکل اپنا بچاؤ کیا..... عقبی دیوار سے ٹکرا کر وہ پچک گیا تھا..... وہ دھاڑی تھی۔

"دفع ہوجاؤ میرے فلیٹ سے ورنہ میں پولیس کو بلالوں گی....."

"بے بی..... تم اتنے غصے میں کیوں ہو.....؟"

کرسٹی نے تالی بجائی تھی۔۔۔ "کلیپنگ شاہ زر سلیم کے لیے۔۔۔ زیادہ انوسینٹ بننے کی ضرورت نہیں۔۔۔ تمہیں کیا لگتا ہے۔ میرے پیسے پر عیش کرو گے اور مجھے ہی دھوکا دو گے اور میں خاموش رہوں گی۔"

وہ کولڈ ڈرنک کارنر کی طرف مڑی اور گلاس میں انڈیلنے لگی۔۔۔

"کلین پوئم کیفے میں تم جوزفین کے ساتھ جو محبت کی پینگیں بڑھا رہے تھے، میں نے وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تم مجھے چیٹ کر رہے ہو۔۔۔ تم پاکستانی بس ڈالر، پونڈ کے لیے ترستے ہو۔۔۔ اور تم شاہ زر۔۔۔ تم تو ڈاگ سے بھی کمتر ہو۔۔۔"

اور شاہ زر کو لگا پگھلا سیسہ اس کے وجود پر ڈال دیا گیا ہے۔۔۔

اس نے کرسٹی کے ہاتھ سے گلاس چھین کر دیوار پر دے مارا تھا۔ شیشے کی کرچیاں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ شاہ زر نے آگے بڑھ کر اس کا گلا دبوچ لیا تھا۔۔۔ وہ پھڑپھڑانے لگی تھی۔ اور با آواز بلند گالیاں دیتے ہوئے اس نے۔۔۔

شاہ زر کو زور سے دھکا دیا تھا اور خود ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی۔۔۔ شاہ زر کا ماتھا سپون اسٹینڈ سے ٹکرایا اور۔۔۔ اسٹیل کے چمچ بج اٹھے وہ دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف آیا تھا اور اسے لگا زمین پیروں کے نیچے سے کھسکتی جا رہی ہے۔

کرسٹی اس کے پاسپورٹ کو لائٹر کا شعلہ دکھا چکی تھی۔۔۔ اس نے آگے بڑھ کر کرسٹی کو دھکیلا اور پاسپورٹ جھپٹ کر چھینا اور ہاتھ سے جھاڑتے ہوئے زور زور سے پھونکیں ماریں۔۔۔ پاسپورٹ بچ گیا تھا شاہ زر کی جان میں جان آئی۔

وہ پلٹا اور زناٹے دار تھپڑ کرسٹی کو جڑ دیا۔۔۔ وہ لڑکھڑا گئی۔

"یو بچ۔۔۔ میں تھوکتا ہوں تم پر۔۔۔"

وہ جواباً غرائی تھی۔ "یو آر اے سن آف بچ۔"

شاہ زر دوبارہ آگے بڑھا اور اس کا گلا دبانے لگا۔۔۔ وہ ہانپنے لگی تھی۔۔۔ "تم نے میری ماں کو گالی دی۔۔۔ تمہاری۔ ہمت کیسے ہوئی ایسا کہنے کی۔۔۔" وہ ٹھڈے لاتیں چلاتا آگ بگولہ ہو رہا تھا۔۔۔

اس نے ایک رسی اٹھائی اور کرسٹی کو کرسی پر دھکیل دیا۔۔۔ وہ چلا رہی تھی۔۔۔ چیخ رہی تھی۔

"تم نے مجھے چیٹ کیا۔۔۔ تم ایک دھوکے باز انسان ہو۔"

وہ رسی کو اس کے گرد بل دے کر کرسی کے ساتھ باندھ رہا تھا۔۔۔ وہ کسمساتی ہوئی جھلا رہی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔۔۔ میں کہہ رہی ہوں چھوڑو مجھے۔۔۔"

وہ جاتے جاتے پلٹا۔۔۔ اپنا بیگ اٹھایا۔۔۔ پاسپورٹ اس میں ڈال کر جانے لگا مگر وہ جانے سے پہلے کہنا نہیں بھولا تھا۔۔۔

"مکیں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے خود تو تمہیں شرم آتی نہیں۔۔۔ مجھ پر چڑھ دوڑی ہو۔۔۔" وہ پلٹ آیا۔۔۔ فلیٹ کا دروازہ باہر سے لاک کرتے ہوئے۔۔۔ اس نے آخری آواز سنی۔۔۔

"یو باسٹرڈ۔۔۔"

وہ مکمل اطمینان اور سکون کے ساتھ باہر آیا تھا۔۔۔ کہ اچانک بیگی وہاں نمودار ہوا۔

"اوہ۔۔۔ میں بہت خوش ہوں میرے دوست کہ میرے مشوروں پر عمل کر کے لوگوں کا بریک اپ ہونے سے رہ جاتا ہے۔ لاؤ۔۔۔ مجھے میری ٹریٹ دو۔"

وہ مسرور سے انداز میں ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ شاہ زر آگے ہوا اور جبڑے پر ایک مکا جڑ دیا اس کے۔ بیگی جبڑے پر ہاتھ رکھے ہکا بکا کھڑا تھا۔

"کیسا لگا انعام۔۔۔ آئی ہوپ پسند آیا ہو گا۔"

روز اف کیفے کے باہر کھڑے عوام نے بیگی کے انجام پر اندر کو قدم موڑ لیے۔۔۔ ویسے بھی اس ہنگامے کے دوران وہ اپنے کافی کپ خالی کر چکے تھے۔۔۔ اور

مسٹر بیگی دانت نکوستا' شام کے اندھیرے میں دوبارہ سے "ڈارک نائٹ" گنگناتا آگے بڑھ رہا تھا۔
اور.... یہ شام شاہ زر سلیم کی سڈنی میں آخری شام تھی....

☆ ☆ ☆

وہ جنوری کی دھند میں لپٹی ہوئی ایک سرد دوپہر تھی۔ جب اسپتال کے کاریڈور میں وہ بی اماں کے گلے سے لگی' دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی.... بلک رہی تھی۔
"بی اماں.... اماں' ابا مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔" بی اماں کیا کہتیں.... ؟ وہ خود صدمے سے نڈھال بیٹھی تھیں.... وقت نے زندگی کا تختہ جیسے الٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ بہو' بیٹے کی وفات پر دل برداشتہ تھیں۔ حادثہ دو زندگیاں لے گیا.... وہ روتی بلکتی مہر کو سہارا دیتیں یا اپنے نڈھال دل کو سنبھالا دیتیں....
وہ روتی تڑپتی مہر کو گھر لے آئی تھیں جہاں مہر پورے وقت بولائی بولائی پھرتی۔
"اس وقت اس کی عمر نو سال تھی' وہ کمروں کے دروازوں' کھڑکیوں سے جھانکتی رہی' مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ زندگی نے سارے بند دروازوں کی حقیقتوں کو کھول کھول کر بیان کرنا شروع کر دیا۔ سوچوں کا ہجوم وجود کے گرد اکٹھا ہو گیا۔
"کیا میں لاوارث ہوں؟"
"میرا کوئی نہیں....؟"
"دنیا کے ہجوم میں' میں تنہا ہو گئی ہوں...."
چچا' چچی' بی اماں اور عینی ہر ممکن تسلی دیتیں مگر دل تھا کہ سنبھالے میں ہی نہ آتا تھا....
اور شاہ زر سلیم....؟
وہ تو جیسے اسے اچھوت سمجھتا تھا.... ناگوار نظریں.... طنز.... وہ چھپتی پھرتی.... آنسو پیتی ہوئی۔
بی اماں کے کمرے میں ان کے ساتھ سوتی تھی۔ بی اماں کی تربیت رنگ لانے لگی تھی۔ اس نے وجود

کے گرد بہادری کا خول چڑھالیا۔ بی اماں کے ساتھ وہ بھی عبادتیں کرنے لگی۔

نماز پڑھ کے چپ۔ آخر میں دعا کا مرحلہ آتا تھا تو وہ لکیروں کو گھورنے لگتی تھی۔

"کیا مانگوں رب سے؟..... کیا زندگی میں کوئی خوشی' کوئی امید باقی رہ گئی ہے.....؟"

وہ بی اماں سے استفسار کرتی۔ یہ اللہ انسانوں کو اتنی جلدی کیوں اپنی طرف بلالیتا ہے.....؟"

تسبیح کے دانے گھماتی وہ رک جاتیں۔ "جن بندوں سے اللہ محبت کرتا ہے انہیں جلدی اپنی طرف بلالیتا ہے۔"

وہ چپ ہوجاتی..... شاید مصلحتیں یوں ہی منہ پر تالا ڈال دیتی ہیں۔

وہ عینی اور شاہ زر کے ساتھ ان کے ہی اسکول جانے لگی تھی..... بھاگتی دوڑتی زندگی تھی معمول پر آگئی..... کھانے کی ٹیبل پر وہ سر جھکائے چپ چاپ کھانا کھا رہی ہوتی تو چچا پوچھتے۔

"مہر بیٹا..... کسی چیز کی ضرورت تو نہیں.....؟"

"نہیں چاچو..... کسی چیز کی ضرورت نہیں....."

نوالہ حلق میں اٹکنے لگا تھا۔

دل ہمک ہمک کر صدائیں دے رہا تھا۔ "مجھے امی' ابو واپس لادیں....." مگر ہونٹوں پر مہر لگائے بیٹھی رہی۔

چچا نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے تھے "اور تمہاری اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں.....؟"

شاہ زر نے بریانی کی پلیٹ پرے کرتے ہوئے کہا تھا

"مہر بیک بینچز پر بیٹھتی ہے....." مہر نے ایک دم سر اٹھایا تھا..... آنکھیں ڈبڈبانے لگیں..... مگر اے وقت..... ٹھہر..... حوصلے سلامت رکھ.....

رشین سلاد ٹونگتی عینی بڑبڑائی تھی..... "بیک بنچو اکثر ٹاپ کرتے ہیں۔"

شاہ زر نے ناگواری سے منہ بنایا تھا.....

چچا اسے تھپکی دیتے اٹھ گئے تھے..... وہ لفظ "بیک بنچو" کی صدائیں سنتی رہی۔

ہائی اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی..... وقت نامی پتھر لڑھکتا گیا..... بچپن' لڑکپن کی چادر اوڑھے جوانی کی دہلیز پر آن ٹھہرا.....

عینی اور اس کی اچھی دوستی تھی مگر شاہ زر سے فاصلہ برقرار رہا..... وہ وقت کا لمحہ ٹھہرا رہا..... ٹھہرا ہی رہ گیا..... اور پھر پرسکون جھیل میں جیسے پتھر گرا تھا..... اور کتنے زور سے گرا تھا.....

وہ اسٹیچو بن گئی..... ساکت..... جامد.....

* * *

وہ شام کے اس پہر سرد لمحوں میں حرارت بھرنے کے لیے کافی بنانے کچن میں آگئی تھی..... ہر طرف پھیلی دھند..... ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا..... جیسے سفید روئی کے گالوں جیسی برف چورے میں تبدیل ہو کر گر رہی ہو..... گرتی جارہی ہو۔ اس نے اوور کوٹ پہن رکھا تھا..... پانی ابل رہا تھا..... جب وہ کچن میں داخل ہوا تھا.....

"تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو.....؟" درشتی سے انداز میں وہ مخاطب تھا۔ آنکھیں جیسے غصے سے لال تھیں۔ منہ سے بھاپ اڑ رہی تھی۔

"جی' کچھ نہیں....." وہ ازحد گھبرا گئی تھی۔ وہ یوں غصہ کیوں دکھا رہا تھا؟

"تو پھر اپنے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھالو کہ تم کچھ بھی نہیں ہو سوائے ایک یتیم لڑکی کے جو اپنے چچا کے ٹکڑوں پر پلتی ہے۔ ہم نے تم پر رحم کرلیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہمارے سر پر ہی سوار ہوجاؤ۔" مہر کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خالی کپ لرزا اور چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔

وہ کیا کہہ رہا تھا.....؟ مہر عالم نے زندگی میں پہلی بار ذلت و رسوائی کا سامنا کیا تھا۔

"تم میرے لائق ہو.....؟ ایسا کیا ہے تم میں کہ میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کروں؟ نہ اسٹیٹس' نہ شکل..... مجھ پر مسلط ہونے کی کوششیں بے کار ہیں مہر عالم.....!"

وہ سوال تھے یا نیزے......؟

وہ سمجھ نہ سکی...... کچھ تھا جو وجود کے آرپار ہوا جارہا تھا۔ وہ دھاڑتا ہوا نکل گیا...... پانی ابل ابل کر سوکھنے لگا تھا...... اور باہر دھند گہری ہوتی گئی...... اور گہری......

وہ اتنی ٹھنڈ میں ہچکیوں کے ساتھ کانپتی ہوئی رو رہی تھی اور روتی جارہی تھی...... باہر برف گر گر کے ڈھیر بناتی رہی...... اور آوازیں آسیب کا روپ دھار گئیں......

"تم کیا ہو...... ایک لاوارث؟"

"کیا ہے تمہارے پاس، نہ اسٹیٹس اور نہ ہی شکل......؟" اونی اوورکوٹ پر اس کے گرم آنسو گرتے رہے۔ عینی اچانک کچن میں آئی تھی۔

"کیا ہوا تمہیں مہو...... کیوں رو رہی ہو......؟" عینی اس کے گال تھپتھپا رہی تھی۔

مہر نے آنسو پونچھے تھے...... اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی......

"آج مجھے میری اوقات پتا چل گئی عینی......"

پرسکون انداز میں جواب دیتی وہ باہر نکل گئی تھی۔

عینی نے دیکھا، پانی ابل ابل کر سوکھ چکا تھا اور کچن کی کھڑکی سے نظر آتی دھند......

سارے منظر، سارے قصوں، ساری کہانیوں پر دھند چھا چکی تھی۔ ٹیرس پر جھولے پر بیٹھی وہ اپنی قریبی دوست مریم سے محو گفتگو تھی...... ٹھنڈ چھائی ہوئی تھی...... ٹیرس پہ انرجی سیور کی دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی......

"تم شاہ زر سے محبت کرتی ہو......؟" مریم کے سوال پر وہ ٹھٹکی...... چونکی...... یہ وہ سوال نہیں تھا جس کا وہ سوچے سمجھے بغیر جواب دے دیتی...... سو اس نے مبہم جواب دیا تھا......

"شاید......"

"محبتوں میں شاید کا لفظ نہیں ہوتا...... یا تو جواب "ہاں" میں ہوتا ہے یا پھر "ناں" میں...... اب جلدی سے جواب دو......" وہ بادلوں کی اوٹ میں چھپے چاند کی کھوج میں لگی ہوئی تھی۔

"ہاں......" غیر ارادی طور پر زبان سے سچ نکل جاتے ہیں...... اور مہر عالم نے بھی سچ بول دیا تھا......

"کب ہوئی محبت......؟"

"کیا مطلب؟" محبت کرنے کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے کیا؟

مریم ہنسی تھی...... "جیسے وارداتوں کے وقت مقرر ہوتے ہیں ایسے ہی محبت کا بھی ہوتا ہے......"

"اچھا...... ہوتا ہوگا۔ میرے لیے تو یہ نئی بات ہے......" مہر نے جواباً کہا تھا...... مریم اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کو بغور محسوس کررہی تھی......

"وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے......؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں......" یہ واقعی ایسا سوال تھا جس کا جواب وہ سوچے سمجھے بغیر دے رہی تھی......

"کیوں......؟" مریم نے پوچھا تو مہر نے لمبی سانس لی تھی۔

"میں نہیں جانتی مگر وہ کہتا ہے کہ مجھے پناہ دے کر انہوں نے مجھے چھت دی ہے۔ سگے رشتوں میں پناہ کے سوال کہاں اٹھائے جاتے ہیں؟...... مگر وہ اٹھاتا ہے اور بار بار اٹھاتا ہے......" فضا میں جیسے نمی گھول دی گئی تھی۔

"اور باقی لوگ......؟"

"باقی سب ٹھیک ہیں مریم...... بی اماں، چچی، چچا، عینی...... وہ غیریت نہیں برتتے...... شاید ان ہی کی وجہ سے میں یہاں رہ رہی ہوں ورنہ مجھے میری خودداری کا سودا کرنا پڑتا...... اور خودداریوں کے سودے آسان کہاں ہوتے ہیں......"

ہلکی سی ہوا چلی تو مہر کو جھرجھری سی آگئی تھی......

چند اور باتیں کرنے کے بعد مہر نے سیل فون بند کر کے قریبی میز پر رکھ دیا تھا۔

تب ہی عینی وہاں آئی۔ "کیا ہورہا ہے؟"

"کچھ نہیں...... بس مریم سے بات کررہی تھی۔" مہر نے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے کہا۔

"کیا کہہ رہی تھی......؟"

"کچھ نہیں..... بس حال احوال پوچھ رہی تھی۔"

مہر نے ٹال دیا تھا اب کیا کہتی کہ محبتوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔

عینی نے اچانک سوال کیا۔ "تمہیں شاہ زر بھائی کیسے لگتے ہیں.....؟"

مہر جھولے پر سیدھی ہو کر بیٹھی "کیا مطلب 'کیسے لگتے ہیں؟'"

عینی نے مونگ پھلیاں اس کی طرف بڑھائیں..... مگر سوال میں الجھی مہر نے ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔

"اصل میں بی اماں اور امی، ابو چاہتے ہیں کہ تمہاری شاہ زر سے شادی کر دی جائے۔" عینی مکمل اطمینان و سکون سے کہہ رہی تھی..... اور مہر کو اتنی ٹھنڈ میں بھی پسینہ آگیا تھا۔

"مگر شاہ زر.....؟" سوال بڑی مشکل سے منہ سے نکلا تھا..... عینی نے غور سے اسے دیکھا تھا۔

"مجھے ابو نے تمہاری رائے پوچھنے کے لیے بھیجا ہے اور رہی بات بھائی کی تو ابا انہیں منا لیں گے۔"

مہر کو اس کا اس دن والا رویہ یاد آیا تھا..... کتنی درشتی، کتنی نفرت تھی ان آنکھوں میں اس کے لیے..... وہ اٹھ کر جانے لگی تھی..... جب عینی نے عقب سے پوچھا۔

"پھر میں ابا کو کیا جواب دوں مہر.....؟"

اور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مہر نے پلٹے بغیر جواب دیا "میں چچا کی خوشی میں خوش ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ نیچے چلی آئی..... پیچھے ٹیرس پر دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

✡ ✡ ✡

"ابا وہ کسی بھی طرح میرے لائق نہیں ہے۔ میں اس دبّو سی اور کم گو لڑکی سے ہر گز شادی نہیں کر سکتا..... میری بھی کچھ خواہشات ہیں۔ میری لائف اس کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو پائے گی.....۔"

شاہ زر سلیم نے اپنی طرف سے دلائل پیش کیے تھے..... اور کیا خوب پیش کیے تھے.....

"اسے لاوارث نہ کہنا..... اس کا چچا ہے اس کے سر پر..... وہ اس آدھے گھر کی مالک ہے۔ رہی بات تمہاری ایڈجسٹمنٹ کی تو وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ ہو جائے گی۔"

"مگر ابا....."

سلیم صاحب نے اس کی بات کاٹی تھی "کوئی اگر مگر نہیں..... یہ میرا آخری فیصلہ ہے..... اگر نہیں منظور تو خود کو عاق سمجھو۔"

اور یہی وہ وجہ تھی جس کی وجہ سے شاہ زر سلیم ہار مان گیا تھا۔

وہ اچھا، کھاتا، پیتا تھا..... امیر لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا..... اور سارے امیرانہ شوق رکھتا تھا..... یونیورسٹی میں بھی وزیروں کے بیٹوں سے اس کی دوستیاں تھیں مال و دولت میں کھیلنے کی وجہ سے سلیم کی فطرت میں عیش و آرام اور کاہلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

وہ کسی بھی صورت جائیداد کے حصہ سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی ہونا چاہتا تھا۔

اور رہی بات مہر عالم کی تو وہ اسے شروع سے ہی پسند نہ تھی..... کم گو، عام سی رنگت، اور گم صم سی مہر سے اسے چڑ تھی۔ اسے بولڈ، آزاد خیال لڑکیاں متاثر کرتی تھیں، روتی دھوتی مہر میں اسے کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوتی تھی۔

اور ابا کے اس فیصلے پر اس نے بہت احتجاج کیا تھا مگر پھر کسی سوچ کے تحت ہامی بھر لی تھی۔ وہ سڈنی میں دو سال کا عرصہ پہلے گزار آیا تھا۔ وہاں اس نے مختلف کورسز کیے تھے..... اور اسے سڈنی بہت پسند آیا تھا۔

اس کا ارادہ سڈنی میں ہی رہنے کا تھا۔

بقول اس کے اس کا لائف اسٹائل سڈنی کی بھاگتی دوڑتی چکا چوند والی زندگی سے میل کھاتا تھا۔ اور یہ بات کتنی سچ تھی، یہ آنے والا وقت بتانے والا تھا۔

✡ ✡ ✡

رنگ و نور میں لپٹی وہ شام اپنے اختتام کو پہنچی تھی..... عینی اور مریم اسے کمرے میں چھوڑ گئی تھیں۔

وہ عروسی لباس میں بیڈ پر بیٹھی اپنی زندگی کے اگلے مرحلے کا انتظار کر رہی تھی۔

اگلے لمحے دروازہ دھماکے سے کھلا اور وہ تن فن کرتا وہ کمرے میں داخل ہوا تھا..... ناقابل فہم سے تاثرات..... شاہ زر نے آگے بڑھ کر مہر کے سر سے دوپٹہ اتار کر جھٹکے سے دور اچھال دیا تھا۔

وہ متوحش سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

"تم سمجھتی ہو اس طرح تم میرے برابر آ گئی ہو..... تو تمہاری بھول ہے یہ، تمہیں کبھی بھی وہ مقام نہیں ملے گا جس کی تمنا تمہارے دل میں ہے۔ اس گھر میں تو تم نے جگہ بنالی مگر میرے دل میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

خوش فہمیوں کا ڈھیر دھڑا دھڑ جلنے لگا..... تو اسے حقیقت کہتے ہیں؟ مہر عالم سے کوئی پوچھتا۔

وہ اب الماری سے اپنے کپڑے نکال کر بیگ میں ٹھونس رہا تھا..... اس کے چہرے پر غصہ تھا۔

"اٹھو۔" وہ دھمکی کے انداز میں بولا تھا..... وہ ہکا بکا بیٹھی رہ گئی تھی۔

شاہ زر نے اس کا ہاتھ زبردستی تھام کر دروازے کے باہر کھڑا کر دیا تھا اور دھاڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

"تم میری زندگی تو کیا میرے کمرے میں بھی رہنے کے لائق نہیں ہو۔" وہ دیوار سے لگ کر باہر بیٹھی تھی۔ دوپٹہ سر پر نہ تھا۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

"امی، ابو! آپ کیوں مجھے اکیلا چھوڑ گئے..... دیکھئے میں کتنی تنہا ہو گئی ہوں۔"

اگر ذلت و رسوائی کی کوئی انتہا تھی تو اس وقت مہر عالم اسے محسوس کر رہی تھی۔ جیسے اس کی روح پر بھی چابک برسائے جا رہے تھے..... وہ گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔

تب ہی دروازہ کھلا، بیگ تھامے شاہ زر باہر نکلا اس پر نگاہ ڈالے بغیر ڈھلتی رات میں وہ گھر کی دہلیز پار کر گیا۔

وہ اب بھی بیٹھی رو رہی تھی..... جب سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے کی طرف جاتی عینی اسے دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔

"کیا ہوا مہر.....؟" عینی بار بار مہر سے پوچھ رہی تھی مگر مہر کے آنسو ہی نہ تھم رہے تھے.....

عینی وہیں سے ہی چچا، چچی اور بی اماں کو آوازیں دینے لگی تھی۔ وہ تینوں حواس باختہ سے اس طرف آئے تھے..... سامنے دیکھا تو ہاتھ کلیجے پر جا پڑا..... سامنے ہی اجڑی ہوئی ننگے سر مہر عینی کے ہاتھوں میں جھول رہی تھی.....

سلیم صاحب کی سمجھ میں سارا معاملہ آ گیا تھا..... وہ شاہ زر کو برا بھلا کہنے لگے تھے۔

"اس کی جرات کیسے ہوئی یہ سب کرنے کی..... ناخلف..... نانہجار....."

انہوں نے اس کا موبائل نمبر ٹرائی کیا تھا مگر آف جا رہا تھا..... وہ غصے سے ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ بی اماں اور چچی وہ مہر کو ساتھ لگائے بی اماں کے کمرے میں چھوڑ گئی تھیں..... اسے غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

بی اماں نے تاسف سے کہا "یتیم بچی رل کر رہ گئی ہے..... اگلے جہان میں کیا منہ دکھائیں گے۔"

چچی نے جواباً کہا تھا۔ "بس اماں..... جب اپنا سکہ ہی کھوٹا نکلے تو کیا کیا جائے۔"

آج کا دن جیسے بہت بھاری تھا.....

ذلت، رسوائی جیسے جذبات بھی کبھی انسانوں کو توڑ دیتے ہیں اور کبھی بلا کا بہادر بنا دیتے ہیں..... اور مہر عالم اس رات بہادر بن گئی تھی..... سنجیدگی، متانت ایسے وجود میں گھسی کہ ہونٹ ہنسنا بھی بھول گئے۔ بس ایک وجود تھا اور خول در خول چھلیے بہادری کے سلسلے۔

☼ ☼ ☼

صبح ناشتے کی ٹیبل پر وہ بالکل پرسکون تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، گزری شب کی نہ کوئی بات اور نہ ہی فسانہ..... چچی مختلف اشیاء اس کی طرف بڑھاتی رہیں جیسے یہ سب گزری شب کا مداوا ہو..... وہ سب شرمندہ تھے..... اور مہر عالم اپنی وجہ سے انہیں مزید شرمندہ نہیں کر سکتی تھی، اس لیے اس کا رویہ معمول کے

مطابق تھا۔

چچا نے اسے مخاطب کیا تھا "سوری بیٹا..... جو سب ہوا، مجھے شاہ زر سے اتنی سرکشی اور بغاوت کی امید نہیں تھی مگر میں اس سب کے لیے اسے معاف نہیں کروں گا۔" وہ بہت شرمندہ لگ رہے تھے۔

مہر خاموش بیٹھی رہی۔ بعد میں چچی نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"مہر بیٹا..... ہمیں معاف کردو..... قیامت والے دن بھائی صاحب اور دیورانی صاحبہ کو کیا منہ دکھاؤں گی کہ ان کی یتیم بچی کو حق نہ دلوا سکے۔" اس نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

"پلیز چچی..... ایسا مت کہیں..... جو مقدر میں تھا وہ تو ہونا ہی تھا۔ میرے یا آپ کے چاہنے سے کچھ بدل تو نہ جاتا۔"

عینی اور بی اماں بھی اسے دلاسے، تسلیاں دیتی رہیں..... چند دن کا قصہ تھا یہ شاید..... پھر سب سمجھوتہ کرنا سیکھ گئے تھے۔ زندگی ایک معمول پر آ گئی تھی۔

یونیورسٹی کا آخری سمسٹر چل رہا تھا..... وہ اور عینی پڑھائی میں مصروف تھیں..... شاید مصروفیت زخموں پر مرہم کا نام ہوتا ہے اور یہی مرہم مہر کے کام آ رہا تھا..... یونیورسٹی سے آ کر کوکنگ، ٹاک شوز اور نماز..... یہی زندگی کا معمول بن گیا تھا..... بی اماں اسے کھوجتی نظروں سے دیکھتی تھیں۔

وہ سب جانتی تھی..... بے خبر نہیں تھی۔

بس وہ یہ سوچتی تھی۔ کیا میں اتنی ارزاں، بے وقعت ہوں کہ شاہ زر سلیم مجھے دل تو کیا کمرے میں بھی جگہ نہیں دے سکتا.....؟" سوچیں..... لاتعداد..... سوال بے شمار..... تاویلیں، دلائل سب ناکافی.....

"میں سمجھوتہ کر لیتی مگر وہ نفرت کے نشتر تو میرے آر پار نہ کرتا۔ شاید میں تمہارے لائق ہی نہیں تھی شاہ زر سلیم....." وہ سارے جرم اپنے کھاتے میں ڈال لیتی تھی۔

وقت آگے سرکا۔ زندگی چلتی رہی، ہاں سچ ہی تو کہا جاتا ہے "کسی ایک شخص کے چھوڑ جانے سے زندگی رک تو نہیں جاتی۔"

اس نے اپنے گرد مصروفیت کے انبار اکٹھے کر لیے تھے..... پہلے پہل عینی، بی اماں سب اس کی دلجوئی کرتے رہے مگر جلد ہی وہ جان گئے کہ مہر کو ان کی جھوٹی تسلیوں، دلاسوں کی ضرورت نہ تھی۔

وہ سمجھوتا کرنا سیکھ گئی تھی۔ پہلے بہت کم ہنستی تھی اب وہ بھی بھول گئی تھی۔

اسی طرح ہوتے ہوتے سال بیت گیا..... تین سو پینسٹھ دن..... لوگ رحم کھاتے..... ترس سے اسے دیکھتے۔

وہ جھوٹی ہنسی ہنستی رہتی اور پھر راتوں کو پھوٹ پھوٹ کر روتی..... تو یہ سب مقدر میں طے تھا..... وہ الجھے ریشم میں جیسے الجھ جاتی.....

"شاہ زر سلیم..... بے شک میری مسکراہٹ میں میرا ساتھ نہ دیتے مگر میرے آنسوؤں کی تو لاج رکھ لیتے۔" شاید محبت نامی طلسم یوں ہی وجود کے گرد مکڑی کی مانند جالا سا بن دیتا ہے..... پھر نہ آنکھ بچائی جاتی ہے اور نہ ہی آنکھ چرائی جاتی ہے..... مگر اس عرصے میں وجود بھربھری مٹی کی مانند کھوکھلے ہو جاتے ہیں..... اور مہر عالم اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھی۔

آس، امید، انتظار آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا.....

"کبھی تو وہ شہر دل میں قدم رکھے گا....."

یہ ان کا یونیورسٹی میں آخری دن تھا..... آخری سمسٹر اختتام کو پہنچا تھا۔ ان سارا گروپ جمع تھا۔ قہقہے..... شرارتیں..... کتنی بے فکری اور لاپروائی کا سماں تھا..... وہ اور مریم آخری کونے میں بیٹھی تھیں۔ لڑکیوں کی آوازوں نے کیفے ٹیریا جیسے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ مہر کے سامنے کولڈ ڈرنک پندرہ منٹ پہلے رکھی گئی تھی..... وہ اپنے آپ میں گم لگ رہی تھی..... مریم اب بغور اسے دیکھ رہی تھی..... اس کی دوست کتنی پریشان تھی۔

"تمہاری کولڈ ڈرنک گرم ہو رہی ہے۔" مریم نے مطلع کیا تھا۔ مہر نے چونک کر دیکھا تھا۔

''اوہ... ہاں'' یہ کہہ کر اس نے کولڈ ڈرنک اٹھالی تھی۔

''تم نے آگے کیا کرنے کا سوچا ہے؟''

''کچھ نہیں....''

''مگر کیوں مہر....؟''

''میری زندگی میں اب بچا کیا ہے....؟'' تاسف بھرا لہجہ۔

''بہت کچھ بچا ہے.... رنگ، مسکراہٹیں، سب کچھ ہے.... آگے بڑھو، کب تک ماضی میں بھٹکتی پھرو گی....'' مریم نے اسے جیسے لتاڑا تھا.... وہ عجیب انداز میں ہنسی تھی۔

''ماضی.... اوہ.... ہاں۔'' دل گرفتہ انداز۔

''تمہیں اس کا انتظار ہے نا؟'' کولڈ ڈرنک گرم ہو چکی تھی مگر وہ آہستہ آہستہ حلق سے اتار رہی تھی۔

''کس کا....؟''

''شاہ زر کا....'' مہر چپ ہو گئی تھی۔

''خاموشی رضامندی کی علامت ہوتی ہے۔'' مریم کی نظریں اس کی گلابی پڑتی آنکھوں پر تھیں۔

''ہاں.... میں انتظار کر رہی ہوں۔'' جیسے یہ جواب صدیوں کا سفر کر کے اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

مریم جیسے پھٹ پڑی تھی ''تم ایسا کیسے کر سکتی ہو مہر.... وہ تمہیں ٹھکرا کر گیا ہے پھر بھی تم اس کی منتظر ہو، اسے فیور دے رہی ہو....؟'' شاکی سا انداز تھا۔ اسے مہر پر غصہ آ رہا تھا۔

''ہاں.... میں دے رہی ہوں اسے فیور.... ہاں.... میں کر رہی ہوں اس کا انتظار۔'' وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ آنسو بھل بھل بہنے لگے تھے۔ اس نے کولڈ ڈرنک پرے رکھ دی تھی۔

''میں کیا کروں مریم.... میں مجبور ہوں.... یہ جو نکاح کے ''قبول ہے'' کے الفظ ہوتے ہیں ناں.... وجود کے گرد انتظار نامی فصیلیں کھڑی کر دیتے ہیں.... اور ایسا انتظار جو کہ جکڑ لیتا ہے.... پیچھا نہیں چھوڑتا.... میں بھی انتظار کرنا نہیں چھوڑ سکتی۔''

مجبوری، لاچاری کیسا دکھ دیتی ہے انسان کو یہ کوئی مہر عالم سے پوچھتا۔

''مگر وہ لوٹ کے نہ آیا تو پھر....؟'' مریم کے آگے بڑھانے پر مہر نے ٹشو پیپر تھام لیا تھا۔

''تو پھر....؟'' سوال واپس پلٹ آیا تھا۔

''تمہارا سارا انتظار اکارت جائے گا.... برداشت کر پاؤ گی؟'' مریم کی بات پر وہ روتے روتے ہنس دی تھی.... بے تحاشا ہنسی.... آنکھوں سے بہتے آنسو اور مریم کو وہ شعر شدت سے یاد آیا تھا۔

وہ ہنستے ہنستے روتی تھی۔
اور دھوپ میں بارش ہوتی تھی۔

''مریم....! میں برداشت ہی تو کر رہی ہوں۔ زندگی میں اتنے نقصان اٹھا چکی ہوں اور برداشت بھی کر چکی ہوں۔ اب تو ہنسی آتی ہے اس لفظ پر بھی۔'' وہ بول رہی تھی.... مریم نے مہر کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے تھے۔ دلاسے، تسلیاں....

''تم بہت بہادر ہو مہر!''

''ہاں میں بہت بہادر ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔

''مریم.... وہ لوٹ آئے گا نا؟'' کیسی امید، کیسی آس تھی ان بھیگی آنکھوں میں۔ مریم نے ضبط سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

''ہاں.... مہر.... وہ لوٹ آئے گا.... مسافر جب سفر پر نکلتے ہیں تو انہیں لوٹنا ہی ہوتا ہے.... اور پتا ہے انہیں لوٹنے پر دو چیزیں مجبور کرتی ہیں۔''

مہر نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تھا.... کون سی دو چیزیں....؟''

مریم تھوڑا آگے ہوئی اور بولی۔ ''امانتیں اور انتظار.... اور تمہارے پاس تو یہ دونوں چیزیں ہیں مہر....'' مہر نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''میرے پاس صرف انتظار ہے۔ رہی بات امانت کی تو وہ مجھے امانت سمجھتا ہی نہیں۔'' کتنا درد۔ کتنا سوز تھا اس بات میں مریم نے اپنے آپ کو جیسے پگھلتا ہوا

محسوس کیا تھا۔

"تم پریشان مت ہو مہر..... اللہ بہتر کرے گا..... وہ کسی کا انتظار رائیگاں نہیں جانے دیتا..... وہ تو دلوں کو پھیرنے والا ہے۔ میری دعا ہے وہ شاہ زر سلیم کا دل تمہاری طرف پھیر دے۔"

وہ چپ بیٹھی رہی پھر وہ دونوں وہاں سے چلی آئی تھیں۔ آخری دن کی گہما گہمی عروج پر تھی۔ رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے' شوخی' شرارت..... تحائف کے تبادلے..... آخر کار سفر اختتام کو پہنچا تھا۔

سفر ختم ہو جاتے ہیں' مگر یادیں باقی رہتی ہیں' کبھی نہ مٹنے کے لیے..... کبھی نہ ختم ہونے کے لیے' وہ دونوں پارکنگ میں آ گئی تھیں۔ ڈرائیور آ چکا تھا..... عینی بھی وہیں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی وہ مریم کو خدا حافظ کہتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سارا رستہ وہ خاموشی سے سوچوں میں مگن رہی جبکہ عینی بولتی رہی.....

وہ باہر دوڑتی بھاگتی۔ زندگی کو دیکھنے لگی..... ہاکر..... اسٹوڈنٹس..... فروٹ چاٹ کی ریڑھیاں۔

"ہاں..... زندگی کہاں رکتی ہے کسی کے چلے جانے سے مگر یوں لگتا ہے..... میری زندگی رک گئی ہے..... صدیوں پہلے جہاں تھی..... صدیوں بعد بھی وہیں کھڑی ہے..... انتظار کی موم جانے کب پگھلنے لگی.....

مناظر پیچھے دوڑ رہے تھے..... دوپہر ڈھلنے کو تھی..... دھوپ میں تارکول چمک رہا تھا.....

✲ ✲ ✲

اور پھر عید سے ہفتہ بھر پہلے شاہ زر سلیم لوٹ آیا تھا..... وہ ایک ٹھنڈی سی فجر تھی جب وہ سحری کے بعد لان میں ٹہل رہی تھی۔ بی اماں اندر تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ چچی اور بی اماں کے ساتھ ساتھ مہر بھی سارے روزے رکھ رہی تھی۔ جبکہ عینی وقفے وقفے سے رکھتی تھی..... باقی بچے چچا تو وہ مریض تھے..... اسی لیے وہ روزے نہیں رکھتے تھے..... ہر طرف ملگجا اندھیرا چھایا ہوا تھا..... وہ نرم گیلی گھاس پر ننگے پاؤں چل رہی تھی..... سارے وجود میں سکون سرایت کرتا جا رہا تھا..... تب ہی دستک ہوئی تھی..... وہ چونکی۔ اس وقت کون آ سکتا تھا ہے؟ اور یہ دستک..... تھکا تھکا سا انداز تھا..... مہر عالم کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ گیٹ تک آئی اور جھری میں سے جھانکا..... لمبا چوڑا وجود..... پشت کیے سفری بیگ کاندھے پر ٹکائے کھڑا تھا..... اس نے آہستہ سے گیٹ کھول دیا..... اور پھر وقت ساکت ہوا تھا..... شاہ زر نے قدم اندر رکھے تھے..... وہ سامنے کھڑی تھی' وجود کے گرد ہاتھ باندھے..... مکمل اطمینان اور سکون کے ساتھ..... کیا شاہ زر سلیم کچھ کہنے کی پوزیشن میں تھا' قطعاً "نہیں..... نماز کے اسٹائل میں دوپٹہ اوڑھے' وہ اسے بڑی نکھری نکھری اور پاکیزہ سی لگی تھی..... مقدس..... اگر وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے آنے پر پاگلوں کی طرح خوشی کا اظہار کرے گی تو وہ غلط تھا۔ وہ آرام سے کھڑی تھی۔ پرسکون.....

"پلیز سامنے سے ہٹیں..... مجھے ڈور لاک کرنا ہے.....'' وہ بے تاثر سے لہجے میں بولی تھی..... وہ ہٹ کر آگے بڑھ گیا..... وہ دروازہ بند کر کے خراماں خراماں اس کے پیچھے چل رہی تھی..... جب وہ آگے چلتا ہوا اچانک پلٹا تو وہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"میں بہت تھک گیا ہوں..... پلیز کیا کافی ملے گی.....؟'' وہ پوچھ رہا تھا..... وہ سر اثبات میں ہلاتی کچن کی طرف مڑ گئی تھی..... وہ بھی پیچھے پیچھے وہیں آ گیا تھا.....

تین سالوں میں وہ ظاہری طور پر کافی بدل گیا تھا..... رنگت مزید سرخ و سفید ہو گئی تھی۔ نقوش ویسے ہی تھے۔ جسم فربہی مائل سا لگتا تھا۔

تین منٹ میں کافی بنا کر اس نے اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم نہیں پیو گی.....؟'' اس کے نرمی سے پوچھنے پر مہر عالم زندگی میں پہلی بار اتنی حیران ہوئی تھی۔

"نہیں..... میں روزے سے ہوں۔'' وہ اب سنک کی طرف کھڑی پلیٹ دھو رہی تھی۔

"سب گھر والے کیسے ہیں.....؟'' سوال ہوا۔

"سب ٹھیک ہیں۔" جواب ملا۔

"اور تم۔۔۔؟" اس کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹتے چھوٹتے بچی تھی۔۔۔ تو کیا شاہ زر سلیم کا دل بدل گیا تھا۔۔۔؟ وہ چپ چاپ اسٹینڈ میں پلیٹ لگاتی بغیر کوئی جواب دیے جانے لگی تھی جب اس نے اسے پیچھے سے کہتے سنا تھا۔

"بہت اچھی کافی بنائی ہے مہر۔۔۔ شکریہ۔۔۔" اور مہر نے جاتے جاتے پلٹ کر ایک نظر اسے دیکھا تھا۔۔۔ اور وہ ایک نظر شاہ زر سلیم کو بہت کچھ یاد دلا گئی تھی۔۔۔

عروسی لباس میں فرش پر بیٹھی' روتی ہوئی مہر عالم۔۔۔ ان آنکھوں کی بے بسی۔۔۔ خالی پن۔۔۔ جس منظر کو دیکھ کر وہ تین سال پہلے پتھر نہیں ہوا تھا آج اس منظر کی یاد اسے پتھر کر رہی تھی۔

آج اسے لگا تھا' وہ تین سال پہلے والی مہر اور تھی اور جسے آج دیکھا یہ کوئی اور ہے۔۔۔ اور شاہ زر سلیم سے کچھ فاصلے پر اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہلتی مہر سوچ رہی تھی۔

"جانے مسافر میرے انتظار کی وجہ سے پلٹا ہے یا پھر سفر کی تھکن سے نڈھال ہو کر لوٹ آیا ہے۔"

☆ ☆ ☆

بی اماں اور چچی سے شاہ زر سلیم نے معافی مانگ لی تھی۔۔۔ اور وہ دونوں تو جیسے موم کی بنی تھیں اسی وقت پگھل گئیں۔۔۔ مہر کو اس بات پر خوب تاؤ آیا تھا۔ دوسری طرف عینی بھائی کی آمد پر جیسے اڑن طشتری پر آسمان کی سیر کر رہی تھی۔۔۔ اور رہے چچا' تو انہوں نے شاہ زر کو خوب لتاڑا تھا۔

"اب پتا چلا کہ بڑوں کے کیے گئے فیصلوں میں کون سی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔۔۔ مگر نہیں' جناب نے تو اپنی ہٹ دھرمی دکھائی تھی۔۔۔ یتیم بچی پر ذرا ترس نہ آیا تمہیں' روز حشر میں اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاتا۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ تم ہی مہر کے لائق نہیں ہو۔۔۔" انہوں نے اسے خوب شرمندہ کیا تھا اور وہ شرمسار سا بیٹھا رہ گیا تھا۔

تین سال سڈنی میں رہ کر اس کی عقل ٹھکانے آگئی تھی۔ اس نے بمشکل چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے گزارہ کیا تھا۔ اور آخری پندرہ دن وہ کرسٹی کے فلیٹ میں رہا تھا۔ یہ کرسٹی کا احسان تھا جو اسے برداشت کر رہی تھی۔

مگر پھر جو ہنگامہ ہوا اس نے شاہ زر صاحب کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ اسی لیے مسافر حد درجہ خواری کے بعد وطن لوٹ آیا تھا۔ سڈنی میں رہائش کا خواب تو جیسے بھک کر کے دماغ سے اڑا تھا۔

والدین کے عیش و آرام پر پلتی اولاد جب قدم باہر رکھتی ہے تو زمانہ زندگی کے قرینے بڑے اچھے انداز میں سمجھاتا ہے اور شاہ زر سلیم ساری "الف" "ب" سمجھ آیا تھا۔ وہ ساری زندگی مہر کی اطاعت' فرمانبرداری کو "کم عقلی" اور "کم گوئی" سمجھتا رہا تھا۔ مگر معاملہ تو کچھ اور ہی نکلا تھا۔ جسے جان کر اس کے دانتوں تلے پسینہ آگیا تھا۔ اب گھر میں رہ کر اس نے تفصیلاً "مہر کو" پرکھا تھا۔ واقعی وہ غیر معمولی لڑکی تھی۔۔۔ اور اس بات کو جاننے میں اس کو تین سال لگے تھے۔

اب مہر نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جھنجلاتا' پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا' مگر گھر والے بھی اس سارے عرصے میں بے نیازی اختیار کیے ہوئے تھے۔ عید میں تین دن باقی تھے۔۔۔ گلیاں' بازار انسانوں سے بھر گئے تھے اور وہ ارد گرد سے بے نیاز اپنی مصروفیات میں مگن تھی اور اس نے تو غیر ارادی نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کی تھی۔۔۔ شاہ زر سلیم کو اس بات پر حیرت تھی کہ وہ اتنی جلدی کیسے "بدل" گئی تھی' مگر اسے اس بات پر بالکل حیرت بھی نہیں تھی کہ اس کا اپنا "دل" کیسے پھر گیا تھا تو یہ سب ہونا طے تھا۔

اس نے مہر عالم کو ٹیرس پر گملوں میں لگے پودوں کو پانی دیتے دیکھا تھا۔ دوپٹہ جھولے کی دھاتی پیڑی پر لٹکا ہوا تھا اور وہ ارد گرد سے بے خبر کام میں مگن تھی۔ لمبے اور بے تحاشا حسین بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔۔۔ اتنے لمبے اور حسین بال شاہ زر نے پہلی بار دیکھے تھے۔

"تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں۔۔۔؟" اس نے

پوچھا۔

مہر عالم ڈر کر پیچھے ہٹی تھی۔ جلدی سے دوپٹہ اٹھا کر اوڑھ لیا تھا۔ "میں کیوں بات کروں؟"

"شوہر ہوں تمہارا۔" وہ مسکرایا تھا۔ وہ چپ کھڑی رہی' پھر توقف کے بعد بولی تھی۔

"تین سال پہلے کی رات مجھے آج تک نہیں بھولی۔"

"مجھے بھی نہیں بھولی مہر! میں بہت جذباتی اور لاابالی سا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ زندگی کے سارے فیصلے میں خود کر سکتا ہوں' مگر میں غلط تھا مہر۔ جس شے کو والدین اپنی زیرک نگاہ اور تجربے سے دیکھتے ہیں' اولاد نہیں دیکھ پاتی.... میں بہت شرمندہ ہوں.... تم سے' سب گھر والوں سے.... میں تمہارا گناہ گار ہوں' تمہارے سامنے ہوں۔ جو سزا دو گی مجھے منظور ہو گی۔"

وہ شکستہ.... ٹوٹا ہوا سا لگ رہا تھا.... مہر کا دل سکڑ کر رہ گیا تھا' مگر وہ تین سالوں کا حساب چار حرفوں کے بدلے تو معاف نہیں کر سکتی تھی۔ قطعاً "نہیں.... وہ اس کی طرف مڑی۔

"ابھی وقت لگے گا.... میرا ظرف ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا کہ تین سال کی مشقت پر چار حرفوں کی دلیل کو مان لوں.... بہت وقت لگتا ہے شاہ زر سلیم...."

یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں اترتی نیچے چلی گئی اور وہ وہیں جھولے پر بیٹھا سوچتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

چاند رات والے دن مریم کا فون آیا تھا۔ "دیکھو مہر.... اللہ نے مسافر کا دل پھیر دیا اور وہ لوٹ آیا.... میں نہ کہتی تھی کہ وہ انتظار اور امانت کی کشش کی وجہ سے کھنچا چلا آئے گا۔"

مہر ہنسی۔ "ہاں.... تم نے سچ کہا تھا.... شاہ زر سلیم بدل گیا ہے۔ کیوں؟ کیسے؟ میں لاعلم ہوں.... مجھ سے معافی مانگ رہا تھا۔"

مریم چیخی "اور تم نے معاف کر دیا....؟"

مہر نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ "نہیں مریم.... تین سال پہلے کی رات میری یادداشت سے محو ہی نہیں ہوتی.... نکلتی ہی نہیں۔" وہ بے بس لگ رہی تھی۔

اور اسی دن بی اماں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر کہا تھا۔ "میری بچی میں جانتی ہوں جو بھی ہوا غلط ہوا.... مگر جب غلطی کو سدھارنے کا موقع نہ ملے تو دیر ہو جاتی ہے۔ وہ لوٹ آیا ہے.... شرمندہ ہے.... سلیم بھی تمہاری وجہ سے ابھی تک اس سے ناراض ہے.... تم بھی اب ناراضی ختم کر دو...." اور وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں "Flies" پڑھ رہی تھی۔ یہ اس کی پسندیدہ کتاب تھی.... ارد گرد سے بے نیاز.... جب وہ دستک دیے بغیر اندر آیا اور اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آئی ایم سوری۔" وہ چونکی.... سر اٹھایا.... اسے دیکھا۔

"سوری فار واٹ....؟" تیکھا سوال۔

"اس سب کے لیے جو میں نے کیا.... میں نے تمہیں ہرٹ کیا.... تمہیں تکلیف دی.... کیا تم مجھ پہ یقین کرتی ہو؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"بالکل نہیں...." مہر عالم کا سپاٹ سا جواب۔

"مگر میں پھر بھی تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ ان تین سالوں میں کوئی بھی دن تمہاری یاد سے خالی نہیں گزرا.... مجھے وہ رات نہیں بھولی.... بالکل بھی نہیں.... عروسی لباس میں تمہارا روتا ہوا وجود مجھے کچوکے لگاتا رہا.... اور تمہاری آنسو بھری آنکھوں نے میری نیندیں اڑا دیں.... یوں لگنے لگا تھا جیسے دل کا کوئی کونا خالی سا رہ گیا ہے...." وہ کہتا جا رہا تھا.... مہر کے ہاتھ میں موجود کتاب لرزی تھی۔ "شاید زندگی میں جن انسانوں کے وجود سے لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو وہی انسان ہمارے لاشعور میں گھس جاتے ہیں.... گزرے ہوئے تین سال میں واپس نہیں لا سکتا' مگر پھر بھی میں آئندہ زندگی میں اس کا ازالہ کر دوں گا...."

اگر بے بسی کی انتہا تھی تو شاہ زر کے چہرے پر تھی.... اگر کرب کی ابتدا تھی تو مہر عالم کے چہرے پر

تھی۔ اس نے کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے میں تمہیں معاف کردوں گی۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ میرا قصور بہت بڑا ہے۔۔۔ میں معافی کے لائق بھی نہیں۔"

"تو پھر کیوں آئے ہو۔۔۔؟"

"مجھے لگتا ہے میرے قصور سے تمہارا ظرف بہت بڑا ہے۔"

"ظرف آزمانے آئے ہو۔۔۔؟" مہر نے پوچھا تھا۔

"نہیں۔۔۔ محبت آزمانے۔۔۔" وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"یہاں محبت کا کیا ذکر۔۔۔؟" مہر کا دل دھڑکا۔

"سارا ذکر ہی تو محبت کا ہے۔۔۔ محبت اپنے آپ کو پردوں میں چھپاتی ہے اور چھپن چھپائی کا کھیل کھیلتی ہے۔۔۔ میرے ساتھ بھی یہ کھیل کھیلا گیا' مگر شاید میں ہار گیا مہر۔۔۔" وہ انتہائی افسردہ اور تکلیف میں لگ رہا تھا۔

مہر کا دل سکڑ کر رہ گیا۔۔۔ بڑھی ہوئی شیو۔۔۔ کمزور چہرہ۔ مہر اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔

"میں نے بہت تکلیف' اذیت اٹھائی ہے۔۔۔ بہت مشکل سے اپنے آپ کو بہادر بنا پائی ہوں۔۔۔ میں اس گھر میں پناہ گزین بن کر آئی تھی' مگر یہاں مجھے گھر جیسا پیار ملا۔۔۔ میں تمہارا حصہ چھیننے' قبضہ جمانے نہیں آئی تھی اور نہ ہی تم لوگوں کی برابری کرنے۔۔۔ چچا کا فیصلہ میرے لیے محترم تھا' میں ان کے فیصلے کی کیسے لاج نہ رکھتی۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے رکی تھی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں زبردستی تم پر مسلط کی گئی تھی۔۔۔ میں نے بہت سمجھوتے کیے تب بھی کر لیتی۔۔۔ بے شک تم میری مسکراہٹوں' خوشیوں میں میرا ساتھ نہ دیتے' مگر زمانے کے سامنے میرے آنسوؤں' غموں کی تو لاج رکھ لیتے۔۔۔" وہ اس کی طرف پشت کیے رو رہی تھی۔۔۔ لرز رہی تھی۔۔۔ کانپ رہی تھی۔

وہ آہستہ سے چلتا ہوا آیا اور اس کے کاندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھ کر اپنی طرف موڑا تھا۔

"ہاں۔۔۔ میں غلط تھا مہر۔۔۔ اب۔۔۔ اب میں ہر غلطی کا ازالہ کردوں گا۔۔۔ میں ہر خوشی میں اور دکھ میں تمہارے ساتھ برابر کا شریک رہوں گا' مگر میری ایک التجا ہے۔۔۔" مہر نے سوالیہ بھیگی نظریں اٹھائی تھیں۔۔۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"میری محبت کی لاج رکھ لو۔۔۔"

دور بار سے قہقہوں کی گونج میں شور سنائی دیا۔ "عید کا چاند نظر آگیا۔"

باریک سے چاند نے جیسے مہر عالم سے التجا کی تھی۔

"مہر عالم۔۔۔ محبتوں کے سوال میں اگر لاج کا جواب مانگا جائے تو "نا" نہیں کہتے۔"

"تیرے اللہ نے تیرے انتظار کی "لاج" رکھ لی اور اب تیرا یہ فرض بنتا ہے کہ اس کے بندے کی محبت کو ٹھوکر نہ مار۔ محبتوں کی' عزتوں کی' جذبوں کی لاج رکھنا لازم ہے۔"

خوشیوں کے جھرمٹ میں گھرے عید کے چاند کی بات پر وہ مسکرائی اور اس نے شاہ زر سلیم کا ہاتھ تھام لیا۔

☆

رات پہ آلکسی سوار تھی۔ جیسے رینگ رینگ کے چلتی سستی اور تھکی تھکی سی، سپیدہ سحر کسی بام پہ اٹک گیا تھا۔

امل بیڈ پہ ویرانی سی تھی۔ گلگل سا کھٹا پھل گل سڑ کے نیچے گر رہا تھا۔

اس کے دل پہ خوف طاری ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں، دیا کی آواز ابھی تک کسی گناہ کی طرح اس کے پیچھے تھی۔

"جب زندگی کو ٹپکا لگا ہو۔ جب سانس سینے کی قید میں سر پٹختی ہو اور روح لمبی اڑان بھرنے کے لیے تیار ہو تو اے میرے اعمال! مجھ سے دور ہو جاؤ۔ مجھ سے دور ہو جاؤ۔" اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اس نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے تاکہ دیا کی آواز اس تک پہنچ ہی نہ سکے۔

یک دم اسے کسی کی زخمی کراہ نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ وہ تیزی سے آراستہ پیراستہ کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ کراہ کی آواز عنایہ کے کمرے سے آرہی تھی۔

عنایہ کے کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ جیسے زندگی کی دھوپ کو مسرت کا ڈھانپ لینے والا سایہ۔ عنایہ کے کمرے میں کچھ ایسا ہی دل چیر دینے والا سماں بندھا ہوا تھا۔ اس کا دل کچلا گیا تھا۔

اس نے عنایہ کا چہرہ دیکھا اور دھک سے رہ گئی تھی۔ وہاں نیلاہٹیں اتری ہوئی تھیں۔ اور موت کی ویرانیاں تھیں۔

اس کے قدموں تلے انگارے بچھ گئے تھے۔

وقت نزع دیا پہ ہی نہیں عنایہ پہ بھی اترا ہوا تھا۔ جان کنی کا عالم۔ وہ صدمے اور خوف کی انتہا پہ تھی۔

ناولٹ

عنایہ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ عنایہ جو اسے بلا رہی تھی، اپنے قریب آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ وہ جس کے ہاتھ اٹھنے سے قاصر تھے اور بے جان ہو رہے تھے۔ وہ پاؤں ہلاتی تو ہل نہ پاتے۔

اور عنایہ اسے اپنے قریب بلا رہی تھی جبکہ اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ ایک قدم کا بار بھی اٹھا سکتی۔ وہ آبنوسی دروازے کے پاس جم گئی تھی۔

عنایہ نے ایک بے بس نگاہ اس پر ڈالی۔

"بیہ! وقت آخر ہے۔ یوں تو نہ کرو۔ کچھ تو قریب آؤ۔" اس کی بے بس نگاہ کی التجا بھی اس کے قدموں کو اپنی جگہ سے اکھاڑ نہیں سکی تھی۔ اسے کسی کے بھی وقت آخر میں اس کے قریب نہیں رہنا تھا۔ وہ کمزور تھی خوف زدہ تھی۔ اور وہ بزدل بھی تھی۔

وہ اسی لیے دیا کے کمرے میں نہیں جاتی تھی۔ اور اسی لیے عنایہ کے کمرے میں نہیں آتی تھی۔

"خاموشی عبادت ہے.... جو تم نے کی اور عمر بھر کی خاموشی شیوہ ہے عاجزوں کا' دبدبہ ہے حاکموں کا' مخزن ہے حکمتوں کا' جواب ہے جاہلوں کا۔ وہ جاہل جو عمر بھر خود کو عالم فاضل سمجھ کر تم پہ چلاتے رہے۔ تمہاری خاموشی نے انہیں شکست سے دوچار کیا اور میری فرماں برداری نے ان کو جہنم میں دھکیل دیا۔ تم مبارک باد کی حق دار ہو بیہ! خدا نے تمہیں تمہاری خاموشی کے بدلے کامیابی دی۔ اور افسوس ہے مجھ پہ' میری فرماں برداری کے بدلے میں ناکامی دی۔"

اس کی سانسیں اکھڑ گئی تھیں۔ اس کے لفظوں نے بیہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ خوش بیاں نہیں تھی۔ وہ تو دو لفظوں کا ایک جملہ بڑی دقت سے ادا کرتی تھی۔ تو پھر یہ خوش بیانی کمال تھی؟

"بیہ! یہاں آؤ' میرے قریب۔ آج میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔" اس کی نرم دل نشین آواز کمرہ مرگ میں پھیل رہی تھی۔ اس کمرے میں عجیب سی باس بھی رچی تھی۔ اس نے ایسی خوشبو آج تک نہ

سونگھی تھی۔ جو اس کا سانس بند کر رہی تھی۔

"جو شخص کثرت خواہشات سے اپنے دل کو مردہ بنائے اس کو لعنت کے کفن میں لپیٹو اور جو نفس کو خواہشات سے باز رکھتا ہے' اس کو رحمت کے کفن میں لپیٹو اور سلامتی کی زمین میں دفن کرو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا بیہ! میرے لیے کون سی زمین ہوگی؟" وہ اتنی الجھی ہوئی تھی جیسے آج ہی اس گورکھ دھندے کو حل کرنا چاہتی ہو۔

جانے اس کی ذہنی رو کیوں بھٹک رہی تھی۔ وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ ایک دم صحت مند نزلہ' زکام' فلو' بخار کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے گال دمکتے تھے' صحت مندی کی سرخی سے' کل رات تک وہ بالکل ٹھیک تھی۔ اور آج رات اچانک اسے کیا ہو گیا تھا؟ یہ بہکی بہکی باتیں اور اڑے اڑے حواس!

وہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ عنایہ کا معصوم چہرہ دل نشین آنکھیں جو نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس کا خوب صورت چہرہ پل پل رنگ بدل رہا تھا۔

"اور میں نہیں جانتی اپنی عمر کے اتنے سالوں میں میں نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اگر شمار کروں تو کچھ نہیں بچتا بیہ! میرے ہاتھ تو خالی ہیں.... اور دل؟ ایک کھنڈر مکان.... یہاں پہ کچھ بھی نہیں.... میں ایسی مفلس اور قلاش ہوں؟"

وہ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں کیا تھا؟ حیرت' حسرت' دکھ یا صدمہ؟ بالکل تہی داماں ہونے کا؟ مفلس اور قلاش ہونے کا؟ خالی ہاتھ ہونے کا۔

اور عنایہ کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تھے۔ بیہ کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا تھا۔ یہ آنکھیں' یہ چہرہ اسے کتنا عزیز تھا۔ اس نے عنایہ سے کتنی محبت کی تھی؟ اس کے دل کے ساتھ یہ پہلا رشتہ تھا۔ عنایہ سے محبت' انسیت' لگاؤ' عنایہ کی فکر۔

عنایہ ایک کہانی کا باب نہیں تھا۔ عنایہ پوری کہانی کا عنوان تھا۔ بیہ کی زندگی کا عنوان۔ اس کی آنکھوں

کے سامنے منظر بدل بدل کر آ رہے تھے۔

وہ صبح جب عنایہ نے اس دنیا میں اپنی خوب صورت آنکھیں کھولیں۔ وہ صبح جب سات سالہ ربیہ کی گود میں اس ننھی سی شہزادی نے اپنی پہلی غذا لی۔ وہ تین انچ کی دودھ سے بھری بوتل۔ جو ننھی عنایہ کے لبوں میں دبی تھی۔

وہ عنایہ کا پہلا زمین پہ جمتا قدم.... اس کے لبوں سے ادا ہوا پہلا لفظ "بیہ۔"

عنایہ تو اس کے اندر جمی ہوئی تھی۔ کیسے اکھڑ سکتی تھی۔ وہ تو اس کے اندر بستی تھی۔ پھر کیسے جا سکتی تھی؟ لیکن عنایہ جا رہی تھی۔ وہ سمجھ ہی نہ پائی۔ عنایہ کو اچانک کیا ہوا تھا؟ وہ ایسی بہکی باتیں کیوں کر رہی تھی؟ اس کا دل چاہا وہ بھاگ کر دیا کے "صنم کدے" کی طرف جائے اور دیا کو بلا لائے۔ کہ "آؤ اور دیکھو عنایہ کو کیا ہو رہا ہے....؟"

"عنایہ! تمہیں کیا ہو رہا ہے؟ کیسی باتیں کرتی ہو میری جان! کیا خواب میں ڈر گئی ہو؟" بہت دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہو سکی تھی۔ اس کی کپکپاتی آواز عنایہ کے لبوں پہ دم توڑتی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ شاید گھڑی بھر کے لیے۔

"خواب تو پہلے تھا۔ اب تو حقیقت میں جی رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے اتنے سال ایک سراب کے پیچھے بھاگتی رہی ہوں۔ حقیقت تو یہی تھی۔ جس نے مجھ پہ انکشاف کیا۔"

"کیسا انکشاف؟" بیہ کے لب بے آواز ہلے تھے۔

"یہی کہ مجھے اس سے کتنی محبت تھی۔" وہ اب رونے لگی تھی۔ اور اس کے قیمتی آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ اور بیہ کے دل پہ جیسے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی۔ وہ اسے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"کس سے؟" بیہ پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن خاموش ہو گئی۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ عنایہ کو کس سے محبت تھی؟ اور کتنی شدت کی محبت تھی۔

"وہ میرے اندر بستا تھا۔ تبھی یادوں سے کبھی نکلا ہی نہیں۔" اس نے جیسے اعتراف کیا تھا۔ یہ شاید اعترافِ گناہ تھا۔

"میں نے محبت کا گناہ کیوں کیا؟" وہ اندر ہی اندر سسک رہی تھی۔

"محبت گناہ نہیں ہوتی۔" بیہ اسے سمجھانا چاہتی تھی۔ لیکن کچھ بول ہی نہ سکی۔ وہ تو اپنے ہی دھیان میں تھی۔ اسے شاید سن ہی نہیں رہی تھی۔

"تم میرا ایک کام کر دینا بیہ!" اس نے لمبی سی سسکاری بھر کے التجا کی تھی۔ "بس اسے بتا دینا کہ عنایہ کو اس سے بہت محبت تھی۔" اس نے ایک لمبی سی آہ بھری اور چپ کر گئی۔

"کس سے؟" بیہ الجھی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ "کیا رافع سے؟"

"نہیں بیہ۔" اس نے الجھی سانسوں کو بمشکل ہموار کیا تھا۔ "فاتح سے" وہ اب آنکھیں موند رہی تھی۔ جبکہ بیہ کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

یہ عنایہ نے کیا کہہ دیا تھا؟ کیا اس کا دماغ چل گیا تھا؛ یا وہ پاگل ہو چکی تھی؟

اور ابھی وہ عنایہ کو جھنجوڑ کر اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ "کیا تمہارے حواس قائم ہیں؟" جب عنایہ نے ایک خوفناک ہچکی لی اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

بیہ کی آنکھیں خوف سے پھٹ پڑی تھیں۔ وہ بے ساختہ آبنوسی دروازے سے لگی اور چیختی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس اونچے مکان کی لمبی راہداریوں میں ماربل کے فرش پہ بھاگتے اٹھتے گرتے وہ دیا کے صنم کدے کی طرف بھاگ رہی تھی۔ لیکن اس سے بھی پہلے اچانک اس کے قدموں کو کسی چیز نے روک لیا تھا۔ وہ راستے میں گرا ٹیلی فون کا تار تھا۔ بیہ کے پیروں کو زنجیر لگ گئی تھی۔ وہ دھونکنی کی مانند چلتی سانسوں کو رواں کرتی فون کے قریب ہی گر گئی۔

اسے کیا کرنا تھا؟ اس کا ذہن کسی بھی طور کام نہیں کر رہا تھا۔

جب آپ کا کوئی قریبی عزیز دنیا سے چلا جاتا ہے تو آپ کیا کرتے ہیں؟ شاید رشتہ داروں کو اطلاع دی جاتی ہے۔ لوگوں کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ تاکہ سب لوگ آئیں اور آپ کے جان عزیز وجود کو زمین کے اندر دفن کرنے کا اہتمام کریں۔

اسے بھی یہی کرنا تھا۔ فون کالز؟ مگر کسے؟ وہ سوچنے لگی۔ ان کے رشتہ داروں کی فہرست کتنی مختصر تھی؟

وہ کسے اطلاع کرتی؟ اس نے دیا کی فون ڈائری ہاتھ میں پکڑلی۔ وہاں پہ تین نمبر تھے۔ ایک افراہیم کا بہت پرانا نمبر شاید اس کے دفتر کا یا گھر کا؟ اور ایک رافع کا..... تیسرا نمبر فاتح کا تھا۔ جانے دیا نے فاتح کا نمبر کیوں لکھ رکھا تھا۔ وہ جس کا وجود اسے گوارا نہیں تھا پھر نمبر لکھنا کیا معنی رکھتا تھا؟ یا پھر فون ڈائری دیا کی تھی ہی نہیں..... کاشف بھائی کی لگتی تھی۔ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔

اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کیا کرے؟

عنایہ کے مرنے کی کسے اطلاع دے؟

اس کے بے جان برفیلے جسم کا کون وارث تھا؟

اس کے جنازے کو کون کندھا دینے کا حق دار تھا؟

کیا رافع؟ یا فاتح؟

یا دونوں ہی نہیں۔

اس نے فون ڈائری کو زمین پہ رکھا اور کسی بپھرے طوفان کی طرح دیا کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔

وہ اس عورت کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کے لیے جا رہی تھی۔ آج عنایہ کا نہیں۔ دیا کا یوم حساب تھا۔

☼ ☼ ☼

عنایہ کی ناگہانی موت نے اس کے حواس سلب کر لیے تھے۔

عنایہ کا اتنا اچانک دنیا سے چلے جانا ایک حشر تھا۔ ایک قیامت تھی۔ یوم حساب تھا۔ عنایہ کو موت کی اندھی کھائی میں دھکیلنے والی دیا تھی۔ اور زندہ سلامت تھی۔ کیوں آخر کیوں؟ یہ ناگن کب تک جیے گی؟

اور اپنے پیاروں کو ڈس ڈس کر موت کے منہ میں دھکیلے گی؟ اس خوب صورت بلا کا کوئی انجام نہیں تھا۔

یہ موت اس کے قریب کیوں نہیں آتی تھی۔

بیہ کسی بپھرے طوفان کی طرح دیا کے عالی شان کمرے کی طرف بڑھی۔ لیکن کمرہ خالی تھا۔ وہ کہاں تھی؟ بیہ کو سوچنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

وہ تیزی سے ــــ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

یہ تہہ خانے کا پورشن تھا۔ جس میں لاؤنج، گیسٹ رومز، ہال اور اسٹور روم تھا۔ اسٹور روم کو بہت سال پہلے دیا نے کاٹھ کباڑ سے خالی کر کے اپنا مسکن بنالیا تھا۔ یہ کمرہ اس کی عبادت گاہ تھی۔ جس میں وہ گھنٹوں بیٹھ کر عبادت کرتی تھی۔ لمبے لمبے وظائف اور جانے کون کون سے عمل۔

اس کمرے میں کسی کو بھی آنے کی اجازت نہیں تھی۔ حتی کہ کاشف بھائی کو بھی نہیں..... اور بھائی تو تہہ خانے میں آتے ہی نہیں تھے۔ ان کی مصروفیت کام اور گھر سے بیزاری..... وہ اپنے گھر سے اتنے ہی لاتعلق تھے۔

اور یہ وہ کمرہ تھا۔ جس میں کسی نوکر کو صفائی کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ دیا کا اس کمرے کے لیے ایک ہی فرمان تھا۔

"میری عبادت کا تقدس خراب ہوتا ہے۔ نوکر بھی جانے کس حالت میں ہوتے ہیں۔ کبھی نجس، ناپاک۔ بے وضو، میرے بیڈ روم میں کوئی نہیں جائے گا۔" اور دیوی کے اس حکم پر کس کی مجال تھی جو سرتابی کی جرأت کرتا؟

عنایہ اور بیہ کی مجال نہیں تھی جو اس کی غیر موجودگی میں بھی تہہ خانے میں جھانک لیتیں۔

اور آج وہ اسی مقدس حجرے کی طرف جا رہی تھی۔ جس میں عمر بھر جانے کی جرأت نہ کر سکی۔ اور دیا اسے اپنے مقدس کمرے میں دیکھ کر کیا کر سکتی تھی۔ پیتل کا کوئی ڈیکوریشن اٹھا کر مار دیتی۔ کوئی گلاس کپ، یا اپنی ہیل اٹھا کے اس کی دھنائی کر دیتی۔ یا

بہت سا چیخی اور نوکروں کو اکٹھا کر کے اسے بری طرح سے پٹواتی۔

وہ آخری حد تک بھی جا سکتی تھی۔ وہ اس کا گلا بھی دبا سکتی تھی۔ اس کی تنہائی اور راج دھانی میں مخل ہونے کا گناہ کوئی معمولی تھوڑی تھا۔

اور جب بیہ نے آبنوسی دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل گھمایا تو کمرے کو مقفل نہیں پایا۔ یعنی دیا اپنا کمرہ مقفل نہیں رکھتی تھی۔ اسے اپنے نوکروں پہ اندھا اعتماد تھا یا نہیں.... اسے اتنا یقین ضرور تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کے کمرے میں کوئی مائی کالال داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

بیہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور خوف سے دھک دھک کرتے دل کو تھپکتے ہوئے آبنوسی دروازے کو پیر کی ٹھوکر سے کھول دیا۔ اس حال میں کہ بیہ باہر کھڑی تھی۔ اور دروازہ اس کی ٹھوکر پہ کھلتا جا رہا تھا۔ یوں کہ پورے کا پورا "دیوی کا مندر" اس کے سامنے کھلا پڑا تھا.... بیہ کی آنکھیں اندر دیکھتی جیسے لمحہ بھر کے لیے پتھرا گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

یہ بادلوں سے ڈھکا ایک رستہ تھا۔ اور خوب صورت سی ایک پگڈنڈی تھی۔ جس کے آخری سرے پہ ایک جیسے فراک پہنے دو چھوٹی بچیاں کھڑی تھیں۔ ان کے بالوں میں ایک جیسے ربن تھے۔ اور پونیوں کا اسٹائل بھی ایک سا تھا۔ وہ دونوں بچیاں آنسو بھری آنکھوں سے اس پگڈنڈی پہ چلتی اس حسین مورت کو دیکھ رہی تھیں۔ کہ آنکھیں نہیں بھرتی تھیں۔

وہ کسی ملکہ کی طرح چل رہی تھی۔ اپنی راج ہنس سی گردن کو اٹھا کر۔ نخوت اور غرور سے دیکھتی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں لباس کے ہم رنگ ٹوکری تھی۔ جس کے اندر تازہ پھول تھے۔ بھینی بھینی مہک والے۔

جب وہ ان کے قریب سے گزری تو ان بچیوں نے ایک بھیانک چیخ ماری اور منہ پہ ہاتھ رکھتی خوف کے عالم میں کانپتی الٹے قدموں دور ہوتی چلی گئیں۔

پگڈنڈی پہ چلتی اس ملکہ نے حیرت سے اس منظر کو دیکھا تھا اور پھر اچانک ہی اس کی نگاہ اپنے ہاتھ میں موجود ٹوکری پہ پڑی تھی اور بالکل ان دو بچیوں کی طرح وہ بھی ٹوکری کو دیکھ کر چیخ اٹھی تھی۔

بچیاں بھاگتی ہوئی اس سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر اس نے محسوس کیا۔ کوئی چیز اس کے ہاتھوں پہ رینگ رہی تھی۔ اس نے خوف کے عالم میں آنکھیں کھولیں۔ تازہ توڑے ہوئے پھولوں کی جگہ ایک سنہرے تاج والا سانپ ٹوکری میں بیٹھا تھا۔ اور پھن پھیلائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور کبھی اپنا ڈنک نکالتا اور اس کے دودھیا ہاتھ پہ زبان پھیرتا۔

اس نے بڑی کوشش کی تھی کہ ٹوکری کو اپنے ہاتھ سے گرا دے لیکن ٹوکری جیسے کسی سخت چیز کے ساتھ اس کے ہاتھ سے چپک گئی تھی۔

اور سانپ پھن نکالتا اسے ڈنک مارنے کے لیے تیار تھا۔

وہ ایک چیخ کے ساتھ سنہرے تخت پوش سے اٹھ گئی۔ اس کا جسم پسینہ پسینہ تھا۔ اس کی رنگت زرد تھی اور خوف اسے تھرتھرانے پہ مجبور کر رہا تھا۔

اسے نماز پڑھتے ہوئے اونگھ آ گئی تھی۔ وہ اپنے نماز والے تخت پہ ہی لمحہ بھر کے لیے لیٹ گئی۔ غنودگی میں اسے کتنا بھیانک خواب آیا تھا۔ جس نے اسے سرتاپا لرزا دیا تھا۔

کیا کسی کو نماز والی جگہ پہ بھی ایسے خواب ڈراتے ہیں؟

کیا کوئی ایسی جگہ ایسا کوئی مقام تھا جہاں لیٹ کر وہ سکون کی ذرا سی اونگھ لیتی اور اسے سانپوں والے خواب نہ ڈراتے؟

وہ رونے لگی 'اونچی آواز میں.... وہ کئی سالوں سے رو رہی تھی۔ لیکن کوئی اس کی مدد کو نہ آتا تھا۔ کوئی اس کا خوف دور نہیں کرتا تھا۔ کوئی اسے ڈھارس دینے نہ آتا تھا۔

اس کے اردگرد جانے کیا کیا تھا؟ ہجوم، لوگ اور عجیب سی مخلوق۔ بہت سی عورتیں، بہت سے مرد۔ یہ کون لوگ تھے؟ وہ انہیں نہیں جانتی تھی۔ اسی لیے خوف کے عالم میں پوچھنے لگی۔

"تم لوگ کون ہو؟ اور کیوں آئے ہو؟ میری عبادت گاہ میں؟" اس نے اونچی آواز میں چلا کر کہا تھا۔ جواباً" وہ ہنسنے لگے اور اپنا تعارف کروانے لگے۔

"ہم وہ "عمل" ہیں۔ جو تم کالی راتوں میں دھاگوں میں پھونکیں مار مار کے کرتی تھیں۔ کیا بھول گئیں؟ ہم تو وہی لوگ ہیں۔ جو تمہاری مدد کرتے تھے۔ سفلی کرامات کی بدولت۔ تم نے ہمیں اپنا تابع کر رکھا تھا۔"

ان میں سے ایک کریہہ چہرے والی عورت پھنکار کر بولی تھی۔ دیا نے نفی میں سر ہلایا اور دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔

"خدا کا واسطہ ہے چلے جاؤ۔ میں تم لوگوں کو نہیں جانتی۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ان کی منت کی۔

"لیکن ہم تو تمہیں جانتے ہیں۔ اور ہم تو تمہارے حصار میں ہیں۔ ان گرہوں کی بدولت جنہیں تم دھاگوں میں لگواتی تھیں اور وہ نجس عمل جو ہمارے ہاتھوں انجام کو پہنچتے تھے۔" اب کے ایک گندی صورت والا مرد گرج کر بولا تھا۔ اسے برا لگ رہا تھا کہ دیا انہیں جاننے سے انکار کر رہی تھی۔ کیا یہ ان کی توہین نہیں تھی۔ وہ سارے ایک ساتھ غصہ کرنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک آدمی بہت سا کچرا، بہت سے دھاگے، کھوپڑیاں، سوئیاں اور کیل اس کے منہ پر مار رہا تھا۔

"کیا انہیں بھی نہیں جانتیں؟ یہ فلاں فلاں قبرستان سے نکال کر لائے ہیں۔ اسی قبرستان سے جہاں اب تیری قبر بنے گی۔" ایک عورت نے اس کے منہ پر کچا گوشت دے مارا تھا۔ اس گوشت کی بساند سے دیا کا جی الٹ گیا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ابکائیاں لینے لگی۔

"تم لوگ چلے جاؤ۔ تمہیں خدا کا واسطہ.... میں تمہیں نہیں جانتی۔" وہ بری طرح سے گڑگڑا رہی تھی۔ اور ان کے پیروں پہ ہاتھ رکھ رہی تھی۔ اور ان کے جسم جو کانٹوں سے بھرے تھے۔ انہیں چھو چھو کر منت کر رہی تھی۔ وہ نوکیلے کانٹے اس کے نرم ہاتھ زخمی کر رہے تھے۔

"کیوں نہیں جانتیں تم۔ کرو اقرار، تم ہمیں جانتی ہو۔ ہم ہیں ناپاک جن اور ناپاک جنیاں.... جن سے شیطانی عملیات کروائے جاتے ہیں.... اور ہم نے تمہاری مدد کی۔ اور تمہارے سفلی عمل کامیاب کیے۔ کرو اقرار....."

وہ ایک بدوضع عورت تھی.... ادھیڑ عمر، کانٹوں سے بھرے جسم والی۔ خوفناک صورت والی۔ اس نے دیا کی گردن دبوچ لی تھی۔ اور دیا کا "دم" گھٹ گھٹ کر نکل رہا تھا۔ وہ اس کی گردن دبوچے کھڑی تھی۔

"میں نہیں جانتی.... تم بہکاوا تھے، شیطانی جال تھے، میرے نفس کا وبال تھے۔ میں تمہیں نہیں جانتی۔ تم لوگ دفع ہو جاؤ۔" وہ اپنی گردن کو اس دیوہیکل عورت کے شکنجے سے آزاد کرواتی چیخ رہی تھی۔

"تم نجس مخلوق ہو۔ کہاں سے چلے آئے؟ میری عبادت کا حصار توڑ کر۔ میری عبادت گاہ کو ناپاک کرنے۔ میری برسوں کی ریاضت کو فنا کرنے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"کون سی عبادت؟ تم نے ساری عمر شیطان کی پوجا کی ہے۔" اب کہ وہ عورت نہیں چلائی تھی۔ کوئی اور ہی چلایا تھا۔ وہ کون تھا؟ عبداللہ؟ ہاں وہ عبداللہ تھا۔

"میرا اللہ مجھے تم سے آزادی دلوائے گا۔ اللہ میری مدد کرے گا۔ میں نے اتنے سال اس کے سامنے اپنی گردن جھکائے رکھی۔" وہ کھانستے ہوئے پوری قوت سے چلائی تھی۔ وہ نورانی چہرے والا عبداللہ ہنسنے لگا۔

"اللہ؟ اللہ تم جیسوں کی مدد نہیں کرتا۔ جو پوری عمر اس کے نائب کو پوجتے ہیں۔ کس اللہ کی بات کرتی ہو۔ جو نہ تمہارا مجاز تھا نہ تمہارا حقیقی خدا؟

"تم نے تو پوری زندگی اس کے بنائے بندے کو پوجا۔ اسی کی عبادت کی.... اس کی محبت کو سجدہ کیا۔ حتیٰ کہ اسے فنا آگئی۔ وہ مٹی ہو گیا۔ وہ زمین کے اندر دھنس گیا۔ لیکن تیرا عشق "مٹی کی اس ڈھیری" کے گرد عمر بھر چکرا تا رہا۔

بتا مجھے.... وہ تیرا خدا تھا یا مجازی خدا! جس کے عشق نے تجھے جہاں بھلا دیا۔

تیرا حسب' نسب' ذمہ داری' تیری وفا تیری بقا' سب کچھ فنا کر دیا۔

وہ کون تھا تیرا جسے "دیوتا" بنا کر عمر بھر پوجتی رہی۔ نہ خدا نہ مجازی خدا.... کس رشتے کے تحت ایک نامحرم سے دل کے تار باندھے تھے جو آج بھی بندھے ہیں۔

وہ کوئی نورانی چہرہ تھا جو تیزابی چھینٹے اس کے منہ پہ مار رہا تھا۔ پھر منہ موڑ کر ان "نجسوں" کے درمیان اسے اکیلا چھوڑ کے چلا گیا۔ وہ ان طمانچوں کے درد سے بے حال ہو رہی تھی۔ وہ اس کی مدد کو نہیں آیا تھا۔ وہ تو اسے آئینہ دکھانے آیا تھا۔

پھر کوئی اٹھا اور چاروں دیواروں سے بڑے بڑے پورٹریٹ اتار کر ڈھیر کرتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ صورت 'وہ مورت'.... جو دل پر نقش تھی.... اور جو دیواروں پہ نصب تھی۔ جان کے زندانوں میں.... اندر بھی باہر بھی۔

"تم نے اس تصویر کو پوجا.... اس کے عشق نے تجھے "بے دین" کیا۔ اس کے ہجر نے تجھے برباد کیا۔ آخر تجھے بھی فنا آگئی۔ تو بتا مجھے فنا اچھی تھی یا بقا؟ حاصل اچھا تھا یا حصول اچھا تھا؟ جسے پایا تھا وہ بہتر تھا یا جسے کھو دیا تھا وہ بہتر؟ وہ خواب اچھا تھا یا آگے ملنے والا عذاب' بتا مجھے محبت بننا اچھا تھا یا محبوب کے فراق میں جل جل کے مرنا اچھا تھا...." کوئی اسے کوڑے مار رہا تھا۔ وہ گلے پہ ہاتھ رکھے دہری ہو رہی تھی۔ پھر بلند آواز میں سورۃ جن کی آیتیں پڑھنے لگی۔ اور سورۃ فلق اور سورۃ یٰسین۔ آخر کون سی سورۃ پڑھے جو اسے ان بلاؤں سے نجات ملے۔ اور حلق میں اٹکتی جان کو رہائی کا پروانہ ملے۔

کیا جان کنی ایسی ہوتی ہے؟ کیا وقت نزع ایسا ہوتا ہے؟ کیا جان کو "جان آفرین" کے سپرد کرنا اتنا عذاب ناک ہوتا ہے؟

"میں نے کب اسے چاہا۔ میں نے تو اس سے نفرت کی۔ میری نفرت نے تو اسے برباد کیا تھا۔ میں نے کب اس کی محبت میں اپنے لیے عذاب خریدے...."

وہ کس کو وضاحت دے رہی تھی۔ آخر کسے؟ اس کا وجود بھاری ہو رہا تھا اور آنکھوں میں لوہے کی سلاخیں گھپ رہی تھیں۔ ایسا درد کہ جس کی کوئی انتہا نہیں تھی۔

"محب بننا اچھا تھا یا محبوب بن کر راج کرنا اچھا تھا؟"

کوئی اس کے حلق پہ چھری پھیر رہا تھا۔

"کچھ بھی اچھا نہیں تھا۔ سوائے اس کے جو اللہ نے منتخب کیا۔ سب دھوکا تھا۔ سراب تھا۔" وہ دونوں ہاتھوں میں گردن دبوچے تخت کے اوپر دہری ہو گئی تھی۔ پھر اس نے اونچی آواز میں چیخ چیخ کر کہا۔

"جب زندگی کو ٹکا لگا ہو اور موت کی طرف بہاؤ چل رہا ہو۔ جب سانس سینے کی قید میں سر پٹختی ہو اور روح لمبی اڑان بھرنے کے لیے تیار ہو تو اے میرے اعمال! مجھ سے دور ہو جاؤ۔ مجھ سے دور ہو جاؤ۔" اس کی سانسیں تیز ہو گئی تھیں۔

"خداوند عالم ناپسند کرتا ہے۔ چڑھی ہوئی آنکھوں کو (غرور بھری) جھوٹی زبان کو (میرے جھوٹ مجھے ہلاک کر رہے ہیں) وہ ہاتھ جو بے گناہ کو آزار پہنچائیں۔ (افسوس' میں نے کیا کیا) وہ دل جو بڑے منصوبے باندھتا ہے۔ (ہائے میرا دل) وہ پاؤں جو جلد برائی کی طرف دوڑتے ہیں۔ وہ گواہ جو جھوٹ بولتا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ اس کے اندر کا ناصح تھا یا ضمیر۔ جو بھی تھا۔ آج کے دن ہی سچ بولنے پہ بضد تھا۔

اور کسی نے سچ کہا تھا۔

"مرنے سے پہلے ہماری آنکھوں کے سامنے اعمال

نامے کھول کر دکھائے جائیں گے۔"

اور اس کے حصے کا صحیفہ کھل گیا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے پوری زندگی کی فلم چل رہی تھی۔

وہ ہریالی جسے قحط کی چاٹ لگ گئی تھی۔ وہ کھیتی جو پانی نہ ملنے کی وجہ سے سوکھ گئی تھی۔ اور وہ شبستان جسے دیمک کھا گئی تھی۔ اس کے دل کی زمین اتنی ہی بنجر اتنی ہی ویران تھی۔ گھن اور گھن لگی ہوئی۔

اس نے گردن کو دونوں ہاتھوں سے دبوچے دبوچے ہی کلمہ پڑھا۔ اٹک اٹک کر' سوچ سوچ کر اور پھر ابلتی آنکھوں میں آخری ہراس اترا۔ لال انگارہ آنکھیں پھٹ کے چھت سے جا لگیں۔ اب وہ شاید اگلے جہانوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور روح قفس عنصری سے پرواز کر رہی تھی۔

آج ایک ملکہ کا انتقال ہوا تھا۔ ایسی ملکہ جس کے جنازے پہ چار لوگ بھی نہیں تھے۔

آج ایک ساحرہ کا وصال ہوا تھا۔ ایک جادوگرنی' جس کا جادو سر چڑھ کے بولتا تھا۔

وہ ایک حقیقی جادوگرنی تھی۔ گرہوں میں پھونک مارتی اور دلوں کو موڑ لیتی۔ اس نے کئی دلوں کو اپنے دھاگوں سے باندھ رکھا تھا۔

اور وہ "دیا" تھی۔ اسم بامسمیٰ۔ جس کا دل عمر بھر کے لیے "دیے" کی مانند جلتا رہا۔

"اور میں "دیا" ہوں.... مثل چراغ۔ جو جلتا بھی ہے اور جلاتا بھی ہے۔ جلا کے راکھ بھی کر دیتا ہے۔ فنا بھی کر دیتا ہے.... جلوں تو روشنی ہی دوں.... جلاؤں تو آگ آگ کر دوں۔ ہنستے بستے کئی گھروں کو راکھ کر دوں.... کیونکہ میں دیا ہوں۔ آگ کا دیا جلوں تو سراپا روشنی' جلاؤں تو سراپا آگ۔"

☼ ☼ ☼

بیہ کو لگا۔ جیسے کھڑے کھڑے آج وہ بھی گزر جائے گی۔ فرشتہ اجل کو اس گھر میں صرف ایک ہی دفعہ آنا پڑے گا۔ آبنوسی دروازے کے ساتھ لگی بیہ کانپ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھیں دیا کو دیکھ رہی تھیں۔ جو جانے کس سے جھگڑ رہی تھی۔

"تم نجس ہو.... یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں نہیں جانتی۔"

وہ کس سے لڑ رہی تھی۔ کس سے جھگڑا کر رہی تھی۔ کس کی منتیں کر رہی تھی؟ بیہ کو اس کے آس پاس کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ دیا کو کٹہرے میں کھڑا کرنے آئی تھی اور اسے اطلاع دینے آئی تھی۔

"عنایہ مر گئی ہے.... ایک اور قیدی تمہاری قید سے آزاد ہو گیا ہے۔ تم جشن منالو۔ عنایہ کے وجود کی سلطنت پہ حکومت کرنے والی۔ اب کس پہ حکم چلاؤ گی؟ اب کسے اذیت دو گی؟ اب کسے مارو گی؟ کسے رلاؤ گی؟ کس کے آنسوؤں کو بہتا دیکھ کر جشن مناؤ گی؟"

لیکن وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ بس لبوں پر ہاتھ رکھے اپنی چیخیں روکتی بمشکل کھڑی رہی۔

اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیا کا کمرہ دیکھا تھا۔ اس کا عبادت خانہ۔ جس کی آڑ میں اتنے سال وہ بہت سارے لوگوں کی سوالیہ نظروں سے بچی رہی تھی۔ جس کی آڑ میں اس نے حقوق و فرائض سے نگاہ چرائی ہوئی تھی۔

تو یہ تھا دیا کا عبادت خانہ.... وہ آگے بڑھی۔ دیا تخت کے اوپر تھی۔ آگے رحل رکھی تھی۔ جس میں قرآن تھا۔ کامیابی کا نسخہ.... اور دیا کا سر رحل پہ ٹکا ہوا تھا۔ وہ شاید آخری گنی چنی سانسیں لے رہی تھی اور اس کے ٹوٹے بے ربط الفاظ؟ بیہ چونک گئی تھی۔

"اے میرے اعمال! مجھ سے دور ہو جاؤ...."

دیا کے الفاظ نے بیہ کے چہرے پہ سیاہی پھیر دی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ وہ تھوڑا اور آگے آئی تھی۔ اس نے احتیاط کے ساتھ سب سے پہلے رحل اور قرآن اٹھا کر الماری میں رکھا تھا۔ پھر دیا کے بے جان ہوتے جسم کو سیدھا کیا۔ اس کی سحر طراز آنکھیں کھلی تھیں۔ بیہ کا دل پھٹ گیا تھا۔ وہ عنایہ کو رو کر آ رہی تھی۔ لیکن دیا کے نام کا ایک آنسو بھی اس

کے پاس نہیں تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے دیا کے مرجانے کے ساتھ ہی سکون، قلب وجان میں سرائیت کر رہا ہے۔

اسے گمان ہوا شاید وہ زندہ ہو اور کوئی نیا ڈراما کر رہی ہو۔ اسی لیے وہ بار بار اس کا جسم چھوتی تھی اور اس کی آنکھیں۔ اور اس کی دھڑکن.... ہر چیز ساکت تھی۔

سکون کی ایک لمبی لہر نے بیہ کو مطمئن کر دیا تھا۔

اب وہ اس کی آنکھیں بند کر رہی تھی۔ پھر اس کے جسم پہ لپٹے قیمتی لبادے کو دیکھنے لگی۔ اس کا لباس بیش قیمت تھا۔ اور اس کے ہاتھوں کا زیور۔ ایک سجی سجائی مورت.... بیہ اسے یک ٹک دیکھنے لگی۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو چلا اٹھتی۔

”کیوں پتھر پھاڑ نظر سے دیکھ رہی ہو۔ نظر لگاؤ گی کیا؟“

لیکن اب اس پہ چلانے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ اسے روکنے والا تھا۔ وہ فرصت سے دیکھ سکتی تھی۔

ایک ایک ترشے ہوئے نقش کو۔ جو قدرت کی صناعی کا منہ بولتا ثبوت تھے بنایا تو اسے اللہ نے تھا۔ پھر ایسا غرور کیوں؟ جیسے اپنی مرضی سے بن کر آئی ہو۔

پھر وہ اس کی عبادت گاہ کو دیکھنے لگی۔ پورا کمرہ قیمتی نوادرات اور فرنیچر سے سجا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا تخت بھی۔

جس پہ وہ نماز ادا کرتی تھی اور قیمتی تسبیحات جن کے دانے قیمتی پتھروں سے تراش کے بنائے ہوئے تھے اور اس کی جائے نماز مخمل کی تھی۔ جس کے اوپر قطب نما لگا ہوا تھا۔ گھڑی کے سائز جتنا۔

اور رحل کرسٹل کی تھی۔ جس کے دونوں اطراف خانہ کعبہ کی تصویر تھی۔ اور ایک میز پہ وظائف کی کتابیں، روحانی کتابیں۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا۔ وہ اس کمرے میں کئی کئی دن روپوش رہ کر عبادت ہی کرتی تھی۔ لیکن یہ سب؟ جب وہ اٹھی تو تصویروں کا ایک ڈھیر اس کے قدموں سے ٹکرا گیا تھا۔ جو زمین پہ پڑی تھیں۔ اور شکستہ حالت میں تھیں۔ ان کے ٹوٹے کانچ پورے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ وہ تصویریں تھیں جو عالم جنون میں دیا نے خود دیواروں سے اتار کر زمین پہ پھینکی تھیں۔

وہ ایک ایک تصویر کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے طوفان اٹھ رہے تھے۔

ایک ہی بندے کی اتنی تصویریں؟۔ مختلف پوز میں۔ مختلف اوقات میں۔ بہت بچپن کی.... اسکول کی، کالج کی.... پھر یونی ورسٹی.... اتنی تصویریں.... ڈھیر کے ڈھیر۔

بیہ ایک ایک تصویر اٹھا رہی تھی اور اس کا دل بند ہو رہا تھا۔

اس نے پھٹی ہوئی تصویروں کے اس ڈھیر کو ایک گٹھڑی میں باندھ دیا۔ صبح تک اگر کوئی دیکھ لیتا تو؟ اس سوچ نے ہی اسے پسینہ پسینہ کر دیا تھا۔

تب ہی اس کی نگاہ کچھ ڈائریوں پہ پڑی۔ یہ بھی شکستہ حالت میں تھیں۔ شاید دیا انہیں بھی پھاڑنا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے نہیں پھاڑا تھا۔ شاید اپنے ترکے ”میں“ چھوڑ دیا تھا اور اسی ڈائری کے ساتھ ایک رقعہ تھا۔ بیہ کا دل کانپ سا گیا۔ یہ رقعہ کیوں تھا؟ اور اس پہ کیا لکھا تھا؟ بیہ نے بے تابی کے ساتھ کھول کر دیکھا۔ مختصر سے الفاظ تھے۔ اور جانے مخاطب کون تھی؟ عنایہ یا بیہ؟

”ان کو پڑھ لینا.... تمہارا تجسس دور ہو جائے گا۔“

”کس کا تجسس دور ہو جائے گا۔“ وہ سمجھ نہ سکی؟

کیونکہ عنایہ یا بیہ کو اس کی زندگی کے بارے میں کوئی تجسس تھا ہی نہیں.... وہ اس کے معاملے میں قطعی طور پر بے حس ہو چکی تھیں.... لیکن یہ تجسس پھر کس کو تھا؟ آخر کس کو؟

اور اسی پل ایک خیال کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا تھا۔

”فاتح کو....“

اور اس خیال پہ جیسے مہر لگ گئی تھی۔ فاتح کے علاوہ اور کسے تجسس ہو سکتا تھا؟ وہی تو تھا۔ ان کے ماضی کا کھوجی.... سوال نہیں کرتا تھا۔ لیکن کھوج میں ضرور تھا۔ تو یہ ڈائریاں پھر فاتح کی امانت تھیں۔ بیہ انہیں فاتح تک ضرور پہنچائے گی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر

تصویروں کی اس گٹھڑی کو بیڈ کے نیچے چھپا کر تھکے تھکے قدم اٹھاتی دیا کے "عبادت کدے" سے باہر آگئی تھی۔ پھر لحظہ بھر کو رکی تھی اور اک نگاہ خالی دیواروں کو دیکھنے لگی۔ کیا اسے عبادت گاہ کہنا مناسب تھا؟ یہ تو دیا کا "صنم کدہ" تھا۔ پھر اسے عبادت گاہ کیوں کہا جاتا۔ وہ تصویروں کے ڈھیر کو سوچتی بھاری قدموں کے ساتھ بیسمنٹ کی سیڑھیاں چڑھتی نوکروں کو اکٹھا کر رہی تھی۔

ان تصویروں نے اسے سر تاپا لرزا کر رکھ دیا تھا۔

کیونکہ وہ تصویریں کاشف بھائی کی نہیں بلکہ افراہیم بھائی کی تھیں اور دیا کے پاس آخر کیوں تھیں؟ یہ کتنا بڑا سوالیہ نشان تھا۔

اور اب اسے کیا کرنا تھا؟ وہی جو اپنے قرابت داروں کی ناگہانی موت پہ کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے انتہائی مختصر رشتہ داروں کو اطلاع دی تھی۔ عنایہ کے پپا کا ایک تایا زاد بھائی.... واصف تایا اور ان کا بیٹا ارسل عنایہ کے دادا اور عزہ۔

اس نے نمبر چیک کیے اور باری باری سب قریبی عزیزوں کے سروں پہ بم گراتی گئی۔ سارے کم و بیش ایک ہی سوال کر رہے تھے۔

"کیا ایکسیڈنٹ ہوا ہے؟ دونوں کیسے ایک ساتھ؟ ہوا کیا ہے؟ دیا اور عنایہ ایک ساتھ چلی گئیں؟" کسی کو یقین ہی نہیں آرہا تھا اور عنایہ کے دادا؟ وہ تو ڈھے گئے تھے کیونکہ دیا اور عنایہ کی ناگہانی موت ایک معمہ بن گئی تھی۔

"دیا کو تو مرنا ہی تھا۔ عنایہ کیوں چلی گئی؟" وہ لاکھ عنایہ سے ناراض تھے۔ لیکن اس کی اچانک موت نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔

"میں نے اسے گھر سے نکالا تھا... زندگی سے تھوڑی نکالا تھا۔ وہ میرا گھر چھوڑ کر گئی تھی۔ مجھے یہ نہیں خبر تھی، دنیا ہی چھوڑ جائے گی۔"

وہ بوڑھا شخص لاٹھی ٹیکتا شکستہ قدموں سے سر جھکائے اپنے بیٹے کے "خالی محل" میں آیا تھا۔ اپنی بہو اور پوتی کا آخری دیدار کرنے۔ جبکہ عنایہ کی دادی نے تو اتنی سی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

"میری بدقسمتی عنایہ کو دادی کا آخری پیار دے دینا۔ میرے اندر نہ اتنا حوصلہ ہے نہ اتنا بڑا ظرف۔ میں نے دیا کی صورت نہ دیکھنے کی قسم کھائی ہے۔ مجھے قسم توڑ کر کفارہ ادا نہیں کرنا۔"

ان کا دل آج بھی ایک بند قلعے کی مانند تھا۔ ایسا قلعہ جس کے دروازوں پہ تالے چڑھے تھے۔ جن کی چابیاں زنگ آلود تھیں اور کھو گئی تھیں۔ پھر یہ تالے کہاں سے کھلتے۔

اور بیہ اس وقت پوش علاقے کی اس کالونی کے اکا دکا لوگوں کو آتا اور جاتا دیکھ رہی تھی۔ فون ابھی تک اس کی گود میں تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔ کوئی ایسا شخص رہ تو نہیں گیا تھا جسے اطلاع نہ پہنچی ہو۔ اور اس سوچ کے ساتھ ہی اس کے دماغ کی بند کھڑکیوں کو کسی انہونی دستک نے چونکا دیا۔ اس نے بوسیدہ اوراق والی ڈائری اٹھائی اور دو نمبروں پہ نگاہ جمادی تھی۔

وہ پہلے کال کسے کرے؟ رافع کو یا فاتح کو؟

اور پھر خود بخود اس کی لرزتی انگلیوں نے ایک نمبر ڈائل کر لیا۔ وہ چونکی تو تب تھی جب کسی کی ٹھنڈی ٹھار برف سی آواز نے اس کے حواسوں کو ایک جگہ پہ یکجا کر دیا تھا۔ بیہ کو خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے ری ڈائل پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اسی انتظار میں تھی کہ کوئی بھی فون اٹھائے اور وہ بس اطلاع دے کر فون کو بند کر دے۔ لیکن جب پورے ایک سال چھ مہینے دو ہفتے بعد اس کی آواز سنی تو اول روز کی طرح ہی بیہ منجمد اور بے خود ہو گئی تھی۔

وہ آواز.... ہواؤں کے دوش پہ لہراتی وہ آواز جو سات سمندر پار سے آرہی تھی۔ ایسی ہی مقناطیسی قوت رکھتی تھی جو بیہ کو منجمد کر دیتی تھی۔ تو ایک بات طے تھی۔ وہ آج بھی اسی بام پہ کھڑی تھی جہاں پہ اس کے رستے بیہ کے رستوں سے جدا ہو گئے تھے۔

قریب تھا کہ وہ اگلے ہی منٹ بعد فون کرنے والے کو دو چار گالیوں سے نواز کر فون بند کر دیتا، اچانک بیہ نے دھیمی اور پرنم آواز میں صرف تصدیق کے لیے

نہیں تمہید کی غرض سے سوال کیا تھا۔ تصدیق تو اس کے دل نے کر ہی دی تھی۔

"فاتح! فاتح سے بات کرنی ہے۔"

"جی' فرمائیے بول رہا ہوں۔" اس کا لہجہ خشک اور بے جان تھا۔ کسی بھی جذبے سے خالی۔

"میں بیہ ہوں۔" یہ تعارف ضروری تو نہیں تھا۔ پھر بھی جانے کیوں؟ اور وہ جواب میں کیا کہے گا "میں جانتا ہوں۔ آگے فرمائیے۔" لیکن ایسا نہیں ہوا وہ کچھ بھی نہیں بولا ایک لفظ تک نہیں۔ وہ شاید اس کے مزید بولنے کے انتظار میں تھا۔

"مجھے ایک اطلاع دینی تھی۔" اس نے اپنی کپکپاتی پرنم آواز پہ قابو پا کر کہا۔

"سن رہا ہوں۔" وہی کٹھور اور سرد لہجہ۔

"دیا کا آج رات دماغ کی نس پھٹ جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا ہے۔" اس نے آنکھیں موند کر کہہ ہی دیا۔ دوسری طرف وہی سنجیدگی اور خاموشی تھی۔

"اور کہ بس....؟" وہ جیسے گھڑی پہ نگاہ جما کر کھڑا تھا۔ اور سوال کر رہا تھا۔ بیہ کو دھچکا لگا۔ کیا وہ اتنا ہی "بے رحم" کٹھور اور سنگ دل ہو چکا تھا؟ اس کی خاموشی پہ سات سمندر پار سے آواز آئی تھی۔

"جتنا کسی کے ساتھ قلبی لگاؤ ہوتا ہے۔ دل کو تکلیف بھی اتنی ہی ہوتی ہے۔" دوسری طرف جیسے وہ اس کی سوچوں میں گھس آیا تھا۔ بیہ کو جھٹکا لگا۔

"فاتح....!" اس کی بے حسی نے بیہ کی آنکھوں میں برف بھر دی تھی۔ وہ اس طرز تخاطب اور (پکار) پہ بھی قطعی چونکا نہیں تھا۔ اس نے بیہ کے درد میں ڈوبتے لہجے کی اذیت کو بھی محسوس نہیں کیا تھا۔

"فاتح! وہ مر گئی ہے۔ تمہاری عنایہ۔" بیہ کا دل صدمے کی شدت سے بند ہو رہا تھا۔ وہ عنایہ کی موت نہیں' فاتح کے دل پہ گزرنے والی قیامت پہ رو رہی تھی۔ فاتح نے اس خبر کو سن کر اپنے دل پہ کیسے سہا ہو گا؟

لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ بلکہ فاتح کے الفاظ نے اسے سر تا پا ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"تم مجھے یہ اطلاع کیوں دے رہی ہو؟ تم نے غلط نمبر ڈائل کیا ہے۔ تمہیں یہ اطلاع رافع کو دینی چاہیے تھی۔"

دوسری طرف وہ اسی رکھائی سے کہہ رہا تھا۔ بیہ کو بڑی زور کا دھکا لگا تھا۔

"کیا عنایہ کے ساتھ صرف ایک ہی رشتہ تھا۔ ایک رشتہ ٹوٹ گیا تو کیا باقی سارے رشتے بھی ٹوٹ گئے؟" وہ یہ سوال نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن صدمہ اتنی شدت کا تھا کہ وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"ہاں' سب رشتے ٹوٹ گئے۔" اس کا لہجہ بلا کا برفیلا تھا۔ اب آگے سننے کے لیے کیا بچا تھا۔ لیکن بیہ کیسے سمجھ پاتی' وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ جو عنایہ کی محبت سے لبالب بھرا تھا۔

"تم اس کے شوہر ہو فاتح!" اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

"میں اس عہدے سے معزول ہو چکا ہوں۔" وہ زہریلے لہجے میں جتا رہا تھا۔

"عنایہ مر گئی ہے فاتح!" بیہ چلائی تھی۔

"وہ میرے لیے ایک سال چھ مہینے دو ہفتے پہلے ہی مر گئی تھی۔ جب میں پاکستان سے آیا تھا تو اسے وہاں دفن کر کے ہی آیا تھا۔" اس نے رکھائی سے کہا اور فون بند کر دیا تھا۔

وہ فون کی بے جان ہوتی ٹوں ٹوں کو سنتی ساکت کھڑی ہال میں آتے جاتے' دھیما دھیما بولتے چند ایک لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں ایک عزہ بھی تھی۔ جو پو پھٹنے سے پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔ عنایہ کے واصف تایا' ان کا بیٹا ارسل اور دادا۔ دو میتوں کے پاس چار پانچ لوگ تو اکٹھے ہو گئے تھے۔

عزہ نے اسے ایک کونے میں گم صم بیٹھا دیکھا تو قریب آ گئی تھی۔ بیہ نے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ پھر اپنا آپ ڈھیلا چھوڑتی افسردگی سے بولی۔

"بیہ! بڑا افسوس ہوا ہے۔ یوں اچانک؟ عنایہ کا تو یقین نہیں آ رہا۔ نانا نے ازمیر کو بھی بلایا ہے۔ وہ اپنا

شک دور کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں ایک ساتھ کیسے؟ ایک ہی ساعت میں ایک ہی وقت اور گھڑی میں؟ کہیں کسی نے ان کو قتل۔" وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی تھی۔ شاید جھجک کر یا اس کی آواز بھرا آگئی تھی۔

بیہ نے اپنے اڑے اڑے حواس یکجا کرنا چاہے تھے۔ اس کا ذہن کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔

"کوئی تو مسئلہ ہوا ہے نا؟ کوئی حادثہ؟ ورنہ اس طرح کیسے؟ یقین نہیں آتا۔" عزہ نم ہوتی آنکھوں کو پونچھ رہی تھی۔

بیہ سے جواب میں کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا۔ دبی دبی کئی آوازیں تو وہ سن ہی رہی تھی۔ "کالونی میں الگ تھلگ یہی ایک بنگلہ ہے۔ آس پڑوس میں کوئی گھر بھی نہیں۔ اور یہ بھی تین عورتیں اکیلی' کوئی چور' ڈاکو' ڈکیتی کی غرض سے نہ آیا ہو؟ زیور' پیسہ' نقدی' خزانے کیا کم تھے یہاں۔" بہت سی دبی دبی آوازیں تھیں۔ شک بھری' قیاس اڑاتی۔ چہ میگوئیاں کرتی۔ اور بیہ سے تردید میں دو انچ کی زبان بھی نہیں ہل رہی تھی۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ کوئی ڈاکو' چور' اچکا نہیں آیا۔ لٹیرے ایک ہی دفعہ آتے ہیں اور سب کچھ لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ ایک سال چھ مہینے دو ہفتے پہلے ایک لیٹرا آیا تھا۔ اور سب کچھ لوٹ کر لے گیا۔ اب دینے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ تو لٹ چکا تھا۔" وہ ان لوگوں کو کیا بتاتی؟ اور کیسے سمجھاتی؟

"سنو بیہ!" اچانک عزہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ چونک کر بے دھیانی میں اسے دیکھنے لگی تھی۔ عزہ کو واضح طور پر محسوس ہوا تھا کہ اس کی ذہنی حالت اچھی نہیں ہے۔

"تم نے رافع کو اطلاع دی؟" عزہ کیا پوچھ رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور اس نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"ہاں' دی تو ہے۔"

"کیا کہا اس نے؟" وہ چاہ کر بھی اپنے لہجے کو سخت نہیں کرسکی تھی۔ وہ نانا جیسی نفرت اور جگرا کہاں سے لاتی؟

"پتا نہیں۔" عزہ اس کے جواب پہ حیران رہ گئی تھی۔

"وہ آئے گا؟" اس نے دوبارہ پوچھا تھا۔ "اپنی بیوی کے جنازے کو کندھا دینے آئے گا؟"

"میں نے رافع کو اطلاع نہیں دی تو وہ آئے گا کیسے؟"

کچھ دیر بعد بیہ نے بہت سوچ سوچ کر اٹکتے ہوئے کہا جسے سن کر عزہ کو پھر سے شاک لگا تھا۔

"ابھی تو تم نے کہا ہے کہ تم نے عنایہ کے مرنے کی رافع کو اطلاع دی ہے۔" عزہ بہت دیر بعد اسی کے کہے گئے لفظوں کو دہرا رہی تھی۔ بیہ اسے پھر سے بے دھیانی میں دیکھنے لگی۔ سوچوں کے اتنے دائرے بن رہے تھے کہ ان دائروں میں اس کے لفظ کھو رہے تھے۔ اور یادیں بھی اور باتیں بھی اور خود بیہ بھی۔

"نہیں میں نے رافع کو نہیں۔ فاتح کو اطلاع دی ہے۔" بالآخر دماغ پہ زور دینے کے بعد اسے یاد آگیا تھا کہ اس نے رافع کو نہیں فاتح کو کال کی تھی اور یہ بات سن کر عزہ کو جیسے ڈنک لگا تھا۔ وہ ہکا بکا سی اسے دیکھنے لگی تھی۔

"بیہ! تم ٹھیک تو ہو؟ تم نے فاتح کو فون کیا؟" وہ شاک کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے بیہ کو جھنجھوڑ دیا تھا۔

"صدمے نے تمہارے حواس چھین لیے ہیں یا تمہاری یادداشت کھو چکی ہے۔ تم سے کیسے بھول ہوئی؟ تمہیں فاتح کو نہیں.... رافع کو کال کرنی چاہیے تھی۔ فاتح کبھی بھی عنایہ کے جنازے پہ نہیں آئے گا۔ اور رافع ضرور آئے گا۔ ہر قیمت پہ آئے گا۔ عنایہ' فاتح کی نہیں' رافع کی بیوی ہے۔"

عزہ نے اس کی کھوئی ہوئی یادداشت بحال کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر اسے حواس باختہ اور غم زدہ چھوڑ کر اٹھ گئی۔ جبکہ بیہ کو بہت دیر بعد اس کی بات سمجھ میں آئی۔ اسے یاد آگیا تھا کہ عزہ جو کچھ کہہ کر گئی ہے وہی سچ اور حقیقت تھی۔ پھر اس نے فاتح کو فون کال بھلا کیوں کی تھی؟ اس کی سوچ اس مقام پہ اٹک

سی گئی۔

اس رات ہوائی اڈے کے بڑے ہال میں معمول سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ اسی ہجوم سے تو وہ ہر جگہ بھاگتا پھر رہا تھا۔ اس وسیع و عریض دنیا میں کیا اس کے لیے تنہائی کا کوئی ایک گوشہ موجود تھا؟ کوئی ایسا ٹھکانا جہاں وہ اکیلا بیٹھ کر جی بھر کے اسے رو لیتا لیکن آنسو تو اس کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

کچھ دیر پہلے جب وہ جہاز کے ٹھنڈے، سرنگ نما کیبن میں ہزاروں فٹ کی بلندی پہ اڑ رہا تھا تو اس کے اندر اچانک بڑی شدت سے ایک خواہش نے جنم لیا تھا۔

مر جانے کی خواہش کا۔ اس کا دل چاہا، وہ کھڑکی سے کود جائے۔ یہ زندگی نہیں تھی۔ تپتا ہوا ریگستان تھا۔ تاپ چڑھی ریت۔ گرم انگاروں سی اور آبلہ پائی کا سفر۔ جو عورتوں کا ہی نہیں مردوں کا بھی کبھی کبھی نصیب بن جاتا ہے۔

وہ ظہران سے آ رہا تھا۔ ظہران کے ہوائی اڈے کی عمارت ٹارمک سے دور کافی فاصلے پر واقع تھی۔ وہ ایک بس پر سوار ہو کر وہاں تک پہنچا تھا۔ راستے میں ہر طرف پیٹرول کے ڈرموں اور ٹن کے ذخائر تھے اور ہوا میں پیٹرول اور ڈیزل کی بو تھی۔ ہوائی اڈے کی عمارت معمولی تھی۔ انتظار گاہ کا لاؤنج مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی بھی نشست خالی نہیں تھی۔ وہ دور ایک کونے میں کھڑا ہو گیا تھا۔

وہاں پی آئی اے کا ایک اسٹیورڈ ان تین چار عرب لڑکیوں کی مدارت کرنے میں لگا ہوا تھا جن کے درمیان "وہ" بھی موجود تھی۔ کسی ملکہ کی طرح گردن اکڑا کے شان سے بیٹھی ہوئی۔

"افسون مشہدی۔" اس کے پورے وجود پہ ایک تھکا دینے والی جھنجلاہٹ سوار ہو چکی تھی اور وہ بحیرہ اسود کے کالے پانیوں جیسی آنکھوں میں ایک زچ کر دینے والی مسکان کے ساتھ جیسے اسے جلا رہی تھی۔

"میرے باپ کی آئل کمپنی سے کیا گیا تین سالہ کانٹریکٹ بھاڑ میں جھونک کر بنا ریزائن دیے تم اکیلے کیسے بھاگ سکتے ہو۔ رافع افراہیم! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ شانہ بہ شانہ۔ ایک سحر کی طرح، ایک سائے کی طرح۔"

اس کی زچ کر دینے والی آنکھوں کا پیام واضح طور پر افراہیم کو بری طرح سے چبھا تھا۔ وہ شخص افسون کی نگاہوں کے قاتلانہ اثر سے نکلنے کی خاطر صالون کی طرف چلا گیا تھا۔

پھر جلد ہی یہاں سے بھی اکتا کر نکل گیا۔ مطار کی عمارت میں بھی دل نہیں لگا تھا۔ بلکہ اس کا دل کہیں بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ قریہ قریہ اسی لیے تو گھوم رہا تھا اور افسون مشہدی اسے پوری مطار کی عمارت میں ڈھونڈتی غصے سے کھول رہی تھی اور اس کا خالص سفید اور قدرتی سرخ رنگ کنچن کے پھل کی طرح لال تھا۔ اور سرخ آگ کی طرح دہکتا محسوس ہوتا تھا۔

"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے مسٹر افراہیم! تم ایک جگہ ٹک کر کام کیوں نہیں کرتے؟ میرے باپ کی آئل کمپنی میں تمہیں ناک رگڑ رگڑ کے نوکری ملی تھی۔ جسے تم لات مار کر یوں بھاگ رہے ہو۔" وہ اس کے سر پہ گرجی تو وہ چونک کر بے خیالی میں اسے دیکھنے لگا تھا۔

"میرا ظہران میں دل نہیں لگا۔ اسی لیے واپس جا رہا ہوں۔" اس نے مختصر کلام کے ساتھ "مفرور" ہونے کی وجہ بتائی تھی جو کسی بھی طور قابل قبول نہ ہوئی۔

"تو دل کہاں لگے گا؟" افسون مشہدی پھٹ پڑی تھی۔ غصہ کی شدت سے اس کی سیاہ آنکھوں میں کالے ڈورے ابھر آئے تھے۔

"جانے کہاں..." وہ بے بسی سے دور کہیں دیکھنے لگا۔ فلائٹ لیٹ تھی اور ہمیشہ کی طرح دل کی "بے قراری" کے ہاتھوں ذلیل ہوتا ایرپورٹ سے باہر۔ ظہران کا آسمان صاف تھا اور سورج آگ اگلتا، دھوپ کو جیسے تاپ چڑھا ہوا تھا اور افسون اپنی ساری "نازک

"انداز" بھلائے کڑکتی دھوپ میں ننگے آسمان تلے کھڑی تھی اور جس کے لیے کھڑی تھی وہ ایک بے ارادہ نگاہ ڈالنے کا بھی روادار نہیں تھا۔

"تمہاری زندگی کا کوئی مقصد بھی ہے افراہیم! چار پیسے کماتے ہو۔ اڑا دیتے ہو اور نوکری کو لات مار دیتے ہو۔ پھر بے روزگاری اور دھکے۔ تم اپنی زندگی کے ساتھ مذاق کیوں کر رہے ہو؟"

وہ غصہ کرتے کرتے "بے بس" ہو گئی تھی۔

"زندگی ایک مذاق کے سوا کیا ہے؟" وہ ظہران میں پھیلی "ظہر" کو دیکھتا رہا۔ دھوپ سروں پہ ناچتی تھی اور گرمی تنور کی مانند سینک دیتی تھی۔ اس نے ظہران کی دھوپ میں پگھلتی اس شہزادی کو دیکھا۔ جس کے قندھاری گالوں پہ پسینہ موم کی طرح پگھل پگھل کر بہہ رہا تھا۔

وہ دھوپ اور تپش سے بے نیاز یہاں اس کے لیے کھڑی تھی جو اس کا نہیں تھا، لیکن وہ اسے اپنا بنانا چاہتی تھی وہ جو اسے نظر بھر کے دیکھتا بھی نہیں تھا۔

رافع افراہیم کی بوجھل شہد جیسی آنکھوں میں ظہران کی ——— ریت اڑ رہی تھی اور افسون مشہدی کا دل شہد سے بھرے ان کٹوروں میں ——— ڈوب کر نجانے کب کا شہید ہو چکا تھا۔

اس نے اپنے "بے قابو" ہوتے دل پہ ہاتھ رکھا اور اس کے دل پہ اترتی اذیتوں کو اپنے دل پہ پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو رافع افراہیم!" ظہران کی شہزادی نے سورج کی تیکھی نگاہوں سے بچنے کے لیے اپنے دودھیا ہاتھوں کا چھجہ بنا کر ماتھے پر رکھ لیا تھا۔

"میں کیا چاہتا ہوں شہزادی افسون مشہدی.....!؟"

اس کی تھکی تھکی آواز اسے اپنے قرب و جوار میں سنائی دی تھی۔ وہ اسے دیکھنے لگی۔ وہ ایک خوب صورت اور بھرپور جوان تھا، لیکن پورے عرب میں وہ ایک خوب صورت اور اکلوتا جوان نہیں تھا جس پہ فوزان مشہدی کی اکلوتی صاحبزادی فریفتہ ہو گئی تھی۔

اس سحر طراز میں کچھ تو تھا جو سب سے الگ تھا۔ سب سے جدا تھا۔

شاید اس کی بے نیازی؟ گم صم سا انداز اس کے پر اسرار وجود میں چھپا "اسرار" یا اس کی قلعے کی مانند مضبوط وجود کی عمارت میں اترا اذیت ناک کرب کا احساس۔

"تم کیا چاہتے ہو رافع افراہیم.....!" وہ اسے دور، بہت دور خیالوں میں گم ہوتا دیکھ کر دھیرے سے چونکا گئی تھی۔

"میں پتا ہے کیا چاہتا ہوں افسون....." وہ اس کے چہرے پہ اپنی "قاتل" نگاہوں کو جما کے کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں چاہتا ہوں افسون! کہ مشرقوں اور مغربوں کے رب کی بنائی ہوئی اس عظیم دنیا کے بیکراں ہجوم میں کھو جاؤں تاکہ میں خود سے کبھی بھی مل نہ پاؤں کیونکہ خود سے ملنا اور اپنی ہی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر کھڑا ہونا بہت مشکل ہے افسوں.....!" وہ دھیمی، بوجھل اور ٹوٹتی آواز میں کہہ رہا تھا۔ اس آواز میں کرب تھا۔ درد تھا۔ افسون کا دل ظہران کی اس تپتی دوپہر میں پگھل پگھل کر ختم ہو رہا تھا۔

وہ اس کو چھوڑ کر دور بہت دور جانا چاہتا تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ فیصلہ کٹھن تھا مگر ہو گیا تھا۔

سامنے کھڑا شخص اپنے فیصلوں میں پختہ نہیں تھا اور اپنے کیے فیصلوں پہ پچھتاتا تھا جب کہ ظہران کی دھوپ میں کھڑی اس شہزادی کے لیے اپنے فیصلوں پہ کھڑا رہنا مشکل نہیں تھا۔

وہ اس کے باپ کی آئل کمپنی سے تین سال کے لیے کیا گیا کانٹریکٹ چھوڑ کر فرار ہو رہا تھا۔ یہ قانونی لحاظ سے ایک جرم تھا۔

سو اس جرم کی "سزا" دینے کے بجائے شہزادی افسون مشہدی اپنے اس "بھگوڑے" کو تلافی کا ایک موقع دینا چاہتی تھی۔ وہ آخر کیا کرنا چاہتی تھی؟

✡ ✡ ✡

وہ خواب کے سفر پہ تھا۔ یہ خواب اسے اکثر ستاتا تھا۔

جھکے برآمدوں والا ایک گھر۔۔۔ جو اپنی شان و شوکت میں کمال نہ تھا۔ اس کے جھکے برآمدوں اور گلیاروں میں ٹھنڈک بارہ مہینے قائم رہتی تھی۔ وہ گھر جو اس کے خوابوں کا مسکن تھا۔ وہ گھر جو امن کا گہوارہ تھا۔ محبتوں کا گڑھ تھا۔ جہاں پہ ہنسی کی جھنکاریں اور قہقہے سنائی دیتے تھے۔ معاً "ایک تیز سا بگولہ اٹھا تھا۔ پورب سے اٹھتی آندھی اور عجیب سا شور۔

وہ اس شور کی آواز سے گھبرا گیا تھا۔ یہ کیسا شور تھا؟ عجیب و غریب سا اور اچانک نتھنوں سے ٹکراتی خوشبو۔

وہ بستر پہ بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ ایئرکنڈیشنڈ کی ٹھنڈک رگوں میں خون کو جما دینے کی قوت رکھتی تھی، لیکن اس نے اپنے وجود کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔

اس کے بازوؤں پہ پسینہ بوند بوند اترتا اور پھسلتا۔ اس کا پورا چہرہ پانی سے تربتر تھا۔ اس نے اپنی پیشانی کو چھوا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ بلڈ پریشر چڑھ رہا تھا یا کم ہو رہا تھا؟ اس کے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ وہ اٹھ کر ایک گلاس پانی پی لیتا۔ جانے کتنی دیر تک وہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔

پھر حواس آہستہ آہستہ ٹھکانے پہ آنے لگے۔ رفتہ رفتہ جسم کا پسینہ بھی خشک ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پانی پی کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

وہ نہا کر باہر آیا تو اعصاب پہلے سے کچھ پرسکون تھے۔

اس نے گھڑی پہ نگاہ ڈالی اور تہجد کی تیاری میں لگ گیا۔

آج کے دن کا شیڈول کس قدر ٹف تھا۔ وہ ایک لمبی فلائٹ لے کر آیا تھا۔ ظہران، کویت، استنبول پہ رکتے ہوئے فرینکفرٹ اور پھر اسی معمول کے مطابق واپسی بھی۔ بہت تھکا دینے والی روٹین تھی۔ وہ ملکی ایئرلائن کمپنی میں بطور کمرشل پائلٹ اپنی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ اس کا ڈیوٹی شیڈول عین اس کے مزاج کے مطابق بہت ٹف تھا۔ کام، کام اور صرف کام۔ وہ سب سے زیادہ فلائٹس لینے والا کمرشل پائلٹ تھا بقول مدید کہ "اگر مہینے بھر میں سب سے زیادہ فلائٹس لینے والے پائلٹس کو ایوارڈ دیا جاتا تو اس کا نام پہلے نمبر پہ آتا۔

مدید کی طرف سوچوں نے پرواز کی تو اسے اور بھی بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ قریب دو ماہ پہلے وہ سرکاری طور پر ملنے والی چھٹی پہ شدید پریشان تھا۔ وہ پورا ایک مہینہ کام کیے بغیر کیسے گزارے گا؟ کام نہ کرنے پہ اس کی سانسیں بند ہونے لگتی تھیں۔ وہ جانتا تھا اگر فارغ رہا تو "یادِ ماضی" کے جوار بھاٹوں میں جلتا رہے گا۔ یادیں جو کسی طور پر بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

"دنیا ان لوگوں کے لیے ایک طربیہ ہے۔ جو سوچتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے "المیہ" ہے جو محسوس کرتے ہیں۔" اور بدقسمتی سے دونوں عوامل اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

وہ دو مہینے پہلے کے اس وقت میں کھو گیا تھا جب اس کے دوست مدید نے بہت ضد، اصرار اور مان کے ساتھ اسے اپنے گھر چھٹیاں گزارنے کی دعوت دی تھی۔ اسے مدید کا مان توڑنا اچھا نہ لگا تھا۔ وہ ہوٹل ڈی فرانس میں تھا جب صبح سویرے مدید کی دھماکہ دار فون کال نے اسے چونکا دیا تھا۔

"جان کی اماں چاہتے ہو تو آج رات تک ڈین ہیگ پہنچ جانا۔ مابدولت آج کل چھٹیاں گزارنے یہاں فروکش ہیں۔ چچا جان کے امیر خانے میں۔ ان کی مہمان نوازی کا مزہ لوٹ رہے ہیں اور آتے ہوئے اس عربی کنجوس شیخ کو بھی لے آنا۔"

یہاں تک تو ٹھیک ہی تھا۔ اس نے مدید کے مان، ضد، اصرار پہ سر جھکا دیا تھا، لیکن اس کا اگلا حکم نامہ سن کر اس کے حواس "اڑ" گئے تھے۔

"وہ۔۔۔ تو۔" اس کا سانس اندر ہی کہیں اٹک گیا تھا۔ وہ شیخ جس سے اس کو اللہ واسطے کا بیر تھا۔ جس سے اس کا مزاج نہیں ملتا تھا اور مدید کہہ رہا تھا کہ اسے ساتھ لے کر آئے۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ کہاں ہے؟" مدید نے اس کے

اٹکتے الفاظ سنبھالے۔
"وہ فرانس میں ہے۔" اس نے روانی میں کہہ دیا تھا۔

"اور تم "ہوٹل ڈی فرانس" میں۔ کیا سمجھتے ہو؟ خبر نہیں ہوگی جگر! ایک بات جان لو۔ تم مشرق میں ہو یا مغرب میں.... مجھ سے چھپ کر نہیں رہ سکتے۔ میں زمین پر بیٹھ کر جان جاتا ہوں کہ تمہارا جہاز مغرب کی فضاؤں سے گزر رہا ہے یا مشرق کی...." مدید کی جان نکالتی تقریر اور محبت یہ کس کی مجال تھی جو سر اٹھا پاتا؟ اور اس کے پاس مدید کی بے لوث "یاری" کے سوا تھا ہی کیا۔

اس نے فرمان بجالانے میں ہی عافیت جانی تھی اور اب دل پہ پتھر رکھ کے شیخ کو فون ملا رہا تھا۔ دراصل شیخ کی کہانی بھی الگ تھی۔ وہ مدید کا گہرا 'پکا' جانی دوست تھا اور اگر مدید کا دوست تھا تو زبردستی اس کے گلے کا بھی ہار بن جاتا جب کہ اسے تو مدید کے علاوہ کوئی بھاتا ہی نہیں تھا اور اب شیخ کو فون کرنے سے پہلے ہی اس نے دل میں پکا عہد کرلیا تھا کہ "دوران سفر شیخ کو بالکل منہ نہیں لگانا۔"

اس کے فون کرنے کی دیر تھی وہ اپنے طول و عرض تک پھیلے سامان سمیت حاضر تھا۔ جیسے ڈین ہیگ میں ایک مہینہ نہیں 'پورا ایک سال رہنا ہو۔

ہوٹل ڈی فرانس میں.... انتہائی شاندار لاؤنج میں ناشتہ کرتے ہوئے جیسے ہی اس کی نگاہ شیخ پہ پڑی تھی۔ اس کی باقی ماندہ بھوک پیاس اڑ گئی۔ جب کہ وہ مسکراتے ہوئے زبردستی اس کے گلے سے آلگا تھا۔

جواباً "وہ ذرا بھی گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کرسکا۔

"سنا ہے جناب! ایک فائل دل کی بھی ہوتی ہے جس میں ایک ہی نام ہوتا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ہوں تو وہ انسائیکلوپیڈیا بن جاتی ہے۔" وہ اسے "تنہا" دیکھ کر چوٹ کررہا تھا۔ "مانا کہ تمہارے دل کے پروجیکٹ کے پاس ایک ہی فائل تھی جس میں ایک ہی نام درج تھا۔ جسے وقت کے بہاؤ نے پیچھے دھکیل دیا۔ اب کسی اور طرف بھی دیکھ لو...." وہ بولے جارہا تھا۔ اس بات سے بے نیاز کہ اگلے بندے کو اس کا بولنا پسند آبھی رہا ہے یا نہیں۔

"اور ایک فائل آپ کے قیمتی سیل فون کے اندر بھی ہوتی ہے۔ کبھی اس میں جاکر زحمت گوارا کرلیا کریں۔ اسے بھی کبھی کبھار دیکھ لیا کریں۔ جو بھول چکے ہیں۔ وہ یاد آ ہی جائیں گے۔" شیخ نے میٹھی میٹھی "بے عزتی" کا سواد اسے چکھا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لی تھی جب ہی اسے بھی بولنے کا موقع میسر آگیا۔

"تکرار گفتگو کے حسن کو گہنا دیتی ہے۔" اس نے طنزیہ انداز میں جیسے بدلہ اتارا تھا۔ شیخ نے اپنی اسودی آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا اور ترنت جواب دیا۔

"الفاظ "اظہار" کا سب سے آسان ذریعہ ہیں۔ وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "اور بات اپنے اثر کے اعتبار سے چھوٹی یا بڑی ہوسکتی ہے۔ فرق تب ہی پڑتا ہے جب لفظ آپ کے دل پر اثر انداز ہوں اور میں خوب جانتا ہوں کہ تمہارے پاس دل نہیں پتھر ہے۔" وہ اس کے الفاظ پر شدید برافروختہ ہوگیا تھا۔

اس کی بے حسی نے شیخ کو افسردہ کردیا تھا۔ وہ اس سے پہلے ہی ناراض تھا اور اب اس کے رویے پہ اور بھی خفا ہوگیا۔ شیخ کو منہ پھلائے دیکھ کر اس کو سکون محسوس ہوا کم از کم سفر کے دوران وہ اس سے بات کرنے سے گریز ہی برتے گا۔

اس نے شیخ سے جان چھڑائی اور تیزی کے ساتھ اپنا ہینڈ کیری اٹھانے روم میں چلا گیا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو شیخ اپنے سامان کے ساتھ ہوٹل کے باہر کسی ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا دکھائی دیا۔ اس کا شمال جنوب میں پھیلا سامان دیکھ کر اس کا دماغ چکرا گیا تھا۔ اور ایک الگ سے بنڈل بلکہ عجوبہ؟ یہ ہمیشہ ہر سفر کے دوران شیخ کے ہمراہ رہتا تھا۔

اس بنڈل میں لال پلشی کی رضائی تھی جو فرانس کے چڑھتے سورج کی تیز روشنی میں اور بھی چمکتی تھی اور جس کا پولی تھین دھوپ کی شدت سے لشک رہا تھا اور شیخ نے اسے چمڑے کے تھیلے میں گھسانے کے بجائے نائیلون کی رسیوں میں باندھ رکھا تھا۔

"اس کا تھیلا کہاں ہے؟" وہ رضائی کے اس بیگ کا پوچھ رہا تھا جو نہایت قیمتی تھا اور جس کے اندر اس رضائی کو محفوظ کیا جاتا تھا۔

"وہ پھٹ گیا۔ اور میں نیا خرید نہیں سکا۔ آج کل کام نہیں ہے۔" اس نے اپنی "بے روزگاری" کا ڈھول پیٹا تھا۔ اس نے شیخ کی طرف دیکھا۔ اس کا لباس ہمیشہ عمدہ، نفیس اور قیمتی ہوتا تھا، چاہے وہ کتنا ہی بے روزگار کیوں نہ ہو۔ یہ معمہ نہ وہ حل کر سکا تھا اور نہ مدید۔

"حریر....!" اس کی آواز میں تنبیہہ تھی اور شیخ حریر سرل کے درخت کی مانند سیدھا ہوا تھا۔ اس تنبیہہ سے اس کی جان جاتی تھی۔

"مسٹر حریر! کیا میں تمہیں نہیں جانتا۔ کیا ان قیمتی سفری بیگز کے اندر "لنڈے" کا مال بھر رکھا ہے؟" اس کے طنز پہ وہ آئیں بائیں کرنے لگا تھا۔

"ان بیگز میں تو وہی کپڑے ہیں جو میری "ماہ گرہ" پہ میری بہن ہر مہینے مجھے بھیجتی ہے۔ خود سے مجھے ایسی توفیق کہاں؟" وہ آزردگی سے کہہ رہا تھا اور شیخ حریر کی "ماہ گرہ" کا بھی عجیب قصہ تھا۔ یعنی سال میں ایک بار منائی جانے والی برتھ ڈے کو وہ ہر مہینے مناتا تھا۔ جسے ماہ گرہ کا نام دیا جاتا اور جس وقت وہ حریر کے ساتھ ٹیکسی میں سوار ہو رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کے بدترین سفر کی ابتدا کی ہے اور جس سفر کی ابتدا ہی اچھی نہ ہو اس کا انجام بھلا کیسا ہوتا ہے؟ یہ بات اسے دو مہینے بعد سمجھ میں آ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

فلائٹ مزید تین گھنٹے لیٹ تھی اور ایسے میں مسافروں کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوا چاہتا تھا۔

اس وقت "مسطار ظہران الدولی" کی ہلکے گلابی رنگ کی عمارت نئے فن تعمیر کا ایک موثر اور دلکش نمونہ لگ رہی تھی۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی ریگستانی وسعت کے وسط میں کھڑی یہ عمارت خیالی اور غیر حقیقی لگتی تھی۔

اندر شیشے کی دیواروں کے پیچھے کشادہ پھسلنے والے فرش، چکنی روشنیں اور فل ایئر کنڈیشنڈ ہال کمرے تھے۔ عمارت کے اندر جانے کے لیے انسان جب کچھ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے اردگرد دیکھتا ہے تو اپنے آپ کو ایک مہیب سنگین ریگستانی حقیقت کے روبرو پاتا ہے اور یوں محسوس کرتا ہے جیسے اب سے پہلے وہ صحرا کے معانی سے پوری طرح آشنا نہ تھا۔

وہ ایئرپورٹ کی ہی عمارت کے انتہائی کونے میں بنے قدمچوں میں سے ایک پر بیٹھی تھی۔ ایک خوش نما قد آدم گملا نما صراحی کے اندر گل آفتاب کھل رہے تھے۔ جس طرف سورج کا رخ ہوتا گل آفتاب اپنے رخسار کو اسی سمت موڑ لیتا۔ اس کی زبان میں اس پھول کو سورج مکھی کہا جاتا تھا۔ اس کی نگاہ افسون مشہدی پہ اٹک گئی۔ وہ ابھی تک یہیں تھی اور اس کے صبر کا امتحان بن کر بیٹھی تھی۔ اور بڑے اطمینان سے اپنے قریب چاکلیٹس کے ریپرز کا ڈھیر لگا رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے اس نے چند کوکیز بھی کھا لیے تھے۔ اس کا مطلب تھا۔ افسون کو بھوک لگ رہی تھی۔ وہ پچھلے چار گھنٹوں سے اس کے ساتھ تھی۔ اور ابھی تک کسی بھی قسم کی اکتاہٹ یا بے زاری اس کے چہرے سے ہویدا نہیں تھی۔ رافع افراہیم کو یہی چیز جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

"آخر یہ مجھ پر لعنت بھیج کر جاتی کیوں نہیں؟" وہ جھلا کر سوچ رہا تھا۔ افسون نے اک نگاہ اس کے جھلائے ہوئے چہرے پہ ڈالی اور مزے سے چاکلیٹ کھانے لگی۔ اسے فرینکفرٹ جانا تھا۔ آلف نے اس کے لیے ملازمت کا انتظام کر رکھا تھا جب کہ اس کی تقدیر اسے پھر سے آزمانے پہ تلی تھی۔ کوئی ایسی ترکیب جو اس بلا سے اسے محفوظ رکھ سکتی؟ وہ اپنی کنپٹی کو ٹھکورتا۔ بیس دنوں سے بڑھی شیو میں ہاتھ پھیرتا بہت ناکام اور افسردہ لگ رہا تھا۔

"مان جاؤ کہ تمہاری زندگی کا کوئی ایسا کرش..... جس نے تمہیں دنیا سے بے زار کر دیا اور تم اپنی ضد میں ماننے سے انکاری ہو۔" خاموشی کو افسون کی آواز نے

توڑا تھا۔ اور وہ اس کے لفظوں پہ جیسے ٹھر گیا تھا۔ کیا وہ سچ کہہ رہی تھی یا صرف ایک اندازہ؟

وہ رخ بدل کے کھڑا ہو گیا تھا۔ افسون کو اس سچویشن بلکہ گریز یا احتیاط نے بڑا ہی لطف دیا۔ کہاں تو لوگ افسون مشہدی کو اک نگاہ دیکھنے کے لیے تڑپ تڑپ جاتے تھے اور کہاں یہ معمولی سا ایشیائی باشندہ۔ جو اس پہ اک نگاہ غلط بھی ڈالنا گوارا نہ کرتا تھا۔

''اگر تم نے اپنی زندگی میں کوئی غلط فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس فیصلے کا سامنا کرنے سے اتنا بھاگ کیوں رہے ہو؟ تاریخ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ تاریخی فیصلے اکثر غلط تھے، لیکن تاریخی تھے۔'' وہ اتنے عام لہجے میں اس پروار کر رہی تھی کہ درد کی شدت سے وہ چلا بھی نہیں سکا تھا۔ اسے روکنے پر تو وہ قادر ہی نہیں تھا۔

''تم میرے بارے میں غلط سلط اندازے لگاتی ہو۔ میں کسی سے نہیں بھاگ رہا۔'' رافع افراہیم نے بڑی شدت کے ساتھ تردید کی تھی۔ وہ ایک بھوں اچکا کر اسے دیکھنے لگی۔ جیسے اس کی بات پہ یقین نہ آیا ہو۔

''اگر تم یہ سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ تمہیں ناخوش کر کے مجھے خوشی نہیں ملے گی، لیکن تمہارے بارے میں میری رائے غلط نہیں ہو سکتی۔'' وہ اتنی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی کہ افراہیم منجمد ہو گیا تھا۔ وہ اسے جھٹلا ہی نہ سکا۔ وہ اتنی بے نیاز اور لاپروا قسم کی لڑکی تھی کہ اس سے ایسی ٹھوس سنجیدگی اور پختگی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

''بنانے والے نے لوگوں کو ستار کے تاروں جیسا بنایا ہے۔ بس اتنا علم ہونا چاہیے کہ کون سا تار چھیڑنا ہے پھر وہی آواز نکلے گی اور وہی دھن بجے گی جو آپ بجانا چاہتے ہیں، میں اچھی باتیں سنتی ہوں اور اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتی ہوں۔ وقت آنے پہ وہ میرے کام آتی ہیں۔'' بلاشبہ وہ اچھی گفتگو کرتی تھی، مگر افراہیم کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ عمدہ سامع نہیں تھا۔ وہ بار بار کلائی موڑ کر گھڑی کی طرف دیکھتا۔ یہ فلائٹ بھی اس کے نصیب کی مانند سست تھی۔ اسے شدید مایوسی نے گھیر لیا تھا۔

''تم اس بات پہ یقین کیوں نہیں کر لیتے۔'' کچھ دیر بعد وہ اسے اپنی طرف متوجہ کر گئی تھی۔ افراہیم گھاس کھرچتا بلا ارادہ ہی اسے دیکھے گیا تھا۔ وہ موبائل پر مصروف تھی۔

''کس بات پہ؟'' اپنے اندر کے شور سے گھبرا کر افراہیم نے بے ساختہ سوال کیا۔

''یہی کہ فلائٹ کی تاخیر میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔ کیا خبر، تمہارا یہاں سے چھپ کر بھاگنا تمہارے حق میں بہتر نہ ہو۔'' افسون کے اگلے الفاظ نے اسے حیران نہیں کیا تھا۔ وہ اتنے مختصر عرصے میں اتنا تو جان گیا تھا۔ وہ ایک ذہین اور تیز ترین دماغ رکھنے والے کاروباری تاجر کی نہایت عمدہ دماغ رکھنے والی صاحبزادی ہے۔

''چھپ کر بھاگنے کا الزام اب تو نہیں میرے سر آتا۔ کیا تمہارے سامنے نہیں جا رہا؟'' افراہیم نے بڑی معصومیت سے اپنے جرم پہ پردہ ڈالتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

''ماشاء اللہ مجھے باقاعدہ طور پر ''اطلاع'' دے کر یہاں سے رخصت ہو رہے تھے اور میں تمہیں سی آف کرنے آئی تھی غالباً۔'' اس کا لہجہ گہرا کاٹ دار طنزیہ تھا۔ وہ خواہ مخواہ ہی نگاہ چرا گیا تھا۔

''میں نے تمہیں باقاعدہ چھاپہ مار کے پکڑا ہے۔ ورنہ تم تو دھوکا دے کر جا رہے تھے۔'' افسون کے جتلانے پہ اس کا سر جھک گیا تھا۔ ہاں، محسنوں کے سامنے سر اٹھا نہیں کرتے۔ اور اس نے کیا کیا تھا؟ خود پہ احسان کرنے والی ہستی کو دھوکا دیا، لیکن وہ کیسے بتاتا، وہ بہت مجبور ہو گیا تھا، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ اور کیوں کرنا چاہتا تھا؟ بس اسے اتنی خبر تھی کہ اسے ظہران سے بھاگ جانا ہے دور بہت دور... جہاں افسون نہ پہنچ پائے۔

وہ بغور اس کے اندر چھڑی جنگ کا تجزیہ کر رہی تھی۔ وہ اس کا چہرہ با آسانی پڑھ لیتی تھی۔

''تم اس مقام سے ہٹ کیوں نہیں جاتے افراہیم!

جسے تذبذب کہا جاتا ہے۔ تم کسی نتیجے پر کیوں نہیں پہنچ جاتے۔" وہ اس کی کشمکش کو جان گئی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں۔" افراہیم ایک مرتبہ پھر منکر ہوا۔

"اوں ہوں..." افسون نے اپنا سر دائیں سے بائیں ہلا کر اس کے الفاظ کی تردید کی تھی۔ "دیکھو افراہیم! انسان اپنی غلطیوں کی تصحیح کرتا ہے نہ کہ غلطی پہ غلطی کرتا جائے۔"

افراہیم ایک دم برہم ہو گیا۔

"میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ تم آخر چاہتی کیا ہو؟ میرے پیچھے کیوں پڑی ہو..." افراہیم شدت غم سے چلا اٹھا تھا۔ اس کی برہمی افسون کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

"تم جانے میری بات کو اپنے حساب میں کہاں لے گئے ہو۔ شاید بہت دور۔ میں نے تو صرف اس غلطی کی بات کی تھی جو تم اس وقت دہرانے والے ہو۔ یعنی ظہران کو چھوڑ کر۔ یہ ایک سنگین غلطی ہے افراہیم!"

وہ نرمی سے کہتے ہوئے افراہیم کو نادم ہونے پہ مجبور کر گئی تھی۔ جانے وہ کیا سمجھا تھا اور اب متاسف کھڑا تھا۔ ظہران کے تلخ سورج کے بالکل مقابل۔

"یہ سورج کب ڈھلے گا آخر..." اس نے بات بدلی۔ افسون نے گہرا سانس بھرا اور اس کے پھیکے پڑتے چہرے کو دیکھنے لگی تھی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔

"یہ تو اپنے وقت پہ ڈھلے گا افراہیم! تم موضوع سے مت ہٹو اور جواب دو... کیا تمہارا اس طرح ظہران چھوڑ دینا قانوناً ٹھیک ہے؟" افسون اس کی توجہ بڑے اہم پوائنٹ کی طرف دلا رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے وہ سن ہو گیا تھا۔ افراہیم نے اس پہلو پہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔

"تم مجھے اپنے قوانین سے ڈراؤ گی اب۔" افراہیم نے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔ وہ لمحوں میں بدل جاتا تھا۔ کبھی بے بس نظر آتا۔ کبھی غصے میں چیخنے لگتا، کبھی بالکل گم صم ہو جاتا۔ افسون مشہدی نے "مطار ظہران الدولی" کے اس ممنوعہ علاقے میں بیٹھے ہی ایک چیز افراہیم کے اندر تلاش کر لی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ افراہیم کے اندر بیک وقت کئی طرح کے "مزاج" پائے جاتے تھے۔ وہ غضب کا مشاہدہ رکھنے والی خاتون تھی۔ اس کا مشاہدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا تھا اور افراہیم کے بارے میں تو کبھی بھی نہیں...

بالآخر ظہران کا سورج ڈھل گیا تھا اور ریگستان پر ٹھنڈی نم ہواؤں نے اپنا راج پاٹ سنبھال لیا۔ اگر کسی کو صحرا دیکھنے کی خواہش تھی تو ظہران کے اس ایئرپورٹ چلا آتا۔

اور اس وقت پورا ظہران ٹھنڈی ہواؤں کے قبضے میں تھا۔ ایک تپا دینے والا دن اتر چکا تھا۔ مشک فام سی شام آنے کا وقت تھا۔ جہاز لیٹ ہونے کی بنا پر افراہیم کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔

اس کی جھلاہٹ ملاحظہ کرتے ہوئے افسون نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا۔

"تمہارے اس جہاز میں سوار نہ ہونے میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہے افراہیم! کیا خبر تمہارا اس جہاز میں بیٹھنا نقصان دہ ہو۔ خدانخواستہ یہ جہاز ہی کریش ہو جائے۔" افراہیم کے چہرے پہ لمحہ بھر میں جگمگاہٹ سی اتر آئی تھی اس کی شہد بھری آنکھوں کے کٹوروں میں ماہ انجم کا نور بھر گیا تھا۔

"کیا یہ ممکن ہے؟ اگر ایسا ہو جائے تو مجھ سا خوش نصیب کوئی دوسرا نہ ہو۔" افسون کو اس کی سرخوشی نے اتنا تھرا دیا تھا کہ وہ ساکت رہ گئی۔ اس کے پاس سے لفظ کھو گئے تھے۔ وہ اپنی زندگی سے اس حد تک بے زار ہو چکا تھا؟

اس کی بحیرۂ اسود کے کالے پانیوں جیسی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ جسے اس نے کمال مہارت کے ساتھ چھپا لیا تھا۔

"صحیح وقت پر مناسب فیصلہ ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ ضد ترک کر دو افراہیم! اور میرے ساتھ چلو۔" وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ رافع افراہیم نے نفی میں سر دائیں بائیں ہلا دیا۔

"ہرگز نہیں... مجھے آگے بڑھنا ہے۔ مجھے رکنا نہیں۔" اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

"تم بہت ضدی ہو۔ دیکھو، پھر پچھتانا نہیں۔"

افسون اسے وارننگ دے رہی تھی۔
"ایسا نہیں ہوگا۔"
"تم سوچ لو افراہیم! کچھ دیر تک اناؤنسمنٹ شروع ہو جائے گی۔" افسون نے اپنی قیمتی گھڑی پہ نگاہ ڈال کر کہا۔
"میں نے سوچ لیا ہے۔ ظہران میرے لیے نہیں۔ دنیا کا کوئی ملک، کوئی براعظم، کوئی خطہ، کوئی شہر، کوئی گاؤں، کوئی قصبہ میرے لیے نہیں ہے۔" وہ اپنی جگہ پہ کھڑا تھا۔ نہ رکنے کے لیے۔ نہ ٹھہرنے کے لیے۔ افسون اسے روکنے کی ہر کوشش میں ناکام ہو چکی تھی، وہ مایوس نظر آرہی تھی۔ اب اس کے پاس صرف ایک حربہ تھا اور آخری داؤ بچا تھا۔ وہ اس کے لفظوں میں نہیں بندھا تھا۔
افسون نے جو میسج ایک گھنٹہ پہلے سینڈ کیا تھا۔ اس پہ عمل درآمد کا حکم جاری کر دیا۔
افراہیم بہت خوش نظر آرہا تھا۔ زیادہ خوش وہ اس بات پہ تھا کہ افسون "ناامید" ہو چکی ہے۔ جیسے ہی اس نے افراہیم کے تاثرات پہ غور کیا وہ حیران رہ گئی تھی۔ اسے ناامیدی کتنا خوش کرتی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر لوٹی تھی۔
"جب تک اناؤنسمنٹ نہیں ہوتی۔ میں تمہیں چھوٹی سی ایک حکایت سناتی ہوں۔ کیا تم سنو گے۔" اس نے نرم لہجے میں سوال کیا تھا۔ افراہیم نے سر ہلا دیا۔ ورنہ افسون سے بعید نہیں تھا کہ وہ اپنی بات سنانے کے لیے جہاز پر سوار ہو جاتی۔
"بہت شکریہ۔" وہ اس کا اشارہ پا کر ہلکا سا مسکرائی تھی۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا۔
"میں ایک دن ظہران کے جیولری بازار میں گھوم رہی تھی۔ تب ایک دکان دار نے مجھے اپنی کہانی سنائی تھی۔
اس نے مجھے بتایا۔ "میں ایک دفعہ بحری جہاز کے سفر پہ تھا۔ سمندر میں طوفانی لہر آئی اور جہاز ڈوبنے لگا۔ بہت سے مسافر ساحل قریب دیکھ کر چھلانگیں مار کے پانی میں کود گئے تھے۔ مجھے تیراکی نہیں آتی تھی۔ پھر بھی میں نے اللہ پہ بھروسا کیا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ کسی ماہر تیراک کا ہاتھ میرے ہاتھ سے لگا اور وہ مجھے اپنے ساتھ تیراکی کراتا ساحل تک لے آیا۔ میں ساحل کے کنارے اس حال میں پڑا تھا کہ بھوک میرا معدہ نوچ رہی تھی۔ تب ہی مجھے پانی کے اندر کوئی چیز ڈوبتی ابھرتی دکھائی دی تھی۔ میں بے تابی کے ساتھ پانی میں کودا اور اس ڈوبتی ابھرتی چیز کو جھپٹ لیا۔ وہ ایک تھیلی تھی جس میں قیمتی ہیرے تھے۔ میں ہرگز اس خوشی کو نہیں بھول سکتا۔ کہ میں نے سمجھا۔ یہ کوئی جانور ہے۔ مچھلی یا کوئی اور آبی جانور۔ پھر میں اس ناامیدی کو نہیں بھول سکتا۔ کہ جب مجھے معلوم ہوا، اس تھیلی میں ہیرے ہیں، لیکن ان ہیروں سے ہی میں نے اپنے کاروبار کو پھر سے شروع کیا۔"
وہ حکایت مکمل کرنے کے بعد افراہیم کا بگڑتا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے تاثرات افسون کو مزہ دے رہے تھے۔ یعنی وہ اس کی پوری حکایت کا متن سمجھ چکا تھا۔
"کبھی کبھی وقتی ناکامی کامیابی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔
اس نے شدید ناگواری محسوس کی تھی۔ وہ اس آواز کو زندگی میں دوبارہ نہ سننے کی خواہش رکھتا تھا اور اسے امید تھی کہ یہ آواز آج کے بعد اس کی سماعتوں کا امتحان ہرگز نہیں بنے گی۔
"زندگی سب کے لیے خوشی کا پیغام نہیں لاتی۔ یہ کچھ لوگوں کے لیے آزار بن جاتی ہے۔ آزار، اذیت کی جڑوں سے نکلا ہے۔ ضروری ہے کہ اذیت کا علاج کیا جائے۔ یہ نہیں کہ زندگی کو جینا چھوڑ دیا جائے۔"
اس نے جہاں تاب کی مانند پڑتی روشنی میں ننھا سا جگنو تیرتا محسوس کر لیا تھا۔
اور افراہیم سوچ رہا تھا کوئی ایسی صورت ہوتی جہاں وہ اس بلا سے نجات پا لیتا۔
"دیکھو، تم یہ ضرور سوچو کہ تمہیں آگے بڑھنا ہے، لیکن یہ ہرگز نہ سوچو کہ تمہیں کھو جانا ہے۔"
اس کا دل چاہا۔ وہ اس "فلاسفر" کو دھکا دے کر یہاں

سے باہر نکال دے یا خود کہیں بھاگ جائے۔

معاً" ظہران کی اس عمارت کے اندر ایک زندگی سے بھرپور آواز نے ہلچل مچادی تھی۔

"انتظار ختم ہوا چاہتا ہے.... فرینکفرٹ جانے والی فلائٹ بالکل تیار ہے۔ تمام مسافر عمارت کے اندر یکجا ہوجائیں۔"

لوگ جوق در جوق مختلف صالونز' ہالز اور لاؤنج میں سے نکل رہے تھے۔ ان میں ایک وہ بھی تھا۔ اس حال میں کہ اس کے وجود سے ایک سرخوشی کا احساس پھوٹتا تھا۔ جیسے وہ ایک "وبال" سے بچ کر ظہران سے محفوظ و مامون واپس جارہا تھا۔

افسون مشہدی اپنی اسودی آنکھوں سے اسے لمحہ بہ لمحہ دور ہوتے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی محبت کو ٹھکرا کر جارہا تھا۔ دوسرے معنوں میں وہ اسے دھتکار کر جارہا تھا۔

وہ سورج مکھی کے صراحی دار گملے کے پاس اس حال میں کھڑی تھی کہ اس کا چہرہ نمکین پانیوں سے بھیگ رہا تھا۔

افسون نے ہتھیلی کی پشت کو آنکھوں پہ رگڑا اور اپنا قیمتی سیل فون دیکھنے لگی۔ اسکرین کے اوپر ایک میل جگمگا رہی تھی۔

"مادام! آپ کے حکم کی تعمیل کردی گئی ہے۔"

جواب کے ساتھ روزف کا سائن نظر آرہا تھا۔

اس نے میل کو دوبارہ' سہ بارہ پڑھا اور اسکرین سے مٹادیا۔ اب وہ ظہران کے ریگستانی پس منظر رکھنے والے عالیشان ایرپورٹ کو اپنی جہاں سوز آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا.... رک جاؤ کہ رک جانے میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہوسکتی ہے۔ میرے دل کا "قیدی" بننا سودمند تھا یا ظہران کی حوالات کا؟ اس کا فیصلہ تم نے خود کیا اور اس بات سے ثابت ہوا کہ تم کبھی بھی اچھا فیصلہ کرنے والے نہیں ہوسکتے۔"

☆ ☆ ☆

رات دور تک پیرس شہر کو ڈھانپ چکی تھی۔ لیکن روشنیوں کے اس شہر میں "تاریکی" کھوجنے سے بھی نہیں ملتی تھی۔ یہ پیرس تھا۔ روشنیوں کا شہر اور اگر مدید اسے مجبور نہ کرتا تو وہ اپنی مہینے بھر کی چھٹی اس شہر کے چوراہوں میں گھومتے ہوئے گمنامی کی حالت میں گزار دیتا۔ اس کے دل میں جینے کی کوئی امنگ باقی نہیں تھی۔

وہ چوک پہ شیخ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ جسے اچانک اپنا مزید ضروری سامان لینا یاد آگیا تھا۔ اسی چوک کی ایک بلڈنگ میں شیخ حریر صاحب کا "ریپئرنگ ہاؤس" تھا۔

وہ گہرا سانس کھینچتا وہیں ایک بنچ پہ بیٹھ گیا تھا۔ انہوں نے جس ٹرین پہ سفر کرنا تھا۔ اس کی روانگی میں بہت وقت پڑا تھا۔ اسی چیز سے فائدہ اٹھا کر حریر کو فوراً اپنا کچھ اور سامان اٹھانا یاد آگیا تھا۔ اب نتیجتاً اسے حریر کا انتظار کرنا تھا۔ شیخ حریر جو پیشے کے لحاظ سے ایک ماہر نفسیات تھا' لیکن حریر کو "ماہر نفسیات" سمجھنا بہت مشکل تھا۔ بھلا یہ جوکروں جیسی حرکات کرتا' مراثیوں کو مات دیتا لاابالی سا جوان نفسیات کا ماہر ہوسکتا تھا؟ وہ بھی انسانی نفسیات؟

ہاں' ڈھور ڈنگروں کی نفسیات میں مہارت کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ جب اس نے مدید کے سامنے اپنے یہ خیالات پیش کیے تو وہ سخت برامان گیا تھا۔

"تمہیں نہیں پتا.... حریر کی قوت مشاہدہ کس قدر تیز ہے۔ وہ بہت ذہین اور اپنی فیلڈ کا ماہر ڈاکٹر ہے۔"

مدید کے بتانے پر اسے لفظ ڈاکٹر پہ اچھو لگ گیا تھا۔ حریر کو کم از کم "ڈاکٹر" کہنا اور اس لحاظ سے عزت دینا بڑا ہی دشوار کام تھا۔ وہ ایک گویا ہوسکتا تھا' جوکر ہوسکتا تھا' کارٹون ہوسکتا تھا' میراثی ہوسکتا تھا' بھانڈ ہوسکتا تھا' مگر ماہر نفسیات ہرگز نہیں.... یہ تو اچھی بھلی ڈاکٹروں کی توہین تھی۔

اور اس وقت وہ روشنیوں کے چوک میں موجود حریر کی مہنگی ترین رہائش گاہ اور "ریپئرنگ ہاؤس" کو دیکھتا سخت اچنبھے میں مبتلا تھا۔ کہاں تو وہ اپنی بے

روزگاری کا ڈھول پیٹتا تھا اور کہاں ایسے شاہانہ ٹھاٹ باٹ۔

کچھ دیر بعد حریر واپس آگیا تھا۔ تپے تپے گلابی چہرے کے ساتھ۔ ایک تو اس کی ادائیں اتنی زنانہ تھیں، اوپر سے نام بھی حریر یعنی ریشم یا شاید اس کی شخصیت پہ نام کا ہی زیادہ اثر تھا۔

"اب دیکھو، ڈین ہیگ بھی کوئی چھٹیاں گزارنے والی جگہ ہے۔ اس قیامت پیرس کو چھوڑ کر ڈین ہیگ میں کیا ہوگا؟" وہ ٹیکسی میں بیٹھتے ساتھ ہی مسلسل تیز رفتاری سے زبان چلا رہا تھا۔ پیرس چھوڑتے ہوئے وہ اتنا ہی خونخوار ہو جاتا تھا۔

مدید نے کہا تھا۔ "پیرس چھوڑتے ہوئے وہ آپے" سے باہر ہوا تو پریشان نہ ہونا۔ پیرس سے اس کا قلبی لگاؤ ہے۔" اور اسے کیا ضرورت تھی حریر کی بک بک پہ پریشان ہونے کی۔

وہ ٹیکسی سے باہر کے نظاروں میں کھویا رہا۔ ایک سڑک جس پہ جہاز لینڈ کر رہا تھا۔ یہ تماشہ پیرس میں عام تھا۔ جگہ اور گنجائش کی کمی کی وجہ سے یورپ والوں نے یہ طریقے رائج کیے تھے۔ جہاں ایک سڑک بن سکتی ہے۔ وہاں اوپر تلے کئی سڑکوں کا جال بچھایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ یہاں یہ سڑکیں بھی کئی منزلہ تھیں۔ سڑک کے اوپر سڑک تھی۔ انگریزوں نے زمین کے اندر بھی کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ سرنگیں کھود کر ان میں سڑکیں بنا دی تھیں۔ زیر زمین ٹرینوں کے علاوہ پورے یورپ میں زیر زمین ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔

ہر پاکستانی کی طرح اس کے دل سے بھی یہی آہ بر آمد ہوتی تھی۔ کاش اس کا پاکستان بھی ترقی کے اسی مقام پہ ہوتا؟ مدید ہوتا تو باقاعدہ رو ہی پڑتا۔

"مدید کا دماغ تو الٹا بہتا ہے۔ ڈین ہیگ سے بہتر تھا۔ وہ ہمیں اپنے وطن پاکستان بلا لیتا۔ سنا ہے، وہاں کے نادرن ایریاز جنت کا نمونہ ہیں۔" اس نے ایک گہرا سانس بھر کے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔

"مدید کے شہر میں تمہیں بڑا ہی مزہ آتا۔ تنگ گلیاں، چھوٹے محلے، دھواں، گرد، شور۔" وہ تو کبھی نہ حریر کو پاکستان آنے دیتا۔ اپنے ملک کی شان میں ایک لفظ بھی سننا اسے گوارا نہیں تھا۔ دکھ اسے اپنوں نے دیے تھے۔ دھوکے اسے اپنوں سے ملتے تھے۔ اس میں وطن کا یا وطن کی مٹی کا کوئی قصور نہیں تھا۔

"اور تم اتنے تنگ دل ہو۔ آج تک مجھے اپنے شہر اپنے گھر نہ لے کر گئے۔ یہاں پیرس میں موجود ہو تب بھی نہیں ملتے۔" اچانک حریر کی توپوں کا رخ اس کی سمت ہو گیا تھا۔ اس نے کندھے اچکا دیے۔ وہ مروتاً بھی حریر کو ایسی کوئی دعوت دینے کے حق میں نہیں تھا۔

"اوئے، سنتے ہو؟ ایک اچھی بات یاد آرہی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ٹیکسی سے اترتے ہوئے حریر اس کے بازو میں اپنی کہنی مارتا ذرا قریب ہو تا بول رہا تھا۔ اپنا ہینڈ کیری سنبھالتے ہوئے اس "بد اخلاقی" پہ اس نے حریر کو گھور کر دیکھا تھا، مگر اس پہ کہاں ان گھوریوں کا اثر ہونا تھا۔

"خوش نصیب وہ ہے جو کسی انسان کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ جو کسی کا منتظر ہے۔ سچ تو یہ ہے جس کے دل میں رفاقت کی روشنی ہے۔ وہ کامیاب اور جس کے پاس یہ روشنی نہیں وہ ناکام۔ اے دوست! میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟"

کچھ دیر بعد وہ ایک تمہیدی مکالمہ اس کے منہ پہ مار کے اب بڑی معصومیت سے اجازت لے رہا تھا۔ اس نے گھور کر حریر کی طرف دیکھا اور اپنا سامان اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔ اس حال میں کہ حریر بھی پیچھے پیچھے تھا۔ انڈر گراؤنڈ ٹرین میں اپنی مطلوبہ سیٹ پہ بیٹھنے کے بعد حریر ایک مرتبہ پھر اس کے مقابل تھا۔

"رفاقت کا جذبہ ازل سے انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ کوئی بھی انسان اکیلا نہیں رہ سکتا۔ خاص طور پہ رشتوں کے بنا۔" وہ ایک مرتبہ پھر سے گفتگو کا ٹوٹا سلسلہ بحال کر رہا تھا۔ اس سے بے نیاز کہ سننے والے پہ کیسی کیسی اذیت ناک قیامتیں اتر رہی تھیں۔ "پھر تم اب تک اکیلے کیوں ہو؟ ایک ساتھی کی خواہش

تمہارے دل میں نہیں؟" وہ بڑی سنجیدگی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔ اسے شدید غصہ آیا تھا۔ یہ کون ہوتا تھا؟ اس کی ذاتی زندگی میں گھسنے والا۔ اس کے ادھ کھلے زخموں پہ نمک پاشی کرنے والا۔

آن کی آن میں اس کی آنکھوں کا رنگ لال ہو گیا تھا۔ وہ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں اترتے' ٹوٹتے' بکھرتے کانچ دیکھ رہا تھا۔ اور اس وقت ایک خوف ناک شاک لگا تھا جب حریر نے اس کی شہد بھری آنکھوں کے کونوں کو بھگتے دیکھا تھا۔ حریر کا دل جیسے ـــ کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا تھا۔

"میں اس لیے اکیلا ہوں کہ میرے اندر کسی رفیق کی رفاقت' ہمراہی یا ہم سفری کی خواہش نہیں۔ اگر تمہارے اطمینان کے لیے اتنا جواب کافی ہے تو مزید کوئی سوال مت کرنا۔" کچھ دیر بعد اس نے زہر خند لہجے میں جواب دیا تھا۔ حریر کے سوال نے اس کے اندر ایک بھٹی کو تپا دیا تھا۔ آگ سی آگ تھی۔ اندر پھیلی ہوئی۔ باہر بکھری ہوئی۔ بھڑکی ہوئی۔ انڈر گراؤنڈ ٹرین کے اس پر تعیش ڈبے میں۔ ڈین ہیگ کی طرف بھاگتے رستوں میں... دل کے اندر' دل کے باہر شعلے ہی شعلے تھے۔ ہاں یہ آگ کے شعلے دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل تھے' لیکن یاد رہے دوسروں کی' حریر کی ہرگز نہیں۔ حریر ایک ماہر نفسیات نہ بھی ہوتا تب بھی اس کی قوت مشاہدہ غضب کی تھی' وہ چہروں پہ لکھی تحریروں کے بھید پڑھنے میں ماہر تھا۔ یہ اس کے اندر خداداد صلاحیت تھی۔

"تمہیں زندگی کے ہم سفر کی ضرورت نہیں' لیکن اس کے علاوہ رفیق اور بھی ہوتے ہیں۔ جیسے ماں' باپ' بہن بھائی' احباب....؟" حریر ماہر نفسیات نہیں' ماہر گفتگو تھا۔ ایک شعلہ بیان' مقرر یا چرب زبان ڈاکٹر....؟

اسے لگا اس کے دماغ کی چولیں ہل جائیں گی۔ ایسے سوال تو مدید کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا اور مدید کا یہ دوست؟ جو گلے پڑا ڈھول تھا۔

وہ انتہائی زہر خند لہجے میں "شٹ اپ" کہنے کے بعد ایک میگزین کھول کر بیٹھ گیا تھا۔

"ہوں.... تو یہ بات ہے.... مدید نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ "میرے دوست کے ساتھ ایک گمبھیر مسئلہ ہے۔ محتاط رہنا' اور اسے ستانا مت۔ وہ اندر سے ایک بکھرا ہوا انسان ہے۔" حریر' مدید کی بتائی باتوں کو سوچتا اس کے عالی شان سراپے کو کھوج رہا تھا۔ اپنے مقابل بیٹھے اس یونانی فلموں کے ہیرو کی پراسراریت حریر کے اندر کی متجسس پسند فطرت کو بے چین کر گئی تھی۔

اس نے اپنا چرمی تھیلا نکالا اور ایک ڈائری ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ ڈیٹ یعنی تاریخ کے ساتھ حریر نے سامنے بیٹھی "پرشکوہ" شخصیت کا نام لکھا' کچھ کوائف درج کیے اور ڈائری چرمی تھیلے میں محفوظ کرلی تھی۔ اس ڈائری میں موجود ساری اپائنٹمنٹس کینسل کردی گئی تھیں۔ وہ ایک وقت میں صرف ایک پروجیکٹ پہ کام کرتا تھا اور اس کے سامنے بیٹھا شخص بہت پیچیدہ' بہت مشکل اور بڑا ہی پراسرار پروجیکٹ تھا۔

جسے دیکھیں تو یونان کے شہزادوں ـــ کا گمان ہوتا تھا

جسے چھوئیں تو ایک سراب معلوم ہو۔

جو چلے تو کسی کاشغر کا گمان ہو۔

جو اٹھے تو غرور کا پیکر نظر آئے اور جب جھکے تو عجز و نیاز کے قالب میں ڈھلے۔

☼ ☼ ☼

خوب صورت بیلوں سے ڈھکے گھر کے چھوٹے سے صحن میں جاتے سرما کی سہ پہر بھاگتی جارہی تھی۔ اتنی مختصر سی دوپہریں ہوتی کہ ـــ پتا بھی نہ چلتا اور رات آنگن میں اتر آتی اسے سردی کا موسم اتنا پسند نہیں تھا۔ ٹھٹھر ٹھٹھر کے برا حال ہوجاتا تھا۔ صبح اٹھ کے منہ دھونا بھی عذاب لگتا۔ اگر کالج نہ جانا ہوتا تو وہ صبح سویرے کبھی بھی نہ اٹھتی۔

ویسے بھی گھر کی ساری ذمہ داری آنٹی کے سپرد تھی۔ آنٹی فرزانہ نے اسے کبھی آواز دے کر جگایا تک نہیں تھا۔ وہ الارم لگا کر سوتی تھی اور چھٹی کے دن

اٹھتی ہی نا۔ سردی ہو یا گرمی۔۔۔ سب کاموں کی ذمہ داری آنٹی فرزانہ کے سپرد تھی اور وہ بغیر چتونوں پہ بل دیے سارے گھر کے کام بخوشی کرتی تھیں۔

آج بھی چھٹی کا دن تھا۔ وہ معدوم ہوتی دوپہر میں اٹھی تو آنٹی فرزانہ کو بیسن پہ جھکے الٹیاں کرتے دیکھ کر چونک گئی تھی۔ ان کی رنگت زرد تھی۔ انادیہ کچھ چونک سی گئی تھی۔ آنٹی فرزانہ اسے دیکھ کر ایسے گھبرائی تھیں جیسے کوئی راز طشت از بام ہو گیا تھا۔

"آپ کی طبیعت خراب لگتی ہے۔ ابا سے کہتیں، دوا لا دیتے۔" وہ عام روٹین میں ایسی ہمدرد ہرگز نہیں تھی۔ بس اسے آنٹی کی پتلی حالت پہ ترس آ گیا تھا۔

آنٹی نفی میں سر ہلاتی صحن میں بچھی چارپائی پہ ڈھے گئی تھیں۔

"نہیں، دوا کی ضرورت نہیں۔ ابھی سیون اپ پیتی ہوں تو طبیعت کچھ بہتر ہو جائے گی۔" ان کا لہجہ نرم تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔

پھر انہوں نے سیون اپ پی۔ اور واقعی طبیعت میں افاقہ ہو گیا۔ آنٹی فرزانہ نے اسے اپنے ہاتھ سے ناشتا بھی بنا دیا۔ آنٹی فرزانہ کو عادت تھی کام کرنے کی۔ بیماری میں بھی بیٹھتی نہیں تھیں۔ لیکن رات ابا نے اس سے عجیب بات کہی تھی۔ اس کے لاڈلے ابا نے۔ جنہوں نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا۔

"انادیہ بیٹی! اپنی آنٹی کا اب کچھ ہاتھ بٹا دیا کرو۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔" ابا کے کہنے پہ وہ ہکا بکا سی ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر اس نے منہ بنا کر کہا تھا۔

"میرے پاس وقت نہیں ہوتا ابا! کالج سے آ کر اتنا تھک جاتی ہوں۔" اس کے ٹھنکنے پہ ابا اور آنٹی فرزانہ کا دل پسیج گیا تھا۔

"قاضی صاحب! رہنے دیں۔ بچی کو پریشان نہ کریں۔ میں کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔" جھینپی جھینپی سی آنٹی فرزانہ کے ٹوکنے پہ ابا نے مزید اسے کاموں کے حوالے سے کوئی لیکچر نہیں دیا تھا۔ اور انادیہ کھل اٹھی کہ آسانی سے جان چھوٹ گئی تھی۔ وہ دنیا کی سب سے کاہل اور سست لڑکی تھی۔ قاضی احمد کی صرف دو ہی اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا ناصر اور ایک بیٹی انادیہ۔ ان کی چھوٹی سی کریانے کی دکان تھی۔ گھر کرائے کا تھا، لیکن خوب صورت تھا، ان دنوں کرائے بھی آسمانوں پہ نہیں چڑھے تھے۔

برابر میں ان کے بھائی کا گھر آباد تھا۔ جن کا ایک بیٹا افراہیم تھا۔ جو اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ افراہیم کی ان دنوں بڑی اچھی جاب لگی تھی اور وہ اپنے چھوٹے سے ذاتی مکان میں اپنی ماں کے ساتھ بڑی خوش حال زندگی گزار رہا تھا جب کہ ان کا اکلوتا بیٹا ناصر، افراہیم کے برعکس نہایت غیر ذمہ دار تھا۔ اور ابھی تک کسی کام سے بھی نہیں لگا تھا۔

آج سے پندرہ سال پہلے بیوی کی وفات کے بعد انہوں نے بھائی بھاوج کے مجبور کرنے پر فرزانہ سے شادی کی تھی۔ بلاشبہ فرزانہ ان کے لیے بڑی اچھی رفیق ثابت ہوئیں۔ انہوں نے ان کے دونوں بچوں کو جو اتنے بچے بھی نہیں تھے۔ بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا تھا۔

اور اب شادی کے اتنے سال بعد فرزانہ امید سے ہوئی تھیں۔ اس عمر میں ماں بنتی وہ کیا اچھی لگتیں؟ وہ تو ہمت چھوڑ رہی تھیں مگر قاضی صاحب اور افراہیم کی ماں نے انہیں بڑی ہمت اور تسلی دی۔ ان کی عمر چاہے اتنی نہ تھی مگر قاضی صاحب کی اولاد جوان تھی۔ انہیں بے پناہ شرم آتی۔ اوپر سے انادیہ کو جیسے ہی اس خبر کا پتا چلا۔ اس کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ وہ براہ راست تو کچھ نہیں کہتی تھی مگر اس کی نظریں فرزانہ کو خائف کر دیتیں۔

اور ابھی یہ معاملہ درمیان میں ہی چل رہا تھا۔ جب انادیہ کے یکے بعد دیگرے رشتے آنے لگے۔ وہ اتنی سندر تھی کہ رشتوں کا بارش کی طرح برسنا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ لیکن کل آنے والے رشتے نے فرزانہ کو ہی نہیں انادیہ کو بھی بری طرح سے ٹھٹکا دیا تھا۔ وہ اس وقت ساکت رہ گئی تھی جب فرزانہ نے اسے بتایا تھا۔

"تمہاری کالج کی سہیلی ہے روبا۔ وہ اپنی ماں کے

ساتھ آئی تھی۔ اپنے بھائی کاشف کا رشتہ لے کر۔ تمہارے ابا کو یہ رشتہ بہت پسند آیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں۔ صداقت بھٹی کے گھر بات بن جائے۔"

فرزانہ نے جیسے انادیہ کے سر پر دھماکا کیا تھا۔ اور اسے ہکا بکا چھوڑ کر اندر چلی گئی تھیں۔ جبکہ انادیہ کا پہلے حیرانی پھر غصے اور اشتعال سے برا حال ہو گیا تھا۔

"روبا..." وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔ اس کا دماغ کھولنے لگا۔ "اس روبا کی اتنی جرات؟......" انادیہ غصے کے عالم میں اٹھی اور پھر دیوار پار افراہیم کے گھر ٹیلی فون کرنے چل دی۔ اسے اپنی کسی کالج کی سہیلی سے روبا کے گھر کا فون نمبر لینا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹرین اب ہالینڈ کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ کہاں تک باہر کے مناظر میں کھویا رہتا۔ وہ تصوراتی دنیا کا ایک پیکر سجائے گم رہا، لیکن کب تک؟ حریر بول بول کر اسے خود سے بھی بے زار کر چکا تھا۔ پھر اس کے لاانتہا ہی بے سرو پا سوالات......

"تم اس قدر گم گو کیوں ہو؟" حریر ایک دفعہ بیچ میں اٹھ کر کمپارٹمنٹ کا راؤنڈ بھی لے آیا تھا۔

"تم اتنے باتونی کیوں ہو؟" سوال کے بدلے سوال پہ حریر کا منہ بن گیا تھا۔ پھر اپنے لیے باتونی کا طعنہ بھی اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کا موڈ واضح طور پر بگڑ گیا۔

"میں باتونی نہیں۔ حاضر جواب ہوں۔" حریر نے چبا چبا کر جتلایا تھا۔

"ویسے کیا خیال ہے۔ تم اپنا پروفیشن بدل کیوں نہیں لیتے؟ جس قدر تیز قینچی سی زبان ہے تمہاری۔ دکان داری کرو اور مہینوں میں ارب پتی بن جاؤ۔" وہ اسے جان بوجھ کر "دستا" رہا تھا۔ زچ کر رہا تھا۔

"مجھے ارب پتی بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" اس نے پھولے منہ کے ساتھ جواب دیا تھا۔ جناب کا موڈ آف ہو چکا تھا کافی بھی نہیں پی رہا اسے بڑا ہی لطف آیا۔ ہاں دوسروں کو ستانے میں شاید مزا آتا ہے۔ تب ہی کچھ لوگ عمر بھر اسی مزے کو انجوائے کرتے تھے۔ دوسروں کو ستا کر، جلا کر، کلسا کر، تڑپا کر......

آن کی آن میں اس کی شہد بھری آنکھوں کے کٹوروں میں چبھن دیتی یادوں کے کانچ کھب گئے تھے۔ جو اس کے چھوڑے میگزین کو غائب دماغی سے دیکھ رہا تھا۔

"سنو... حریر...!" اس نے حریر کو اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ اپنی اسودی آنکھوں میں خفگی بھرے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

"تم ایک کامیاب سائیکاٹرسٹ ہو۔ پھر ابھی تک اکیلے کیوں؟" اس کے سوال پہ حریر کے تاثرات بدل گئے تھے۔ بگڑا موڈ کچھ بحال ہوا تھا۔

"رشتوں کی درجہ بندیوں کی وجہ سے.... آسان لفظوں میں ترتیب...." یہ حریر کا پسندیدہ موضوع تھا۔

وہ اس پہ گھنٹوں کے حساب سے بول سکتا تھا۔

"میرے بابا ایک اصول پرست آدمی ہیں۔" بولتے ہیں کہ پہلے بڑی کی ہوگی، پھر تمہاری۔" حریر نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"تمہیں شادی کا بڑا شوق ہے؟" وہ پہلی مرتبہ بڑی دلچسپی کے ساتھ حریر کے چمکتے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"بہت..." حریر ایک جذب کے ساتھ بولا تھا۔

"شوق کیوں نہ ہو۔ ہمارے خاندان میں تو سب دو تین شادیاں کرتے ہیں۔ اتنے ڈھیر سے بچے ہوتے ہیں کہ ان کے نام بھی یاد نہیں رہتے۔" اب وہ خوش دلی سے بتا رہا تھا۔ وہ بغور حریر کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ حریر پل میں دھوپ، پل میں چھاؤں جیسا تھا۔ جبکہ وہ خود کس قدر بے سکون، کس قدر ادھورا اور کس قدر ناخوش تھا۔

کھڑکیوں کے سلائیڈ ہٹ گئے تھے اور ریل اب اونچائیوں سے گزر رہی تھی۔ تاحد نگاہ سبز لبادے کا فرش بکھرا تھا۔ زمین کا کوئی بھی ٹکڑا سبز رنگ سے خالی نہیں تھا۔ خشک، بنجر، بدنما زمین کہیں دیکھنے کو بھی نہیں ملتی۔ کسانوں کے گھر مختصر تھے، لیکن انڈے کی طرح سفید، چمکتے ہوئے اور آس پاس کا ماحول بھی انتہائی شفاف... گھروں کے سامنے ٹریکٹر، کاریں اور جیپ گاڑیاں بھی کھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ یورپ کے دیہات شہروں سے زیادہ خوب صورت ہیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

فرانس کی سرحدیں ختم ہو چکی تھیں۔ بلجیم کا علاقہ شروع تھا اور اس کے بعد اگلی منزل ہیگ تھی۔ جسے ڈین ہیگ بھی کہا جاتا تھا۔

ایسے ہی بے ارادہ اس نے اچانک حریر سے کہہ دیا تھا۔ اس کی پل پل بدلتی شخصیت کی وجہ سے یا پھر ایسے ہی....

"تم کیا ہو حریر!" اس کا اشارہ حریر کی پرسنالٹی کی طرف تھا۔ لیکن حریر بات کو کسی اور طرف لے گیا تھا۔

"میں خوش نصیب ہوں۔ اور خوش نصیبی ایک متوازن زندگی کا نام ہے۔ نہ زندگی سے فرار ہو‘ نہ بندگی سے فرار۔ جانتے ہو خوش نصیب کون ہوتا ہے....

خوش نصیب اپنے آپ سے راضی‘ اپنی زندگی پر راضی‘ اپنے حال پر راضی اور اپنے خدا کی رضا پر راضی رہتا ہے۔"

حریر کے الفاظ نے اسے سرتاپا منجمد کر دیا تھا۔ اسے کچھ دیر پہلے کی اپنی سوچ پہ ترس سا آیا تھا۔

وہ بے سکون تھا۔ وہ ادھورا تھا۔ وہ نامکمل تھا۔ وہ اپنوں کی دھوکا دہی کے ہاتھوں ذلیل ہوا‘ ایسا شخص تھا جو گمنام ملکوں کے چوراہوں میں اپنے دل کا بوجھ اٹھائے زخم زخم پھر رہا تھا۔ وہ ایک شکستہ انسان تھا۔ وہ ایک ناکام انسان تھا۔

"ہاں.... حریر پڑھنا چاہتا ہے تو کوشش کر لے‘ پڑھ لے.... لیکن وہ میرے اندر موجود تاریک کنویں میں سانس لیتی اس شرمناک کہانی کو کبھی پڑھ نہیں سکے گا۔" وہ چہرے پہ پتھریلے تاثرات سجائے سوچ رہا تھا۔ جبکہ حریر کے اندر چھڑی جنگ الگ ہی تھی۔

"تم میری زندگی کا سب سے مشکل ترین کیس ہو۔ اتنی آسانی سے تو نہیں کھلو گے۔" وہ کامل یقین سے سوچ رہا تھا۔ "لیکن میں ایک دن تمہیں جان جاؤں گا۔"

☆ ☆ ☆

یہ گئے وقتوں کی بات تھی۔ جب صداقت بھٹی کا بڑا چلتا ہوا کاروبار تھا۔ پلاسٹک کا ذاتی کارخانہ.... مختصر کنبہ اور ہر طرف آسودگی.... یوں لگتا تھا‘ کوئی دکھ انہیں چھو کر نہ گزرے گا۔

بیٹا پڑھا لکھا‘ فرماں بردار اور بیٹی اس سے بھی زیادہ فرماں بردار.... گھر میں خوش حالی تھی اور وقت بڑا خوش گوار گزر رہا تھا۔ پھر ایسے ہی روبا کی ماں کو بیٹے کی شادی کا ارمان جاگ اٹھا۔ شوہر سے ذکر کیا تو وہ پہلے سے تیار تھے۔ یوں رشتہ ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ روبی کو بیٹھے بیٹھائے اپنی کلاس فیلو انادیہ کا خیال آگیا تھا۔ یوں اماں سے صلاح و مشورے کے بعد ایک دن یہ مختصر سا قافلہ انادیہ کے گھر پہنچ گیا۔ انادیہ کی ماں بڑی رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں۔ بڑے اخلاق اور خوشی سے ملیں۔ رشتے کے سارے کوائف کا علم ہوا تو انہیں کاشف کا رشتہ دل کو لگا۔ روبی اور اس کی اماں خوشی خوشی گھر لوٹے تھے۔ کیونکہ انادیہ کے گھر والوں کا رویہ بڑا حوصلہ افزا تھا۔

لیکن اگلے دن کچھ عجیب ہوا۔ روبی صبح کالج گئی تو انادیہ کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ روبی کچھ پریشان ہوئی تھی۔ جانے انادیہ کو کیا برا لگا تھا۔ روبی کچھ خائف سی ہو گئی تھی۔ انادیہ نے اس سے سیدھے منہ بات ہی نہ کی تھی۔ فری پریڈ ہوا تو روبی انادیہ کے پاس آگئی۔ انادیہ کتاب کھول کر بیٹھی تھی۔ حالانکہ اس کا پڑھائی کی طرف دھیان نہیں تھا۔ بس خود کو مصروف ظاہر کر رہی تھی۔

روبی نے بڑی نرمی اور حلاوت سے پوچھا۔

"کیا بات ہے انادیہ! تمہارا موڈ کیوں آف ہے۔ کیا ہمارا آنا برا لگا تمہیں؟" انادیہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ ان آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ ناسمجھ سی روبی سمجھ ہی نہیں پائی تھی۔

"ہاں.... برا لگا۔" انادیہ کے الفاظ نے روبی کو منجمد کر دیا تھا۔ کوئی اتنا بھی صاف گو ہوتا ہے؟ روبی کو یقین ہی نہ آیا۔ وہ یک ٹک انادیہ کے خوب صورت چہرے کو دیکھتی رہ گئی۔ وہاں بہت سے احساس رقم تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا‘ روبی کے پاس ان احساسات کو سمجھنے

والی نظر ہی نہیں تھی۔ وہ اس وقت انادیہ کے چہرے پہ لکھی تحریر کو پڑھ لیتی تو زندگی میں اتنے الجھاؤ کبھی نہ آتے۔

"کیا... واقعی...؟" اس کا چہرہ پھیکا سا پڑ گیا۔

"اسٹامپ پیپر پہ لکھ کر دوں۔" انادیہ نے تلخی سے کہا تھا۔ روبی اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اب بات کیا کرے؟ پھر بھی اس کے منہ سے بے ساختہ "کیوں؟" نکلا تھا۔

"ہر "وجہ" بتانے والی نہیں ہوتی اور نہ ہر "کیوں" کا کوئی جواب ہوتا ہے۔" وہ تلخی سے کہتے ہوئے اپنی کتابیں سمیٹنے لگی تھی۔

روبی ہکا بکا رہ گئی تھی۔ پھر اس نے اٹھتی ہوئی انادیہ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور یہ عمل بڑا ہی بے ساختہ تھا۔ انادیہ نے اک نظر اپنے ہاتھ پہ ڈالی جو روبی کے نازک سے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور دوسری نگاہ اس کے چہرے پہ جمائی۔ وہاں پہ الجھن تیر رہی تھی۔

"لیکن کبھی کبھی وجہ بتانی پڑتی ہے۔ اس طرح انسان بہت ساری الجھنوں سے بچ جاتا ہے۔ خود بھی اور دوسرے بھی..." روبی نے رسانیت سے جتایا تھا۔

انادیہ اسے دیکھتی رہی۔ عام سی روبی اور عام سے نقوش... اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ملاحت اور صباحت کے۔ انادیہ کو عجیب سا حسد ہوا۔ جانے کیوں؟

"اچھا..." انادیہ کا انداز تلخ سا ہو گیا تھا۔ پھر اس پہ نگاہ ڈال کر اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی تھی۔

"اگر یہ بات ہے تو سن لو... وجہ تم خود ہو..." انادیہ نے یہ الفاظ کہے اور اپنی چیزیں اٹھا کر چلی گئی تھی۔ اس حال میں کہ روبی بت بن گئی تھی۔ اتنی حیران اور ساکت جیسے کوئی مجسمہ ہو۔

✲ ✲ ✲

دھوپ دیواروں پہ پھر رہی تھی۔ سائے لمبے ہونے کا وقت تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔

اماں نماز والے تخت پہ بیٹھی نماز عصر ادا کر رہی تھیں۔

ابا کارخانے میں تھے اور کاشف بھائی اپنے دفتر... واپڈا میں بڑی اچھی جاب پہ تھے اور رات دیر سے گھر آتے تھے۔ روبی اس وقت آب خوروں میں پانی بھر کے چڑیوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے مٹی کے گھڑوں میں ٹھنڈا پانی بھرا تھا۔ گھڑونچی کو دھو کے گھڑے اور سیٹ کر کے رکھ دیے تھے۔ پھر سوئی دھاگا لے کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے سامنے ٹوکری میں موتیا کے پھول تھے۔ جنہیں دھاگے میں پروتے ہوئے بھی اس کا دھیان انادیہ کی طرف تھا۔

"انادیہ کو ہمارا اس کے گھر جانا برا لگا۔ میں نے پوچھا کیوں... تو اس نے کہا۔ وجہ تم خود ہو..." "میں "وجہ" کیسے ہو سکتی ہوں؟ یہ کوئی بات ہے کیا؟ میرا کیا قصور؟ بس اتنا ہی کہ اپنی اماں کو اس کے گھر لے گئی۔ انادیہ کو یہ اچھا نہیں لگا۔ کیوں اچھا نہیں لگا؟ اس کی اماں تو بہت خوش تھیں۔ کہیں انادیہ کہیں اور تو خواہش مند نہیں؟"

اس کا الجھا ذہن بہت سے مفروضوں میں الجھا ہوا تھا اور دھیان کا پنچھی نہ جانے کہاں کہاں اڑ رہا تھا۔ یوں ہی سوئی اس کی انگلی میں بے دھیانی میں کھب گئی تھی۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ "سی" کی آواز نکلی۔

"روبا! دھیان سے میری بچی..." اماں اس کی تکلیف پہ تڑپ سی گئی تھیں۔ اماں کی محبت پہ روبی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"یہ مائیں بھی نا... اتنی سی تکلیف پہ تڑپ اٹھتی ہیں اور جانے نصیب میں کتنی تکلیفیں لکھی ہوتی ہیں۔" اس کا دل جانے کیوں بھر آیا تھا۔ انادیہ کے تلخ رویے کی وجہ سے یا اماں کی محبت پہ؟

انادیہ اس کی اچھی سہیلی تھی۔ جانے کیوں کاشف بھائی کے لیے انادیہ کا خیال اس کے ذہن میں آ گیا تھا۔ دراصل انادیہ کا حسن و جمال ہی ایسا تھا۔ جو دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا اور یہ کوئی انہونی تو نہیں تھی۔ جس گھر میں بیری ہو، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ پھر اس میں برا ماننے والی کیا بات تھی؟ اسے انادیہ کے عجیب رویے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

اماں بہت دیر سے تسبیح کے دانے گھماتی اسے دیکھ رہی تھیں۔ پھر ان سے رہا نہیں گیا۔ انہوں نے بے ساختہ روبی کو ٹوک دیا تھا۔

"روبا! کدھر کھوئی ہو بیٹا! کوئی سبزی' ہانڈی کا کرلو' دیکھو تو دن ڈھل رہا ہے۔"

"جی اماں!" اس نے گجرے پرو کر گھڑوں کے منہ پہ ڈال دیے تھے۔ بھینی بھینی سی خوشبو چہار سو پھیل گئی تھی۔ وہ اٹھی تو اماں نے اسے اپنے قریب بلا لیا تھا۔

وہ ان کے قریب تخت پہ بیٹھ گئی تھی۔ اماں نے اس کی موہنی سی صورت دیکھی اور کچھ پڑھ کر پھونک ماری۔

"کیا بات ہے روبا؟ کیوں پریشان ہو۔" اماں نے بالآخر پوچھ ہی لیا تھا۔

"اماں! ایسے ہی....." وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ اماں کو کیسے بتائے؟ اور بتائے بھی کیا؟ انادیہ نے کوئی ٹھوس وجہ تو بتائی ہی نہیں تھی۔ پھر کچھ سوچ کر آہستہ سے بولی۔

"اماں! انادیہ کے گھر والوں نے کوئی جواب نہیں دیا؟ بھائی کو دیکھنے بھی نہیں آئے۔ اس کی اماں تو بہت خوش لگ رہی تھیں۔"

"تو اس بات پہ پریشان ہے میری بچی۔" اماں نے پیار سے کہا۔ "رشتے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔ کیا خبر' ان کا ارادہ نہ ہو۔ تمہارے ابا کسی اور جگہ کا بتا رہے تھے۔ کیا پتا وہاں لکھی ہو ماشاء اللہ میرے کاشف میں کیا کمی ہے۔" اماں کا انداز سمجھانے والا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اماں کو انادیہ کے عجیب و غریب رویے کا بتا نہیں سکی تھی۔ بتانے کے لیے تھا بھی کیا؟ لیکن آئندہ آنے والے دنوں میں کچھ ایسا ہو گیا تھا جس نے روبی کو شاک میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

موسم آج بھی گرم تھا اور شاید گرم ہی رہتا' لیکن یورپ سے آتی ہواؤں نے ایک دم چہار جانب ٹھنڈک کر دی تھی۔ پہلے ٹھنڈی ہوا اور پھر تیز آندھی اور بعد میں موسلا دھار بارش..... موسم تو کیا کمال کا ہوا۔ پورے گھر میں پتے' گرد اور کوڑا کرکٹ اکٹھا ہو گیا تھا۔ اوپر سے کاشف بھائی کی فرمائش.....

"روبا! پکوڑے بنا دو..... کیا آفت موسم ہے۔" وہ حکم دے کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور روبا آفت موسم کی "آفتوں" کو سمیٹنے کا کام موقوف کر کے کچن میں چلی گئی تھی جب کاشف بھائی کی آواز آئی تھی۔

"روبا! تمہاری کسی سہیلی کا فون ہے۔" کاشف بھائی کے پیغام نے روبی کو حیران کر دیا تھا۔ اس کی کون سی ایسی سہیلی تھی جس نے فون کیا تھا؟

اور یہ وہ زمانہ تھا۔ جب فون اتنے عام نہیں تھے۔ اکثریت ٹیلی فون ایکسچینج جا کر بہت ضروری فون کالز کرتی تھی۔ کاشف بھائی کی "افسری" کے ساتھ ہی ان کے گھر ٹیلی فون لگا تھا۔ واپڈا کالونی میں یہ سہولت عام تھی۔ وہ اپنا چھوٹا سا گھر کرائے پہ چڑھا کے واپڈا کالونی شفٹ ہوئے تو فون کے ساتھ اور بھی سہولیات میسر آ گئی تھیں۔

وہ حیران حیران سی فون تک آئی تو دوسری طرف انادیہ کی آواز سن کر حیران رہ گئی تھی۔ انادیہ نے اسے کال کی تھی؟ روبی کو بہت خوشی ہوئی تھی۔

"تم نے کیسے یاد کر لیا؟" روبی نے اندرونی خوشی چھپاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"بس ایسے ہی....." وہ الجھی الجھی لگی تھی۔ روبی اپنی خوشی میں سمجھ نہ سکی۔ وہ کیوں اتنی الجھی ہوئی تھی اور اس کا عجیب سا سوال..... وہ تو پریشان سی ہو گئی تھی۔ نادیہ نے باتوں باتوں کے دوران ہی پوچھا تھا۔

"کیا تمہارا کہیں رشتہ طے ہے روبا؟" اس کے سوال نے روبی کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ یہ کیسا سوال تھا۔ اور انادیہ نے کیوں پوچھا؟ اس کی جہاں تک معلومات تھیں۔ انادیہ کا ایک ہی بھائی تھا۔ جس نے اپنی کزن سے لو میرج کی تھی۔ یعنی اس کا بھائی شادی شدہ تھا۔ تو پھر یہ سوال؟

"نہیں تو..." روبی کے جواب نے انادیہ کو شاید بہت مایوس کیا تھا اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا تھا۔

"میں نے سمجھا... تم کہیں انگیجڈ ہو گی۔" انادیہ کی آواز میں شکستگی تھی۔

"تم نے ایسا کیوں سمجھا؟" روبی نے حیرانی چھپا کر پوچھا تھا۔

"بس ایسے ہی... تمہاری فیملی میں تو جلدی رشتے طے کر دیے جاتے ہیں۔ تمہاری اماں اس دن بتا تو رہی تھیں۔ میں نے سمجھا' تمہارا بھی رشتہ طے ہو گا۔" انادیہ کے اگلے الفاظ نے روبی کو کچھ سوچنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ پھر ایسے ہی روبی نے بھی انادیہ سے سوال کر ڈالا تھا۔

"تمہاری اماں نے تو ہمیں کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ نہ اقرار نہ انکار... اماں اسی انتظار میں ہیں۔ اگر کوئی جواب ملے تو بات آگے بڑھائیں۔"

"آں... ہاں..." انادیہ باقاعدہ چونکی تھی۔ پھر جھنجلا سی گئی۔

"مجھے کیا پتا۔ اماں' ابا کو ہی خبر ہو گی۔" اس نے بے ربط انداز میں کہا۔ وہ شاید فون بند کرنا چاہتی تھی' جب روبی کے اگلے الفاظ نے اسے ٹھٹکا دیا تھا۔

"اچھا... پھر... میری اماں تمہارے گھر جواب لینے آئیں گی۔"

انادیہ لمحہ بھر کے لیے چپ سی ہو گئی تھی۔ پھر اچانک بولی۔

"ابھی اپنی اماں کو روک دو۔" انادیہ نے صرف اتنا کہا اور کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔ جبکہ روبی ہکا بکا سی فون کی ٹوں ٹوں سنتی رہ گئی تھی۔ معاً" کاشف بھائی کا ادھر سے گزر ہوا تو... اس کو بت بنا دیکھ کر رہ نہ سکے۔

"کیا ہوا اروبا؟"

"کچھ نہیں بھائی..." وہ گڑبڑا گئی تھی۔ پھر جلدی سے ریسیور رکھ کر کچن میں چلی آئی۔ تب ہی اماں نے کچن میں آکر اسے بے ساختہ ٹوکا تھا۔

"گھر کا نمبر سہیلیوں کو کیوں دیا؟ کاشف کو اچھا نہیں لگا۔" اماں کے ٹوکنے پہ روبی شرمندہ ہو گئی تھی۔ پھر اس نے فوراً" ہی نفی میں سر ہلایا تھا۔

"میں نے نہیں دیا تھا۔ بلکہ آپ نے خود دیا تھا۔" روبی کے بتانے پہ اماں ذرا ہونق ہوئیں۔

"میں نے دیا؟ کس کا فون تھا بھلا؟" انہوں نے پوچھا۔ روبی نے گہرا سانس بھرا اور دھیمی آواز میں بتایا۔

"انادیہ کا..." اس کے بتانے پہ لاؤنج سے گزرتے کاشف نے بھی چونک کر کچن کی طرف دیکھا تھا۔

"انادیہ..." اس کے ہونٹ بے آواز ہلے تھے۔ یہ وہ نام تھا جو کچھ دنوں سے ان کے گھر میں ہاٹ ٹاپک بنا ہوا تھا۔ انادیہ کے نام کے ساتھ ہی ایک ان دیکھی حسینہ کا تصور ذہن میں اتر آتا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ انادیہ کے حسن کی تعریف سن رہا تھا۔ ایک فطری سی کشش نے اسے کئی دنوں تک مسحور رکھا تھا۔ وہ اس کی میٹھی' مدھر سی آواز کو کئی دنوں تک اپنے اردگرد محسوس کرتا رہا۔ یہ کشش بے معنی ہرگز نہیں تھی۔ یہ احساس بے نام ہرگز نہیں تھا۔ اس "احساس" کا ایک نام تھا جسے محبت کہتے تھے اور بڑا ہی غلط کہتے تھے۔

☆☆☆

آسمان بادلوں سے ڈھکا تھا جب وہ کلاس روم سے باہر نکلی تھی۔ وہ کتابیں سینے سے لگائے گراؤنڈ میں آگئی تھی۔ اس کی متلاشی نظروں نے انادیہ کو تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ انادیہ کے علاوہ کالج میں کم ہی اس کی کسی سے سلام دعا تھی۔ کچھ دیر بعد اروما اس کے قریب آگئی۔

"تم انادیہ کو ڈھونڈ رہی ہو۔"

"ہاں..." روبی نے مایوسی سے دور تک لڑکیوں سے بھرے گراؤنڈ کو دیکھا۔ انادیہ اسے کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

"وہ تو کلاس روم سے سیدھی گیٹ کی طرف گئی ہے۔" اروما کے بتانے پہ روبی کو قدرے حیرت ہوئی۔

"اتنی جلدی..." اس نے گھڑی پہ نگاہ ڈالی۔ ابھی تو چھٹی میں کافی وقت تھا۔

"ہاں... پیریڈ تو اب فری ہیں۔ اس کا کزن لینے آگیا۔ تمہاری وین تو دیر سے آئے گی۔ میں تمہیں ڈراپ کردوں؟" اروما کی آفر پہ وہ سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ اسے تذبذب میں ڈوبے دیکھ کر اروما نے پھر سے کہا۔

"سوچنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ ابھی تو گرمی ہو جائے گی۔ یہ بادل دو گھڑی کے ہیں۔ اتنی دیر فضول میں بیٹھنا ہے۔"

"چلو... ٹھیک ہے۔" روبی نے ہامی بھرلی تھی۔ پھر وہ دونوں اکٹھے ہی گیٹ سے باہر نکلیں۔ سوئے اتفاق بلیک گاڑی کے پاس اسے انادیہ کھڑی نظر آگئی تھی۔

اس کے قریب ایک ماڈرن سا ہینڈسم لڑکا کھڑا تھا۔ روبی نہ جانے کیوں رک سی گئی تھی۔ یہ لڑکا دیکھا دیکھا لگ رہا تھا۔ جانے اسے کہاں دیکھا تھا؟ اور اسی پل انادیہ کی نگاہ اس کی طرف اٹھی تھی اور یک دم جیسے ٹھٹک گئی۔ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اس لڑکے نے بھی روبی کی طرف دیکھا تھا اور جیسے بے بس ہو گیا۔ اس کی نگاہ تھی کہ ہٹ ہی نہیں رہی تھی اور روبی اس نگاہ کے "اثر" سے اتنی خوف زدہ ہوئی کہ جلدی سے اروما کی اوٹ میں ہوتی اس کی گاڑی کے اندر گھس گئی۔

"یہ کون تھا؟" بہت دیر بعد وہ اروما سے پوچھنے کے قابل ہو سکی تھی۔ اس کا دھڑکتا دل کسی طور قابو میں نہیں آرہا تھا۔

"انادیہ کا کزن ہے... افراہیم نام ہے اس کا... بہت اچھی جاب ہے۔ اس کے تایا کا بیٹا۔" اروما نے باقی تفصیل بھی فراہم کردی تھی۔ اسے یاد آگیا تھا۔ اس نے انادیہ کے کزن کو کہاں دیکھا تھا۔ انادیہ کے گھر میں ہی... ان کے گیٹ پہ... اس لڑکے نے اماں کو سلام بھی کیا تھا اور اس کی نگاہیں؟ روبی کا دل ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔

گھر آکر بھی وہ اس کی نگاہوں کے حصار میں رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آنکھیں ابھی تک اسے دیکھ رہی ہیں۔

وہ پورا دن کھوئی کھوئی رہی۔ کسی بھی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ اماں نے بھی محسوس کرلیا۔

"روبا! کیا پریشانی ہے؟ کیا سوچتی ہو؟ ایسی گپ چپ تو نہ تھی۔" اماں کے ٹوکنے پہ وہ دھک سے رہ گئی تھی' تو کیا اس کا چہرہ کھلی کتاب تھا؟

"اماں! ایسے ہی انادیہ کو سوچ رہی تھی۔ مجھے نہیں لگتا' وہاں بات بن سکے۔" اس نے فوراً" گفتگو اور سوچوں کے رخ کو موڑ دیا تھا۔ اماں اسے بڑی سنجیدگی سے دیکھتی رہیں۔ کیا یہ ہی وجہ تھی روبا کی خاموشی کی؟ انہیں یقین تو نہیں آیا تھا' پھر بھی سر جھٹک کر بولیں۔

"میں تو اول روز سے جان چکی تھی۔ وہاں بات نہیں بننے والی۔ اب سوال ڈالا ہے' جواب تو لینا ہی ہے۔" اماں نے اسے خشک ہوئی سبز مرچوں کی پرات لانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ اماں کا اس سے دھیان ہٹ گیا تھا۔ یہ ہی غنیمت تھا۔ لیکن روبا کا دھیان نہیں ہٹ رہا تھا۔ کسی طور بھی نہیں۔ رات جب بستر نصیب ہوا تو وہی سوچیں دامن کو چمٹ گئیں۔ انادیہ کا الجھا دینے والا رویہ... اس کی فون کال... اور اس کے الفاظ...

"وجہ تم خود ہو..."

بھلا روبی اس کے اکھڑے رویے کی وجہ کیسے ہو سکتی تھی؟ اس کا سادہ سا' صاف ستھری سوچوں والا دماغ حل نہیں کرپا رہا تھا۔ تب اچانک ہی وہ ہو گیا تھا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بلکہ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

عندلیب زہرا

آبنوسی رنگ کا دروازہ ہمیشہ مقفل ہی رہتا۔ مجھے خواہش تھی کہ کبھی تو یہ دروازہ وا ہو اور میں دیکھ سکوں کہ اندر کیا ہے؟

وہی ازلی تجسس.... دن پر دن گزرتے گئے۔ مقفل دروازے پر ہلکی سی گرد کی تہ جمتی گئی اور میری نگاہ مایوسی کی ردا اوڑھنے لگی۔

آخر دعائیں مستجاب ہو ہی گئیں۔ ایک روز یوں ہی نگاہ پڑی تو دیکھا کہ دروازہ ہلکا سا وا تھا۔

میں دبے قدموں اندر داخل ہو گئی۔ ملگجا سا اندھیرا تھا۔ قد آدم کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور باہر شام کا سناٹا اداسی اور مایوسی میں لپٹا ہوا تھا۔ رائٹنگ ٹیبل پر کچھ صفحات اور فائلیں بکھری ہوئی تھیں۔ چائے اور کافی کے کپ یوں ہی دھرے تھے۔ جن پر ہلکی سی تہ جمی تھی۔ قلم کی سیاہی سوکھ چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی لکھتے لکھتے ابھی اٹھ کر گیا ہے۔

"کوئی ہے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ہلکی ہلکی ہوا کی سرسراہٹ تھی اور پھر خاموشی....

"کوئی ہے؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔ اچانک دھیمی دھیمی سرگوشیوں کی آواز آئی۔ پھر وہ آواز قدرے بلند ہوتی گئی اور ٹیبل پر رکھی اشیا میں ارتعاش پیدا ہونے لگا۔ پیپر ویٹ کسمسانے لگا۔ پوائنٹر، قلمدان، اسکیل اور دیگر اشیا ادھر ادھر گرنے لگیں۔ میں نے ہمت کر کے قدم آگے بڑھائے۔

"تو یہ سرگوشیاں، ارتعاش ٹیبل پر دھرے صفحات اور فائلز میں برپا تھا۔" میں نے ہمت جمع کر کے ایک فائل اٹھائی۔ پڑھنے کی غرض سے اسے کھولا تو دیکھا چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر فائل ٹیبل پر رکھ دی اور پانی کے قطرے خود پر سے جھٹکنے لگی۔ یہ ساون اور پکوان کی مہک، آگے بڑھ کر فائل میں جھانکا تو راحت جبیں کا ساون کے موسم کے رنگ اوڑھے ادھورا ناول اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ دلچسپی سے صفحات کا پلندہ اٹھا لیا۔ جھومتے بادل، تیز ہوائیں۔

بارش کی تیز بوچھاڑ میں من چلی، لاپروا سی لڑکی بھاگ رہی تھی۔ میں پوری دلچسپی کے ساتھ اس میں کھو گئی کہ اچانک ٹرین کی سیٹی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ دیکھا تو پاس پڑے بکھرے صفحات پر ہیروئن ٹرین میں سوار شادی میں شرکت کے لیے اندرون پنجاب کی طرف جا رہی تھی۔ سہیلیوں کی نوک جھونک، چٹکلے، لطیفے، بدحواسیاں، حماقتیں، دادی اور نانی کی کڑی نگاہ، شرارتی سا ہیرو، ماؤں کی گھرکیوں کے باوجود ٹھی ٹھی کرتی کم عمر ہیروئن، پراٹھے، اچار، ٹرین کی کھڑکی سے سارا منظر اتنا دلچسپ تھا کہ میں ساون کے پکوان بھول کر اندر جھانکنے لگی۔ لیکن یہ کیا؟

خالی صفحات، ادھورے قصے، میں نے صفحات الٹ پلٹ کیے تو اوپر "ثمرہ بخاری" کا نام جگمگا رہا تھا۔ ایک کونے میں جوادی اور شبلی اداس بیٹھے قلم کو تک رہے تھے۔

"ارے آپ...!" میں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ "ہم سب قارئین آپ کو مس کرتے ہیں۔" میرا جوش و خروش دیدنی تھا۔

"ہم تو خود آپ سب سے ملنے کو بے چین ہیں۔ اپنے نئے کارناموں کے ساتھ اور نانا، ماموں بھی آنا

چاہتے ہیں۔ لیکن ثمرہ آپی کو فرصت ہی نہیں ملتی۔" جوادی نے ہونٹ لٹکا کر شکوہ کیا۔

"ہم تو ہر روز قلم کو آس بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ صفحات پر نگاہ دوڑاتے ہیں۔ لیکن آپی تو ہمیں بھول ہی گئیں۔" شبلی کا لہجہ بھی گلوگیر ہو گیا۔

ان کے گلے شکوے شاید یوں ہی جاری رہتے کہ اچانک ایک ڈائری نیچے گر پڑی۔ میں نے اٹھائی تو اس میں سے زور زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"شش..." میں نے شبلی اور جوادی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دونوں سر جھٹک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

"کون ہے... کیا ہوا؟" میں نے گھبرا کر استفسار

کیا۔ کان ذرا مزید کھڑے کیے تو معلوم ہوا عون اور زارا کے جھگڑوں کی آوازیں آرہی تھیں، کچھ معاشرتی مسائل اور کردار اپنے اظہار کے لیے فریاد کررہے تھے۔ میں نے ڈائری کو اٹھا کر ٹیبل کی سائیڈ پر رکھا تو اس پر فائزہ افتخار کا نام جگمگا رہا تھا۔ میں نے پیپرویٹ اس کے اوپر رکھ دیا۔ شور ذرا سا تھم گیا۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا تو خوب صورت پھولوں، رنگوں اور دل فریب انداز سے سجی فائل نے یک دم میری توجہ اپنی جانب کھینچی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو ایلیٹ کلاس کے کردار پاستا اور اٹالین پزا سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ جبکہ ایک معصوم محبتوں سے گندھی، جذباتی سی لڑکی اداسی سے چہل قدمی کررہی تھی۔ بے حد ہینڈسم، بلیک تھری پیس میں ملبوس، جیل سے جمائے ہوئے بال، ایک ڈیسنٹ شخص بار بار گھڑی پر نظر دوڑا رہا تھا۔ یہ "فرحت اشتیاق" کی فائل تھی۔ ادھورے ناول بھول جانے والے وعدے... "فرحت آپی آپ بھی...!"

اچانک کافی کے کپ پر نگاہ پڑی تو اپنی سیاہی، سیانے سے ملکی حالات پر زور و شور سے بحث کررہی تھی۔ مجھ پر ایک خفا سی نظر ڈالی اور سابقہ مشغلے میں مصروف ہوگئی۔ (انیسہ سلیم! ہاں وہ رائٹر جن کا قلم سیاسی حالات پر بے ساختہ تبصرے کرتا تھا)۔

آخر ان تحریروں کی خالق کہاں کھو گئیں؟ اپنے ادھورے کردار اور ناول چھوڑ کر کیا انہیں نہیں معلوم کہ ادھورے کام، ادھورے دکھ اور آس، انسان کو کتنا توڑ کر رکھ دیتے ہیں چاہے وہ قاری ہو یا لکھاری....

کچھ صفحات میں سے نقرئی گھنٹیوں اور خوب صورت مدھ بھرے جملے سر بکھیر رہے تھے۔ کستوری کی خوشبو فضا میں محسوس ہورہی تھی۔ (آہ! رفعت سراج کے افسانے)۔

کسی فائل میں سے حب الوطنی پر مشتمل گفتگو، فوجی بھائی گھن گرج کے ساتھ کررہے تھے (اوہو! ساجدہ حبیب کی کاوش)۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

ہما کوکب بخاری، فارحہ ارشد اور عالیہ بخاری کے لکھے ادھورے صفحات خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ ایک فائل میں سے لے میں پڑھتا عبداللطیف بھٹائی کا کلام اداسی میں اضافہ کررہا تھا۔ (کنیز نبوی سندھ کے رسم و رواج اور بھٹائی کے کلام سے روشناس کرواتے کرواتے جانے کہاں کھو گئیں۔)

میں نے مایوسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ شاید کسی لکھاری بہن سے ملاقات ہوجائے۔

لیکن کمرے میں اداسی تھی۔ انتظار تھا۔ آس تھی۔ معلوم نہیں یہ اداسی.... انتظار اور آس قارئین کی تھی یا ان کرداروں کی، جو ہر ماہ انتظار کرتے ہیں کہ مصنفین کی ایک نظر کرم ہوجائے۔

اچانک کھٹکا ہوا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ تخیل ٹوٹ گیا تھا یا خواب تھا جو بکھر گیا تھا۔

دروازہ اب بھی مقفل تھا۔ ہلکی سی گرد کی تہ تھی، جس نے سنہری ناب کو دھندلا دیا تھا۔ آبنوسی دروازہ سختی سے بند تھا۔ میں نے خاموشی سے قدم آگے بڑھا دیے۔

☼

نبیلہ عزیز

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔

ولید‘ ماورا کے سامنے والے صوفے پہ گم صم اور ساکت سا بیٹھا ماورا سے سنی ہوئی داستان پر یقین کرنے اور نہ کرنے کے بیچ ڈول رہا تھا۔

کہاں کہ جو کچھ وہ بتا چکی تھی‘ وہ قابل فراموش تو نہیں تھا۔

رضا حیدر... علی مرتضیٰ کے قاتل تھے.... عافیہ بیگم اور ماورا مرتضیٰ کے مجرم تھے اور قاتل اور مقتول کی اولادیں محبت میں گرفتار تھیں۔

معاملہ کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں پہنچا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا‘ سب عقل اور سمجھ سے باہر کی باتیں تھیں۔ ولید کی پُرسوچ آنکھیں پنپنا رہی تھیں۔

”بتاؤ ولید! میرا ساتھ دو گے؟ مجھے تیمور حیدر واپس چاہیے.... ہر حال میں....“ ماورا التجا بھی کر رہی تھی تو ایک ضد‘ ایک ہٹ دھری کے ساتھ۔

تینتیسویں قسط

”تمہاری زبان پہ میرا نام بھی آئے مجھے یہ بھی گوارا نہیں....“ وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا تھا۔ اور ماورا تو جیسے مزید گنگ ہو کے رہ گئی تھی‘ وہ حد درجہ متنفر اور بدظن ہو چکا تھا اس کے اندر کی بدگمانی اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اور اس پل ماورا کو لگا وہ تیمور حیدر کے سامنے اس کے قدموں کی دھول بھی بن جائے تب بھی وہ اس کا اور اس کی محبت کا یقین نہیں کرے گا۔

آخر اسے ٹھوکر ہی ایسی لگی تھی کہ اب یقین کی گنجائش ہی نہیں نکلتی تھی اور ماورا اس کی بے یقینی اور بدگمانی کے خیال سے ایک بار پھر جیسے تڑپ اٹھی تھی۔

"تت..... تیمور..... آپ....." اس نے لب وا کیے....

"خاموش....!" وہ ایک دم دھاڑا..... "ایک لفظ بھی نہیں..... میں مر جاؤں تب بھی نہیں..... اور بہتر یہی ہے کہ تم کبھی میرے سامنے مت آنا..... ورنہ تمہیں نہ مار سکا تو خود کو مار لوں گا۔" تیمور انتہائی نفرت سے کہتا اس کے چہرے کو اک جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے اس کے سامنے سے ہٹا اور باہر نکل گیا۔

اور ماورا خاک ہو کے رہ گئی..... اسے اپنے جبڑے کی تکلیف بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تیمور....!" ولید کوریڈور میں ہی ٹکرا گیا تھا۔

"میرا راستہ چھوڑو....." تیمور کا لہجہ اجنبیت لیے ہوئے تھا۔

"پاگل ہو گئے ہو..... یہ کیا ہوا ہے..... کہاں جا رہے ہو.....؟" ولید اس کے ہاتھ سے بہتا خون اور کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھ کر اچھا خاصا بوکھلا گیا تھا۔

"تم نے اس کو کیوں بتایا.....؟ کیوں بلایا یہاں.....؟ کیا تم اکیلے میری دیکھ بھال نہیں کر سکتے تھے..... کیا مر گیا تھا میں..... میری لاش پہ بلا لیا اس کو.....؟" تیمور کا دماغ مکمل طور پر الٹ چکا تھا اس کے منہ میں جو آ رہا تھا وہ بولے جا رہا تھا.....

"وہ بار بار تمہارے لیے فون کر رہی تھیں۔ تمہارا پوچھ رہی تھیں۔ میں نے بتانا تو تھا ہی۔ کیسے چھپا سکتا تھا۔" ولید نے صفائی پیش کرنا چاہی۔

"ٹھیک ہے تم نے جو کیا اچھا کیا..... مجھے اجازت دو....." تیمور بیگانگی کی حد کر رہا تھا۔

"اجازت.....؟ مطلب.....؟ کہاں جا رہے ہو.....؟" ولید ٹھٹکا تھا۔

"وہاں جہاں اس کا ولید رحمان جیسا کوئی خیر خواہ نہیں ہو گا....." تیمور کا لہجہ انتہائی زہر خند تھا۔

"ولید رحمان صرف ان کا ہی خیر خواہ نہیں ہے..... تمہارا بھی ہے..... پہلے تیمور حیدر..... بعد میں کوئی اور..... کیونکہ ان سے جو رشتہ ہے وہ تم سے ہی تو ہے..... ہمارا تعلق تم سے شروع ہوتا ہے..... اور تم پہ ختم....." ولید نے اس کو دلیل سے سمجھانے کی کوشش کی تھی.....

"تو جب میرا ہی کسی سے تعلق نہیں تو تم کون سا تعلق نباہ رہے ہو.....؟" اس نے غصے سے زچ ہو کر پوچھا۔

"کیونکہ وہ تمہارے نکاح میں ہیں..... بیوی ہے وہ تمہاری..... اور تمہارے اس تعلق اور اس رشتے کے حوالے سے میرا حق بنتا ہے کہ میں مشکل وقت میں ان کا ساتھ دوں۔" ولید نے بھی غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تو ٹھیک ہے پھر..... دو ساتھ۔ جتنا ہو سکے دو۔ میں جا رہا ہوں۔" تیمور سرکشی پر اترا ہوا تھا۔

"لیکن کہاں؟" ولید بھی غصے میں تھا۔

"مجھے خود بھی نہیں پتا....." وہ کہہ کے آگے بڑھا۔

"تیمور۔ تیمور۔" ولید نے یک دم پیچھے سے پکارا۔ "تم مجھے چھوڑ کے جا رہے ہو۔ تمہیں ہماری دوستی کا بھی خیال نہیں؟" ولید کے لہجے میں دکھ تھا اور تیمور کے قدم رک گئے تھے۔

"جو شخص گھر اور گھر والوں کو چھوڑ کے جا سکتا ہے وہ کسی کو بھی چھوڑ کے جا سکتا ہے۔ اور ویسے بھی میں بدقسمتی

سے رضا حیدر کا بیٹا ہوں.... مجھے ذرا بھی دوستی کا خیال نہیں.... وہ اپنے دوست کو نکل سکتے ہیں تو میں بھی تو ان ہی کی اولاد ہوں ناں...؟" تیمور کے لفظ لفظ میں زہر تھا' ولید بمشکل ضبط کرتے ہوئے اس کے قریب آیا تھا....

"ہر انسان ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اور میرا دوست رضا حیدر کا بیٹا ہونے کے باوجود رضا حیدر جیسا نہیں ہے۔ یہ بات میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں...." ولید نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تھا اور تیمور نے اس کے اتنے یقین اور اتنے بھروسے پر بے ساختہ سر جھٹک دیا تھا۔

"اتنے یقین سے مت کہو.... سب سے پہلے یقین ہی تو ٹوٹتا ہے..." اس کے لہجے میں تلخی باقی تھی۔ ولید نے پھر بھی نظرانداز کر دیا۔

"جو بھی ہے۔ تم کہیں نہیں جا رہے.... میرے ساتھ گھر چلو...." ولید نے اس کا بازو تھام لیا کہ وہ کہیں نہ جائے۔

"آئم سوری.... مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ جو تمہارے ساتھ رہتے ہوئے نہیں کر سکتا۔ تم میری وجہ سے خوار ہو رہے ہو.... اپنا کام کرو.... ڈونٹ وری.... سب ٹھیک ہے...." تیمور نے ولید کا ہاتھ اپنے بازو سے الگ کر دیا تھا اور اس کا کندھا تھپک کر کہتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

ولید وہیں کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

اس نے تو اس کی دوستی کا پاس بھی نہیں رکھا تھا اور سب کچھ بالائے طاق رکھتے ہوئے چلا گیا تھا.... ولید کو لگا آج سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔

☼ ☼ ☼

ڈائننگ روم میں وہ چاروں کھانا کھانے میں مشغول تھے۔

جب آفاق کی نظر فارہ پہ پڑی' وہ کھانا نہیں کھا رہی تھی بلکہ چمچہ ہاتھ میں پکڑے کسی گہری سوچ میں گم تھی' اور سوچ کی سنگینی اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ آفاق رہ نہیں سکا۔ "فارہ....!"

اس کی آواز پر فارہ یک دم جیسے سٹپٹا کے رہ گئی۔

"ہاں...؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا بات ہے؟ تم پریشان لگ رہی ہو؟" آفاق کے سوال پر ثمینہ یزدانی اور اشتیاق یزدانی بھی متوجہ ہو چکے تھے۔

"نن.... نہیں...." اس نے بے ساختہ انکار کر دیا۔

"تو پھر کھانا کیوں نہیں کھا رہیں....؟" آفاق نے اسے اس کی پلیٹ کی طرف متوجہ کیا۔" جہاں بریانی جوں کی توں رکھی تھی' ایک چمچ بھی نہیں لیا گیا تھا اور یہی حال پانی کے گلاس کا بھی تھا' پانی بھی ویسے کا ویسا موجود تھا۔

"کچھ نہیں.... بس ایسے ہی...." فارہ نے بات ٹالنے کے لیے نفی میں سر ہلایا۔

"دیکھو بیٹا....! تم اس کنڈیشن میں نہیں ہو کہ کوئی بھی ٹینشن ذہن پر سوار کرو.... اور اسے چپ چاپ سوچتی رہو.... اگر کوئی مسئلہ ہے تو شیئر کرو.... ذہن کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ ریلیکس ہو جاؤ گی...." ثمینہ یزدانی نے اسے بولنے پہ اکسایا تھا اور فارہ چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔ آفاق نے ایک نظر ثمینہ یزدانی اور اشتیاق یزدانی کی سمت دیکھا۔ ثمینہ یزدانی نے بیٹے کو اکسایا۔ وہ ان کی نظروں کا اشارہ سمجھ چکا تھا۔

"فارہ....! کیا بات ہے....؟ کیا تم بتانا نہیں چاہتیں....؟" آفاق کا سوال گرم البتہ لہجہ نرم ہی تھا۔

"نن نہیں... ایسی کوئی بات نہیں ہے... وہ دراصل حیدر انکل کے گھر میں کافی مسئلہ چل رہا ہے آج کل..."
بالآخر اس نے اگل ہی دیا... اور وہ تینوں اس کی بات پر چونک گئے تھے...
"کیسا مسئلہ...؟" اب سب کو مزید تشویش ہوئی تھی...
"تیمور بھائی نے اپنی پسند سے شادی کرلی ہے..." فارہ نے ساس اور سسر کے چہرے دیکھے...
"کب...؟" یہ خبر ان کے لیے دھماکے سے کم نہیں تھی۔
"چند روز پہلے... لیکن حیدر انکل اس شادی سے خوش نہیں تھے... وہ اس شادی کے خلاف تھے۔ انہوں نے بہت ایشو اٹھایا..." فارہ رفتہ رفتہ سب بتاتی جارہی تھی۔
"مگر کیوں...؟" ثمینہ یزدانی نے فوراً" پوچھا۔
"کیونکہ حیدر انکل کو ماورا پسند نہیں ہے۔ انہیں ماورا سے نفرت ہے۔"
"ماورا کون...؟" وہ جو تمہاری دوست ہے...؟ جو فیصل آباد سے آئی ہے...؟" سارے سوال ثمینہ یزدانی کی زبان پر مچل رہے تھے۔
"جی... وہی..." اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"ارے وہ تو بہت اچھی لڑکی ہے... اس میں اعتراض والی کیا بات ہے بھلا...؟" ثمینہ یزدانی نے خفگی کا اظہار کیا۔
"اعتراض والی بات یہ ہے کہ وہ حیدر انکل کے دوست علی مرتضیٰ کی بیٹی ہے..." اب کی بار فارہ نے بڑا دھماکا کیا تھا اور ثمینہ یزدانی مطمئن ہوتے ہوتے ایک دم پھر سے چونک گئی تھیں ان کے ذہن پر ضرب پڑی تھی۔
"کیا کہا...؟ علی مرتضیٰ کی...؟" انہوں نے دوبارہ پوچھا۔
"جی ہاں...! آپ جانتی ہیں علی مرتضیٰ کو...؟" فارہ نے بھی جان بوجھ کر سوال کیا تھا۔
"ارے... علی مرتضیٰ کو کون نہیں جانتا... حیدر بھائی کے سب سے قریبی اور جگری یار تھے' ہر اچھے برے وقت میں انہوں نے حیدر بھائی کا ہمیشہ ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ ہماری شادیاں بھی انہوں نے ہی کروائی تھیں' سارا خرچا انہوں نے ہی افورڈ کیا تھا... بہت اچھے انسان تھے..." ثمینہ یزدانی کو علی مرتضیٰ کی تمام مہربانیاں اور احسانات یاد تھے۔
وہ ان کے بھائی کا دوست تھا لیکن ان کے لیے بھائیوں جیسا ہی تھا۔
"کیا ہوا تھا ان کو...؟" فارہ کرید رہی تھی وہ بھی جان بوجھ کے۔
"بخار ہوا تھا ان کو... اور پھر وہی بخار ٹائیفائیڈ بن گیا... وہ ایسے بستر پر پڑے کہ پھر اٹھ نہ سکے... حیدر بھائی نے دن رات ان کی کیئر کی... اتنی کہ ان کی بیوی کو بھی ان کے قریب نہیں جانے دیتے تھے... عافیہ بھابھی کہتی تھیں کہ حیدر بھائی سوتن کا کردار ادا کر رہے ہیں میرے ساتھ..." ان کو ایک ایک بات یاد تھی۔
"حالانکہ وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ ایسے دوست سے سوتن بہتر ہوتی ہے' وہ کم از کم شوہر کو موت کے گھاٹ تو نہیں اتارتی ناں...؟"
فارہ کے طنزیہ اور کاٹ دار جواب پر ثمینہ یزدانی کے ساتھ ساتھ ان دونوں باپ بیٹے نے بھی ٹھٹک کر دیکھا تھا۔
"کیا مطلب...؟ تم کہنا کیا چاہ رہی ہو...؟" وہ دونوں ساس بہو آپس میں سوال جواب کر رہی تھیں۔
"مطلب یہ کہ مرتضیٰ انکل کو بخار ہوا تھا مگر ٹائیفائیڈ حیدر انکل نے بنا دیا... وہ دوست کی دولت اور جائیداد دیکھ کر لالچ میں آگئے تھے... انہوں نے ان کی معمولی سی بیماری کو دائمی بیماری میں بدل دیا... وہ ان کو سلو پوائزن

دیتے رہے..... اور خود ان کا آفس اور ان کا کاروبار سنبھالتے رہے..... اور چند دنوں میں ہی انہوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ تمام کاغذات پر سائن کروا کے ٹوٹل پراپرٹی اپنے نام کروالی تھی۔ جس طرح مرتضیٰ انکل کو اپنے دوست پر اندھا اعتماد تھا..... اسی طرح عافیہ آنٹی کو بھی ان کے دوست پر اندھا اعتماد تھا..... لیکن اس اندھے اعتماد کو دو آنکھیں اور بھی دیکھتی تھیں۔

اور وہ دو آنکھیں بی گل کی تھیں۔

بی گل نے حیدر انکل کے اتنے خلوص اور اتنی خدمت گزاری کا نوٹس لینا شروع کردیا تھا..... لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی..... مرتضیٰ انکل کا جگر چھلنی ہو چکا تھا وہ خون اگلنے لگے تھے اور ایک روز طبیعت ایسی بگڑی کہ بی گل عافیہ آنٹی کو ساتھ لے کر خود اسپتال چلی گئی تھیں وہاں مرتضیٰ انکل کے ٹیسٹ ہوئے اور پتا چلا کہ گھر کا بھیدی اندر سے نقب لگا چکا ہے' عافیہ آنٹی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو رہی تھیں کیونکہ مرتضیٰ انکل بس چند لمحوں کے مہمان تھے۔

اور حیدر انکل کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ زندگی ہار گئے تھے۔ ان کے دوست کے سیاہ اعمال ان سے پوشیدہ ہی رہے..... بلکہ انہیں تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ باپ بننے والے ہیں..... دنیا والوں کے سامنے حیدر انکل ایک مخلص دوست کا کردار نبھاتے رہے۔

بے لوث اپنائیت دکھاتے رہے۔ جب سارا معاملہ ٹھنڈا ہو گیا تو وہ عافیہ آنٹی کے پاس جا پہنچے۔ وہ "حیدر لاج" میں شفٹ کرنا چاہتے تھے جس پر عافیہ آنٹی حیران ہوئیں' بی گل نے بھی احتجاج کیا تھا مگر وہ اپنی اصلیت پر اتر آئے تھے اور انہیں شام سے پہلے گھر چھوڑ دینے کی دھمکی دی..... عافیہ آنٹی تو جیسے لاوارث ہو کے رہ گئی تھیں۔

انہوں نے حیدر انکل کے سامنے ڈٹ جانے کا سوچا تھا اور ایسا کیا بھی تھا مگر جیسے ہی انہوں نے قتل کی دھمکی دی وہ خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ کیونکہ وہ اکیلی نہیں تھیں ان کے ساتھ ایک اور زندگی جڑی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ علی مرتضیٰ کے بچے کا انکشاف کرتیں بی گل نے انہیں روک دیا تھا اور اس بچے کی زندگی کی خاطر وہ دونوں چپ چاپ گھر چھوڑ گئی تھیں..... تن تنہا۔ خالی ہاتھ۔

اس سے آگے ان کے ساتھ کیا ہوا.....؟ کیا بنا.....؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے....." فارہ ذرا توقف کے لیے رکی..... کیونکہ ڈائننگ روم میں سب لوگ ششدر رہ گئے تھے۔

"لیکن انہوں نے تو کہا تھا کہ عافیہ بھابھی کسی کو پسند کرتی تھیں اس لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چلی گئیں۔ اور ان کا کوئی اتا پتا نہیں چلا....." ثمینہ یزدانی کی آواز مدھم ہو چکی تھی۔

"ان کا اتا پتا ڈھونڈا کس نے تھا جو نہیں ملا.....؟ الٹا وہ ان کے کردار پہ کیچڑ اچھالتے رہے۔ نہ دوست کا خیال کیا۔ نہ اس کی عزت کا..... اس کی بیوہ کو بھی گھر سے بے گھر کردیا۔ اور پورے شہر میں یہ خبر پھیلا دی کہ میرا دوست سب کچھ مجھے سونپ گیا۔ کیونکہ اس کی بیوی بد چلن تھی۔ اس لیے اس نے بیوی کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔

لیکن انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ ایک روز علی مرتضیٰ کا خون ماورا مرتضیٰ کے روپ میں ان کے سامنے آکھڑا ہو گا..... اور انہیں گھر سے بے گھر ہونا پڑ جائے گا۔"

"کیا مطلب.....؟"

"مطلب یہ کہ تیمور بھائی نے سب کچھ ماورا کے نام کردیا تھا جس پر مشتعل ہو کر حیدر انکل گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور قیام مرزا کے گھر رہائش پذیر ہیں۔" فارہ نے تو بیٹھے بیٹھے ان لوگوں کے چودہ طبق ہلا کے رکھ دیے تھے ایک سے بڑھ کے ایک انکشاف ہو رہا تھا۔

"اب ماورا اکیلی رہ رہی ہے اس گھر میں۔" فارہ نے کہتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھالیا۔
"اوہ مائی گاڈ۔۔۔! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔۔؟" ثمینہ یزدانی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا اور یہی حال آفاق کا بھی تھا۔
"تیمور کہاں ہے۔۔؟" آفاق کو پہلا خیال تیمور کا آیا تھا۔۔۔۔
"سب سے پہلے گھر انہوں نے چھوڑا ہے۔ ان کی نظر میں ماورا ان کی محبت کی مجرم ہے۔۔۔ وہ کہتے ہیں ماورا نے دھوکا دیا ہے، جبکہ مجھے پتا ہے ماورا نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔۔۔ اس نے تیمور بھائی کو اس رستے سے ہٹانے کی بہت کوشش کی تھی، وہ حیدر انکل کی سزا تیمور حیدر کو نہیں دینا چاہتی تھی مگر پھر بھی تیمور بھائی اس سے بدظن ہو چکے ہیں، دور ہو چکے ہیں اس سے۔۔۔" فارہ نے الف تا ے سب کچھ بتا دیا تھا۔
اور اب آفاق کا دماغ مشین کی طرح کام کر رہا تھا پھر اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"کیا ہوا۔۔۔؟ کہاں جا رہے ہیں۔۔؟" فارہ یکدم چونکی۔
"کہیں نہیں۔۔۔ آجاؤں گا تھوڑی دیر تک۔" وہ یہ کہہ کر اپنے بیڈ روم میں گیا اور موبائل اور گاڑی کی چابیاں لے کر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

زوبیہ شاہنواز کی گاڑی کے ٹائر بہت زور سے چرچرائے تھے۔ لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی، سامنے والا گھائل ہو چکا تھا۔
"اوہ مائی گاڈ۔۔!" وہ پریشانی سے بوکھلا کر گاڑی سے اتر آئی اور گاڑی سے ٹکرانے والے آدمی کو سہارا دے کر سیدھا کیا تھا اور اسٹریٹ لائٹ میں اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں اسے ایک زوردار ذہنی جھٹکا لگا تھا۔
"تیمور حیدر۔۔؟" اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔
اس نے تیمور حیدر کو کبھی نہیں دیکھا تھا، بس آفاق کی شادی کی مووی اور تصاویر وغیرہ میں دیکھا تھا یا پھر میگزین میں۔۔۔ لیکن پھر بھی وہ پہلی نظر میں ہی پہچان گئی تھی۔
"میں ٹھیک ہوں۔" تیمور نے اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں زوبیہ کو احساس ہوا کہ اس کا جسم گرم ہے۔۔۔ یعنی اسے بخار تھا۔۔۔ وہ ایک بار پھر ٹھٹکی۔
"آپ ٹھیک نہیں ہیں۔۔۔ آپ کو تو بخار ہے۔۔؟" زوبیہ نے بلا جھجک اس کی کلائی چھو کر دیکھی، جس پر تیمور مزید خفا ہوا۔
"ڈونٹ وری سر۔ میں ڈاکٹر ہوں۔۔۔ ڈاکٹر زوبیہ شاہنواز۔۔۔ مریض کو چیک کرنا میرا روٹین کا کام ہے۔" زوبیہ اس کی خفگی بھانپ چکی تھی اسی لیے ذرا مسکرا کر اپنا تعارف کروایا تھا۔
"اٹس اوکے۔" تیمور نے کہہ کر آگے بڑھنا چاہا لیکن اس کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔
"ارے سنبھل کے۔۔۔" زوبیہ نے ایک دم اسے بازو سے تھام لیا تھا۔
"پتا نہیں کیا بات ہے۔ چکر آرہے ہیں اور ٹھیک سے دکھائی بھی نہیں دے رہا۔" تیمور نے اپنی کنپٹیوں کو سہلانے کی کوشش کی۔
"یہ سب بخار اور نقاہت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دیتی ہوں۔۔۔" زوبیہ نے اپنی گاڑی کی سمت اشارہ کیا تھا۔

"نہیں.... میں چلا جاؤں گا....." وہ ڈاکٹر زوبیہ کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھا۔
"آپ اس حالت میں کہیں بھی نہیں جاسکتے..... اگر جائیں گے تو نقصان ہو گا۔" زوبیہ نے اسے منع کیا تھا۔
"ہونہہ..... کیسا نقصان.....؟" اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔
"دیکھیے۔ آپ سے ٹھیک سے چلا بھی نہیں جارہا' ڈرائیو کرنا تو دور کی بات ہے۔" زوبیہ اسے اس حالت میں ایسے رسک کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی تھی۔ اور پھر تیمور کے لاکھ انکار کے باوجود وہ اسے اپنی گاڑی تک لے آئی تھی۔ گاڑی کی اگلی نشست کی پشت سے سر ٹکاتے ہی تیمور کا دماغ جیسے غنودگی میں اترنے لگا تھا۔
"مسٹر تیمور..... آر یو اوکے.....؟" زوبیہ نے اس کا بازو ہلایا۔
"ہوں.....ہاں....." اس نے غنودگی میں ہی جواب دینے کی کوشش کی تھی۔
"آپ کا ایڈریس۔"
"میرا..... ایڈریس..... کوئی بھی نہیں..... گھر بھی نہیں..... کچھ بھی نہیں۔" وہ غنودگی میں کیا بول رہا تھا زوبیہ کو سمجھ میں نہیں آیا..... اور وہ پریشان ہونے لگی۔

☼ ☼ ☼

آفاق' تیمور کو ڈھونڈنے نکلا تھا' لیکن کہاں کہاں ڈھونڈتا۔ اس نے سڑکیں چھان ماری تھیں۔ اس کا نمبر بند جارہا تھا۔ ماورا لاعلم تھی۔ ولید لاعلم تھا۔ گھر والے کہاں تھے۔ کچھ خبر ہی نہ تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتا تو کیسے ڈھونڈتا.....؟
لیکن جب اوپر والا ساتھ دے تو سب کام آسان ہوجاتے ہیں۔
اچانک اس کے نمبر پر ڈاکٹر زوبیہ شاہنواز کی کال آئی تھی۔ پہلے تو اس نے اس پریشانی اور افراتفری میں نظر انداز کردینا چاہا' لیکن پھر سوچا کہ شاید کوئی کام ہو۔ اس لیے ریسیو کرلیا ..... ساتھ ساتھ ڈرائیو بھی کررہا تھا۔
"ہیلو.....!" آفاق غائب دماغی سے بولا۔
"کیسے ہیں آفاق صاحب.....؟" زوبیہ کی آواز بھی کچھ پریشان تھی ورنہ اس کا لہجہ اور اس کی آواز ہمیشہ خوشگوار ہوتی تھی ایک دم ہشاش بشاش۔
"اللہ کا شکر ہے..... آپ سنائیں۔ اس وقت کیسے یاد کیا.....؟"
"آپ سے ملاقات کا ارادہ ہے..... انتظار میں ہوں..... آجائیے' پاپا بھی آچکے ہیں....." زوبیہ اسے اپنے گھر بلارہی تھی۔
"لیکن میں اس وقت تھوڑا مصروف ہوں۔ بلکہ ٹینشن میں ہوں..... ابھی نہیں آسکتا..... ملاقات پھر کبھی سہی....." آفاق نے اسے ٹالنا چاہا۔
"چلیے..... ہمارے لیے نہ سہی۔ اپنے کزن کے لیے ہی آجائیں....." زوبیہ بات کو گھمارہی تھی۔
"کزن.....؟ کون.....؟" آفاق ایک دم ٹھٹکا۔
"تیمور حیدر۔"
"واٹ.....؟ تیمور آپ کے گھر پہ ہے اور ادھر میں اسے ڈھونڈتا پھررہا ہوں۔" آفاق تو جیسے حیرت زدہ سا رہ گیا تھا۔
"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں..... آپ جلدی آجائیے۔" زوبیہ نے کہہ کر فون بند کردیا اور آفاق نے گاڑی کا رخ موڑلیا تھا۔ وہ قدرے مطمئن ہوچکا تھا کیونکہ اسے ڈھونڈنے کی پریشانی ختم ہوچکی تھی' اور پھر اگلے پندرہ

منٹ میں وہ ڈاکٹر شاہنواز کے گھر پر موجود تھا۔!

☼ ☼ ☼

عافیہ بیگم نے سلام پھیرا ہی تھا کہ دروازے پہ لگی گھنٹی بجنے لگی۔
ارے..... اس وقت کون آگیا.....؟ وہ وال کلاک کی سمت دیکھتے ہوئے دعا مانگے بغیر ہی اٹھ کر دروازے کی طرف آگئیں۔
"کون...؟" انہوں نے قریب جا کے پوچھا۔
"امی...!" ماورا کی مدھم سی آواز کانوں میں پڑی تھی اور عافیہ بیگم نے یک دم دروازہ کھول دیا تھا۔
"ماورا...؟" وہ اسے دیکھ کر بوکھلا گئی تھیں وہ ان کے سامنے بے حال کھڑی تھی۔
"امی...!" ماورا بے اختیار ان کے گلے لگ کے رو پڑی تھی اور عافیہ بیگم کے تو جیسے جسم سے جان نکلی جا رہی تھی۔
"ماورا...! کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک تو ہے ناں.....؟ تیمور کہاں ہے؟" انہوں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے تھے۔
"ارے کیا ہوا ہے؟ دروازے پہ ہی شروع ہو گئی ہو' اندر تو لے آؤ بچی کو..." بی گل بھی نماز سے فارغ ہو چکی تھیں۔ اور عافیہ بیگم یوں ہی روتی بلکتی ماورا کو ساتھ لیے اندر آگئی تھیں۔
"بیٹھو..." انہوں نے خود ہی سہارا دے کر اسے صوفے پر بٹھایا تھا۔ "میں پانی لے کر آتی ہوں..." بی گل خود ہی جا کر کچن سے پانی لے آئی تھیں...
"اب بولو... کیا ہوا ہے...؟" تھوڑی دیر بعد انہوں نے ماورا سے سوال کیا تھا۔
اور ماورا نے ایک بار پھر تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے انہیں سب سنا ڈالا تھا۔
"دیکھو بیٹا۔ اس طرح تو ہونا ہی تھا۔ صبر سے کام لو۔ ابھی نیا نیا زخم ہے' درد تو ہو گا۔ لیکن ایک نہ ایک دن ختم بھی ہو جائے گا... وقت کے ساتھ ساتھ سب گھاؤ بھر جاتے ہیں..... تیمور کا گھاؤ بھر گیا تو تیرے ہی پاس آئے گا... آخر کب تک بھاگے گا..... کہاں جائے گا.....؟ اس کی منزل تو تم ہو ناں....؟" بی گل تیمور حیدر کے احساسات دور رہ کے بھی سمجھ سکتی تھیں۔ اسی لیے اس کی طرف داری بھی کرتی تھیں۔
"لیکن بی گل کب تک.....؟ کب تک کی امید رکھوں.....؟ کب لوٹے گا میرے پاس...؟" ماورا کے اندر کی شدت اسے رلا بھی شدت سے رہی تھی۔ "یہ تو گھاؤ بھرنے کی بات ہے..... کہ کب تک بھرے گا..... کب اس کا درد ختم ہو گا" وہ بھلا اور کیا کہتیں....؟
"بی گل..... آپ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ کبھی کبھی چھوڑ کر جانے والے واپس نہیں آتے..... دور بھاگنے والے ہمیشہ کے لیے ہی دور ہو جاتے ہیں..... ان کے پاؤں منزل کا راستہ بھول جاتے ہیں' بی گل مجھے صاف بتائیے..... مجھے دلاسے مت دیں..... میرا تسلیوں سے گزارا نہیں ہو گا....."
وہ بلک رہی تھی اور عافیہ بیگم چپ چاپ بیٹی کی حالت دیکھ رہی تھیں.....
جب تک وہ محبت کی چاشنی سے محروم تھی تب تک پر سکون تھی' لیکن جب سے محبت منہ کو لگی تھی سکون کا پنچھی اڑ گیا تھا..... وہ بے چین اور بے کل پھر رہی تھی' تڑپ ایسی تھی کہ ماں کو بھی رونا آ رہا تھا.....
بی گل اسے بہلا بہلا کے تھک گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ولید کے نمبر پر کسی اجنبی نمبر سے فون آرہا تھا اس نے فوراً اٹھالیا۔

"ولید...!" عزت کی آواز پر ولید کا کھٹا کھٹ چلتا ذہن ایک دم رک گیا تھا۔

"ولید...!" اس نے پھر پکارا۔

"مر گیا ولید...!" وہ تو جیسے ایک دم پھٹ پڑا تھا۔

"اف کیا ہوا...؟" عزت نے گھبرا کے پوچھا۔

"یہ تم پوچھ رہی ہو کیا ہوا ہے...؟ واہ... کیا دیدہ دلیری ہے؟" وہ تو جیسے بھرا بیٹھا تھا۔

"لیکن کچھ بتائیں تو سہی...؟" وہ الٹا اور پریشان ہو رہی تھی...

"کیا میرے بتانے کی کوئی کسر باقی ہے...؟ آپ دونوں بہن بھائی کی عشق و عاشقی کا نتیجہ بھگت رہے ہیں سب..." ولید غصہ اگل رہا تھا۔

"کیا صرف ہماری عشق و عاشقی تھی؟ آپ کو کچھ نہیں تھا...؟" عزت کا دماغ گھوم گیا۔

"نہیں... ہرگز نہیں... ہمیں اگر تھا بھی تو ہمارے اندر صبر تھا... برداشت تھی... ضبط تھا... تم دونوں بہن بھائی میں نہیں تھا' دونوں کو نکاح کی پڑ گئی... اب آگیا نکاح کا مزا...؟"

اس نے تو عزت کے لتے لے ڈالے تھے تیمور کا غصہ اس پر نکل گیا تھا۔

"ولید..." وہ چبا کے بولی۔

"کہا ناں... مر گیا ولید..." وہ لاپروائی سے بولا۔

"میں فون بند کر رہی ہوں..." عزت نے دھمکی دی...

"کر دو..." وہ ویسے ہی لاپروائی سے بولا... اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

اور عزت نے کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا وہ بڑبڑا کے رہ گیا' لیکن چند سیکنڈز بعد دوبارہ گھنٹی بجنے لگی تھی' اس نے پھر ریسیو کر لیا۔

"اب کیا ہے...؟" وہ عجیب چڑچڑا ہو رہا تھا۔

"سنو... میں نے ماورا بھابھی کے لیے فون کیا تھا... ان کو پیغام دے دو' وہ اپنی حفاظت کریں۔ ان کو اور ان کی امی کی جان کو خطرہ ہے۔ یہاں پلاننگ ہو رہی ہے..." مجھے ٹھیک سے سنائی نہیں دیا... لیکن معاملہ سنگین ہے... پلیز الرٹ رہو سب..." عزت نے کہہ کر فون دوبارہ بند کر دیا تھا اور ولید موبائل ہاتھ میں پکڑے ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"ماورا بھابھی اور ان کی امی کی جان کو خطرہ...؟" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

قرۃ العین خرم ہاشمی

آدھی روٹی

کل رات سے مسلسل ہونے والی بارش نے ہر طرف جل تھل کر دیا تھا۔ کچے آنگن میں، سرخ اینٹوں پر ناچتی بارش کے کتنے ہی رنگ اس کی کاجل سے عاری آنکھوں نے پچھلے دس سالوں میں دیکھے تھے۔

ہاں صرف دیکھے! محسوس صرف اس بارش کو اس وقت کیا تھا جب کسی کی قربت اور رفاقت اس کے ہونٹوں پر ہنسی اور آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیریں سجاتی تھیں۔

اب تو موسم صرف آتے تھے اور جاتے تھے۔ تھکے ماندے ذہن کے ساتھ جسم نے صرف ایک ہی تمنا کو اوڑھا ہوا تھا۔ سب کام ختم کر کے اپنے بستر پر لیٹنے اور فوراً "سونے کی خواہش۔ اسی لیے وہ خود کو اتنا تھکا لیتی تھی تاکہ بستر پر لیٹتے ہی فوراً" نیند کی آغوش میں چھپ جائے۔

جہاں اس کی سوچیں اور کسی کی یاد نہ ستائے۔

بس وہ ہو اور مہربان نیند کا تھپکتا لمس ہو۔

جیسے ماں کی گود میں چھپ جانے کی خواہش بچے کو ہمیشہ رہتی ہے۔ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشیں اس کی بھی تھیں۔

شام کی طرح سانولی سلونی، گندم کی بالی کی طرح سنہری رنگت اور کالی رات کی طرح گہری گہری اور چمکتی ہوئی پراسرار سی آنکھوں والی۔ ماہ جبیں عرف مہو اپنے دل میں ایسی ہی بے شمار خواہشوں کے دیپ جلاتی اور بجھاتی رہتی تھی۔

"ابا! سموسے نہیں لے کر آئے؟" سات سالہ مریم نے اچک اچک کر باپ کے ہاتھ میں پکڑے لفافوں کی طرف دیکھا تھا۔ جنید نے بائیک اندر کھڑی کر کے بیرونی دروازہ بند کیا۔

چھوٹے سے صحن میں جگہ جگہ چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ سارا دن کا تھکا ہارا ٹریفک کے شور اور گاڑیوں کے دھویں کو برداشت کر کے وہ گھر میں داخل ہوا تو گھر کی ابتر حالت دیکھ کر اس کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ گیا۔

"ہاں لایا ہوں۔ پہلے اندر تو آنے دو۔"

جنید نے چڑ کر بیٹی سے کہا تو وہ ڈر کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اسی وقت دوپٹا سر پر باندھے، دو سالہ روتے نومی کو لیے اندر کمرے سے رخسانہ نکلی۔ جنید کو دیکھ کر اس نے نظر انداز کیا۔

اور جان بوجھ کر نومی کو ایک ہاتھ سے پکڑا اور بڑبڑاتی ہوئی واش روم میں لے گئی۔ جنید نے اپنے غصے کو بمشکل روکا تھا۔ نہیں تو ابھی ایک طوفان آجاتا۔ رخسانہ لڑنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ جبکہ جنید کبھی برداشت کر جاتا تھا اور کبھی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا تو وہ بھی رخسانہ کا لحاظ نہیں کرتا تھا۔

دونوں کی لڑائی میں متاثر ہوتے تھے بچے۔ مریم کے بعد ان کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا تھا۔ بیٹے کی تمنا میں دونوں پاگل تھے۔ مگر ان کی یہ تمنا بالآخر شادی کے آٹھ سال بعد پوری ہوگئی تھی۔ نعمان عرف نومی کی آمد نے جہاں دونوں کو بے تحاشا خوشی عطا کی تھی وہیں رخسانہ کا مزاج مزید تیکھا اور ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

ہڈ حرام اور کام چور وہ پہلے سے تھی۔ گھر کے کاموں، صفائی ستھرائی سے اس کی جان جاتی تھی۔

کھانا بمشکل وہ کچا پکا بناتی تھی۔ اکثر جلا دیتی یا نمک یا مرچ زیادہ کر دیتی۔ روٹیاں سردی ہو یا گرمی باہر سے آتی تھیں۔ رخسانہ یا تو آس پاس کے کسی بچے کو

پیسوں کا لالچ دے کر دوپہر میں تندور سے روٹی منگوالیتی یا پھر سات سالہ مریم اور حریم کو بھیج دیتی۔

جنید نے ایک بار حریم کو تندور پہ دیکھا تھا۔ گھر آکر اس نے رخسانہ سے شدید لڑائی کی تھی اور سختی سے دوبارہ بچیوں کو باہر بھیجنے سے منع کیا تھا۔ رخسانہ نے جنید کا غصہ بچیوں کو مار کر نکالا تھا۔ مگر اس دن کے بعد سے اس نے بچیوں کو تندور پر بھیجنا چھوڑ دیا تھا۔

جنید نے ہاتھ میں پکڑے شاپرز کچن کی سلیب پر بمشکل جگہ بنا کر رکھے اور خاموشی سے اندر جا کر لیٹ گیا۔

کچھ دیر باہر سے نعمان کے رونے اور رخسانہ کے چیخنے چلّانے کی آواز آتی رہی، پھر یکدم سناٹا چھا گیا۔ شاید نعمان روتے روتے تھک کر سو گیا تھا۔

"یہ لے روٹی کھالے۔"

کچھ دیر کے بعد اکتائی ہوئی رخسانہ نے ٹرے لاکر پاس رکھی میز پر زور سے رکھی تھی اور پانی کا جگ لینے کمرے سے باہر چلی گئی۔

جنید نے اٹھ کر گہری سانس لی اور کھانے سے پہلے ہاتھ دھو کر آیا۔ تب تک رخسانہ' نومی کو گود میں اٹھائے وہاں آبیٹھی تھی۔

"پتا بھی ہے سبزیاں کتنی مہنگی ہو گئی ہیں۔ تم تو تھوڑے سے پیسے مہینے کے شروع میں پکڑا کر ہر ذمہ داری سے آزاد ہو جاتے ہو۔ مجھ سے پوچھو روز کے اس جوڑ توڑ اور حساب کتاب نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ ہر وقت بچوں کے کام.... نہ کوئی آرام' نہ کوئی طاقت ور غذا اور نہ کوئی نوکر.... سب خود کرو' چاہے جیو یا مرو۔"

حسب معمول رخسانہ شروع ہو چکی تھی۔ ننھا نومی روٹی کے ٹکڑے سے کھیل رہا تھا۔ جنید نے گہری سانس لے کر بدمزا پکی ہوئی بھنڈیوں اور آدھی کچی اور پکی روٹی کی طرف دیکھا تھا۔

بارش ہونے کی وجہ سے آج رخسانہ نے روٹی گھر پہ بنائی تھی' مگر روٹی کی حالت دیکھ کر جنید نے سوچا تھا کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ تندور سے ہی لے آتا۔

"چائے ملے گی۔" جنید نے پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے چند لقمے بہت بددلی سے کھائے تھے۔

"ہاں بادشاہ سلامت! آپ بس حکم کرتے جائیں۔ کنیز سب حاضر کر دے گی۔ چاہے وہ جیے یا مرے' آپ کے سب کام ہو رہے ہوں گے۔"

رخسانہ نے جنید کا بے فکری کا رویہ دیکھا تو تڑخ کر بولی تھی۔

"دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتا ہوں گھر میں.... اور میری کون سی ذمہ داری ہے تم پر...." جنید نے چڑ کر کہا تو رخسانہ کو آگ ہی لگ گئی۔

"کیا بات ہے جناب کی۔ یہ بچے' یہ گھر کیا صرف میری ذمہ داری ہیں۔" رخسانہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا تو جنید ایک اکتائی ہوئی نظر اس پر ڈال کر رہ گیا۔

رخسانہ کا قد پانچ فٹ کے قریب تھا۔ رنگ گورا چٹا اور اوپر سے اسے سجنے سنورنے کا بہت شوق تھا۔ اس کی ان ہی اداؤں پر جنید کبھی جان دیتا تھا۔ مگر آج شادی کے نو سال کے بعد اس کا جسم موٹاپے کا شکار ہو کر بے ڈول ہو چکا تھا رنگ آج بھی سفید ہی تھا اور اس کے ہونٹوں پر ہر وقت لگی سرخ رنگ کی لپ اسٹک دیکھ دیکھ کر جنید کا دل اوب چکا تھا۔ شاید وہ آج بھی اتنی بری نہیں تھی' مگر جب وہ ہاتھ نچا کر غصے میں چیخ چیخ کر بولتی تھی تو بہت خوف ناک لگتی تھی۔

جنید نے ایک نظر اس پر ڈالی جو حسب معمول لڑنے کے لیے تیار تھی اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا رخ چھت کی طرف تھا۔ جہاں وہ کچھ گھڑیاں سکون سے گزار سکتا تھا۔ جبکہ رخسانہ نے اپنا غصہ نومی کو ایک تھپڑ لگا کر اتارا تھا۔ جواب' گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہا تھا۔ غصہ اتارنے اور انتقام لینے کے لیے بچے آسان ہدف تھے۔

رخسانہ نے بڑبڑاتے ہوئے کھانے کی ٹرے اٹھائی تھی۔

☆ ☆ ☆

"چاچا حق! یہ نہیں ہو سکتا۔"

ناز بھابھی نے غصے سے چلا کر کہا تھا۔ چھوٹے عبداللہ کو گود میں اٹھائے مہرو نے پلٹ کر بیٹھک کے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ جہاں سے مسلسل اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

دو سالہ عبداللہ کو رات سے تیز بخار تھا۔ اسی لیے وہ بہت ضدی اور چڑچڑا ہو رہا تھا۔ مہرو نے اسے بہلانے کی ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی تھی' مگر وہ آج کسی طرح بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

"کڑیے! لہجہ نیوا.... (نیچے' آہستہ) رکھ! تیرا مردان باتوں کا عادی ہو گا' چاچا حق کسی کی نہیں سنتا۔" چاچا حق نے اپنی مخصوص گونج دار اور کڑک آواز میں کہا تھا۔

یک دم ہی کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"تم لوگوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ مہرو کو اس کا حصہ دے دو۔ نہیں تو میں پنڈ کی پنچایت بلا لوں گا اور

پھر تمہیں حصے کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ کی گئی زیادتی کا حساب بھی دینا ہوگا۔" چچا حق نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ مہرو کے قدم تھم گئے۔

"کیا زیادتی کا حساب دینا اتنا آسان ہوتا ہے چچا حق۔۔۔" مہرو کی آنکھوں میں نمی تھی، مگر لب خاموش تھے۔

"تم لوگوں کے پاس دو دن ہیں۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔" چچا حق نے سامنے بیٹھے دونوں نفوس سے کہا۔ جن کے چہروں اور دلوں پر لالچ کی کالک ملی ہوئی تھی۔ چچا حق نے ہنکارا بھرا اور دونوں کو گم صم حالت میں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکلے تو نظر سیدھی مہرو پر پڑی۔ ان کے چہرے کے تاثرات میں سختی کی جگہ نرمی نے لے لی تھی۔

"بس دھی! بہت دکھ اٹھا لیے تو نے۔ اب میں آگیا ہوں۔ سب ٹھیک کردوں گا۔" چچا حق نے مہرو کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"چچا حق! سب ٹھیک کردیں گے؟" مہرو نے حسرت بھرے لہجے میں بھیگی آنکھوں کے ساتھ سر اٹھا کر پوچھا تو چچا حق اسے دیکھتے رہ گئے۔

"دھی رانی! میں بندہ ہوں۔ نصیبوں کی سیاہی تو دور نہیں کرسکتا، مگر ان کے کالے کرتوتوں کا حساب ضرور لوں گا، آگے تیری قسمت، رب راکھا!" چچا حق نے کہا اور ڈیوڑھی پار کرگیا۔

"سارا کھیل ہی قسمت کا ہے چچا حق! قسمت کی سیاہی، رات کے اس اندھیرے سے زیادہ خوف ناک اور دل کو چیرنے والی ہوتی ہے۔"

مہرو نے خود کلامی کی تھی، جسے سننے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ سوائے اس ذات کے۔

جو سب سنتا اور دیکھتا ہے۔

☆ ☆ ☆

جنید کا موڈ آج بہت خوش گوار تھا۔ اسی لیے اپنی پرانی بائیک کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتے ہوئے وہ مسلسل گنگنا رہا تھا۔

رخسانہ نے اس کی گنگناہٹ اور چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو کینہ توز نظروں سے دیکھا تھا۔ شادی سے پہلے اور بعد میں اکثر جنید اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور گنگناتا تھا، مگر یہ تب کی بات تھی جب ان میں محبت تھی۔

اب تو صرف ایک دوسرے سے بے زاری اور چڑچڑاہٹ رہ گئی تھی۔ رخسانہ نے کچھ دیر تو برداشت کیا، پھر اپنا وہی حربہ آزمایا جس سے جنید چڑتا تھا۔

پہلے رخسانہ نے آس پاس پڑی چیزوں کو ادھر سے ادھر پٹخنا شروع کیا، جنید نے ایک نظر اسے دیکھا مگر نظر انداز کردیا۔ پھر رخسانہ نے گھر گھر کھیلتی حریم کو بلاوجہ مارنا شروع کردیا۔ بہن کو مار کھاتا دیکھ کر نومی ڈر کر گلا پھاڑ کر رونے لگا۔

"کیا تکلیف ہے تمہیں؟ کیوں بچوں کو مار رہی ہو؟" جنید تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور سختی سے رخسانہ کا ہاتھ پکڑ کر رخ اپنی طرف موڑا۔

"میری مرضی! میں کچھ بھی کروں، تمہیں کیا تکلیف ہے؟" رخسانہ نے تن کر کہا تو جنید دانت پیس کر رہ گیا۔

"جاہل عورت! نہ بات کرنے کی تمیز ہے اور نہ گھر چلانے کا سلیقہ۔"

جنید نے حقارت سے کہا تو رخسانہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"مت بھولو' یہ جاہل عورت تمہارا ہی انتخاب ہے۔" رخسانہ نے چیخ کر کہا۔

"انتخاب نہیں، بھول تھی میری۔" جنید نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ بچے ڈر کر ایک دوسرے سے چپکے کھڑے تھے۔

"اچھا میں بھول تھی۔ جاؤ پھر یہاں کیا کررہے ہو؟ اپنی بھول کو سدھار لو۔" رخسانہ نے اسے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔ جنید چند لمحے غصے سے اسے گھورتا رہا۔

"ہاں اب یہ ہی کروں گا۔" جنید نے پاس رکھی کرسی کو ٹھوکر ماری اور غصے سے گھر سے باہر نکل گیا۔ رخسانہ اس کے لفظوں کی سنگینی سے بے خبر نہیں

تھی۔ اسی لیے ٹھٹک کر اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کبھی اس کی ماں نے اسے سمجھایا تھا کہ.....

آج جنید کے انداز نے نہ جانے کیوں رخسانہ کو سالوں پہلے کی بات یاد دلا دی تھی اور اس کا دل پریشان ہو اٹھا تھا۔

کردی تھی۔ اس رات مہرو پہلی بار سکون سے سوئی تھی۔ جبکہ ناز اور فاروق نے انگاروں پر رات گزاری تھی۔

حق دار کو حصہ دینا، بہت دل گردے کا کام ہوتا ہے اور وہ دونوں میاں، بیوی اس ہمت سے عاری تھے۔

☆ ☆ ☆

"اتنے سال ہم نے اس احسان فراموش، منحوس عورت کو اپنے گھر میں رکھا، سائبان دیا اور آج یہ ہم سے حصے کی بات کر رہی ہے۔"

ناز بھابھی پچھلے دو دن سے چلا رہی تھیں، اسے کوس رہی تھیں۔ جو سب سے بے نیاز بنی بمعمول کے کام سر انجام دے رہی تھی۔

"بس کردے ناز! کیوں اپنا سر دیوار سے پھوڑ رہی ہے۔" فاروق نے اپنی بیوی کو بے زاری سے ٹوکا تھا۔

چچا حق نے مہرو کو اس کا حق دلوانے کا جو ٹھیکہ لیا تھا آج اس کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ اور یہ فیصلہ مہرو کے حق میں اور ان دونوں کے خلاف ہوا تھا اور یہ بات ہی دونوں میاں، بیوی کو تپا رہی تھی، مگر مہرو ہر چیز سے ایسے لاتعلق تھی جیسے بات اس کی نہیں، کسی اور کی ہو رہی ہے۔

"میرے دل میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس میسنی نے میرے بچوں کے حق پر ڈاکا ڈالا ہے۔ بھلا اسے علیحدہ گھر کی کیا ضرورت ہے؟ نہ بال، نہ بچہ، بنجر زمین ہے یہ.... خبردار، جو میرے بیٹے کو ہاتھ بھی لگایا۔" ناز نے دو سالہ عبداللہ کو اس کی گود سے چھینا تھا۔ مہرو اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی۔

"چل مہرو دھی! بہت سن لی شہریوں کی باتیں.... آجا.... تو بھی کچھ سکھ کا سانس لے لے۔"

چچا حق نے صحن میں گم صم سی کھڑی مہرو سے کہا۔ چچا حق ابھی ابھی کچہری سے لوٹا تھا۔ نیلی فائل بغل میں دبائے وہ مہرو کا ہاتھ پکڑ کر کچے برآمدے کی دوسری طرف لے گیا۔ جہاں آج کے بعد اسے رہنا تھا۔ شام تک سرخ اینٹوں کی دیوار نے اس کے حصے پر مہر ثبت

"میں نے آج آلو قیمہ بنایا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اچھی خوراک اور توجہ سے.... تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

رخسانہ نے میٹھے لہجے میں کہا تو نومی سے باتیں کرتے جنید نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی اور پھر دوبارہ نومی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ رخسانہ کا چہرہ بجھ کر رہ گیا، مگر اس نے خود کو تسلی دی۔

"ابھی کچھ وقت لگے گا۔"

اس دن جنید، رخسانہ سے لڑ کر غصے میں گھر سے نکلا اور ایک تیز رفتار کار کی ٹکر سے شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔ رخسانہ کو یہ خبر محلے داروں نے دی تو وہ دل تھام کر رہ گئی۔

تب پہلی بار اسے احساس ہوا کہ جنید کو کھونے کا تصور بھی وہ نہیں کر سکتی۔ جنید کی بیماری نے اسے پہلے والی رخسانہ بنا دیا تھا۔ جنید کی ایک ٹانگ شدید زخمی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ پچھلے دس دن سے گھر میں پڑا تھا۔

اس دوران رخسانہ کے والدین اور بہن، بھائیوں نے اس کا ساتھ ضرور دیا تھا، مگر پھر آہستہ آہستہ کر کے سب غائب ہونے لگے۔ آج کل مہنگائی کے دور میں اپنے گھر کا چولہا جلانا آسان نہیں، کسی اور کی ذمہ داری کون اٹھائے۔ محلے کے لوگ جنید سے اچھی سلام دعا کی وجہ سے خبر گیری کرنے آجاتے تھے، مگر رخسانہ کی کسی سے اتنی دوستی بھی نہیں تھی۔ اس موقع پر اسے ان باتوں کا احساس شدت سے ہوا۔

ان دنوں رخسانہ کی کمیٹی نکلی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ بہت آسانی اور عزت کے ساتھ یہ مشکل

وقت گزار رہی تھی۔ کچھ تھوڑی بہت جنید کی آمدنی بھی محفوظ تھی۔ دن گزر رہے تھے۔ جنید کا سارا دن خاموشی سے کچھ سوچتے ہوئے گزرتا یا پھر وہ چاروں بچوں کو اپنے پاس بٹھا کر باتیں کرتا رہتا۔ ان دنوں ان کے گھر سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں نہیں آتی تھیں۔

"میں روٹی پکا کر لاتی ہوں۔ مریم اور زینت تم دونوں دسترخوان بچھا کر فریج سے پانی کی بوتل اور گلاس لے کر آؤ۔"

رخسانہ نے سمجھ دار ماؤں کی طرح بیٹیوں کو بھی اپنے ساتھ کام میں شامل کیا۔ کچھ دیر میں دسترخوان پر گرم گرم روٹی کی خوشبو پھیلی تھی۔

رخسانہ نے سب سے پہلے جنید کو روٹی پلیٹ میں رکھ کر دی۔ جنید نے روٹی کے چار ٹکڑے کیے اور منتظر بیٹھے بچوں کے سامنے رکھی پلیٹ میں رکھ دیے۔

"بسم اللہ پڑھو!" جنید نے آہستہ سے کہا اور بچوں نے بسم اللہ پڑھ کر پہلا نوالہ توڑا۔

"ابا! پہلے آپ۔" مریم نے چھوٹا سا نوالہ بنا کر باپ کی طرف بڑھایا تو جنید ٹھٹک کر رہ گیا۔ کتنا ملا جلا سا تھا یہ لمحہ۔

مریم کی دیکھا دیکھی زینت اور پھر حریم نے بھی پہلا نوالہ باپ کی طرف بڑھایا۔ ننھا نومی جو روٹی کے ٹکڑے کو اپنے دانتوں سے کتر رہا تھا۔ بہنوں کی نقل کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا روٹی کا ٹکڑا باپ کی طرف بڑھا کر مسکرایا تو بے ساختہ جنید کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

یہ ہی حال دروازے میں کھڑی رخسانہ کا تھا۔ بچے جنید سے زیادہ قریب تھے۔ رخسانہ کے غصے اور ڈر کی وجہ سے بچے اس کے پاس نہیں آتے تھے۔ وہ ہر طرف سے تنہا رہ گئی تھی۔ یہ احساس ہی اسے مارنے کے لیے کافی تھا۔

"بس میں نے کھانا کھا لیا۔" جنید نے ہاتھ بڑھا کر رخسانہ سے کہا۔ رخسانہ نے اس کی خالی پلیٹ کو دیکھا۔ اس نے برائے نام ہی کھانا کھایا تھا۔ رخسانہ کو اب احساس ہو رہا تھا کہ جنید کی بھوک بہت کم ہو کر رہ گئی ہے۔

جبکہ جنید اپنی سوچوں میں گم، کسی لمحے کی قید میں تھا۔

☆ ☆ ☆

مہو نے سارے کام پھرتی سے کر دیے تھے۔ اب فارغ بیٹھی ہوئی صحن میں دانہ چگتی مرغیوں کو دیکھ رہی تھی۔

ناز بھابی کے ساتھ رہتی تھی تو کام ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے اور اب فراغت کی وجہ سے دن ہی نہیں گزرتا ــــ بھلا ایک اکیلی جان کا کام ہی کتنا ہوتا تھا۔

چچا حق نے مہو کا رشتہ یہاں کروایا تھا۔ پھر چچا حق اپنے بیٹے کے پاس کویت چلا گیا۔ مہو کے والدین آگے پیچھے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تو وہ مکمل طور پر اپنے جیٹھ، جٹھانی کے رحم و کرم پر آ گئی۔ جس کا فائدہ ناز بھابی نے خوب اٹھایا۔

وہ تو کئی سالوں کے بعد چچا حق اپنی زمین بیچنے کے لیے پاکستان آیا اور رشتہ داروں اور محلے داروں سے مہو کے حالات کے بارے میں سن کر رہ نہ سکا اور اس کی مدد کرنے پہنچ گیا۔

وہ دکھی دل کے ساتھ واپس گیا تھا کہ مہو کی زندگی اس کے غلط فیصلے کی وجہ سے برباد ہوئی ہے، مگر مہو اپنی تقدیر پر راضی تھی۔

"یہ تیری کیسی عادت ہے مہو! آدھی روٹی کھاتی ہے اور آدھی روٹی مرغیوں کو ڈال دیتی ہے۔ اپنی صحت دیکھ، کتنی کمزور ہو گئی ہے تو۔۔۔" ماسی جنتے نے مہو کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ماسی جنتے اکثر مہو کے پاس چلی آتی تھی۔ یہ بھی چچا حق کی خاص ہدایت تھی اسے۔

"بس ماسی! بھوک ہی نہیں لگتی۔" مہو نے سادگی سے کہا۔

ماسی جنتے (ماسی جنت) نے سرد آہ بھری اور افسوس بھرے لہجے میں بولی۔ "ٹھیک کہتی ہے تو! اتنے سال

کولہو کے بیل کی طرح تجھ سے کام لیا اور پیٹ بھر کے کھانے کو بھی نہ دیا۔
اللہ بھلا نہ کرے اس کا جسے خوف خدا ہی نہیں۔"

"نہیں ماسی! ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ تو میں ہی ایسی ہوں۔ میں آدھی روٹی کم بھوک کی وجہ سے نہیں کھاتی، بلکہ میں آدھی روٹی کسی کی محبت میں کھاتی ہوں۔ اب ماسی اتنے سال گزر گئے ہیں۔ آدھی روٹی کو آدھی محبت سے بانٹتے ہوئے کہ اب اگر کوئی پوری روٹی تو کیا، پوری محبت بھی دے تو یقین نہیں آتا۔" مہرو نے بے ساختہ ہنستے ہوئے کہا۔

ماسی جنتے نے دیوانی کو بھیگی آنکھوں سے ہنستے دیکھا تو ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔ "ابھی تک یاد ہے وہ ہرجائی۔"

ماسی جنتے کا لہجہ نرم تھا۔ مہرو کی ہنسی رکی۔ اس نے اپنی آنکھوں میں پھیلی نمی کو دوپٹے سے صاف کیا۔

"وہ کبھی بھولا ہی نہیں تھا اور قسم سے ماسی۔۔۔ میں نے کبھی اسے بھولنے کی کوشش بھی نہیں کی — میں اسے بھول جاتی تو وہ محبت کا مجرم بنتا۔ بھلا میرا دل کیسے گوارا کرتا کہ جسے میں نے سب سے انمول اور الگ جانا، وہ محبت کی عدالت میں مجرم کہلاتا۔ محبت میں بھولنے والے کمال نہیں کرتے۔ محبت میں یاد رکھنے والے کمال کرتے ہیں۔ یاد کرنے والے نہ ہوں تو بھولنے والے تو راستہ ہی بھٹک جائیں گے نا۔ واپسی کے لیے راستے پر یاد کے دیپ جلانا ہی، یاد کرنے والوں کا اولین فرض ہے اور میں اپنا فرض ہی ادا کررہی ہوں ماسی!" مہرو نے کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے آزردہ لہجے میں کہا۔

ماسی جنتے اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "تیری آس کے دیے، مولا سلامت رکھے۔ جانے والے کسی شام لوٹ آئیں گے۔ یقین رکھ۔" ماسی نے نم لہجے میں کہا اور خود کلامی کرتی برآمدے سے چلی گئی۔ مہرو قطرہ قطرہ پگھلتی شام کے سنگ بہنے لگی تھی۔

خزاں کے موسم کی سرد شامیں
سراب یادوں کے ہاتھ تھامے
کبھی جو تم سے حساب مانگیں
مایوسیوں کے نصاب مانگیں
بے نور آنکھوں سے خواب مانگیں
تو جان لینا۔۔۔
کہ خواب سارے
میری حدوں سے نکل چکے ہیں
تمہاری چوکھٹ پہ آرکے ہیں
سوالی نظروں سے تک رہے ہیں
تمہاری چوکھٹ پہ جانے کب سے؟
جبیں جھکائے ہوئے کھڑے ہیں!

☆ ☆ ☆

دستک کی آواز پر مریم نے دوڑ کر دروازہ کھولا تھا۔

"ابا! آگئے ہیں۔" مریم نے پلٹ کر پکارا تھا۔ رخسانہ فورا" کمرے سے باہر نکلی۔ جنید کے چہرے پر تکلیف کے واضح تاثرات تھے۔ وہ لنگڑاتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں پکڑا شاپر مریم کو تھمایا۔

"جاؤ! سب کے ساتھ مل کر کھاؤ۔" جنید نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ مریم گرم گرم جلیبیوں کا شاپر لے کر سرہلاتی اندر کی طرف بھاگی تھی۔

"کہاں گئے تھے تم؟ اپنی حالت دیکھی ہے۔ میں کتنی پریشان تھی۔ تمہیں اندازہ بھی ہے۔"

رخسانہ صبح سے جلے پیر کی بلی کی طرح اندر سے باہر چکر لگارہی تھی۔ جنید اس کے اٹھنے سے پہلے گھر سے جاچکا تھا۔ اب شام ڈھلے واپسی ہوئی تھی۔ بائیک اس کی گھر پر ہی تھی۔ کیونکہ وہ ابھی بائیک نہیں چلا سکتا تھا۔

"دفتر گیا تھا۔ پہلے ہی اتنی چھٹیاں ہوگئی ہیں۔" جنید نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

زخمی ٹانگ کے ساتھ لوکل ٹرانسپورٹ کا سفر کرنا کسی سزا سے کم نہیں تھا۔ جنید اندر کمرے میں جاکر لیٹ گیا۔ رخسانہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اتنی محنت اور

تکلیف وہ صرف اپنے گھر کے لیے اٹھا رہا تھا۔

"کھانا لے آؤں؟" رخسانہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جنید سے پوچھا۔ جو دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے چت لیٹا ہوا تھا۔

"ہوں..." جنید نے آہستہ سے کہا تو رخسانہ فوراً گرم گرم کھانا ٹرے میں لگا کر لے آئی۔ گھر کی حالت بھی پہلے سے بہتر ہو چکی تھی۔ بچے بھی صاف ستھرے حلیے میں نظر آتے تھے۔ رخسانہ کا مزاج بھی دھیما ہو گیا تھا۔ جنید نے ایک نظر سامنے رکھے خوش رنگ سالن اور روٹی پر ڈالی۔ چند نوالے لینے کے بعد اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"بس! صرف آدھی روٹی کھائی ہے تم نے۔" رخسانہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ جو دوبارہ چت لیٹ چکا تھا۔

"اب بھوک ہی صرف آدھی روٹی کی ہے۔" جنید بڑبڑایا تھا۔

"جاتے ہوئے لائٹ بند کر دینا۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

جنید نے کہا تو رخسانہ بے دلی سے ٹرے اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ جبکہ جنید دل پر دستک دیتے گرد میں اٹے اس کی چوکھٹ پر کب سے سر جھکائے کھڑے خوابوں کے سوالی نظروں کے پچھتاوے میں ڈوبا ماضی کی گلیوں میں بھٹکنے لگا۔ دونوں بھلے ایک دوسرے سے دور' الگ الگ جگہ پر موجود تھے مگر ایک پھر ایک لمحے' ایک وقت کی قید میں جکڑے ایک ساتھ ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

"میرے سب یار کہہ رہے تھے کہ میں دولہا بن کر بہت جچ رہا تھا۔"

شادی کے تیسرے دن بیس سالہ جنید نے... سجی سنوری' نکھرے رنگ کے لباس میں ملبوس ماہ جبین سے کہا تھا۔ اٹھارہ سالہ ماہ جبین عرف مہرو نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ جو اپنی دلہن کی تعریف سے زیادہ خود ستائشی میں مگن تھا۔

"ہاں... مگر خوب صورت تو دلہن ہی لگتی ہے نا۔" مہرو نے جھجکتے ہوئے کہا تو جنید نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"خوب صورت لگنے میں اور ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے محترمہ!" اماں کے لاڈلے اور بگڑے نواب جنید نے شاہانہ انداز میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں بد صورت ہوں۔" اپنی چھوٹی سی عقل کے مطابق مہرو نے سوچا اور اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں آنسو بھر کر' پیر پٹختی کمرے سے باہر نکلی۔ اسے روتا دیکھ کر جنید کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"میری بات سنو مہرو۔" جنید نے پکارا' مگر مہرو تیز گام کی طرح چلتی' سیدھا اماں کے سرہانے جا کر رکی تھی۔ ضعیف اور بیمار اماں بستر پر لیٹی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"کیا ہوا مہرو؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟" اماں نے کسی خدشے کے تحت پوچھا تھا۔

اسی وقت جنید بھی پشیمان سا کمرے میں داخل ہوا' مہرو اماں سے لپٹ کر زارو قطار رو رہی تھی۔

"ارے ہوا کیا؟ کچھ بول بھی..." اماں نے دہل کر پوچھا۔

"اماں! سب کہتے ہیں کہ میں اتنی سوہنی ہوں اور دلہن بن کر تو مجھ پر بہت روپ آیا تھا۔ آپ نے میری نظر بھی اتاری تھی نا؟"

مہرو نے معصومیت سے سوال کیا تو اماں کچھ نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگیں۔

"تو اماں پھر آپ کے بیٹے نے کیوں کہا کہ میں بد صورت ہوں۔ یقین نہیں تو پوچھ لیں۔" مہرو نے نروٹھے پن سے کہا تو اماں نے پہلے اس کا چہرہ دیکھا' پھر جنید کا... پھر بے ساختہ ہنس پڑیں۔ ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"جھلی ہے تو..." اماں نے مسکراتے ہوئے اس کی

پیشانی چومی تھی۔

"اماں! غیر لڑکی کو زیادہ سر نہ چڑھا! کل کو یہ بھی ناز بھابھی کے نقش قدم پر چلے گی۔"

جنید اماں کا مہرو کے ساتھ پیار دیکھ کر جل بھن گیا تھا۔ اسے کب عادت تھی اماں کا پیار کسی سے بانٹنے کی۔

"بندہ اپنے خمیر سے اٹھتا اور پہچانا جاتا ہے۔ ناز کا خمیر کسی اور مٹی کا ہے اور مہرو کا خمیر صرف محبت سے بنا ہے۔ تو فکر مت کر۔"

اماں نے یقین سے کہا۔ پھر تینوں کتنی دیر۔ بیٹھے باتیں کرتے، ہنستے رہے۔ ناز بھابھی یہ دیکھ کر کڑھتی رہی۔ اماں اپنے لاڈلے اور راج دلارے بیٹے کے لیے بہت ڈھونڈ کر نگینہ لائی تھیں۔ جنید ابھی لاابالی سا تھا۔ کچھ عمر بھی ایسی تھی۔ مگر اماں اپنی بیماری سے گھبرا کر بہت جلد اس کی دلہن لے آئی تھیں۔

خود مہرو بھی والدین کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ یہ رشتہ چچا حق نے کروایا تھا۔ معصوم اور سیدھی سادی مہرو، اماں کو پہلی ہی نظر میں بھا گئی تھی۔

جنید اور مہرو کی ہلکی پھلکی، معصوم سی نوک جھونک اماں کے چہرے کو خوشی سے منور رکھتی تھی۔

مگر اماں جہاں دیدہ عورت تھیں۔ مہرو کی سادگی اور معصومیت انمول سہی مگر دنیا میں ایسے لوگ بے مول ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔ گھر کا سارا انتظام اور زمینوں کا حساب کتاب بڑے بیٹے فاروق کے ہاتھ میں تھا۔ اماں نے کافی سوچ بچار کے بعد چچا حق کے صلاح مشورے سے بڑے سے گھر کا آدھا حصہ اور زمینوں کی برابر تقسیم کے کاغذات تیار کروا لیے تھے تاکہ ان کے مرنے کے بعد دونوں بیٹوں میں زمین، جائیداد کے جھگڑے نہ پیدا ہوں۔ اس وقت فاروق اور ناز تلملا کر رہ گئے تھے۔ مگر کچھ کرنے سے قاصر تھے۔

جنید کو اچھی طرح یاد ہے کہ اس کی شادی کے کچھ مہینوں کے بعد اماں کا انتقال ہو گیا اور جنید جو موج مستی اور لاابالی پن میں وقت گزار رہا تھا۔ ماں کی ٹھنڈی چھاؤں کا سایہ سر سے ہٹا تو رویوں اور لہجوں کی تیز تپش سے گھبرا کر جوش جوانی میں سب چھوڑ چھاڑ کر دوست کے کہنے پر شہر آگیا۔ اماں کے مرنے کے بعد جو دو سال کا عرصہ اس نے فاروق بھائی کی جھڑکیاں سننے اور ناز بھابھی کی تیز زبان کے جوہر دیکھنے میں گزارا، وہ بہت تلخ تھا۔

زمینوں کی دیکھ بھال فاروق بھائی کرتے تھے۔ اماں کے مرنے کے بعد بٹوارے کی تقسیم کے کاغذات ان کی الماری سے غائب ہو گئے تھے۔ چچا حق پردیس جا چکے تھے۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو ان کی مدد کرتا۔ جنید کو اماں نے بہت بار کام کاج میں دلچسپی لینے اور سنبھالنے کو کہا تھا۔ مگر وہ کبھی سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔ اسی بات کا فائدہ دوسروں نے اٹھایا۔

جنید جذباتی تھا۔ ایک دن غصے میں لڑ جھگڑ کر قسمت بنانے کے لیے گھر سے نکلا تھا اور پھر پلٹنا ہی بھول گیا تھا۔ مہرو سے شادی اماں کی پسند پر کی تھی اور رخسانہ اس کی پسند تھی۔ جس سے طوفانی محبت اور پھر شادی کر کے وہ بہت خوش و مطمئن تھا۔

مگر آنے والے وقت نے اسے اماں کی ایک بات بار بار یاد دلائی تھی۔

اماں اکثر یاد کرتی تھیں کہ ان کے شوہر مرحوم ایک بات بار بار کہتے تھے۔

"کہ میں نے عورت کی محبت کو "آدھی روٹی" سے جانا۔"

یہ بات جنید کو تب نہیں سمجھ میں آئی تھی۔ وہ ہنستا، مذاق اڑاتا تھا، مگر جب سمجھ میں آئی تو وقت اس پر ہنس رہا تھا۔ اس کے ہونٹ تو ہنسی کا ذائقہ ہی بھول چکے تھے۔

✲ ✲ ✲

"آدھی روٹی" کا راز اور منتر اماں، مہرو کو دے گئی تھیں۔ مہرو نے اماں کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کیا تھا۔

مہرو کو یاد ہے کہ اماں کہتی تھیں کہ "سب سے ظالم چیز "پیٹ کی بھوک" ہے۔ اس بھوک کو مٹانے کے

لیے انسان کیا نہیں کرتا۔

اور اگر کوئی اپنی بھوک سے آگے کسی کی محبت رکھتا ہے تو وہ محبت کرنے والوں میں افضل ہے۔"

مہرو نے اماں سے سیکھا تھا کہ ایک عورت کس طرح قدم قدم پر اپنے گھر اور اپنے شوہر کے لیے قربانی دیتی ہے۔

اماں نے ایک وقت بہت تنگی میں گزارا تھا کہ کھانے کو بمشکل نصیب ہوتا تھا اور اماں اس وقت بھی ابا کا خیال خود سے بڑھ کر رکھتی تھیں اور اپنے حصے کی آدھی روٹی ان کے لیے رکھ دیتی تھیں۔ یہ بات ابا کو بعد میں پتا چلی تو وہ اماں کی اس محبت پر اشک بار ہو گئے اور پھر اکثر یہ ہی کہتے کہ.....

"میں نے عورت کی محبت کو آدھی روٹی سے جانا ہے۔"

یہ قربانی کتنی بڑی ہوتی ہے اس کا اندازہ مہرو کو تب ہوا جب وہ مکمل طور پر ناز بھابھی کے رحم و کرم پر آ گئی تھی۔

سارے دن کا کام اور جھڑکیوں کے بعد سب سے آخر میں اسے روٹی ملتی۔ جنید جو شروع سے خوش خوراک تھا۔ ناز بھابھی کی دی ہوئی ایک روٹی سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ بھوک مہرو کو بھی لگتی تھی کہ یہ فطری چیز تھی۔ مگر جنید کی بھوک کے احساس سے وہ اپنے حصے کی ایک روٹی کے دو ٹکڑے کرتی اور اخبار میں لپیٹ کر رکھ دیتی۔ جنید رات کو جب بھوک سے بے چین ہوتا تو وہ فوراً" روٹی کے آدھے ٹکڑے پر کبھی گڑ کبھی تھوڑا مکھن یا اچار رکھ کر اسے دے دیتی۔

اس سے جنید کی بھوک مکمل ختم تو نہیں ہوتی تھی، مگر اسے آسرا ہو جاتا تھا۔

"یہ آدھی روٹی کہاں سے آتی ہے۔" ایک بار جنید نے پوچھا تھا۔

"محبت سے....." مہرو نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔ جسے نا سمجھی میں جنید نے نظر انداز کر دیا۔ پھر اکثر ایسا ہی ہونے لگا۔ مہرو کے میکے یا محلے سے کچھ بھی کھانے پینے کی چیز آتی وہ جنید کے لیے ایک حصہ نکال کر رکھ دیتی۔ مہرو نے اماں سے وفا اور قربانی کے جو سبق پڑھے تھے وہ اسے رٹو طوطے کی طرح ازبر ہو چکے تھے۔ تنگ حالات میں بھی وہ دونوں ایسے رہتے تھے کہ جیسے کتنے خوش حال اور خوش ہیں۔

یہ بات ناز بھابھی کو آگ لگانے کے لیے کافی تھی۔ اب اس نے آسان ہدف کو چنا تھا۔ جنید کم عقل اور جذباتی تھا۔ وہ پے در پے ہونے والے واقعات سے گھبرا کر اس ماحول سے ہی دور چلا گیا۔

پیچھے مہرو خالی ہاتھ اور حیران آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اماں نے وفا کے سب قاعدے تو پڑھائے تھے۔ مگر مرد کی بے وفائی اور ہرجائی پن کا صفحہ کیوں چھپا گئی تھیں۔ مہرو اکثر سوچتی تھی اور آہ بھر کر رہ جاتی تھی۔

یہ درد کے سکے، یہ اشک کے موتی
وہ بھیجتا ہے محبت کی اجرتیں کیا کیا

☆☆☆

"منڈیر پر تمہارے بولنے سے اگر کسی کے آنے کا یقین ہوتا تو میں ساری منڈیر تمہارے کالے وجود سے بھر دیتی۔"

مہرو نے منڈیر پر بیٹھے، شور مچاتے کوے کو دیکھ کر خود کلامی کی تھی۔ اپنے لیے روٹی بنا کر وہ صحن میں بچھی چارپائی پر آ بیٹھی۔ ابھی اس نے نوالہ توڑا بھی نہیں تھا۔ جب یک دم کوئی بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

مہرو کی نظر اٹھی اور پلٹنا بھول گئی۔ سفری بیگ کاندھے پر ڈالے، ہلکی لنگڑاہٹ لیے وہ چلا آ رہا تھا۔ مہرو نے بے یقینی سے پہلے اسے اور پھر منڈیر کی طرف دیکھا۔ کوا پھر کر کے اڑ گیا تھا۔

"ٹھہرو! پہلے میں حساب تو کروں! کتنے پل، کتنے لمحے، کتنے دن، کتنے ہفتے، کتنے سال گزارے ہیں اکیلے....."

مہرو نے دل ہی دل میں حساب لگانا چاہا، مگر سب گڈمڈ ہو کر رہ گیا۔ بس اس کے جانے اور آنے کا لمحہ

ٹھہر گیا تھا۔ باقی سب گزر...

"تم جانتی ہو مہرو! مجھے کون سی چیز تمہارے پاس واپس لے کر آئی ہے۔" جنید صحن میں لگے نلکے سے ہاتھ دھوتا اس کی طرف پلٹا اور چارپائی کے ساتھ رکھے موڑھے پر آبیٹھا۔

مہرو نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"تمہاری آدھی روٹی..." جنید نے کہا تو مہرو چونک گئی۔

"ہاں مہرو! ان گزرے سالوں نے سب کچھ دیا۔ ایک گھر، عورت کا ساتھ، بچے، اچھا کھانا، پینا، مگر شاید تم یقین نہ کرو کہ کھانے سے بھرے دسترخوان نے کبھی وہ عزا، وہ ذائقہ، وہ احساس نہیں دیا جو تمہاری آدھی روٹی دیتی تھی۔

میں بہت ترسا ہوں، بہت پچھتایا ہوں اس آدھی روٹی کے لیے جو محبت اور وفا کے اجزا سے میرے لیے تم بناتی تھیں، میرے لیے رکھتی تھیں۔

ساری دنیا کی ٹھوکریں کھا کر آیا ہوں اور پورے یقین سے کہتا ہوں کہ تم انمول ہو اور تمہاری آدھی روٹی آج کے دور میں نایاب ہے۔ مجھے معاف کردو مہرو!"

جنید نے اس کے سامنے جھکے سر اور نم لہجے میں کہا۔ مہرو بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"اماں! آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ آپ جیت گئیں آج۔"

مہرو نے دل ہی دل میں کہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ایک مدت سے میں نے بھی پوری روٹی نہیں کھائی، بسم اللہ کرو۔"

مہرو نے کہا تو جنید نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر سامنے رکھی روٹی کو... دونوں نے مل کر وہ ایک روٹی کھائی، اسی وقت اماں جنتے اندر داخل ہوئیں۔ صحن کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"اماں جنتے! دیکھو آج میں نے پوری روٹی کھائی ہے۔"

مہرو نے خوشی سے چہک کر کہا۔ اماں جنتے نے سمجھ کر اثبات میں سرہلایا اور اسے خوش رہنے کی دعا دے کر چلی گئیں۔ شام گہری ہوئی تو گھر کے سامنے شور ابھرا۔ صحن میں مغرب کی نماز پڑھتی، مہرو نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ جنید بھی کمرے سے باہر نکلا۔ اتنے میں کوئی زور سے بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

"ابا..." چاروں بچے بھاگتے ہوئے باپ سے لپٹ گئے۔ پیچھے پیچھے رخسانہ، بیگز گھسیٹتی، منہ بناتی اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ صحن کے وسط میں آکر دھم سے چارپائی پر بیٹھی اور بولی۔

"یہ اچھا طریقہ ہے۔ اپنے پیچھے خط چھوڑ آئے کہ میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے۔ آنا ہو تو اس ایڈریس پہ آجانا۔ نہیں تو میں گھر اور بچوں کا خرچا باقاعدگی سے ہر مہینے بھیج دیا کروں گا اور بچوں سے ملنے بھی آیا کروں گا۔ واہ جناب! یہ اچھا طریقہ ہے اطلاع دینے کا۔ کوئی احساس نہیں کوئی..."

"پانی..." رخسانہ کی چلتی زبان کو یک دم بریک لگا۔ اس نے ایک نظر سامنے کھڑی سنجیدہ چہرے پر نرم مسکراہٹ سجائے کھڑی مہرو پر ڈالی۔ جس نے اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال شوہر کی رفاقت کے بغیر گزارے تھے۔ وہ تو ایک دن کی دوری کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس عورت کی ہمت اور وفا کو سلام تھا۔

"شکریہ!" رخسانہ نے بھی جواباً مسکرا کر اسے دیکھا اور گلاس تھام لیا۔ جنید نے مسکراتے ہوئے یہ منظر دیکھا اور بچوں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔

وہ جانتا تھا کہ...

"کچھ کام دیر سے ہی سہی، مگر درست طریقے سے سرانجام دینا ضروری ہوتے ہیں، کیونکہ لمحہ احساس کے بعد آنے والا وقت ہی نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ اختتام کی کسے خبر؟ مگر آغاز تو شاندار ہونا چاہیے نا۔" اور یہ ہی اس نے کیا تھا۔

نور فاطمہ
شب آرزو

رات کے آخری پہر کی گہری تاریکی میں سناٹے کا سینہ چیرتی فون کی گھنٹی کی تیز آواز نے انسپکٹر شاہ زیب کو نہ صرف نیند سے جگایا بلکہ رات کے اس پہر بجنے والی فون کی گھنٹی خطرے کے الارم کی طرح اسے چوکنا کرنے کے لیے کافی تھی۔ اپنے لیے ان مشکل ترین راستوں پر چلتے ہوئے ایک پُرعزم ڈیوٹی کا انتخاب اس نے خود کیا تھا۔ اسے رات کے کسی بھی پہر فرض کی پکار پر کہیں بھی جانا پڑ جاتا تھا۔ تب پیچھے انتظار کرتی اس کی تنہا ضعیف دادی جان اس کے لوٹنے تک وظائف کا ورد جاری رکھتیں۔

"انسپکٹر صاحب! یقیناً "خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔" فون کان سے لگاتے ہی وہ آواز آئی جسے وہ لاکھوں آوازوں میں پہچان سکتا تھا۔ "یوں ہی سوتے سوتے عمر گزارنے کے ارادے نہیں ہیں تو اُٹھیے آپ کے علاقے میں شہر کے شرفا کی زیر سرپرستی چلنے والا "بہنوں کا گرلز ہاسٹل" ان لوگوں کے بے شمار جرائم کی پردہ پوشی کا ذریعہ بنا ہوا ہے جنہیں آپ جیسے پولیس آفیسر صبح و شام سلیوٹ کرتے ہیں، واقعی وطن کے محافظ ہونے کے دعوے دار ہیں تو آج رات بڑی کھیپ کے ساتھ تمام مجرموں کو بلا تفریق رنگے ہاتھوں گرفتار کریں۔ میں نے اپنی جان پر کھیل کر آپ کو یہ انفارمیشن دی ہے اب آپ کو اپنی جان پر کھیل کر خود کو ایک سچا محب وطن ثابت کرنا ہے دم ہے تو کر کے دکھائیں۔" یہ کہہ کر اگلی کوئی بھی بات سنے بغیر اس نے بھی فون بند کر دیا۔

اس آواز نے تب بھی اس کے ہوش و حواس چھین لیے تھے جب پہلی بار اسٹیشن پر چھوٹتی ٹرین کو پکڑنے کی جدوجہد میں اپنی بے ترتیب اکھڑتی پھولتی سانسوں کے ساتھ وہ ایک ہاتھ میں سفری بیگ تھامے دوسرا ہاتھ بلند کیے چلتی ہوئی ٹرین کے تعاقب میں پوری طاقت کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اپنی بوگی کے دروازے میں کھڑا وہ اس ویران اور بے نام اسٹیشن پر ٹرین کے رکنے کی وجہ جاننے کی غرض سے کھڑا اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں کسی اجنبی

مکمل ناول

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

سائے کو ٹرین کے تعاقب میں بھاگتے دیکھ کر اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے اس کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا اور اس نے بھی بغیر کسی حیل و حجت کے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر اسی کی ہمت اور طاقت کے سہارے خود کو ٹرین کے اندر پایا تھا۔ ٹرین پر سوار ہونے کی کوشش میں اس کا نقاب ڈھلک گیا تھا شاہ زیب کے ہاتھ میں اس کا نازک ہاتھ آجانے کی طرح اس کے رخ روشن سے نقاب کا ہٹ جانا بھی اس کی زندگی کا ایک حسین اتفاق تھا۔

ٹرین میں چھائے مدھم اندھیرے میں ٹرین سبک رفتاری کے ساتھ شاید اس منزل کی جانب جس سے وہ دونوں ہی اس لمحے بے خبر اور لاعلم تھے' بڑھ رہی تھی' مگر اس بوگی کے دروازے پر جیسے وقت تھم سا گیا تھا۔ سانسیں رک سی گئی تھیں۔ ٹرین میں سوار ہونے والے بلیک گاؤن میں ملبوس اس سائے کی معطر اور مدہوش کن قربت نے انسپکٹر شاہ زیب جیسے مضبوط اور بہادر شخص کو چند لمحوں کے لیے بے خود سا کر دیا۔ وہ گھنی پلکوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی ان آنکھوں میں کھو سا گیا۔ ایسا اس کے ساتھ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ اس کے حواس بحال ہونے شروع ہوئے تو احساس ہوا کہ وہ نازک اندام حسینہ اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے کسمسا رہی تھی۔ اس نے اس کے کھنکھارنے پر فوراً" اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"شکریہ! اگر آپ مدد نہ کرتے تو یہ ٹرین بھی چھوٹ جاتی۔" اس کی آواز بھی اس کی آنکھوں کی طرح سامنے والے کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھی۔

"میں آپ سے مخاطب ہوں مسٹر!"

اسے یک ٹک اپنی طرف گھورتے پا کر اس نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اور اپنی خوب صورت آواز کا جلترنگ بکھیرتی ہوئی مسکرا کر بولی۔ اس کی مدھ بھری کانوں میں رس گھولتی آواز نے انسپکٹر صاحب کو بھی ہوش کی دنیا میں پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

"ارے نہیں اس میں شکریہ کی کیا بات ہے یہ تو میرا فرض تھا۔ جو میں نے پورا کیا۔" اس نے کسر نفسی کے ساتھ اس کی بات کا جواب دے کر خود کو ہوش مند ثابت کرنے کی کوشش کی ورنہ وہ اب تک اس حادثے سے خود کو نکالنے میں ناکام تھا' جو ابھی ابھی اس کے دل پر گزرا تھا۔

"آپ کی فرض شناسی کا بھی بے حد شکریہ۔" وہ نظریں گھما کے بوگی میں خالی سیٹ دیکھتے ہوئے بولی۔ ساری سیٹیں بھری تھیں۔ رات کے اس پہر مسافر چلتی ہوئی ٹرین میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔

"آیئے.... ادھر میری جگہ پر بیٹھ جائیں۔" وہ اس کی سیٹ کو تلاش کرتی نظروں کو بھانپ کر بولا۔

"نہیں' آپ نے میرے لیے جو کیا ہے۔ اس کا قرض ابھی اترا نہیں.... اور قرض رکھنے کی مجھے عادت نہیں۔" وہ حواس درست ہوتے ہی اپنا نقاب ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"ارے! اس میں تکلف اور قرض کی تو کوئی بات نہیں۔ آپ بیٹھیں میں تو آن ڈیوٹی ہوں' نجانے کب اور کہاں اترنا پڑ جائے۔" وہ انتہائی شائستگی کے ساتھ بولا۔

"ٹکٹ پلیز!" ابھی وہ بیگ رکھ کے بیٹھی ہی تھی کہ ٹکٹ چیکر کی آواز پر بوکھلا سی گئی۔

"یہ ایمرجنسی میں' چلتی ٹرین میں سوار ہوئی ہیں۔ شاید ٹکٹ ان کے پاس موجود نہیں.... آپ اب ان کا ٹکٹ کاٹ دیں۔" وہ ٹکٹ چیکر کو جواب دینے کے لیے ابھی مناسب الفاظ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ بہت مہذب انداز میں آگے بڑھ کر بولا۔

"چلیں جی.... کوئی بات نہیں۔ کہاں جانا ہے آپ کو کہاں کا ٹکٹ کاٹوں؟" وہ ٹکٹ چیکر ڈائریکٹ اس سے مخاطب ہوا۔

"اس ٹرین کا جو آخری اسٹاپ ہے' وہیں کا ٹکٹ کاٹ دیں۔" وہ قدرے سنبھل کر بولی۔ یعنی اسے اپنی منزل کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔

"کراچی کینٹ ہے جی.... اس کا آخری اسٹاپ"

اس نے اپنے رجسٹر پر نظریں جھکائے جھکائے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"تو ٹھیک ہے وہیں کا ٹکٹ بنا دیں۔" وہ اپنے بیگ کی زپ کھول کر اندر سے پرس نکالنے میں مگن تھی جب کہ ٹکٹ چیکر شاہ زیب سے پیسے لے کر ٹکٹ تھما کر آگے بڑھ چکا تھا۔

"ارے چلا بھی گیا۔" وہ پرس میں سے پیسے نکال کر بولی۔

"یہ لیں آپ کا ٹکٹ... میں نے پے منٹ کر دی ہے۔" شاہ زیب نے ٹکٹ اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

"اچھا' یہ لیں... آپ اپنے پیسے اس میں سے کاٹ لیں۔" اس نے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اب رہنے بھی دیں... کیا ہوا جو میں نے پیسے دے دیے۔"

"مجبور مسافر کو اس کی چھوٹی ٹرین میں سوار کرانا آپ کا فرض ہے جو آپ نے پوری ایمانداری کے ساتھ نبھایا' مگر اس کے ٹکٹ کی پے منٹ کرنا تو آپ کا فرض نہیں ہو سکتا نا۔" وہ نقاب سے جھانکتی آنکھوں سے اسے گھور کر بولی۔ شاہ زیب نے مزید کوئی بحث کیے بغیر نوٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اپنی جیب سے اسے واپس پیسے دینے کے لیے نکالنے لگا۔

"پچیس پیسے کم ہیں؟" وہ بقایا پیسے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"کوئی بات نہیں اٹس اوکے۔" اس نے باقی کے پیسے پکڑنے کے لیے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"کیسے کوئی بات نہیں... آپ کی طرح مجھے بھی قرض رکھنے کی عادت نہیں۔" اس کے لبوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ تھی۔

"اب کیا ہو سکتا ہے؟ مجبوری ہے۔" اس نے باقی کے پیسے اس کے ہاتھ سے لے کر معصومیت کے ساتھ نظریں جھکا کر کہا۔

"شاید یہ قرض ہماری اگلی ملاقات کی وجہ بن جائے۔"

"نہیں میں اگلی ملاقات کے بجائے اس قرض کو معاف کرنے کو ترجیح دوں گی۔" وہ اس کی گھورتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں کو نظرانداز کرتے ہوئے فوراً" بولی۔

"کیوں؟ کیا ہماری ملاقات اتنی ناخوش گوار ہے کہ اگلی ملاقات کا بہانہ نہ بن سکے۔" وہ بھی گویا گفتگو کا سلسلہ توڑنے کو تیار نہ تھا۔

"یہ ملاقات نہیں بلکہ ایک اتفاق ہے اور اتفاقات کو یاد رکھنا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔" وہ خود کو پُراعتماد ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب کہ اس کے کانپتے ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں کا ایک دوسرے میں پھنسنے اور الگ ہونے کا عمل اس کے اندر کے خوف کی نشاندہی کر رہا تھا۔

"آپ کے لیے کچھ کہہ نہیں سکتا' مگر میں اس اتفاقی حادثے کو کبھی نہیں بھولوں گا۔" وہ اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو کر بولا۔

عجیب آدمی ہے خوامخواہ ہی بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی حیرت زدہ آنکھوں میں شاہ زیب اس کے دل کی کیفیت صاف دیکھ سکتا تھا۔ تب ہی اس کے فون کی گھنٹی نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا "ٹھیک ہے ان کے علم میں لائے بغیر نگرانی کرو ان کی ہمیں آرہا ہوں۔" اس نے فون بند کر کے جیب میں رکھتے ہوئے عجلت میں ایک الوداعی نظر اس پر ڈالی اور اگلی بوگی کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے ساتھیوں نے دو بوگیاں چھوڑ کر کچھ مشکوک افراد کی موجودگی کی خبر دی تھی۔ اس کا فوراً" وہاں سے جانا بے حد ضروری تھا۔ اگر اس حسینہ سے اگلی ملاقات قسمت میں ہوئی تو اللہ ضرور کوئی سبب بنا دے گا۔ وہ یہ سوچتے ہوئے تیز قدم اٹھاتا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

✡ ✡ ✡

اور پھر کراچی کینٹ اسٹیشن پر آنے اور جانے والے مسافروں کے جم غفیر میں وہ اسے راہ سے بھٹکنے والے مسافر کی طرح ادھر سے ادھر راستے کی تلاش

میں چکر کاٹتی ہوئی ملی۔

اسے رات کے اس پہر تن تنہا ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کے تعاقب میں دوڑتے ہوئے دیکھ کر شاہ زیب کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ ڈالی سے ٹوٹا ہوا ایک ایسا خزاں رسیدہ پتا ہے جسے راستوں کی خبر ہے نہ منزل کا کوئی نشان اس کے سامنے ہے۔ ٹرین میں اس سے جدا ہوتے ہوئے وہ تہہ دل سے اسے اللہ کی پناہ میں دے کر گیا تھا، مگر یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک بار پھر اس کے سامنے تھی۔

"آپ کو برا نہ لگے تو میں آپ کو آپ کی منزل تک پہنچا سکتا ہوں۔" وہ یک دم اس کے سامنے آکر بولا تو وہ چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں.... بے نام و نشان منزلوں کی تلاش میں انسان کو اکیلے ہی بھٹکنا پڑتا ہے۔ اور میں نے اس کے لیے تیار ہو کر ہی سفر کا آغاز کیا ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ قدرے سنبھل کر بولی۔

"آپ مجھ پر بھروسا کر سکتی ہیں.... میرا تعلق پولیس سے ہے۔" اس نے اپنا نامکمل سا تعارف کرانے کی کوشش کی۔

"پولیس کے آدمی ہیں آپ؟" اس نے بے یقینی کے ساتھ اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"کبھی کبھی مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے ہمیں وردی چھوڑ کر سادہ لباس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں اٹھنے والے سوال کا مطلب سمجھ کر جواباً بولا۔

"واہ! بڑے ماہر ہیں فیس ریڈنگ میں، پھر تو آپ یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ میں نہ صرف اکیلی ہوں بلکہ اس شہر کے راستوں اور لوگوں سے بھی ناواقف ہوں، لیکن میں آپ پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ اکیلی اور ناواقف ہونے کے باوجود میں اپنی حفاظت بہت اچھی طرح سے کر سکتی ہوں۔ جہاں سے آپ نے مجھے پک کیا ہے، وہاں سے بھی ایک درندہ صفت انسان کو پچھاڑ کر نکلی ہوں۔"

"رہی بات پولیس والوں پر بھروسا کرنے کی تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سیانے کہتے ہیں ڈاکو پر بھروسا کر لو، مگر کسی بااختیار پولیس والے پر نہیں۔ کیونکہ اختیار اور اقتدار کا گھمنڈ۔ ان سے ہر احساس چھین لیتا ہے جنگل کے قانون کو فالو کرنے والے یہ بااختیار کارندے اپنے اپنے زور کے مطابق مجبوری میں گھری بے بس مخلوق کو نگلنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔" اس نے پولیس والوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیا۔

"سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ آزما کر دیکھ لیں۔" وہ اپنی فیلڈ سے متعلقہ لوگوں کے لیے اس کے خیالات پر مسکرا کر بولا۔

"وقت آیا تو آپ کو بھی آزمائیں گے، مگر اس وقت کسی پر بھی بھروسا کرنا میں افورڈ نہیں کر سکتی لہٰذا آپ اپنے راستے جائیں اور مجھے میرا راستہ تلاش کرنے دیں۔" کہہ کر وہ آگے بڑھی۔

"سنیے...." وہ رکی، مگر مڑی نہیں۔ "یہ میرا کانٹیکٹ نمبر اپنے پاس رکھ لیں، کبھی کہیں بھی کسی بھی وقت ضرورت پڑے تو کال ضرور کیجیے گا۔ اتنا تو کر سکتی ہیں نا آپ؟" اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کے سامنے کرتے ہوئے اپنی شرافت کا پہلا ثبوت پیش کیا۔ اس نے بھی بغیر کچھ کہے بغیر وہ کارڈ تھام لیا۔

شاہ زیب نے اس کے بعد اس کا پیچھا کرنا مناسب سمجھا اور نہ ہی اصرار، لیکن اس وقت سے آج تک شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرا ہو جس میں اس کی زبان سے نکلی سچائی پر مبنی باتوں کو اس نے یاد نہ کیا ہو۔ اس کے اپنے ہی ڈپارٹمنٹ میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جن کی تعریف میں اس اجنبی ہم سفر نے سچ اگلا تھا۔ آج ایک اہم انفارمیشن دے کر وہ دوبارہ پُراسرار طور پر غائب ہو گئی تھی، مگر اگلی صبح اس امتحان پر پورا اترنے کے لیے وہ رات ہی کو منصوبہ بندی تیار کر چکا تھا۔ پورے ڈپارٹمنٹ میں تین بندے تھے جن پر وہ آنکھ بند کر کے اعتبار کر سکتا تھا اور اپنی سروس کے دوران

اس نے جتنے بھی کیس حل کیے تھے۔ وہ ان ہی تین ساتھیوں کے ساتھ مل کر کیے تھے۔ سب انسپکٹر رحمٰن' حوالدار مراد خان اور ایک نیا بھرتی ہونے والا سپاہی اکرام' جن کی بہت جانچ پرکھ کرنے کے بعد انسپکٹر شاہ زیب نے اپنے قانونی گینگ کا حصہ بنایا تھا جو مجرم کو رنگے ہاتھ پکڑنے سے پہلے کیس کے کسی بھی پہلو کی دوسرے افسران اور عملے کے باقی لوگوں کو ہوا بھی نہیں لگنے دیتے تھے۔

ہر کیس کو حل کرنے کا ان کا اپنا ایک طریقہ تھا جسے اپنا کر وہ فرض شناسی اور ایمان داری کی ایک مثال بن کر مجرموں کے ہاتھوں آلہ کار بننے والے افسران کی آنکھوں میں کسی پھانسی کی طرح چبھ رہے تھے۔

انسپکٹر شاہ زیب کے آدمیوں نے ایک ہفتے کے اندر گرلز ہاسٹل کی جو رپورٹ تیار کر کے شاہ زیب کی ٹیبل پر رکھی اسے پڑھنے کے بعد جو انکشافات سامنے آئے وہ ناقابل یقین اور ناقابل بیان تھے۔ گرلز ہاسٹل کی آڑ میں جہاں قانون کے رکھوالوں کا خواب میں بھی دھیان نہیں جا سکتا تھا۔ ڈرگز مافیا سے لے کر اسلحہ کی سپلائی کرنے والے لوگوں تک کتنے ہی جرائم پیشہ لوگ تھے جو ہاسٹل میں ایک نیک کام کی آڑ میں ملک دشمن عناصر کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر نوجوان نسل کو تباہ کرنے کے فرائض پوری ذمہ داری سے نباہ رہے تھے۔ اس ہاسٹل میں پناہ لینے والی لڑکیوں کو اور عورتوں کو پورے شہر میں اس ہاسٹل سے زیادہ سستے داموں میں کوئی جگہ رہنے کے لیے نہیں مل سکتی تھی۔

گرلز ہاسٹل کی بیس منٹ میں اس رات اس پاک سرزمین کو تباہ کرنے کے ارادے کی تکمیل میں حصہ دار بننے والے وطن دشمن عناصر کے آلہ کار اور وطن پرستوں کی آمنے سامنے لڑائی کے امکان تھے جس سے دشمن بے خبر تھا۔ منشیات اور اسلحے کی ایک بڑی کھیپ سمیت تقریباً "پندرہ افراد وہاں اپنے ہی لوگوں کی موت کا سامان جمع کرنے میں مصروف تھے۔ انسپکٹر شاہ زیب نے جس حکمت عملی سے اس خطرناک کیس کو ہینڈل کیا تھا۔ اس گروہ کی پشت پناہی کرنے والے سرغنہ اپنی اپنی جگہ پر سر پکڑے آنے والی تباہی و بربادی کا رخ موڑنے کے لیے ڈوبتی کشتی کے ملاح کے طرح ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ دشمن حیرت زدہ تھا کہ ان کے جس اڈے پر کسی کا گمان پہنچنے کی بھی امید نہیں تھی۔ وہاں انسپکٹر شاہ زیب اپنی پوری ٹیم کی تیاری کے ساتھ پہنچا تو کیسے پہنچا۔ انسپکٹر شاہ زیب گرفتار ہونے والے دشمن کے کارندوں کا عدالت سے ریمانڈ حاصل کر چکا تھا۔

معاملہ گمبھیر بھی تھا اور بارسوخ شخصیات سے جڑا ہوا بھی ہے۔ اس لیے میڈیا کو انوالو کرنا شاہ زیب کے لیے بے حد ضروری تھا۔ اس کیس سے متعلق ہر پیش رفت کی خبر لحہ بہ لحہ چینلز کی بریکنگ نیوز بن رہی تھی۔ اس کیس کی وجہ سے شاہ زیب کی ترقی کے امکانات کافی روشن تھے۔ رات کو سونے سے پہلے دادی کی گود میں سر رکھے جب وہ اپنے دل کی ہر بات ان سے شیئر کرتا تو سرراہ ملنے والی اس انجانی سی اجنبی لڑکی کا ذکر بڑے پیار سے کرتا۔ جو اس کے من میں ہلچل مچاتی بے چینیوں اور بے کلی کی وجہ تھی۔

اور وہ جو ہر مسئلے کا حل چٹکیوں میں نکالنے میں ماہر تھا اس معاملے میں بے بس ہو کر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

دادی جان بڑی شفقت اور پیار سے کبھی کبھی شاہ زیب کو زندگی کی اونچ نیچ سمجھاتیں تو ان کے اپنے پرانے زخم اُدھڑ جاتے۔ خون رسنے لگتا تو دل میں دبے راز نہ چاہتے ہوئے بھی مصلحتوں کے تمام بند توڑ کے زبان تک آنے کو بے قرار ہو جاتے۔

"دادی جان! کبھی کبھی آپ کی باتوں سے لگتا ہے کوئی راز درد بن کر آپ کے سینے میں دفن ہے۔ وہ درد آپ کسی سے بانٹنا نہیں چاہتیں یہاں تک کہ اپنے لاڈلے پوتے سے بھی چھپا کر رکھنا چاہتی ہیں۔ میں آپ کو فورس نہیں کروں گا لیکن کسی دن اس راز سے پردہ اٹھا کر ہی دم لوں گا۔ اور آپ کے ہر زخم پر اپنے ہاتھ سے مرہم رکھوں گا۔" وہ پورے عزم کے ساتھ

انہیں یقین دلاتا تو دادی جان ہلکے سے تبسم کے ساتھ اسے پیار بھری نظروں سے تکتی رہ جاتیں۔
اس کے پاکستان لوٹنے سے پہلے شہر بانو خاتون پرانے خاندانی ملازموں کے رحم و کرم پر عمر کوٹ میں اپنی آبائی حویلی میں اپنی کبھی نہ ختم ہونے والی تنہائی کے ہمراہ مقیم تھیں۔ شاہ زیب تب صرف پانچ سال کا تھا جب خاندانی جھگڑوں کی بناء پر اس کے بابا شاہ میر سائیں بیرون ملک چلے گئے تھے۔ وہ تو اپنی اماں شہر بانو خاتون کو بھی ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جانے پر بضد تھے مگر وہ اپنے شوہر کی حویلی گوٹھ اور خاندان کو چھوڑ کر دیار غیر جانے پر کسی بھی صورت راضی نہ ہوئیں۔ شاید انہیں اس حویلی میں کسی کے لوٹنے کا انتظار تھا۔
شاہ زیب اپنے بابا اور بھائی سے بہت مختلف تھا۔ بابا جب بھی پاکستان میں تنہا زندگی گزارتی شاہ زیب کی دادی جان سے فون پر بات کرتے تو کتنے دن تک ڈسٹرب رہتے۔ دادی جان کو پاکستان میں چھوڑ کر اپنے بابا کے ساتھ دیار غیر بسنے کی اصل وجہ سے وہ ناواقف تھا، مگر اتنا ضرور جانتا تھا کچھ ایسا ہوا تھا۔ کوئی ایسا حادثہ جو دادا جان کی موت کی وجہ اور بابا کے ملک چھوڑنے کا جواز بن گیا۔ بچپن سے لے کر آج تک کسی نے اس کے اس سوال کا جواب دیا نہ اسے خود معلوم ہوسکا کہ آخر پچیس سال پہلے ایسا کون سا حادثہ پیش آیا تھا جس نے حویلی کے مکینوں کی زندگی اتھل پتھل کردی۔ بابا تو بچپن ہی سے اسے اس سوال کے جواب میں ڈانٹ کر چپ کراتے آئے تھے۔ بابا کی ڈانٹ اور ماما کے سمجھانے پر اس نے اپنا سوال دل کے کسی گوشے میں دفن کردیا۔ مگر عمر کے ساتھ ساتھ اس سوال کا جواب جاننے کا تجسس بڑھتا گیا۔
یہ مٹی کی کشش تھی یا دادی جان سے محبت کی تڑپ وہ پاکستان لوٹنے کے لیے ہر پل نئے نئے بہانے سوچتا رہا۔ اس کے باوجود کہ بابا اور ماما اس کی ہر خواہش پوری کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے مگر اس کے اس معاملے کو ماننے سے ہمیشہ انکار ہی کرتے آئے تھے۔
گریجویشن کے بعد بابا نے جب اسے اپنے بزنس میں ایڈجسٹ کرنا چاہا تو اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز پاکستان جاکر کرنے کا دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔ بیٹے کی ضد کے سامنے شاہ میر اور شگفتہ بیگم کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو انہوں نے اپنی اماں جان شہر بانو خاتون کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ لمبی بحث و تکرار کے بعد ہی طے پایا تھا کہ شاہ زیب گاؤں ہرگز نہیں جائے گا۔ دادی جان کو کراچی شفٹ ہو کر اسے ساتھ رکھنا ہوگا۔
شاہ زیب کی ضد اور بے پناہ محبت کے سامنے تو دادی جان کو بھی گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ گاؤں کی زمینوں کے تمام حساب کتاب تو پہلے ہی منشی کرم کے سپرد تھے پوتے کی خوشی کے لیے انہوں نے حویلی بھی اپنے خاندانی نمک خوار منشی کرم داد اور اس کی فیملی کو سونپ کر اس کے وطن واپس لوٹنے سے پہلے کراچی میں ہی سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کراچی میں رہائش کے لیے گھر اور گاڑی وغیرہ کے تمام انتظامات شاہ میر کے پرانے دوست نادر شاہ نے اپنی ذمہ داری سمجھ کر انجام دیے تھے۔ نادر شاہ نے پاکستان لوٹنے پر شاہ زیب کی ہر معاملے میں مدد کی۔ امریکی یونیورسٹی کے سرٹیفکیٹ دیکھ کر اسے کسی بھی اچھے ادارے میں ایک پرکشش سیلری پیکیج کے ساتھ آسانی سے جاب مل سکتی تھی۔ مگر اس نے اپنے وطن کے نظام کو بگاڑنے والے ہاتھوں کو روکنے کا تہیہ امریکہ چھوڑنے سے پہلے کرلیا تھا اور پولیس کی نوکری کا خواب لے کر ہی وہ وطن لوٹا تھا۔ اس نے سول سروس سے متعلقہ امتحان کی تیاری پوری لگن اور محنت سے شروع کی۔ کہتے ہیں کہ انسان کی نیت نیک ہو تو اللہ بھی مددگار بن جاتا ہے اور جس کام میں اللہ کی مدد شامل ہوجائے اسے ہونے سے کون روک سکتا ہے۔
امتحان کا رزلٹ آنے سے پہلے نادر شاہ اپنے اثر و رسوخ کی بناء پر اسے پولیس میں انسپکٹر کی پوسٹ پر بھرتی کرواچکے تھے۔ ٹریننگ کے بعد ــــــ منشیات فروشوں کی گرفتاری کا وہ پہلا کیس ہینڈل کررہا تھا جب ٹرین میں مجرموں کے تعاقب کے دوران وہ بے نام اجنبی دوشیزہ اس سے ٹکرائی اور دل میں دوبارہ ملنے کی

تڑپ جگا کر غائب ہوگئی۔ تین ماہ کے اندر امتحان کا رزلٹ ملنے تک وہ اپنی فیلڈ میں کتنے ہی کامیاب کیسز ہینڈل کرنے کے بعد ایک خاص نام اور مقام پیدا کرچکا تھا۔ اور اس کی دی ہوئی انفارمیشن پر اس نے کئی خطرناک مجرم بے نقاب کیے تھے اس کے اس کارنامے نے اسے وطن پرستوں کی نظر میں ہیرو اور وطن دشمن عناصر کے حلق کا ایسا کڑوا نوالہ بنادیا تھا۔ جسے نگلنا اور اگلنا دونوں ہی کام ناممکن تھے۔ وہ ان کے حلق میں کسی نوکدار ہڈی کی طرح پھنس چکا تھا۔ عدالت کی طرف سے ریمانڈ کے لیے دی ہوئی مہلت ختم ہونے سے پہلے گرفتار ہونے والوں کے آقاؤں نے خود ہی شاہ زیب سے رابطہ کرنا شروع کردیا۔

مگر بدقسمتی سے اس بار ان کا سامنا کسی ضمیر فروش نہیں بلکہ سرفروش سے ہوا تھا۔ جس کے پختہ ارادوں اور قوت ایمانی نے ان پاور فل بااختیار اور با اقتدار شخصیات کی راتوں کی نیندیں اور دن کا چین حرام کررکھا تھا۔

زمین کے ان خداؤں سے لڑائی میں اللہ کی مدد کے بعد ڈی سی صاحب کی حمایت اس کے لیے ایک بہت مضبوط ڈھارس تھی۔ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے تک اور عدالت میں مجرموں کی پیشی کے دن تک ان لوگوں کے چہرے بے نقاب ہوئے جنکی پشت پناہی میں ہونے والے جرائم کی طرف عام آدمی کا دھیان جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عدالتی فیصلے کے مطابق اس کیس میں ملوث حضرات کی سزاؤں کا اعلان شاہ زیب کے لیے ایک بہت بڑی کامیابی تھی وہ اس زمین پر پاؤں جمانے میں کامیاب ہوگیا تھا جس کو بے ایمان بے ضمیر اور شیطان صفت لوگوں کے ناپاک اور غلیظ ارادوں کے بھینٹ چڑھنے سے بچانے کا عزم لے کر وہ دیار غیر سے وہاں کی عیش و عشرت سے بھری زندگی کو ٹھکرا کر بھوک افلاس اور غربت کی جنگ لڑتے ہوئے اپنوں لوگوں میں لوٹا تھا۔

گرلز ہاسٹل کی آڑ میں غیر قانونی دھندوں کو کامیاب کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی کوشش میں سرخرو ہونے اور امتحان کا قابل ستائش رزلٹ آنے پر شاہ زیب کے رتبے اور عہدے میں ترقی اور اختیار میں اضافہ ہوا۔ اس کے مجرموں کی گردنوں پر ہاتھ ڈالنے کے جذبے نے جہاں مسائل کی چکی میں پستی عام عوام کے دل میں امید کی کرن جگمگائی وہیں کھلے عام انسانی زندگیوں اور عزتوں سے کھیلنے والے شرپسند عناصر بھی الرٹ ہوگئے کہ شاہ زیب جیسے قانون کے محافظوں کی موجودگی میں وہ اس سرزمین کی سالمیت اور قانون کی بالادستی کو کسی تر نوالے کے طرح نہیں نگل سکتے۔ شاہ زیب کو امید تھی کہ گرلز ہاسٹل کے آپریشن کے بعد وہ اس اجنبی لڑکی سے بھی مل سکے گا۔ مگر وہاں کے ریکارڈ کے مطابق اس نے وہاں سے نکلنے کے بعد ہی اسے ہاسٹل کی بیس منٹ میں ہونے والی غیر قانونی سرگرمیوں سے مطلع کیا تھا۔ وہاں موجود لڑکیوں سے تفتیش کے بعد اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ اسے اس شہر سے باہر کوئی نئی جاب مل گئی تھی۔

وہ بہادر اور نڈر تھی۔ مردانہ وار زندگی کی ہر اونچ نیچ کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتی ہے مگر اس سب کے باوجود وہ سادہ دل اور معصوم بھی تھی اسی لیے اس سے متعلق بے شمار وسوسے اور اندیشے اسے اس نامعلوم سچی اور بے باک انفار مر کے لیے پریشان رکھتے۔ اس تک پہنچنے کا کوئی بھی راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اسے تو شاید خبر بھی نہ ہو مگر شاہ زیب کے دل و دماغ اس کی ہر سوچ پر وہ چپکے سے قابض ہوگئی تھی۔ جس کا نام پتا اور ٹھکانہ تک اسے معلوم نہ تھا۔

وہ ایک ایسے میٹھے درد میں مبتلا تھا جسے وہ کسی سے بانٹتے ہوئے بھی اس کشمکش میں تھا کہ سننے والے اس کی دیوانگی کا مذاق نہ اڑانے لگیں۔ فون کی ہر گھنٹی پر اس کے فون کا گمان ہوتا ' ہر آہٹ اس کے آس پاس ہونے کا احساس دلاتی۔ مگر ہر گزرتا پل اس کے اندر کی بے قراری کو بڑھا کر ہاتھ سے نکل جاتا۔

"اپنا پتا ملے نہ خبر یار کی ملے مجھ کو تو اک جھلک میرے دلدار کی ملے۔" وہ اپنے کمرے میں بے خیالی میں یہ شعر گنگنا رہا تھا کہ دادی جان لبوں پر شفقت

بھری مسکراہٹ سجائے کب سے اسے تصورات کی دنیا میں گم ٹکٹکی باندھے تک رہی تھیں۔ دادی جان کی کمرے میں موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شرمساری سے یوں نظریں چرانے لگا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

”ہمیں تو آج معلوم ہوا کہ ہمارے اس بہادر سپاہی کی آواز میں اتنا درد ہے۔ شاہ زیب! اتنی درد بھری فریاد تو اللہ ___ رد نہیں کرے گا۔“ دادی جان لاٹھی ٹیکتی ہوئی اس کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔

”دادی جان! یہ بے نام سا درد کب میرے وجود کا حصہ بن گیا مجھے پتا بھی نہیں چلا۔“ اور وہ دادی جان کی گود میں سر رکھے کسی معصوم بچے کی طرح اپنے اس درد کا درماں تلاش کر رہا تھا۔ اس کا ہر لفظ اداسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ”دادی جان! آپ تو اللہ سے بہت قریب ہیں۔ دعا کریں نا میرے لیے کہ وہ مجھے مل جائے۔ جہاں بھی ہو مجھے اتنا تو پتا ہو کہ وہ خیریت سے ہے۔“ اس کے لہجے ایسی بے بسی تھی کہ دادی جان تڑپ اٹھیں۔

”یوں مایوس نہیں ہوتے میری جان! وہ بے نادلوں کے حال جاننے والا رب‘ وہ ضرور اس سے ملنے کی کوئی سبیل پیدا کرے گا۔ سچے دل کی طلب بھی اس کے دربار میں رائیگاں نہیں جاتی۔“ دادی جان اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی اداسی مٹانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”میں خود کو بہت سمجھاتا ہوں دادی جان! میں جتنا اس کے خیال کو خود سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں اس کا پریشان حال چہرہ اسی قدر میری نظروں کے سامنے آکر میری ہر جدوجہد کو ناکام بنا دیتا ہے۔ بس آپ دعا کریں یا تو میں اسے اپنے دل و دماغ سے نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں یا مجھے اس کا کوئی سراغ مل جائے۔“ وہ دادی جان کی گود میں منہ چھپائے بے بسی سے بولا۔

”نا امیدی کو خود پر اور اپنے حوصلوں پر حاوی نہ ہونے دو میرے بچے! امید کا دامن تھامے رکھو اور اس کی ذات پر کامل یقین رکھو۔ کبھی کبھی اپنے پیاروں کی جدائی میں بھی اس کی کوئی بڑی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے جو ہم دیکھ نہیں سکتے۔“

”کاش وہ اپنا کوئی رابطہ نمبر ہی مجھے دے دیتی۔ تو میں خود کو اتنا بے بس محسوس نہ کرتا۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر وہ کسی پریشانی اور مشکل میں نہ ہوتی تو ہاسٹل کے کامیاب آپریشن پر مجھے مبارک باد ضرور دیتی۔ وہ... یقیناً ”مشکل میں ہے۔ اور اس مشکل میں کسی سے بھی رابطے میں نہیں ہے۔“ وہ اپنے دل و دماغ سے اٹھتے وسوسوں اور اندیشوں کو جس قدر دبانے کی کوشش کر رہا تھا‘ حالات اور واقعات کا رخ اسے اسی قدر الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ سوچوں کے اس بھنور میں گھرا دادی جان کے سہلاتے ہوئے ہاتھ کا لمس تھا یا سورتیں پڑھ کر اس کے بے چین اور بے سکون دل کو پر سکون کرنے کی کوشش وہ کچھ ہی دیر میں سو گیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز حسب معمول وہ دادی جان کی ڈھیروں دعاؤں کے حصار میں آفس جانے کے لیے تیار تھا۔

”میرے مولا! میرے بچے کو وہ سکون اور قرار عطا فرما جسے کھو کر اس کے اندر کی ہر خوشی دم توڑتی جا رہی ہے۔ اس کے حوصلوں کی پرواز کو مایوسی کا شکار ہونے سے بچا لے میرے مالک!“ دادی جان وظیفے پڑھ کر اس پر دم کرتے ہوئے اس کے لیے دعا گو تھیں۔

شاہ زیب کا اپنے آفس پہنچ کر سب سے پہلا کام لیپ ٹاپ کھول کر ای میلز اور فیس بک کھول کر اپنے کام کے متعلق اور بابا ماما کے میسجز چیک کرنا ہوتا تھا۔

”سر! آج پوسٹ مین اس کے تمام خرچے وصول کرنے کے بعد یہ پیکٹ آپ کے لیے چھوڑ گیا ہے۔ میری نظر میں یہ پیکٹ نہ صرف مشکوک ہے بلکہ کسی دشمن کی طرف سے خطرے کی گھنٹی بھی ہو سکتی ہے۔ اسے کھولنے کے لیے صرف آپ کی اجازت کی ضرورت تھی..... آپ کی اجازت ہو تو میں اسے کھولوں؟“ سب انسپکٹر اکرام حسن نے شاہ زیب کو

لیپ ٹاپ آن کرنے سے پہلے اس پراسرار پیکٹ کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ شاہ زیب چند لمحے اس پیکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر اسے کھولنے کے لیے ہاتھ سے اس کا سرا پھاڑنے لگا۔

"آپ کیوں خطرہ مول لے رہے ہیں سر! مجھے دیں میں کھولتا ہوں۔" اکرام حسن نے جانثاری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

"اس خطرے کا سامنا تم کرسکتے ہو اکرام حسن تو میں کیوں نہیں؟" اس نے اکرام حسن کی بات کو نظر انداز کرکے مسکراتے ہوئے پیکٹ کھول دیا۔ پیکٹ سے ایک پرچہ برآمد ہوا جس پر کوئلے کی نوک سے لکھی ہوئی تحریر لکھنے والے کی بے بسی اور بے چارگی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

"انسپکٹر صاحب! اتنی جلدی شاید میں دوبارہ آپ کو تکلیف دینے کے بارے میں کبھی نہ سوچتی مگر مجبوری ہے کہ آپ کے علاوہ اس روئے زمین پر میرا کوئی واقف کار نہیں جس کو میں یہ تکلیف دے سکتی میں وہ مجبور اور بے بس لڑکی ہوں جو زندگی کے کڑے سے کڑے امتحان سے گزرنے کا حوصلہ جمع کرکے گھر سے نکلی تھی۔ اس گھر میں سوتیلی ماں کے مظالم کی انتہا یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنے اوباش بھانجے کی منکوحہ بنانے کا فیصلہ مجھ سے پوچھے بغیر کرچکی تھیں۔ میں نے اس شیطان سے بچنے کے لیے گھر سے قدم نکالا یہ تو جانتی تھی کہ اب راستے کانٹوں بھری خاردار راہگزر ہیں اور ان ہی پر چلتے ہوئے زندگی کا سفر طے کرنا ہے۔ جس گاؤں کے اسٹیشن پر آپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر ٹرین میں سوار کرایا تھا۔ اس گاؤں میں خود کو پناہ دینے والی ایک پرانی دوست کے کافی عزت دار اور شریف نظر آنے والے شوہر کا پول کھول کر بھاگنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ آپ کی مدد سے کراچی پہنچی تو پناہ کے لیے جس ہاسٹل کو ٹھکانہ بنایا۔

وہاں کچھ شیطانوں کے ایک ٹولے کو وہاں کی لڑکیوں کی عزت کی زندگی اور سودے بازی کرتے دیکھا۔ خود کو وہاں سے بچاکر نکلنے میں کامیاب ہوگئی مگر وہاں پناہ لینے والی اپنے جیسی سینکڑوں لڑکیوں کو شیطانوں کی درندگی سے بچانے کی ایک کوشش آپ کو فون پر انفارم کرکے دیتی ہوئی ایک ایسی جہنم میں پہنچ گئی ہوں جہاں ایک بیمار عورت کی تیمارداری کی ڈیوٹی نبھاتے ہوئے یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ اس بار میں ایک ایسی بند گلی میں پھنسی ہوں۔ جس کے اندر داخل تو ہوگئی ہوں مگر باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس بند گلی میں داخل ہونے سے پہلے باہر کی دنیا سے رابطے کا سامان مجھ سے چھین لیا گیا جس بیمار اور ضعیف عورت کی دیکھ بھال پر مجھے مامور کیا گیا ہے' وہ بھی نجانے کب سے قید و بند کی صعوبتیں کاٹتی موت کی دہلیز پر قدم رکھنے کو تیار ہے۔ ان دو ماہ کے دوران نجانے کیا کیا جتن کرکے میں نے یہ پیغام لکھنے کا سامان جمع کیا۔ اس کاغذ کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہوں۔ آپ کا ایڈریس اور کونٹیکٹ نمبر مجھے یاد ہے اس لیے اس پر لکھ کر اس سنہری موقعے کے انتظار میں ہوں کہ کبھی تو باہر کی دنیا کا کوئی زندہ انسان ملے گا اور میں اس کے سامنے گڑگڑاؤں گی۔ شاید میرا اللہ اس کے دل میں رحم ڈال دے اور میرا یہ پیغام کوئی سن لے۔ میں گمنامی کی موت مرنا نہیں چاہتی۔

وہ عورت بھی میرے اندازے کے مطابق زندگی کی آخری سانسیں گن رہی ہے۔ اس وقت اس قید خانے میں میرے اللہ کے سامنے میری یہی التجا ہے کہ بچی کھچی سانسیں ختم ہونے سے پہلے اس مظلوم کو آزادی کی چند سانسیں نصیب ہوجائیں....." کاغذ کے اس میلے کچیلے ٹکڑے پر اس سے زیادہ الفاظ لکھنے کی جگہ نہیں بچی تھی۔ پچھلے واقعات کی تفصیل پڑھ کر شاہ زیب کو یقین ہوگیا تھا کہ اتنے دنوں سے جس کے لیے وہ بے چین تھا اس کی بے چینی بے وجہ نہیں تھی۔ وہ واقعی بہت خطرناک اور سفاک لوگوں کے قبضے میں تھی۔ پرچے پر لکھی تحریر نے شاہ زیب کو بے حد مغموم ہی نہیں بلکہ آبدیدہ کردیا۔

"اکرام حسن! اس لفافے کے باہر کی اسٹیمپ سے یہ تو معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ خط کس شہر کے کس

پوسٹ آفس سے پوسٹ کیا گیا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے مجھے اس بارے کی تمام انفارمیشن چاہیے۔" شاہ زیب کی آواز میں کچھ کر گزرنے کا جوش و جذبہ جنون کی طرح چھلک رہا تھا۔

اکرام حسین نے بھی بغور وہ خط پڑھا اور بغیر کچھ کہے صاحب کا آرڈر پورا کرنے کے لیے تیزی سے باہر نکل گیا۔

اکرام حسین نے نیٹ کے ذریعے جو معلومات اکٹھی کیں ان کے مطابق وہ علاقہ اندرون سندھ میں ضلع دادو کے اندر کا کوئی بے نام و نشان پسماندہ سا گاؤں تھا۔ کراچی سے وہاں پہنچنے میں اور پھر اسے تلاش کرنے میں کوئی چار پانچ گھنٹے درکار تھے۔ شاہ زیب نے آفس کے تمام کاموں کی ذمہ داری اپنے اسسٹنٹ کے سپرد کی اور ایک سیکرٹ مشن کا اشارہ دے کر اکرام حسین کے ساتھ ایک بھی لمحے کی تاخیر کیے بغیر وہاں کے لیے روانہ ہو گیا۔ مشن مکمل ہونے تک اسے نہ وقت کا اور نہ وہاں پیش آنے والی مشکلات کا کچھ اندازہ تھا۔ اس کے بس میں نہیں تھا کہ وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آناً "فاناً" وہاں پہنچ جائے۔

"یہ خط اس پوسٹ آفس سے بھیجا گیا ہے ہمیں اسے پوسٹ کرنے والے کی تلاش ہے۔" شاہ زیب نے پوسٹ آفس کے ہیڈ کلرک کو شامل تفتیش کرتے ہوئے پہلا سوال کیا۔ اس ڈاک خانہ میں کام کی زیادتی تھی نہ ہی کام کرانے والوں کی۔ اسے پورا یقین تھا کہ خط یہاں تک پہنچانے والے کی نشاندہی زیادہ مشکل نہ ہوگی۔

"میرے ساتھ آئیے صاحب! میں شاید آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔" یہ شاید اس ڈاک خانے کا چپڑاسی تھا۔ جو کچھ فاصلے پر کھڑا شاہ زیب اور ہیڈ کلرک کی گفتگو سن رہا تھا۔ "جناب میں سرکاری ہسپتال کا ایک وارڈ بوائے تھا جس نے یہ خط پوسٹ کرنے کے لیے میری بڑی منت سماجت کی تھی۔ میں نے اس کا نام پتا تو نہیں پوچھا تھا البتہ اس کو دیکھوں گا تو فوراً پہچان لوں گا۔" چپڑاسی ان کے ساتھ چلتا ہوا ڈاک خانے سے باہر آ گیا۔ اسپتال تک پہنچتے ہوئے، راستے میں ہی شاہ زیب کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے وہ اس گاؤں کے متعلق بہت معلومات فراہم کر چکا تھا۔

اس پسماندہ خستہ حال گاؤں میں خالص جاگیردارانہ نظام کا راج تھا۔ جس کی ملکیت میں زمین کا جتنا زیادہ رقبہ ہوتا ہے، وہ اتنا ہی بڑا جاگیردار ہوتا ہے۔ اس علاقے کا سب سے بڑا جاگیردار سائیں فیروز شاہ تھا۔ اپنے بزرگوں کی وفات کے بعد وہی یہاں کے لوگوں کا ان داتا بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے فیصلوں سے جب چاہے، جس کو چاہے زندگی دے سکتا تھا یا چھین سکتا تھا اور اسے یہ اختیار وہاں کے لوگوں کے دلوں میں موجود ان کے ڈر اور خوف کی وجہ سے حاصل ہوا تھا۔ وہاں کے مظلوم مجبور اور بے بس لوگوں کی لاچاری اور کمزوری کو طاقت بنا کر گویا وہ وہاں کا خدا بنا ہوا تھا۔ وہ کبھی کبھی وہاں کا چکر لگانے آتا تھا کیونکہ اس کی فیملی تو شہر میں رہتی تھی مگر اس کی غیر موجودگی میں بھی اس گاؤں کا کوئی پرندہ بھی اس کی اجازت کے بغیر پر نہیں مار سکتا تھا۔ وہ لوگوں کے ساتھ جو بھی سلوک کرے، لوگ اپنی قسمت اور اس گاؤں کی قسمت کا ہر فیصلہ اس کے ہاتھ میں دینے پر مجبور تھے۔

گاؤں کی ڈسپنسری میں ایک ڈاکٹر اور عملے کے اکا دکا لوگوں کی موجودگی اس ہسپتال کے لاوارث ہونے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ پوسٹ آفس کے چپڑاسی نے وہاں کے واحد وارڈ بوائے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا تو وہ بھی کسی نئی افتاد کے ڈر سے سہم سا گیا۔ مگر شاہ زیب نے جب نہایت پیار اور شفقت سے اسے خط دکھا کر اسے دینے والے کے متعلق پوچھا تو اس وارڈ بوائے نے پہلے تو بہانے سے ٹالنے کی کوشش کی مگر اکرام حسین نے جب اپنا پولیس کا کارڈ دکھایا تو وہ سب کچھ بتانے پر راضی ہو گیا۔

"منشی فیاض کے ساتھ ایک لڑکی ایک بہت بیمار ماں جی کو لے کر اسپتال آئی تھی۔ سب کی نظر بچا کر اس نے مجھے یہ کاغذ دیا تھا اور اللہ کا واسطہ دے کر اسے

پوسٹ کرنے کی تاکید کی تھی۔" وارڈ بوائے کی نشاندہی کے بعد منشی فیاض سے ملنا اتنا کچھ مشکل نہ تھا۔ منشی فیاض ایک ادھیڑ عمر بہت عاجزی اور انکساری والا شخص تھا۔ اس نے اس راز کو اپنے تک محفوظ رکھنے کا وعدہ لے کر جو بتانا شروع کیا تو شاہ زیب اور اکرام حسن ظلم کی اس داستان کو سن کر سر سے پاؤں تک کانپ اٹھے۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں انسانی حقوق کا پرچار کرنے والے لیڈروں کی زیر سرپرستی ظلم اور ناانصافی اس قدر عروج پر ہو سکتی ہے ان کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"وہ بیمار عورت کبھی فیروز شاہ کی منگیتر تھی۔ شہر کی پڑھی لکھی، سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ سن شعور میں قدم رکھتے ہی بڑوں کے فیصلے سے بغاوت کر بیٹھی۔ لیکن یہاں پر کوئی بھی اس کے شرعی اور قانونی حق کو ماننے پر تیار نہ تھا۔ اس نے شہر میں اپنے ہم جماعت سے پسند کی شادی کر لی۔ اس کے بابا سائیں تو اس کی شادی کی اطلاع ملتے ہی گاؤں والوں اور رشتہ داروں خاص طور پر فیروز شاہ کے خاندان والوں کے لعن طعن سننے سے پہلے ہی موت کو گلے لگا بیٹھے۔ ان کا ایک بیٹا اپنا بیوی اور بچے کے ساتھ پردیس چلا گیا۔ کیونکہ رشتے داروں کی چبھتی نگاہوں اور اٹھتی انگلیوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی اس کے اندر۔ ماں نے یہ کہہ کر بیٹے کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کہ اس کی بیٹی نے کچھ غلط نہیں کیا۔ وہ اپنی بیٹی کے اس قدم پر شرمسار نہیں ہیں۔ اس نے اپنا حق استعمال کیا ہے۔ وہ جہاں بھی رہے خوش رہے۔ مگر میں یہاں سے منہ چھپا کر اپنا گھر بار چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

بہت مضبوط ارادوں کی مالک ایک بہادر عورت تھیں بی بی صاحب۔ انہوں نے فیروز شاہ کے ہر ظلم و زیادتی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انہیں یہ اطمینان تھا کہ ان کی بیٹی اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کر کے ایک خوشحال زندگی گزار رہی ہے۔ وہ ان سے دور ہے تو اس بات کا بھی انہیں کوئی غم نہ تھا۔ مگر پچھلے سال کسی وجہ سے انہیں گاؤں چھوڑ کر شہر جانا پڑا تو فیروز شاہ کے ظلم کی ایک اور کہانی لوگوں کے سامنے آئی کہ اپنی سابقہ منگیتر کو تو وہ اس شادی کے ایک سال بعد ہی اغوا کر کے اپنی حویلی کے قید خانے میں رکھے ہوئے تھا۔ بی بی صاحب کے شہر جانے کے بعد گاؤں کے خاص خاص لوگ فیروز شاہ کے اس کارنامے پر چہ میگوئیاں تو کر سکتے تھے مگر اس کے ڈر اور خوف کی وجہ سے کھل کر یہ بات زبان پر نہیں لا سکتے تھے۔ بہت بری حالت تھی جی اس روز ان کی' بائیس سال کی قید کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میں انہیں دوا دارو کے لیے ڈاکٹر صاحب کے پاس لے کر گیا تھا۔ وہ لڑکی جو فیروز شاہ نے ان کی دیکھ بھال کے لیے رکھی ہے بڑا دم ہے جی اس میں' کسی شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی ان روز ان کی سانسیں رکتی دیکھ کر کہ فیاض چاچا! زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں کے سامنے اس ظلم کو چپ چاپ دیکھتے رہو گے تو اس ظالم کے مددگار بن جاؤ گے اور خدا کے قہر سے کبھی بچ نہیں سکو گے۔ کیا اثر کیا اس کی اس بات نے کہ میں ہر ڈر اور خوف سے بے پرواہ ہو کر انہیں اسپتال لے گیا۔ دو روز تک آکسیجن لگی رہی انہیں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کو بھی ان کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا ورنہ شاید فیروز شاہ کے ڈر سے وہ علاج سے بھی انکار کر دیتے۔ ان کی حالت سنبھلنے تک میں ان کے ساتھ ہی تھا۔ وہ خط کب اس بہادر اور نڈر لڑکی نے وارڈ بوائے کو دیا۔ مجھے پتا نہیں چلا۔ آپ وعدہ کریں جی فیروز شاہ سائیں کے سامنے اس تمام واقعے کا ذکر نہیں کریں گے۔" فیاض منشی ہاتھ جوڑے شاہ زیب کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ اور خود کو بچانے کے لیے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں فیاض چاچا! آپ کو کچھ نہیں ہوگا بس آپ مجھے ان دونوں مظلوم عورتوں کے پاس لے چلیں۔ ان دونوں کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچانا فی الوقت بے حد ضروری ہے۔ اس کے بعد آپ کے سائیں فیروز شاہ کو بھی دیکھ لیں گے۔" شاہ زیب نے منشی فیاض کا ڈر اور خوف دور کرنے کے لیے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ منشی فیاض تھوڑے تردد اور بحث

تکرار کے بعد انہیں ایک پرانی حویلی کے اس حصے میں لے گئے جہاں ان دونوں کو رکھا گیا تھا دروازے کے باہر گارڈز پہرہ دے رہے تھے مگر منشی فیاض کو دیکھ کر انہوں نے بھی بغیر کچھ پوچھے دروازہ کھول دیا۔ حویلی کی لمبی لمبی راہداریوں سے گزر کر شاہ زیب اس تاریک کمرے تک پہنچ گیا جہاں اس کی تلاش کو ختم ہونا تھا۔ شاہ زیب پر نظر پڑتے ہی وہ بے اختیار دیوانہ وار سب کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھی۔

"مجھے یقین تھا آپ آئیں گے۔ ضرور آئیں گے... دل میں امید کی روشنی تھی اور آنکھیں آپ کی منتظر تھیں۔" اس کے قریب پہنچ کر وہ ایک دم رک گئی اور نظریں جھکا کر بولی۔

"مجھے تو آنا ہی تھا... مگر تم نے یوں روپوش ہو کر میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ اس نے بھی فوراً" ہی شکایت کر دی۔ وہ اس روز سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی۔ اترا ہوا بے رونق چہرہ، ستاروں جیسی چمک دار آنکھوں میں مایوسیوں کا بسیرا دیکھ کر شاہ زیب کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"نور بانو!... نور بانو! کہاں ہو تم؟ یہاں میرے قریب آؤ۔" ایک درد بھری آواز عقب سے ابھری۔

"یہ بہت بیمار ہیں شاہ زیب! انہیں علاج کے لیے کسی اچھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔" وہ شاہ زیب کو ان سے متعارف کراتی ان کی طرف بڑھی۔

"تم فکر مت کرو۔ اب میں آ گیا ہوں... سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا؟" شاہ زیب نے اسے اطمینان دلایا۔ شاہ زیب نے اکرام حسین کو آنکھ سے اشارہ کیا تو اس نے آگے بڑھ کر اس بیمار عورت کو بازوؤں میں اٹھایا اور نور بانو کو اپنے پیچھے آنے کو کہا جب کہ شاہ زیب منشی فیاض اور دروازے پر کھڑے گارڈز کی مزاحمت پر بولا۔

"تم لوگوں کو زیادہ وفاداری دکھانے کی ضرورت نہیں، تمہارا سائیں ان کے متعلق تم لوگوں سے باز پرس کرنے سے پہلے جیل کی سلاخوں کی پیچھے پولیس کے سوالوں کے جواب دے رہا ہو گا۔ کیونکہ اس وقت ان مظلوم خواتین کو یہاں سے لے جانے والا کوئی عام آدمی نہیں بلکہ پولیس کا ایک ذمہ دار آفیسر ایس پی شاہ زیب ہے۔" پولیس کا نام سنتے ہی ان لوگوں نے شاہ زیب اور اکرام حسین کا راستہ چھوڑ دیا۔ کچھ ہی دیر میں ان کی گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ جانب منزل سفر طے کر رہی تھی۔

تمام سفر خاموشی سے کٹ گیا۔ شاہ زیب نے گاڑی کا رخ شہر کے بہترین اسپتال کی طرف موڑ دیا۔ بہت اچھے ڈاکٹرز کی نگرانی انتہائی نگہداشت والے کمرے میں چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ تھکن سے چور تھی مگر اس بیمار خاتون کے ساتھ سائے کی طرح رہنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر کے اطمینان دلانے کے باوجود وہ انہیں اکیلا چھوڑنے پر راضی نہ تھی۔ شاہ زیب نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا اسپتال کے وی آئی پی روم میں منتقل کرنے اور اکرام حسین کو کمرے کے باہر ڈیوٹی دینے کی ذمہ داری سونپ کر شاہ زیب اگلی صبح آنے کا کہہ کر گھر چلا گیا۔ کیونکہ دادی جان اس کے لیے فکر مند تھیں۔ ان کی بار بار کی فون کال وہ مسلسل کاٹ رہا تھا۔ اب گھر پہنچ کر اپنی دن بھر کی مصروفیت کی تفصیل بتانا چاہتا تھا کہ ان کی شاہ زیب کے لیے مانگی دعاؤں کو قبولیت کی گھڑی نصیب ہوئی۔

اگلے روز اسے نور بانو اور اس کے ساتھ بیمار خاتون کے شکایتی بیان پر دستخط لینے تھے اور فیروز شاہ کے گرفتاری کے وارنٹ حاصل کر کے اس علاقے کے مجبور و بے بس لوگوں کو اس کے مظالم سے نجات دلانے کی ذمہ داری پوری کرنی تھی۔ وہ فیروز بخت جیسے بے رحم سفاک درندے کو سنبھلنے یا فرار ہونے کا موقعہ دینے کے حق میں نہیں تھا۔ شاہ زیب کی تیار کردہ رپورٹ پر سائن کرتے ہوئے اس شفیق خاتون نے غم سے نڈھال ہوتی حالت میں شاہ زیب سے درخواست کی کہ اس معاملے کو اتنا نہ اچھالے کیونکہ وہ لوگوں کے تماشے کا سامان بننے کے حق میں نہیں تھیں۔ شاہ زیب نے انہیں اطمینان دلایا کہ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔

ڈاکٹرز کی ٹیم نے پچھلے روز ان کی بیماری سے متعلق چند ٹیسٹ لیے تھے آج ان کی رپورٹ ملنے کے بعد یہ طے ہونا تھا کہ ان کی ٹریٹمنٹ کے سلسلے میں مزید اور کتنے دن اسپتال میں رکنا پڑے گا۔

شاہ زیب وہاں سے جانے سے پہلے اسے بتا رہا تھا کہ وہ شام کو فیروز کی گرفتاری کی خوش خبری کے ساتھ اپنی دادی جان کو بھی لے کر آئے گا کیونکہ وہ بھی رات سے ہی ان دونوں سے ملنے کے لیے بے قرار تھیں۔ نوربانو نے یہ سن کر خاموشی کے ساتھ مسکراتے ہوئے اثبات میں سرہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ وہ جس طرح احسان مندی کے بوجھ سے جھکی نگاہوں سے اس کے ہر سوال کا مختصر جواب دے رہی تھی وہ شاہ زیب کے لیے اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ تو اسٹیشن والی اسی نور بانو کو دیکھنا چاہتا تھا جو اپنے دفاع میں سامنے والے کو لاجواب کرنے والی دلیر اور بے باک لڑکی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ آگے بڑھتے ہوئے انسان کے لیے جب ہوائیں اپنا رخ تبدیل کرتی ہیں تو ایسے ہی صدمے سے دوچار ہونا یہ ایک فطری عمل ہے جس سے نوربانو اس وقت گزر رہی تھی۔

اس روز اسپتال سے جانے کے بعد شاہ زیب نے ڈی سی صاحب کی مدد سے فیروز شاہ کے اریسٹ وارنٹ حاصل کیے اور کراچی سے لے کر ضلع دادو تک کے تمام تھانوں میں اس کی تلاش کے آرڈرز جاری کر دیے۔ شاہ زیب کو اس کے متعلق جو معلومات ملیں ان کے مطابق وہ اپنی فیملی کے ساتھ کراچی میں ہی قیام پذیر تھا مگر آج کل وہ اپنی فیملی کے ساتھ دبئی گیا ہوا تھا۔ وطن واپسی پر ایئرپورٹ پر ہی پولیس کی ہتھکڑی اس کی منتظر تھی۔ یہ تو اس کے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اپنے قابل گرفت کارناموں کا تو اس نے کبھی کوئی نشان تک نہ چھوڑا تھا پھر یہ کیا ہو گیا۔

اسے ایک کمزور مجبور و بے بس بیمار عورت کو بلا جواز پچھلے بائیس سال سے اپنی جاگیر کے قید خانے میں قیدی بنا کر رکھنے کے جرم میں قانون کے محافظ گرفتار کر رہے تھے۔

وہ جو زمانے کی نگاہ میں اپنی فیملی کے نزدیک ایک بے مثال اور قابل ستائش شخصیت کا مالک بن کر ایک شاہانہ زندگی گزار رہا تھا' اس کی زندگی کا سب سے بڑا راز یوں بے نقاب ہو گا کہ وہ اپنی شریک حیات سے لے کر اس کی کامیابی اور خاندانی جاہ و جلال کے قصیدے پڑھنے والوں تک کی نظروں میں ذلت و رسوائی کا عبرت ناک نشان بن کر رہ جائے گا یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

ڈھیر سارے دفتری کام نمٹانے کے بعد شاہ زیب فیروز شاہ جیسے کھلے عام گھومنے والے خونی درندے کی گرفتاری کی خوش خبری لے کر دادی جان کے ساتھ اسپتال پہنچا تو اس کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ظلم کی چکی میں پسنے والے مظلوم کو جب ظالم کے انجام کی خبر ملے تو خبر رساں بھی گویا زندگی کا سب سے قیمتی انعام بن کر سامنے آتا ہے۔ نوربانو تو اسے اسپتال کے کوریڈور میں ہی مل گئی جو آنٹی کے انتظار میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی۔ ڈاکٹر انہیں کسی اسپیشل ٹیسٹ کے لیے لیب میں لے کر گئے تھے۔ اس کے چہرے پر منڈلاتے فکر مندی کے بادل ایک دم سے شاہ زیب کو سامنے پا کر چھٹ گئے۔ بالکل یوں جیسے تپتی دوپہر میں سفر کرنے والے مسافر کو سائبان مل گیا ہو۔ دادی جان تو بغیر تعارف کے ہی اس سے یوں ملیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ نوربانو کے لیے شاہ زیب کے جذباتی لگاؤ کو جاننے کے علاوہ بھی نوربانو سے مل کر اسے گلے لگا کر انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اپنی کسی کھوئی ہوئی بہت پرانی متاع عزیز کو پالیا ہو۔

روشن کشادہ پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے انہوں نے ڈھیروں دعائیں دیں اور بے شمار بلائیں لیں۔ شاہ زیب چند قدموں کی دوری پر کھڑا دادی کو اس پر پیار لٹاتے مسکراتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا تب ہی ہاتھوں میں مائیک پکڑے رپورٹرز کی ایک ٹیم وہاں آن موجود ہوئی۔ سب نے شاہ زیب کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ لوگ اس قید سے رہائی پانے والی خاتون سے سوال کرنا چاہتے تھے۔

مہربانو کے لیبارٹری سے لوٹنے تک رپورٹرز کا جوش و خروش تھم چکا تھا۔ شاہ زیب کی دادی جان نور بانو کے ساتھ ان کے لوٹنے کی منتظر تھیں۔ وقت گزاری کے لیے ادھر ادھر کی باتوں کے دوران دونوں ایک دوسرے کے متعلق بہت کچھ جان چکی تھیں یوں جیسے برسوں پرانی شناسائی ہو۔

ڈھیر سارے ٹیسٹوں کے بعد مہربانو اسٹریچر پر ہی اپنے روم میں لوٹیں تو شاہ زیب ٹیسٹ کی رپورٹس کے متعلق ان کے ساتھ آنے والے ڈاکٹر صاحب سے تبادلہ خیال کرنے لگا جبکہ نور بانو دادی جان کے ساتھ اسٹریچر کے تعاقب میں کمرے کی طرف بڑھی

اسٹریچر کھینچ کر لانے والے لڑکے کی مدد سے نور بانو نے بہت احتیاط کے ساتھ انہیں بستر پر لٹایا۔

"دو انسپکٹر صاحب کی دادی جان کب سے آپ سے ملنے کے انتظار میں یہیں پر موجود ہیں۔" نور بانو نے سائیڈ پر ہٹتے ہوئے دادی جان کے بارے میں بتایا۔ مگر ان دونوں کو حیرانی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے پا کر وہ خود بھی حیران و ششدر تھی۔ ان کے دیکھنے کے انداز سے یہ تو وہ جان چکی تھی کہ وہ دونوں پہلے بھی ایک دوسرے سے مل چکی ہیں، مگر کیسا تعلق ہے کے ساتھ یہ جاننے کی کوشش میں تھی کہ شاہ زیب بھی کمرے میں آگیا۔ کمرے میں پھیلی خاموشی اور ہونقوں کی طرح اپنی دادی جان کو مریضہ اور مریضہ کو دادی جان کو دیکھتے ہوئے اشارتاً نور بانو سے اس غیر متوقع صورت حال کے متعلق جاننا چاہا، مگر جب اس نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا تو اس تجسس سے پردہ اٹھانے کی نیت سے خود ہی آگے بڑھا۔

"کیا ہوا دادی جان۔۔۔! یوں چپ کیوں لگ گئی آپ کو؟ آپ تو ملنا چاہتی تھیں ان سے؟" شاہ زیب نے دادی جان کو کندھے سے تھام کر پوچھا۔

"شاہ زیب۔۔۔ یہ مہرو ہے۔۔۔ میری مہرو۔" دادی جان بس اتنا ہی کہہ سکیں، اس کے بعد زبان نے الفاظ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ آگے بڑھ کر دیوانہ وار مہربانو کو چومنے لگیں آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ دونوں ہی وارفتگی کے عالم میں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں۔ نور بانو اور شاہ زیب ابھی تک یہی سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

دادی جان، بابا اور اماں کی زبانی مہرو کا نام تو وہ بھی کئی بار سن چکا تھا، مگر جب بھی اس نام سے جڑا ان کا تعلق جاننے کی کوشش کی انہوں نے سختی سے منع کر دیا تھا، مگر آج مہرو اور دادی کا ایک دوسرے سے مل کر یوں بلک بلک کر رونا اس پر انکشافات کے ایسے پردے کھول گیا کہ قدرت کی طرف سے ہونے والے اس اتفاق پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ یعنی مہربانو جسے وہ نور بانو کی انفارمیشن پر اپنا فرض سمجھتے ہوئے فیروز شاہ کی قید سے چھڑا کر لایا تھا وہ حقیقت میں دادی جان کی وہ بیٹی تھیں جس نے برسوں پہلے اپنی پسند کا جیون ساتھی چننے کا حق استعمال کر کے خاندان بدر ہونے کی سزا پائی تھی۔ وہ جو ایک تلخ یاد بن کر دل کے قبرستان میں دفن تھی اس کے اپنوں کی زبان پر اس کا ذکر بھی ممنوع تھا۔

آج وہ جس حال میں دادی جان کے سامنے آئی ان کے لیے یہ ایک ناقابل برداشت صورت حال تھی۔ وہ تو آج تک اپنی روتی بلکتی ممتا کو اس کی خوشیوں کی دہائی دے کر تھپک تھپک کر سلاتی رہیں جبکہ ان کی لخت جگر بیٹی دوپہر میں سفر حیات طے کرتی، آج آبلہ پا ہو کر نڈھال حالت میں غم کی تصویر بنی ان کے سامنے تھی۔ اور وہ ان کا کینہ پرور ظالم و سفاک بھتیجا ان کے سامنے ان کی بیٹی کی ہر غلطی کو درگزر کر کے انہیں اپنے احسانوں کے بوجھ تلے دبائے تمام عمر ان سے ان کی بیٹی کی زندگی کا تاوان وصول کرتا رہا تھا۔ اور وہ ممتا کے ہاتھوں مجبور اس کے اسی احسان پر اس کے سامنے جھکی رہیں کہ وہ اپنے بڑوں کے طے کیے ہوئے اس بے جوڑ رشتے سے شرافت کے ساتھ دستبردار ہو گیا تھا۔

ان کے لیے آج تک جدائی کا ہر زخم سہنے کے باوجود یہی اطمینان کافی تھا کہ وہ جہاں بھی ہے اپنی زندگی اپنی خوشی اور چاہ کے ساتھ جی رہی ہے۔ بھلے وہ ان کی نظروں

سے اوجھل ہے، مگر زندگی کو پوری خوب صورتی اور
خوشی کے ساتھ جی رہی ہے۔ انہیں اپنے دلیر اور بہادر
پوتے کے اس قابل فخر کارنامے پر غرور تھا کہ کسی
مظلوم عورت کو ظالم کی قید سے نجات دلانے کے لیے
قدرت نے اس کا انتخاب کیا تھا، مگر وہ مظلوم عورت
ان کی اپنی بیٹی اور اس کی نرم و نازک کمر پر چابک
برسانے والا سفاک درندہ ان کا اپنا بھتیجا فیروز شاہ ہوگا۔
یہ تو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

شاہ زیب نے بڑی مشکلوں کے ساتھ دادی جان
کے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹا اور انہیں دلاسا دیا کہ
اگلے دو روز میں فیروز شاہ کی عدالت میں پیشی ہے اور
مہرو اور نور بانو کی اس کے تمام مظالم کے خلاف گواہی
ہے تب وہ دادی جان کو بھی ساتھ لے کر جائے گا۔

ڈاکٹرز کی ٹیسٹ رپورٹس ملنے کے بعد یہ انکشاف بھی
سب کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا کہ گزرتے وقت کی
ہر گھڑی میں گرتے آنسوؤں کی کثرت نے مہر کے
پھیپھڑوں کے زخم کو ناسور بنا کر زندگی کی سانسوں کا
دائرہ ان پر تنگ کر دیا تھا۔ ڈاکٹرز ان کی صحت یابی سے
کچھ زیادہ پرامید نہ تھے، مگر ایک صبر آزما اور بے نتیجہ
علاج کا دلاسا ضرور دے کر گئے تھے۔ دادی جان کی
آنکھوں میں ایک سوال پوری شدت سے زبان تک
آنے کے لیے مچل رہا تھا، مگر مہربانو کی بگڑتی حالت نے
انہیں اجازت نہ دی۔ مہربانو کی کھلتی بند ہوتی آنکھوں
سے اماں جان کا سوال پوشیدہ نہ تھا۔

"میں جانتی ہوں اماں جان! آپ یہ جاننے کے لیے
بے چین ہیں کہ جس کے لیے میں نے آپ سب کی
عزت و ناموس کو پاؤں تلے روند کر ایک نئی دنیا بسائی
تھی وہ میرے ساتھ کیوں نہیں ہے۔ وہ مجھے فیروز شاہ
کے حوالے کر کے میری زندگی سے بے دخل کیسے
ہو گیا؟" ماں کی خاموشی میں چھپے سوال اس نے خود ہی
جان لیا۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے اثبات میں سر
ہلایا کہ کہیں اس سوال کا جواب ان کی بیٹی کے زخموں کو
نئے سرے سے ادھیڑ نہ دے۔

"اماں جان! آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ کی بیٹی کی
یہ حالت فیروز شاہ کے جبر و تشدد کے سبب ہوئی ہے....
نہیں اماں جان! یہ تو اس بے وفائی کی تہمت کا غم ہے
جو اپنی بچی کی زندگی کی سلامتی کے عوض میں نے خود
اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کے دامن پر لگائی ہے۔
فیروز شاہ نے جب مجھے میرے آشیانہ، محبت سے الگ
کیا تو میرے ہاتھوں سے اس گھر کے دروازے مجھ پر
بند کروا دیے یہ لکھوا کر میں تمہاری دنیا سے جا رہی ہوں
کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے۔ کیونکہ میں اتنے
عرصے میں جان چکی ہوں کہ آسائشات کے بغیر مزید
زندگی گزارنا ناممکن ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں اماں جان! جو
میں نے اپنی بچی کی زندگی کی قیمت کی صورت ادا کیے
انہی الفاظ کی بازگشت نے جینے کی تمنا چھین لی۔ ایسا
نہیں ہے کہ فیروز شاہ کو میری پروا نہیں تھی وہ مجھے زندہ
رکھنا چاہتا تھا۔ کسی قیمتی چیز کی طرح سب سے زیادہ
محفوظ جگہ پر چھپا کر رکھنا چاہتا تھا اچھے سے اچھا علاج
اور گورنس دن رات میری خدمت کے لیے موجود
تھی، مگر میں اپنی زندگی سے بے زار ہو کر خود کو ختم
کر کے اسے شکست دینا چاہتی تھی۔ میں نے اس
بیماری کی پرورش اور نشوونما بڑے پیار سے کی ہے۔
نور بانو کو دیکھ کر مل کر اس سے بات کر کے نجانے
کیوں زندگی کی امنگ اس دل میں بھی پیدا ہونے لگی۔
آپ کو معلوم ہے اماں جان! میں نے اور احسان الحق
نے بھی اپنی بچی کا نام نور بانو رکھا تھا۔ مجھے اس لڑکی میں
اپنی بچی کی جھلک نظر آتی ہے۔ کاش یہ میری اپنی بچی
ہوتی، مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو اسے اپنی جان سے
بڑھ کر پیار کرتا تھا یوں اسے بے یار و مددگار دربدر
ٹھوکریں کھانے کے لیے تھوڑی ناں چھوڑ سکتا ہے۔
یہی سوچ کہ میری نور بانو نہ سہی اس کے جیسی تو ہے۔
اس کے لیے جینے کو دل چاہتا ہے اماں جان! اسے اس
قید خانے سے نکالنے کے لیے چند سانسیں قدرت
سے مانگی ہیں۔" مہربانو کی آنکھوں سے آنسو سیلابی
ریلے کی طرح بہہ رہے تھے، شاہ زیب اور نور بانو لب

سے رپورٹس لینے گئے تھے ان کے لوٹنے تک دونوں ماں بیٹی اپنا اپنا غم ایک دوسرے سے بانٹ کر کسی حد تک سنبھل چکی تھیں۔ تمام ٹیسٹ رپورٹس چیک کرنے کے بعد ڈاکٹر نے دواؤں کے ایک بڑے نسخے کے ساتھ انہیں ڈسچارج کردیا۔ نور بانو نے ان کی صحت یابی تک ان دیکھ بھال کی تمام ذمہ داری اپنے سر لی اور ان کے ساتھ شاہ زیب کے گھر میں آگئی۔ شاہ زیب اور دادی جان کی تو مانو جیسے من کی مراد پوری ہوگئی تھی اور نور بانو کو ایک محفوظ پناہ گاہ ایک نیک مقصد کے ساتھ مل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

فیروز شاہ کا اصل روپ سب کے سامنے آنے پر وہ عدالت کے فیصلہ سنانے سے پہلے اپنی زندگی کو ختم کرنے کے لیے کسی بہتر موقعے کی تلاش میں تھا۔ شاہ زیب اس کے اس ارادے کا ادراک کر کے اس کے گرد سیکورٹی سخت کرنے کے آرڈر دے کر مطمئن ہو کر عدالتی فیصلے کا منتظر تھا' مگر ٹھیک اس روز جب عدالت میں پیش کرنے کے لیے سیکورٹی گارڈز کے حصار میں وہ کمرۂ عدالت کی طرف بڑھ رہا تھا' اس نے ایک گارڈ سے پستول چھین کر خود کو زندگی کی قید سے آزاد کروا لیا۔ یہ بھی نیوز چینل کے لیے ایک زبردست بریکنگ نیوز تھی' جس نے ہر خبر دیکھنے اور سننے والے کو فیروز شاہ جیسے ایک سفاک اور بے رحم جاگیردار سے متعارف کرایا جو اس سے پہلے صرف اپنی سلطنت اور جاگیر میں سانس لینے والے کمزور و ناتواں' بھوک و افلاس کی چکی میں پسنے والے کسانوں اور مزارعوں پر اپنے ظلم و جبر کو آزما تا رہا تھا' مگر اب ایک عورت کی کمزوری اور مجبوری سے کھیلنے کے جرم میں خود ہی ایک عبرت ناک موت کو گلے لگانے پر مجبور ہوگیا۔

نور بانو کی دن رات کی خدمت' لگن اور محبت کا نتیجہ تھا کہ مہربانو کی حالت دن بدن سنبھلنے لگی۔ اس کے لیے نور بانو وہ پرندہ ثابت ہوئی جس کے اندر اس کی جان قید تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ وہ نور بانو سے اس کے ماضی کے متعلق کچھ پوچھتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں اس کا کوئی دعوے دار اسے لے نہ جائے۔ وہ ایک پل کے لیے بھی ادھر ادھر ہوتی تو مہربانو اس کا نام پکار پکار کر پورا کمرہ سر پر اٹھالیتی اور نور بانو بھی گھر کے جس کونے میں بھی ہوتی ان کی آواز پر بجلی کی طرح بھاگتی اس کے پاس آن موجود ہوتی۔ اور دیر تک اسے اپنے دلاسوں سے بہلاتی رہتی کہ وہ انہیں چھوڑ کر کہاں جاسکتی ہے۔ اسے چھوڑ کر اس کی کوئی دوسری جائے پناہ نہیں ہے۔

مگر اس کے چھن جانے کا خوف تھا جو ہر وقت مہربانو کے اعصاب سے چپکا ہوا تھا۔ شاہ زیب اپنی مہو پھپھو کا شکر گزار تھا کہ نور بانو اس کے آس پاس تھی۔ ورنہ شاید وہ اسے زبردستی اپنے پاس روکنے کی جرات نہ کرپاتا' مگر ایک روز ایک اجنبی نے آکر جب نور بانو کے وارث ہونے کا دعوا کر کے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مہربانو اور شاہ زیب کو تو پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ وہ شخص نیوز چینل پر نور بانو کی تصویر دیکھ کر اسے ڈھونڈتا ہوا ایس ایس پی شاہ زیب کی رہائش گاہ تک پہنچا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے بے تاب تھا اور شاہ زیب کے پاس ایسا کوئی جواز نہیں تھا کہ وہ نور بانو کو اس شخص سے ملنے سے روک سکتا۔

وہ مہو پھپھو کو بتائے بغیر نور بانو کو ڈرائنگ روم میں اس شخص کے پاس لے آیا۔ ان دونوں کا دیوانہ وار ایک دوسرے سے لپٹ جانا ثابت کر رہا تھا کہ وہ شخص جھوٹا نہیں تھا۔ اس کے اپنے باپ کے ساتھ جانے کے خیال سے شاہ زیب کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ کچھ دیر رونے دھونے کے بعد نور بانو گویا ہوئی۔

"سو بابا! آپ نے میری تلاش میں اتنی مشقت برداشت کی' مگر میں آپ کے ساتھ اس گھر میں نہیں جاؤں گی جہاں ہر لمحہ میری عزت نفس آپ کی چہیتی

بیوی کے ہاتھوں مجروح ہوتی ہے۔ آپ کو ان کی ہر بات کی سچائی پر آنکھ بند کرکے یقین ہے۔ میں اپنی صفائی میں آپ سے کچھ کہوں گی اور نہ ہی اپنی قسمت کا ہر فیصلہ اس خود غرض عورت کے ہاتھ میں دوں گی۔ میں یہاں ایک بیمار، مجبور و بے بس عورت کی خدمت اور دیکھ بھال کی جاب کررہی ہوں۔ باقی کی عمر اسی نیک کام کی نذر کردوں گی۔ کھوکھلے خود غرض رشتوں کا سہارا نہیں چاہیے مجھے جینے کے لیے۔"

اس کا لہجہ سپاٹ تھا ہر احساس سے عاری۔

"میں، تمہارا بابا تم سے وعدہ کرتا ہوں اب ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا جس میں تمہاری مرضی شامل نہ ہو..... میرے ساتھ چلو..... میں تمہیں یوں غیروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا..... تم لاوارث نہیں ہو۔ تمہارا بابا ابھی زندہ ہے۔" وہ شخص نور بانو کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کررہا تھا۔ شاہ زیب چپ چاپ ایک طرف کھڑا تمام صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اصولی طور پر بھی اور اخلاقی طور پر اسے باپ اور بیٹی کے معاملے میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں تھا اس لیے اس کا انہیں اکیلے چھوڑ دینا زیادہ مناسب تھا۔ اس نے کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ نور بانو کی آواز نے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک لیا۔

"آپ کہاں جارہے ہیں جناب ایس ایس پی شاہ زیب صاحب! یہاں کچھ بھی ایسا سیکرٹ نہیں ہے جس کی آپ سے پردہ داری ہو۔ یہ شخص میرا باپ ضرور ہے، مگر کبھی بھی میرے پاس نہیں تھا۔ مجھے پوری زندگی اپنے باپ سے وہ تحفظ اور شفقت نہیں ملی جو ان چند دنوں میں آپ نے غیر اور اجنبی ہونے کے باوجود مجھے دی۔ آپ اپنی پناہ کے حصار سے نور بانو کو نکال دیں تو الگ بات ہے۔ ورنہ میں یہاں، وہاں سے زیادہ محفوظ اور مطمئن ہوں۔" اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کے ساتھ ایک بھرپور اعتماد تھا جو صرف اور صرف شاہ زیب کے لیے تھا۔ شاہ زیب دل ہی دل میں خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھ رہا تھا کہ اس کی خاموش محبت میں اتنا دم تو تھا کہ نور بانو اس کی ذات پر اپنے باپ سے بڑھ کر اعتبار کررہی تھی، مگر اس نازک صورت حال میں اسے اپنے احساسات کو نہیں بلکہ معاملے کی سنگینی کو ترجیح دینا تھی۔

"میں تمہارے بابا اور تمہارے درمیان اس کشیدگی کی اصل وجہ سے ناواقف ہوں، مگر پھر بھی تمہیں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ کچھ بھی ہو، یہ تمہارے بابا ہیں۔ تمہیں ان کی ہر بات ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سننی چاہیے۔ انکل! آپ بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ نور بانو سے بات کریں..... یہ آپ کی بات سنے گی بھی اور سمجھے گی بھی..... آپ سے الگ ہونے کے بعد جس دلیری اور حوصلے کے ساتھ اس نے حالات کو فیس کیا ہے..... وہ آپ کو فیس کرنے سے کترا کر خود کو بزدل ہرگز بھی ثابت نہیں کرسکتی۔" وہ نور بانو کے بابا سے مخاطب تھا، مگر اس کی نظریں نور بانو کے غم زدہ چہرے پر گڑی تھیں۔

"بابا! آپ نے کوئی بات سننے اور کہنے کی گنجائش چھوڑی ہے کیا؟ کوئی باپ اپنی ننھی سی چار سالہ بچی کو سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جاتا ہے کیا؟ آپ روپیہ کمانے کی دھن میں دیار غیر میں بیٹھے، کیسے جان سکتے تھے کہ آپ کی بیٹی کی زندگی کتنی مشکل تھی۔ ہر سانس پر پہرہ تھا۔ راتوں کی تاریکی میں بستروں میں چھپ چھپ کر ٹارچ کی روشنی میں اپنی دوست کی کتابوں سے پڑھ کر میں نے بی اے کیا۔ فریال نے آپ کی بیوی کی نظر بچا کر ہمیشہ میری مدد کی۔ اس وقت مجھے آپ کی ضرورت تھی، آپ کہاں تھے بابا! ہر مہینے ڈھیروں روپے اپنی بیوی کے نام بھیج کر آپ ہر حق اور فرض سے دستبردار کیسے ہوگئے؟ آپ اپنے ذہن پر زور دے کر بتائیں ان بیس سالوں میں آپ نے کبھی فون پر بھی مجھ سے بات کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس نے میرے متعلق جو کہا آپ نے یقین کرلیا۔ یہاں

تک کہ اس کے کہنے پر آپ نے مجھے اس کے اوباش بھتیجے کے سپرد کرنے کے فیصلے پر رضا مندی کی مہر لگا دی بغیر اس سے ملے بغیر اسے دیکھے۔ وہ کہتی تھی میرا باپ مجھ سے میری ماں کی بے وفائی کا بدلہ لے رہا ہے۔ مجھے بتائیں بابا میری ماں نے اگر آپ سے وفا نہیں کی تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔

مجھے تمام عمر کس جرم کی سزا ملتی رہی۔ آپ کی ایما پر وہ اگلے روز میرا نکاح ایک ایسے شخص سے پڑھوانے جا رہی تھی جس کے اخلاق و کردار پر لوگ تھوکتے تھے، مگر آپ کو کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ فریال نے وہاں سے بھاگنے میں میری مدد کی۔ میں کیوں ان جھوٹے خود غرض رشتوں پر خود کو قربان کروں جو مجھے کچرے کے ڈھیر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد ہر قدم پر اس مسیحا نے ہر راستے میں میری رہنمائی بغیر کسی غرض اور لالچ کے کی۔ میری آنے والی زندگی کا ہر فیصلہ میں ان پر چھوڑتی ہوں یہاں تک کہ اگر یہ مجھے آپ کے ساتھ جانے کے لیے کہیں گے میں تب بھی انکار نہیں کروں گی جبکہ یہ فیصلہ میری مرضی اور چاہ کے برعکس ہوگا۔" وہ زار و قطار روتے ہوئے بچپن سے لے کر آج تک کی جمع ہونے والی تمام شکایتیں اپنے بابا کے سامنے دہرا رہی تھی۔ کس قدر غبار تھا دکھوں کا اس کے اندر اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر کا ہر دکھ عیاں ہو گیا تھا۔ شاہ زیب تو خود آج اسی لمحے آشنا ہوا تھا اس بظاہر مضبوط اور بہادر نظر آنے والی لڑکی کے ہر غم سے۔

ناکام باپ ہوں.... مجھے معاف کر دو.... میری بچی! میں محبت کی راہ میں چوٹ کھایا ہوا وہ زخمی مسافر ہوں جس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے الفاظ بھی باقی نہیں بچے۔ وہ اس لیے مجھے چھوڑ گئی کہ میں ایک پر آسائش زندگی اسے دے نہ سکا۔ اس کی بیٹی کو وہ تمام آسائش مہیا کرنے کے لیے میں نے دیار غیر میں دن رات ایک کر دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ جس کو میں اپنی متاع حیات سونپ کر گیا ہوں وہی میری بچی کی سب سے بڑی دشمن ہوگی۔" وہ زار و قطار رو رہے تھے۔

"فریال تمہاری دوست، فون کر کے مجھے یہ سب نہ بتاتی تو میں آج بھی بے خبر ہی رہتا۔ تمہارے گھر چھوڑنے کے بعد اس نے پتا نہیں کس طرح سے میرا کانٹیکٹ نمبر حاصل کر کے مجھے یہاں کی تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ اسی دن سے تمہاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں.... آج میری تلاش ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ میں کس قدر بدنصیب باپ ہوں جس کی خوشیوں کے لیے دربدر ہوا اسی کو اپنے ہاتھوں سے غموں کی آگ میں جھونک دیا۔" نور بانو کے بابا پچھتاوے کی دلدل میں گردن تک دھنسے ہوئے تھے۔

وہ خاموش تھی۔ بابا کا گڑگڑانا اپنی جگہ ایک بہت بڑا سچ تھا، مگر وہ اس بیمار اور قریب المرگ عورت کو ایسے چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی۔ جو انجانے میں اپنی زندگی کی بچی ہوئی ہر سانس اس کی اپنے پاس موجودگی سے منسوب کر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں مانتا ہوں تمہاری ہر شکایت اپنی جگہ پر درست ہے۔ تم سے کچھ بھی کہنے یا منوانے کا حق میں کھو چکا ہوں.... لیکن میرا یقین کرو.... میں نے آج تک جو کچھ بھی کیا تمہیں ایک اچھی زندگی دینے کے لیے کیا۔ آج میرے پاس وہ سب کچھ ہے۔ جس کے لیے تمہاری ماں تمہیں اور مجھے چھوڑ کر گئی تھی، لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ سب کچھ پانے کے جنون میں اپنی بیٹی کو ہی کھو دوں گا۔ میں ایک ناکام شوہر اور ایک

"نور بانو.... !نور بانو، اماں! نور بانو کہاں ہے.... میں نے ابھی ایک بھیانک خواب دیکھا ہے کوئی نور بانو کو مجھ سے چھین کر لے جا رہا ہے۔" دوسرے کمرے سے آنے والی اس درد بھری بلند آواز نے ان تینوں کو اس آواز کی جانب متوجہ کر دیا۔

"آپ نے دیکھا بابا! آپ سے زیادہ انہیں میری ضرورت ہے۔ جب تک مجھے ان کی طرف سے اطمینان نہیں ہو جاتا، میں آپ کے ساتھ جانے کا

سوچ بھی نہیں سکتی۔ ہم دونوں نے اس وقت ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما تھا جب ہر راستے پر اندھیروں کا راج تھا اور دیکھنے کے لیے ہمارے پاس ایک دوسرے کی بے بسی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ آپ چلے جائیں اس اطمینان کے ساتھ کہ آپ کی بیٹی آپ سے زیادہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ جہاں پوری زندگی ہم نے ایک دوسرے کے بغیر گزار لی وہاں یہ بھی سہی۔" نور بانو نے اپنا آخری فیصلہ سنا کر دروازے کا رخ کیا۔ اس کے بابا آنکھوں میں بے بسی کے آنسو لیے اسے کمرے سے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

تب ہی دروازے کی چوکھٹ تھامے ایک ہانپتی کانپتی بیمار اور لاغر خاتون ایک خود سے بھی زیادہ ضعیف عورت کے سہارے نور بانو کے راستے میں آن کھڑی ہوئی۔ "کون ہے نور بانو؟ جو تمہیں مجھ سے دور لے جانے آیا ہے۔ میں تمہیں خود سے دور نہیں جانے دوں گی۔" اکھڑتی سانسوں کے دوران ٹوٹتے ہوئے بے ترتیب جملے وہ بڑی مشکل سے ادا کر سکی تھیں۔

"نہیں... نور بانو کہیں نہیں جا رہی... آپ کو چھوڑ کر... آپ اپنے بستر میں چلیں... یہاں کیوں آگئیں؟ آپ کی طبیعت بگڑ جائے گی۔" نور بانو نے لپک کر ان کے لڑکھڑاتے ہوئے وجود کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ شاہ زیب بھی تقریباً بھاگتے ہوئے ان کے قریب پہنچا۔ دونوں نے سہارا دے کر انہیں صوفے پر لٹایا۔

"نور بانو! تم... مم... میری زندگی کی آ... خری سانسوں کی ضمانت ہو... مجھے چھوڑ کر مت جانا۔" صوفے پر لیٹتے لیٹتے بھی ان کی زبان پر بس یہی ایک التجا تھا۔ نور بانو کے بابا بھی یہ تمام منظر دیکھ کر اس خاتون کی زندگی میں نور بانو کی اہمیت کو بہت اچھی طرح جان چکے تھے۔ شاہ زیب، نور بانو اور اس ضعیف العمر خاتون کی آڑ میں وہ صوفے پر لیٹی ہوئی اس عورت کو ایک نظر دیکھنے سے قاصر تھے۔ جس کی درد بھری التجا نے کمرے میں موجود ہر شخص کو ایک لمحے میں تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

"آپ نے دیکھا بابا کہ انہیں میری زیادہ ضرورت ہے نہ کہ آپ کو... آپ فریحہ بیگم کے پاس لوٹ جائیں۔ میں بھی لوٹ آؤں گی مگر انہیں اس حالت میں چھوڑ کر تو ناممکن ہے کہ میں آپ کے ساتھ جاؤں کیونکہ ان کے ساتھ جڑنے والا تعلق قدرت کا میری ذات پر خاص کرم ہے۔ زندگی بھر کی ساری تشنگی مٹ جاتی ہے ان کی گود میں سر رکھ کر، صرف انہیں میری ضرورت نہیں مجھے بھی ان کی ضرورت ہے۔" نور بانو وہیں بیٹھے بیٹھے رخ موڑ کر اپنے بابا سے مخاطب تھی۔

"نور بانو میں کہاں جاؤں گا تمہیں چھوڑ کر..."

"وہیں، جہاں آج سے پہلے تھے۔" نور بانو نے سپاٹ لہجے میں ان کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

"تم نے مجھے معاف نہیں کیا اس کا تو یہی مطلب ہوا نا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولے۔

"میں کون ہوں کسی کو معاف کرنے والی... بس آپ یہ سمجھ لیں کہ ان کی قربت میں آکر نور بانو کو زندگی سے کوئی شکایت نہیں رہی۔ یہ میرے لیے وہ سائبان ہیں جو برسوں سے تپتی دھوپ میں سفر کرنے کے بعد نصیب ہوا ہے۔ کیا میرا خوشیوں پر حق نہیں ہے بابا؟" نور بانو کی آواز میں آنسوؤں کی لرزش تھی۔

"مجھے باپ اور بیٹی کے معاملے میں بولنے کا کوئی حق تو نہیں پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گی کہ تمہیں نور بانو کے جذبات و احساسات کو سمجھنا چاہیے وہ مہر بانو کے پاس رہنا چاہتی ہے تو تمہیں بھی اسے روکنا نہیں چاہیے۔" دادی جان نے اس ساری گفتگو میں پہلی بار حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"مہر بانو... کون مہر بانو؟" وہ چونکتے ہوئے دادی جان سے مخاطب ہوئے۔

"یہی مہر بانو جس کی زندگی کی ڈور نور بانو میں اٹکی ہے۔" انہوں نے صوفے پر لیٹی مہر بانو کی طرف اشارہ کیا۔ اب وہ کسی معصوم بچے کی طرح گہری نیند میں تھیں۔ وہ بے تاب ہو کر آگے بڑھے پھر جو ٹکٹکی باندھے ان کے چہرے کو تکنا شروع کیا تو آس پاس

کے لوگوں کی حیرانی اور تجسس کو بھی نظرانداز کر بیٹھے۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں بابا! کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟" کتنے ہی خاموش لمحوں کے گزر جانے کے بعد آخر نوربانو سوال کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں جس کی خود غرضی اور خود پرستی نے تمہاری اور میری زندگی اجاڑ کر رکھ دی... مگر یہ تو آسائشوں اور خوشیوں بھری زندگی کے تعاقب میں ہم سے دامن چھڑا کر گئی تھی۔ اسے اس حال تک یقیناً "میرے ویران دل کی کسی آہ نے پہنچایا ہے۔" بابا کے لہجے میں دکھ بھرا طنز تھا۔

"نوربانو! تم اپنے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کا ذمہ دار مجھے سمجھتی ہو ناں؟ آج میں تمہیں اس مجرم سے ملواتا ہوں جو تمہارے اوپر ہونے والے ہر ظلم میں برابر کی شریک ہے۔ یہ مہربانو 'ماں' ہے تمہاری 'جس نے محبت کے نام پر میری زندگی اور خواہش کے نام پر تمہاری زندگی داؤ پر لگائی اور کسی کھیل کی طرح تیرے بابا کی غربت اور افلاس میں لٹی عزت کو پاؤں تلے روند کر چلی گئی۔ فریحہ تمہیں تمہاری ماں کی آوارگیوں کا طعنہ دیا کرتی تھی۔ مجھے آج بھی تیری شکایت بھری نظروں سے میری طرف دیکھنا یاد ہے کہ میں اس کی زبان بند کیوں نہیں کروا پایا... اس کی بے وفائی نے مجھے کچھ بولنے کے قابل چھوڑا ہی کب تھا' قدرت نے اسے ہم سے ملوایا ہی اس لیے ہے کہ میں اس سے ہر اس لمحے کا حساب مانگ سکوں جو میں نے اس کی وجہ سے ذلت و رسوائی کی پستیوں میں گرتے ہوئے گزارا ہے۔" بابا بولنے پر آئے تو بولتے ہی چلے گئے۔ ان کی رندھی ہوئی آواز' آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں ان کے دل کی ترجمان تھیں۔ یہ کاتب تقدیر کی قلم سے لکھی گئی وہ کہانی تھی جس پر یقین کرنا سب کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

"اسے اٹھاؤ نوربانو! اسے بہت ساری باتوں کا حساب دینا ہے۔ یہ ہماری زندگیوں کو ذلت و رسوائی کی آگ میں جھونک کر یوں پرسکون نیند کیسے سو سکتی ہے۔" بابا آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ ایسے میں شاہ زیب نے اشارے سے نوربانو کو انہیں سنبھالنے کو کہا۔

نوربانو بابا کا بازو پکڑ کر دوسری طرف لے گئی۔ اس حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لیے نوربانو نے اپنے بابا کو اطمینان سے بٹھا کر مہربانو پہ گزری داستان سنائی جسے سن کر بابا ندامت پشیمانی اور پچھتاوے کے پسینوں میں نہا گئے۔ خاص طور پر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ فیروز شاہ نے وحشت و بربریت کا یہ تمام کھیل فریحہ بیگم کے ساتھ مل کر کھیلا تھا جسے ان کی ماں نے اپنی زندگی کا واسطہ دے کر ان کی زندگی میں شامل کیا تھا۔ مہربانو کے چلے جانے کے بعد فریحہ بیگم کو نوربانو کی ذمہ داری سونپی تھی اور ان کی بے رنگ ویران زندگی میں رنگ بھرنے کا جواز بنایا تھا وہی آج تک ان کی پیٹھ میں چھرے گھونپتی رہی۔ اور اپنی دلفریب مکاریوں اور عیاریوں کو ہتھیار بنا کر ایک باپ کو ہی بیٹی کے خلاف ورغلاتی رہی۔

اس کی چالبازیوں اور عیارانہ منصوبہ بندیوں کے نتیجے میں مہربانو پر مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے۔ یہ جاننے کے بعد ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی جا کر فریحہ بیگم کے ناپاک وجود کو اپنے ہاتھوں سے مٹا دیتے' مگر نوربانو نے جس حکمت اور دانش مندی کے ساتھ بابا کو غصے اور انتقام کی اس دہکتی ہوئی آگ سے نکالا' دادی جان اور شاہ زیب بھی حیران رہ گئے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں ایسی معرفت سے جڑی گفتگو آخر اس نے سیکھی کہاں سے؟ وہ کیا جانیں جس نے تلخیوں کی آغوش میں آنکھ کھولی ہو ظلم و ستم کے سائبان تلے بچپن اور تہمتوں اور الزامات کی بازگشت میں اپنا لڑکپن گزارا ہو اس کی زبان سے اس طرح کی غیر متوقع بڑی بڑی باتیں کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

مہربانو کے ہوش میں آنے سے پہلے نوربانو کے بابا' دادی جان کے سامنے رو رو کر کسی حد تک اپنا جی ہلکا کر چکے تھے۔ آنکھ کھلتے ہی اپنے سامنے اس شخص کی

شبیہہ دیکھ کر ہمیشہ کی طرح ایک تصور کو آنکھوں میں قید کیے انہوں نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

"تمہارا تصوراتی ہیولا میری امید کو ٹوٹنے نہیں دیتا کہ زندگی کی شام ہونے سے پہلے میرا یہ خواب حقیقت کا روپ ضرور دھارے گا۔ یوں ہی تو قدرت نے اس خالی وجود کو زندہ نہیں رکھا۔" وہ آنکھوں کے کناروں سے پھسلتے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے پونچھتی زیر لب بڑبڑائی۔

"آنکھیں کھولیں اماں دیکھیں.... کتنی خوشخبریاں آپ کی آنکھ کے کھلنے کی منتظر ہیں۔" نور بانو نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے خوش گوار لہجے میں کہا۔

مہربانو نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"تم نے مجھے اماں کہا.... مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا۔" اس کی آنکھیں نور بانو کی آنکھوں سے یہی سوال کررہی تھیں کیونکہ آج سے پہلے انہوں نے جب بھی نور بانو کو خود کو ماں پکارنے پر اصرار کیا اس نے ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "میری ماں اس قابل نہیں تھی جس کی جگہ آپ جیسی فرشتہ صفت عورت لے سکے۔ آپ کے ساتھ میرا جو تعلق ہے میرے لیے وہی کافی ہے۔" اور خود مہربانو کے لیے بھی اتنا ہی بہت تھا کہ کسی بھی تعلق سے سہی وہ ان کے آس پاس تو ہے۔

"ہاں.... میں نے آپ کو اماں کہہ کر پکارا کیونکہ آپ ہی میری اماں ہیں۔ اور یہ میرے بابا ہیں آپ پہچانتی ہیں ناں ان کو۔" نور بانو کا لہجہ شوخ ہوگیا تھا۔

تم احسان الحق.... یہ یقیناً "ایک خوب صورت خواب ہے، ہمیشہ کی طرح۔" نور بانو نے بابا کا بازو تھام کر مہربانو کے سامنے کیا تو انہیں یہ خواب سا لگا۔ اسی خواب کو آنکھوں میں چھپائے انہوں نے بیس سال کی ایک صبر آزما طویل قید تنہائی کاٹی تھی۔

"یہ خواب ہمیشہ نہیں رہے گا، ایک دن اس خواب کو تعبیر ضرور ملے گی بس اسی دن کے انتظار میں جی رہی ہوں۔" انہوں نے اپنی زندگی کی سب سے خوب صورت حقیقت کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ خواب نہیں ہے اماں! یہ حقیقت ہے، میں نور بانو آپ کی اپنی بیٹی، جس کی زندگی کی سلامتی کے لیے آپ نے یہ بن باس کاٹا اسی بیٹی کو آپ کے صبر و ضبط کا شیریں ثمر بنا کر قدرت نے آپ کے دامن میں ڈال دیا۔ اس سے بڑا معجزہ تو اور کوئی ہو نہیں سکتا۔" نور بانو خود بھی گھٹنوں کے بل مہربانو کے قریب زمین پر بیٹھی تھی اور احسان الحق بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے مہربانو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ واقعی احسان الحق تھا۔ جسے پانے کے لیے اس نے اپنے ماں باپ اور بھائی کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر نور بانو کے ننھے سے وجود نے اس کے اندر ممتا کا جو احساس جگایا وہ احسان الحق کی محبت پر بھی غالب آگیا۔ ایک طویل جدائی کے بعد وہ لمحے وہ منظر ان کی آنکھوں میں ٹھہر سا گیا۔ احسان الحق کی جھکی ہوئی نگاہوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ رہی تھیں وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے ہاتھ باندھے مہربانو کے سامنے بیٹھے تھے۔

"آپ رو رہے ہیں احسان؟" مہربانو دیر تک پلکیں جھپکائے بغیر اس شخص کو دیکھتی رہی۔۔۔ بے وفا بن کر جس سے وفا کے عہد و پیمان نبھاتی رہی تھی۔

"مجھے معاف کردو مہربانو! ندامت کے یہ آنسو اس یقین کا ماتم کررہے ہیں جو میں نے تمہارے ہاتھ سے لکھے چند الفاظ پر کیا۔ دل کے شور کو دبا کر دماغ کے فیصلے کو ماننے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کی۔ کاش! تمہاری تلاش میں یہ عمر گزاری ہوتی تو آج یوں محبت اور وفا کے دربار میں شرمسار نہ ہونا پڑتا۔" ہچکیوں کے درمیان الفاظ بے ترتیب سے ہورہے تھے۔

"ایسا مت کہیں احسان! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے.... آپ نے وہی کیا جو اس وقت آپ کو کرنا چاہیے تھا شاید ہماری محبت کو جدائی کی آزمائش سے گزر کر ہی سرخرو ہونا تھا۔ ہماری محبت کو خود غرضی کا کفارہ شاید اسی طرح ادا کرنا تھا۔ اپنوں کو دکھ دے کر تعمیر ہونے والے محبت کے شیش محل شاید اسی

طرح زمین بوس ہوجاتے ہیں۔ ہم نے محبت کا امتحان پاس کرلیا تب ہی تو آج ہم ایک ساتھ ہیں۔" مہربانو نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو تھام کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ آنسوؤں کی برستی برکھا میں یہ خوب صورت ملن زمین و آسمان بھی دیکھ رہے تھے۔

ایک ہی کارواں کے یہ تین مسافر الگ الگ سمتوں پر سفر کرتے ہوئے آخر کار آج منزل پر پہنچ کر ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ ان کا ملنا قدرت کا وہ حسین اتفاق تھا جس پر دادی جان اور شاہ زیب بھی آنسوؤں کا نذرانہ دیے بغیر نہ رہ سکے۔ اور پھر ہی آسمان جو بیس برس سے ان تینوں کو محبت کے جرم کی سزا پاتے دیکھتا رہا تھا، اسی آسمان نے خود کشی کرتے فیروز شاہ کو اور فریحہ بیگم کو طلاق کا پروانہ ملنے کے بعد ہوش و حواس سے عاری ہو کر زمانے کے پیروں کی دھول سر میں ڈالتے دیکھا۔ صحیح غلط کی پہچان کھو کر سڑکوں کی خاک چھانتی، دیکھنے والوں کے لیے عبرت کا نشان بن کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

شاہ زیب کے بابا مہربانو کے بھائی اور دادی جان کے اکلوتے بیٹے کو جب تمام صورت حال سے آگاہی ہوئی تو انہوں نے بھی وطن لوٹنے کا فیصلہ ایک پل میں کرلیا۔ مہربانو کی بغاوت نے جس حویلی کو برسوں پہلے ہولناک سناٹوں کا مسکن بنادیا تھا اس کے لوٹتے ہی جیسے بہار لوٹ آئی۔ اس علاقے کے لوگ جو پچھلے بیس برس سے فیروز شاہ کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے پیٹ بھر کر کھانے کو ترس رہے تھے۔ حویلی کا دروازہ کھلتے ہی اچھے دنوں کی امید کے ساتھ ایک نئی زندگی جینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس خاندان کا لوٹنا ہی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی نوید تھا۔

☆ ☆ ☆

احسان الحق نے بیس برس دیار غیر میں رہ کر جو دولت کمائی تھی وہ اس نے اس پسماندہ گاؤں کی تقدیر بدلنے کی نیت سے خرچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مہر بانو فاؤنڈیشن کے نام سے ایک فلاحی ادارے کی بنیاد رکھی، جہاں تعلیم سے لے کر صحت تک علاقے کے تمام لوگوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے نور بانو ادارے کی چیئرمین کے فرائض انجام دینے لگی۔ چھ ماہ گزرنے کے بعد نور بانو شاہ زیب کی مدد سے مہر فاؤنڈیشن کو اسٹیبلش کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوگئی تھی۔ مہر فاؤنڈیشن ہر گزرتے دن کے ساتھ نہ صرف مستحق غرباء، بے سہارا اور بے آسرا عوام کے لیے ایک محفوظ اور مضبوط پناہ گاہ بن گیا بلکہ آس پاس کے گاؤں کے خدا ترس مخیر حضرات جو صاحب حیثیت تھے ان کی توجہ کا مرکز بھی بن گیا۔ احسان الحق جب اس ادارے کے ذریعے گاؤں کے بے بس اور مجبور لوگوں کے چھوٹے بڑے مسائل کو حل ہوتے دیکھتے تو جرم محبت کی لپیٹ میں آنے والے سب لوگوں کے چہروں پر اطمینان دیکھ کر انہیں یہ احساس ہی پرسکون کرجاتا کہ ان کے اٹھائے ہوئے اس باغیانہ قدم کے صدمے سے مہربانو کے بابا کی اچانک موت نے علاقے کے لوگوں سے ایک رحم دل اور خدا ترس مہربان چھین لیا تھا۔

ان کے اس عمل سے اس علاقے کے لوگوں کے ساتھ ساتھ آس پاس کے گاؤں کے لوگوں کو بھی ایک آسرا ملا اور یہی ان کے نزدیک ان کی خود غرض محبت کی غلطی کا کفارہ تھا۔

احسان الحق کے مل جانے سے مہربانو کی حالت بھی غیر متوقع طور پر سنبھلنے لگی تو نور بانو کو بھی ان کی طرف سے اطمینان نصیب ہوا۔ ہر طرح سے ہر کام جاننے کے باوجود وہ شاہ زیب سے مشورہ ضروری سمجھتی۔ وہ پاس ہوتا تو پوری پوری رات لوگوں کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں گزر جاتی۔ وہ ویک اینڈ گزارنے کے بعد گاؤں سے باہر ہوتا تو فون پر ہر کام سے پہلے اس کی رائے لینا اس کے لیے لازم ہوتا۔ دادی جان تو ان کے اس رشتے کا اعلان سب کے سامنے کرنے کے لیے

بے چین تھیں مگر شاہ زیب نے انہیں یہ کہہ کر منع کر دیا تھا نور بانو جب تک خود اس رشتے کی خواہش نہیں کرے گی وہ پہل نہیں کریں گی۔ ورنہ تمام عمر وہ اس بوجھ سے نہ نکل سکے گا۔ کہ نور بانو نے ایک مسیحا اور راہنما کے طور پر اسی کو اپنی زندگی کا ہمسفر تو مان لیا ہے مگر محبوب نہیں۔ اپنی بے پناہ محبت کے بدلے میں اس کی محبت پانا تو اس کا حق تھا جس کے حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی تمام عمر بھی انتظار میں گزارنے کو تیار تھا۔ وہ جب بھی ویک اینڈ پر آتا نور بانو کے ڈھیر سارے کام اس کے ساتھ ــــ بانٹنے کے لیے تیار ہوتے۔

اس روز وہ پندرہ دن کے بعد گاؤں لوٹا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ حویلی کے بڑے سے دالان میں چہل قدمی کرتے کرتے پیپل کے بڑے سے درخت کے نیچے بچھے لکڑی کے جھولے پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا' جب وہ اپنا اور اس کا کافی مگ ہاتھ میں لیے' بغل میں کام سے متعلق فائل دبائے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"جلدی سے پکڑیں ورنہ ایک آدھ چیز تو گر ہی جائے گی۔" وہ اس کا مگ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے ایک جاندار مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ تیز ہوا کے جھونکے اس کے چہرے پر بکھری لٹوں کو سمیٹنے سے قاصر تھے۔

"کتنی دفعہ کہا ہے بوجھ اتنا ہی اٹھایا کرو جتنا آسانی سے سنبھال سکو۔" شاہ زیب نے مگ اس کے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے تنبیہہ کی۔

"کیا کروں مجھے ضرورت سے زیادہ بوجھ اٹھانا اچھا لگتا ہے.... اور پھر آپ ہیں ناں میرا بوجھ بانٹنے کے لیے' میں کیوں فکر کروں۔" وہ چہکتی ہوئی آواز میں جواب دے کر دھڑام سے اس کے برابر بیٹھ گئی۔ اتنا عرصہ ساتھ کام کرنے کے بعد اتنی بے تکلفی تو ہو گئی تھی۔ کہ کوئی بھی بات کرنے کے لیے اسے سوچنا نہیں پڑتا تھا کہ کرے یا نہ کرے' بس جو جی میں آیا کہہ دیا۔

"اس بار آپ پورے پندرہ دن بعد آئے ہیں۔" کافی کا سپ لیتے ہوئے وہ بولی۔ شاہ زیب منتظر تھا کہ وہ یہ بھی کہہ دے کہ اس نے اسے بہت مس کیا ہے۔

"ڈھیر سارا کام جمع ہو گیا ہے' پوری رات جاگنا پڑے گا۔" اس نے کام کی کثرت بتا کر اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

"کام کے علاوہ بھی کچھ سوجھتا ہے میڈم کو۔" وہ چڑ سا گیا۔

"سوجھتا ہے ناں! اماں بابا کا اور نانی جان کا خیال کون رکھتا ہے۔ میں ہی رکھتی ہوں کام سے فارغ ہونے کے بعد۔"

"تمہارے ساتھ تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" وہ اس کا غیر متوقع جواب سن کر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"کیا کہا آپ نے مجھے سنائی نہیں دیا۔" وہ کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے بھی مختصر جواب دیا۔

"اچھا چلیں چھوڑیں' ایک بہت ضروری میٹر ہے جو آپ کے زیر غور لانا چاہتی ہوں۔" کافی ختم کرتے ہی وہ فوراً "کام کی بات پر آ گئی"۔ ساتھ والے گاؤں میں موجودہ ایم۔ این۔ اے کا بیٹا سکندر لاشاری ایک بھاری ڈونیشن کے ساتھ بار بار آفس کے چکر لگا رہا ہے۔ کچھ زرعی اراضی بھی ادارے کے لیے وقف کرنا چاہتا ہے۔ شکل سے تو انتہائی خوفناک مونچھوں والا کوئی ظالم جاگیردار لگتا ہے مگر میرے ساتھ بڑے ادب سے پیش آیا۔ میں نے تو صاف کہہ دیا کہ جب تک سر شاہ زیب آپ سے مل نہیں لیتے آپ کی اس گرانٹ کو قبول کرنے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔" نور بانو نے شروع سے آخر تک اس ایم۔ این۔ اے کے بیٹے کی ساری کہانی کھول کر رکھ دی۔

"ہاں وہ ہمیشہ سے اس حلقے سے الیکشن جیتتے آئے ہیں۔ فیروز شاہ اہل حلقہ کو چند دنوں کی روٹیوں کے عوض ووٹ سمیت خرید کر ان کی جیت کو یقینی بنا دیا کرتا تھا مگر اب لوگوں کی بنیادی ضرورتیں تو ادارہ پوری

کررہا ہے' اس لیے وہ ادارے کو خریدنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔"

"یعنی ہمیں ان لوگوں کی گرانٹ لینے سے صاف انکار کردینا چاہیے۔" نوربانو شاہ زیب کی پوری بات سن کر فوراً بولی۔

"بابا... بابا کا کیا کہنا ہے کہ آپ جو کہیں گے وہی بہتر ہوگا۔ ادارے کے لیے علاقے کے معتبر لوگ تو بابا کو الیکشن میں کھڑا ہونے کا مشورہ بھی دے رہے ہیں۔ مگر بابا نے اس جھنجھٹ میں پڑنے سے صاف انکار کردیا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں تیز تیز بولتے ہوئے اسے پورے پندرہ دن کی رپورٹ دے رہی تھی۔

"آئیڈیا برا نہیں۔ انکل کو سیاست کے میدان میں ایک بار نصیب ضرور آزمانا چاہیے۔" شاہ زیب نے اس خیال کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے بھی بابا سے یہی کہا تھا۔ لوگ بڑی عزت کرتے ہیں بابا کی... ان کا خیال ہے کہ بابا وہ پہلے شخص ہیں جو باہر ملک میں کمایا ہوا پیسہ پاکستان میں خرچ کررہے ہیں' ورنہ یہاں تو لوگوں کا خون بھی بیچ کر سرمایہ دار دوسرے ملکوں کے بینکوں میں منتقل کردیتے ہیں۔"

"لوگ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ تمہارے بابا جیسے خدا ترس اور ہمدرد انسان ملتے کہاں ہیں آج کے دور میں۔" شاہ زیب نے بھی بابا کے متعلق اپنے خیالات کا کھلے دل سے اظہار کیا۔ آدھی سے زیادہ رات بیت گئی مگر نوربانو کے کام باتیں مشورے' اور تجاویز ختم ہونے میں ہی نہیں آرہی تھیں۔

"اوئے ہوئے... اتنی رات ہوگئی اور پتا بھی نہیں چلا۔" نوربانو کی نظر گھڑی پر پڑی تو اسے احساس ہوا۔ "میرا خیال ہے آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے کل اگر آپ کی کوئی اور مصروفیت نہ ہوتی تو باقی کل صبح۔" اس نے فائلیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟... اب کیا ہوا؟ مجھے تو نیند نہیں آرہی کام مکمل کرنا چاہو تو کرلو۔" شاہ زیب کے دل میں مچلتی خواہش دبے لفظوں زبان پر آئی۔

"نہیں میرا خیال ہے اب سونا ہی چاہیے ورنہ آپ تھک جائیں گے۔"

"میری پروا نہ کرو تم اپنی بات کرو۔ لگتا ہے کہ ڈر رہی ہو۔ سچ سچ بتاؤ' مجھ سے ڈر رہی ہو یا رات کے ان سناٹوں سے۔" شاہ زیب کا یہ سوال نوربانو کے لیے عجیب وغریب ضرور تھا مگر نا قابل جواب نہیں۔

"ڈر؟... اور نوربانو... آپ کا ساتھ ہو اور نوربانو کسی سے ڈر جائے' یہ تو ناممکن ہے... ہر ڈر اور خوف کے سامنے ڈٹ جانا آپ سے ہی تو سیکھا ہے نوربانو نے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"تو بیٹھ جاؤ... کام مکمل کرو کیونکہ آج کا کام کل پر کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بات ہے؟... تو ٹھیک ہے جناب! چلیے یوں ہی سہی۔" اس نے دوبارہ فائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"چھوڑو اسے' باتیں کرتے ہیں آج..." وہ اس کا فائل کی طرف بڑھتا ہاتھ روک کر بولا۔

"آج آپ بہت... بدلے بدلے سے لگ رہے ہیں۔ یا یہ میرا وہم ہے؟" وہ حیران سی اس کا یہ غیر متوقع مطالبہ سن کر مسکرائی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا میرے ساتھ بیٹھنا اور باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔" وہ اس کی آنکھوں میں حیرانی دیکھ کر بولا۔

"ایسا نہیں ہے... آپ کے ساتھ گزرنے والا ہر پل میری زندگی کا سب سے قیمتی پل ہے مگر ان لمحوں کو قیمتی بنانے کے لیے میں آپ کا قیمتی وقت تو برباد نہیں کرسکتی ناں۔" اس نے رک رک کر اپنا جواب مکمل کیا۔

"آج میں تمہاری باتیں سن کر اپنا وقت قیمتی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کا ہاتھ ابھی تک شاہ زیب کے ہاتھ

میں تھا، جس کا احساس نور بانو کو تھا اور نہ ہی شاہ زیب کو۔

"آج آپ کی ان فلمی باتوں نے مجھے تو حیران و پریشان کردیا ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔" وہ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے شرارت سے مسکرائی۔

"ٹھیک ہے۔ تمہیں میری باتیں فلمی لگتی ہیں؟ تم جاؤ جاکر آرام کرو..... میں اکیلا ہی یہاں بیٹھ کر صبح کا انتظار کروں گا۔" وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر چہرہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے بولا۔

"میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا آپ ناراض ہوگئے آپ تو صرف صبح ہونے تک کی بات کرتے ہیں، نور بانو تو عمر بھر آپ کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے کے لیے تیار ہے' بتائیں..... کس موضوع پر بات کرنا چاہتے ہیں آپ۔" وہ اطمینان سے اس کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔

"یہی کہ اگر آج کی طرح کل بھی تمہارے کام میں تمہاری مدد نہ کرسکا تو کیا کرو گی؟"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ ایسا کیوں ہوگا۔ نانو بھی ایک روز مجھ سے یہی کہہ رہی تھیں۔"

"کیا..... کیا کہہ رہی تھیں دادی جان تم سے۔" وہ جاننے کے لیے بے چین تھا۔

"یہی کہ کل کو اگر آپ کی شادی ہوگئی تو آپ کی بیوی مجھے آپ کے پاس پھٹکنے بھی نہیں دے گی۔" وہ نانی جان کے انداز میں ہی ان کی بات دہراتے ہوئے بولی۔

"پھر تم نے کیا کہا۔" وہ بے ساختہ ہنس کر بولا۔

"میں نے نانی جان سے یہی کہا کہ آپ ان کی ہونے والی بیوی سے پہلے یہ شرط منوائیں کہ نور بانو تو اس کے شوہر کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑے گی۔ جو یہ شرط مان لے گی وہی آپ کی بیوی بن سکے گی۔ ورنہ......"

"ورنہ کیا؟" اسے خاموش ہوتے دیکھ اس نے بے تابی سے سوال کیا۔ "ورنہ تو آپ کو کنوارا ہی رہنا پڑے گا کیونکہ نور بانو کو تو آپ کی مدد کے بغیر چلنا آتا ہے نہ جینا۔"

"کنوارہ رہ کر تمہارے مسئلے حل کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی تو نکل سکتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔

"یعنی نانی جان ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں کہ آپ شادی کے بعد میرے ہر مسئلے سے دستبردار ہوجائیں گے؟" وہ پوری کی پوری اس کی طرف مڑ کر بولی۔

"میرا مطلب ہے..... تمہاری بھی تو شادی ہوگی ایک نہ ایک دن' کیا تمہارا شوہر شادی کے بعد تمہیں یوں اس طرح میرے ساتھ بیٹھنے دے گا؟" شاہ زیب کا یہ سوال واقعی نور بانو کے لیے باعث تشویش تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے اس سوال کا جواب سوچنے لگی۔

"بات تو واقعی قابل غور ہے۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔" وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کوئی معقول جواب تلاش کررہی تھی مگر اس سوال کا کوئی جواب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"وہ دیکھو نور بانو صبح کا ستارہ نمودار ہورہا ہے' ہم سب کے لیے ایک نئی صبح اور نئی امیدیں لے کر۔ میں تمہیں اگلے ویک اینڈ تک کا وقت دے رہا ہوں اگلی بار اسی ستارے کے سامنے تم اس مسئلے کا حل تلاش کر کے رکھنا۔ میں اپنے سوال کا جواب سننے کے لیے پورا ہفتہ انتظار کروں گا۔ اب میں سونے جارہا ہوں۔ دن کے اجالے میں ملیں گے۔" اسے کتنی ہی دیر اپنے سوال سے الجھتے دیکھ کر وہ آسمان پر چمکتے ہوئے ایک بہت ہی زیادہ روشن ستارے کی طرف اسے متوجہ کرتا ہوا بولا اور اس کا کوئی جواب سنے بغیر مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اور نور بانو موذن کی اذان کی آواز گونجنے تک اس کے اس عجیب و غریب مگر حقیقت سے بہت قریب سوال پر غور کرتی رہی۔ لاکھ کوشش کے بعد بھی اس الجھن کو سلجھانے میں ناکام رہی تو سر جھٹک کر اپنی فائلیں اٹھا کر کمرے کی طرف چل دی۔

اگلی صبح اتوار تھا چھٹی کی وجہ سے وہ اور شاہ زیب

دونوں ہی اپنے اپنے کمروں سے خلاف معمول دیر سے نکلے جب اماں بابا اور نانی جان ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ جب سے بابا نے اماں کی دواؤں کا خیال رکھنا شروع کیا تھا' نور بانو کسی حد تک بے فکر ہو گئی تھی۔ ان کی طرف سے اب تو مہربانو کی حالت میں اتنا بدلاؤ آ گیا تھا کہ وہ ناشتہ لنچ اور ڈنر کھانے کی میز پر سب کے ساتھ کرنے لگی تھیں۔ ان کی طبیعت کے سنبھلنے میں بابا کی بے پناہ محبت اور نور بانو کی خدمت گزاری کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ مگر اس روز اٹھتے ہی نانی جان کی زبانی پریشان کن خبر سننے کو ملی کہ بہت دنوں کے بعد مہربانو آج پھر ٹوٹتی سانسوں کے ساتھ موت کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے بعد دوا کھا کر سوئی ہیں۔ بابا کسی ذمہ

"لیکن بابا! یہ سب ہوا کیسے؟" نور بانو نے کمرے میں داخل ہوتے ہی تشویشناک لہجے میں بابا سے سوال کیا۔

"ہونا کیا تھا شاہ نواز لاشاری علاقے کے ایم این اے کا چھوٹا بھائی اپنے بیٹے سکندر لاشاری کے لیے نور بانو کا رشتہ مانگنے پوری تیاری سے آیا تھا۔ میں نے تو صرف یہ کہہ کر اسے لوٹا دیا کہ نور بانو اس مہربانو کی بیٹی ہے جس کے خاندان سے باہر شادی کرنے پر سب سے زیادہ واویلا لاشاری خاندان نے ہی مچایا تھا۔ وہ میرا انکار سن کر چلے گئے اور شہربانو پہلے تو غصے کے مارے کانپتی رہی' پھر اس حال کو پہنچ گئی۔ مہربانو کو شاید اسی صدمے نے دوبارہ بستر سے لگا دیا کہ کہیں رشتوں کے معاملے میں بھی نور بانو کو ان کی غلطیوں کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے۔"

"تو وہ مجھے ادارے کو فنڈز دینے کے لیے نہیں اس نیت سے بار بار چکر لگا رہا تھا۔ اب جو سامنے آئے تو اس کا منہ نوچ لوں گی۔" نور بانو بھی غصے کی حالت میں تلملاتی کمر پر ہاتھ رکھے' کمرے میں چکر

لگا رہی تھی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔ نانی جان نے اسے پرسکون رہنے کی تاکید کی مگر اس کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

"اس کی ہمت کیسے ہوئی میرے لیے اتنی گھٹیا بات کرنے کی۔" وہ غصے سے دانت پیستی اپنی نانی سے مخاطب تھی۔

"پرسکون ہو جاؤ نور بانو' یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ جہاں بیری ہو وہاں پتھر آ ہی جاتے ہیں۔" نانی جان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ پریشان نہ ہوں دادی جان! اس تمام معاملے کو آپ کا شاہ زیب خود ہی ہینڈل کرلے گا۔ مجھے معلوم ہے اتنے برس گزر جانے کے بعد اچانک اس حویلی اور حویلی کے مکینوں کے ساتھ تعلق جوڑنے کا خیال ان کے دل میں کیوں آیا ہے۔ مہر فاؤنڈیشن کی بڑھتی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ان کے دل میں یہ ڈر بیٹھ گیا ہے کہ اگر اس خاندان کا کوئی فرد ان کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا تو ان کی برسوں پرانی خاندانی حکمرانی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ایسا ہر راستہ وہ کھلنے سے پہلے بند کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس خاندان سے رشتہ داری جوڑنے سے بہتر اس مسئلے کا اور کوئی حل ہو ہی نہیں سکتا۔" شاہ زیب نے لاشاری خاندان کے مطالبے کا تمام کچا چٹھا ایک منٹ میں سب کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

"شاہ زیب بیٹا! اس علاقے کے لوگوں کی جتنی خدمت ہم اپنی بساط کے مطابق کر سکتے ہیں کر رہے ہیں اور آگے بھی کرتے رہیں گے مگر سیاست کے اس کھیل کا حصہ تو ہم ہرگز نہیں بنیں گے' تم انہیں یہ اطمینان دلا دو۔۔۔۔۔ میں کسی بھی طرح کا اختلاف یا جھگڑا افورڈ نہیں کر سکتا۔ اور نہ ان اونچے لوگوں کو اپنی بچی سونپنے کا سوچ سکتا ہوں۔" احسان الحق اس ملک کی سیاست اور سیاست کے نام پر لوگوں کے جذبات سے کھیلنے والوں کے متعلق اپنے دلی خدشات سے آگاہ کرتے ہوئے اس جھنجھٹ سے دور رہنے کا فیصلہ سناتے ہوئے بولے۔

"رہی بات نور بانو کی' میں اسی ہفتے اس کے متعلق کوئی بہتر فیصلہ کر کے ان کی امیدیں اور مہربانو کے دل

میں پیدا ہونے والے اندیشوں اور وسوسوں کو خاک میں ملادوں گا۔" انہوں نے اس تمام مسئلے کا حل اپنی عقل و دانش اور طبیعت کے عین مطابق نکال کر اس کمرے میں موجود تمام افراد کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"انکل! اتنا بھی سیریس نہیں ہے یہ معاملہ خواہ مخواہ آپ اپنے فیصلوں کو عجلت کی نذر کر رہے ہیں۔" شاہ زیب نے انہیں پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

"معاملے کو سیریس بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ یہ فیوڈل نظام کے پیروکار کب کدھر سے وار کر کے کسی کی عزت اور جان و مال سے کھیل جائیں پتا بھی نہیں چلتا۔ مہربانو کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس کے بعد میں نوربانو کے لیے ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ میں جانتا ہوں ان لوگوں کی دوستی اور دشمنی دونوں ہی ہم جیسے سیدھے سادے شریف لوگوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ان لوگوں کے منہ لگنے سے پہلے میں یہ گاؤں چھوڑ دینے میں بھی تاخیر نہیں کروں گا۔" احسان الحق مہربانو کے اغوا اور طویل قید کے ایام کے تصور کو یاد کر کے وقت سے پہلے اور ضرورت سے زیادہ محتاط ہونے کو ترجیح دے رہے تھے۔

"آپ یوں ہی فکر مند ہو رہے ہیں۔ میں ہوں ناں آپ کے ساتھ، کس کی مجال ہے کہ اس حویلی یا پھر نور بانو کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرات کر سکے۔" شاہ زیب، احسان الحق کو کندھوں سے تھام کر دلاسا دینے کی کوشش میں بولا۔

"تم سمجھ نہیں رہے ہو... شاہ زیب بیٹا! بس میں ان لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتا۔ اور اب میں مہربانو کے سامنے اس موضوع کو چھیڑنا بھی نہیں چاہوں گا۔ میں نے جو سوچا ہے مجھے وہ چپ چاپ کرنے دو۔" انہوں نے دو ٹوک فیصلہ سنا کر سب کی زبانیں بند کر دیں۔ "میں یہاں مہربانو کے پاس موجود ہوں تم لوگ جاؤ اپنے

نے اس علاقے کے طاقتور جاگیرداروں کی طرف سے آنے والے پیغام کو کسی خطرے کی طرح اپنے ذہن پر سوار کر لیا تھا۔ دادی جان نے آنکھ کے اشارے سے ان دونوں کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

✡ ✡ ✡

اسی روز شام کو شاہ زیب کے جانے سے پہلے گاؤں کے معتبر لوگوں کی موجودگی میں احسان الحق نے ایک پرامن میٹنگ میں لاشاری خاندان کے باعزت اور با اختیار لوگوں کے سامنے ان کے وہم دور کر دیے کہ۔

وہ یا ان کے خاندان کا کوئی بھی فرد سیاست میں حصہ لینے میں کوئی بھی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اور یہ کہ مہر فاؤنڈیشن کا انعقاد بھی فقط مہربانو کے والد کی روح کے ایصال ثواب کے لیے ہے اس کا مقصد کسی دوسرے کو نیچا دکھانا ہرگز نہیں۔ رہی بات نوربانو کے رشتے کی وہ بہت پہلے اس کا رشتہ کہیں اور طے کر چکے ہیں۔" احسان الحق کے تمام جواب انتہائی مصالحت اور امن پسندی پر مبنی تھے۔ جن میں کہیں سے بھی اختلاف کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا۔

احسان الحق سمیت اس پنچایتی محفل کے شرکاء بات سے اتفاق کرتے ہوئے چپ چاپ بڑی عزت کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ مگر احسان الحق کے تمام خدشات اس واقعے کو لے کر بے بنیاد نہیں تھے۔ ان کا عقیدت مند اور وفادار ملازم اگلے ہی روز اس پنچایت کا رد عمل ان کے گوش گزار کر چکا تھا جسے گاؤں کی ہر اچھی بری خبر کا علم ہوتا تھا۔ سکندر لاشاری نے اپنے اوباش احباب کے سامنے قسم کھائی تھی کہ۔

"وہ ایک بار جس کو پسند کر لے وہ ہر صورت اس کی ہو کر رہتی ہے۔ اور نوربانو کو پسند کرنے کے بعد ہی اس نے رشتے کا پیغام بھجوایا تھا۔" وہی ہوا جس کا احسان الحق کو ڈر تھا۔ انہوں نے نوربانو کا حویلی سے باہر نکلنا

اپنے کام کرو۔ اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" احسان الحق بند کروایا۔ "مہر فاؤنڈیشن" کا تمام دفتری اندراج کا کام جو

جو نور بانو کیا کرتی تھی۔ وہ فضل دین کے بیٹے مراد چانڈیو
کے سپرد کر دیا۔ وہ جس سنجیدگی سے یہ تمام احکام جاری
کر رہے تھے نور بانو یا کسی اور کی ہمت نہیں ہو رہی تھی
کہ ان سے ان سب کی وجہ دریافت کر سکیں۔

اماں جان اور مہربانو کو انہوں نے نور بانو کی شادی کی
تیاریوں کا کہہ کر اعلان کر دیا تھا کہ اس بار شاہ زیب
ویک اینڈ پر آئے گا تو وہ نور بانو کا سادگی سے نکاح کر دیں
گے، وہ نور بانو کا نکاح کس کے ساتھ کرنا چاہتے تھے اس
بات سے نور بانو بے خبر تھی۔ نور بانو نے نہایت
سعادت مندی کے ساتھ انہیں اپنے ہر فیصلے کا اختیار
سونپ دیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس کے بابا اس
کے لیے جو بھی کریں گے وہ اس کے اچھے کے لیے ہی
کریں گے۔

اس شام جب شاہ زیب، احسان الحق کے آرڈر
کیے ہوئے تمام سازو سامان کے ساتھ حویلی پہنچا تو
حویلی کے تمام ملازمین کو کسی نہ کسی کام میں مصروف
پایا۔ احسان انکل حویلی میں موجود نہیں تھے۔ دادی
جان سے شام میں ہونے والی تقریب کی تمام تر تفصیلات
سن کر وہ نور بانو کے کمرے کی طرف چلا آیا۔ کمرے
کے مدھم اندھیرے میں وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی
تھی۔ وہ خوش تھی یا غمگین، یہ وہ خود بھی نہیں جانتی
تھی۔

"شاہ زیب! آپ کے بغیر مجھے چلنا آتا ہے نہ
جینا۔" وہ اسی کے لہجے میں اس کے الفاظ دہراتا کمرے
میں داخل ہوا۔ اس کی آواز پر وہ یوں چونکی جیسے جاگتی
آنکھوں سے کسی جن بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ "اور
زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کرنے سے پہلے شاہ زیب کو بتانا
بھی گوارا نہیں کیا۔ وجہ بتانا پسند کریں گی میڈم نور
بانو؟" اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

"یہ میرا نہیں بابا کا فیصلہ ہے اور باپ کے ہر فیصلے پر
آنکھ بند کر کے عمل کرنا ایک بیٹی کا فرض ہوتا ہے۔"
نور بانو نے سنبھل کر جواب دیا۔

"تمہارے فرض کی ادائی میں چاہے کسی کا دل ہی
کیوں نہ کچلا جائے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔"
وہ اس بات پر حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اسی بات کا تو افسوس ہے کہ اس دل نے جسے چاہا
وہ ہی اس دل کا قاتل نکلا۔" وہ آزردگی کے ساتھ بولا۔

"مگر آپ نے پہلے کبھی ایسی کسی خواہش کا اظہار
نہیں کیا۔ پھر اب اس وقت، جب سب کچھ ہاتھ سے
نکل چکا ہے۔۔۔ آپ کیوں نور بانو کو مشکل میں ڈال
رہے ہیں۔" نور بانو کی آواز کانپ رہی تھی۔

"تمہاری اسی ناسمجھی کا تو ماتم کرنے پر مجبور ہوں کہ
میرے کسی اشارے کو تم سمجھ ہی نہ سکیں اب عمر بھر
اس لاحاصل غم کا روگ لگا کر جینا ہے۔" اس کا لہجہ
پہلے سے زیادہ دکھی تھا۔

"ایسا نہ کہیں شاہ زیب! یہ حقیقت ہے کہ آپ کی
طرف سے ملنے والے کسی اشارے نے مجھے کوئی ہنٹ
نہیں دی۔ اسے میری ناسمجھی کہیں یا سادگی کہ خود
اپنے دل سے اٹھنے والی دبی دبی سی آپ کو پانے کی آرزو
کو میں نے اپنے ہاتھوں سے دبا دبا کر حسرتوں کا قبرستان
بنا دیا۔ میں نے خود کو کبھی اس قابل سمجھا ہی نہیں کہ
اس چاند کو چھونے کی آرزو کروں جسے صرف دیکھنے کی
اوقات تھی میری پانے کی نہیں۔" نور بانو بیڈ سے اتر
کر اس کے مقابل کھڑی اسی محبت کا رونا رو رہی تھی جو
جنم لینے سے پہلے ہی اپنے۔۔۔ مقام پر دم توڑ چکی تھی۔

"آپ مرد تھے شاہ زیب! آپ کے پاس اختیار بھی تھا
اور طاقت بھی، جب آپ کچھ نہ کر سکے تو مجھ جیسی
کمزور لڑکی سے کیسی شکایت۔۔۔ اب آپ کو کوئی حق
نہیں پہنچتا کہ کہ ایک بیٹی کو اس کا فرض پورا کرنے سے
روکیں۔ آپ جائیں یہاں سے، جو کچھ ہو رہا ہے
اسے ہونے دیں۔ نور بانو اپنے دل کی خواہش کی تکمیل
کے لیے اپنے بابا کا سر جھکانے کا تصور بھی نہیں
کر سکتی۔" وہ شاہ زیب کے سامنے سر جھکائے کھڑی
تھی۔ اس کے سامنے بندھے ہوئے ہاتھوں کی
کپکپاہٹ سراپا التجا تھی۔

"تم جہاں بھی جس کے ساتھ بھی رہو، خوش رہو۔

بس اتنی سی دعا ہے میری۔" وہ اس کے بندھے ہوئے ہاتھ تھام کر بولا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ نور بانو بھی کتنی ہی دیر اپنی بے بسی اور مجبور محبت پر آنسو بہاتی رہی۔

بابا حویلی لوٹے تو شاہ زیب کے بابا شاہ میر اور ماما ان کے ساتھ تھے۔ انہیں وہ ایرپورٹ پر ریسیو کرنے کے لیے صبح سے گئے تھے نور بانو کے نکاح میں ان کی شرکت بے حد ضروری تھی۔ ان کا یوں اچانک آنا نور بانو اور شاہ زیب کے لیے ایک زبردست سرپرائز تھا' مگر اب ان کے لیے ہر سرپرائز بے معنی اور بے مقصد تھا۔ مہربانو' دادی جان' بابا اور شازیب کے ماما بابا سب کے لبوں پر ایک معنی خیز تبسم تھا۔ نور بانو اپنے کمرے میں بند تھی اور شاہ زیب کسی کٹھ پتلی کی طرح محبوب کی شادی کی تیاریوں میں مگن تھا۔ دادی جان کے لیے اس کی آنکھوں میں شکایتوں کا ایک جہاں سمٹ آیا تھا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے انہوں نے احسان انکل کو یہ سب کیوں کرنے دیا۔

دادی جان ہر بار اس سے نظریں ملتے ہی نگاہیں جھکانے پر مجبور تھیں۔ وہ نور بانو کے نکاح کی تقریب میں شرکت کرنے والے مہمانوں کے استقبال کی تیاریاں ذمہ داری سے انجام دے رہا تھا۔ احسان انکل نے اس کو اپنا ہمدم و ہم راز جان کر اس تقریب پر منڈلاتے خطرے سے آگاہ کرکے اس کے محکمے کی مدد حاصل کرنے کی تجویز پیش کی تو اس نے نور بانو کے بابا کو یہ کہہ کر دلاسا بھی دیا کہ اس کی خوشیوں کو میلی آنکھ سے دیکھنے والے ہر خطرے سے نمٹنے کے لیے وہ اکیلا ہی کافی ہے۔ احسان انکل نے بتایا تھا کہ نکاح کے لیے آنے والے مہمانوں میں لڑکے کے ساتھ دو گواہوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا' مگر اس مختصر بارات کا استقبال کرنے کی ہمت بھی اس کے اندر نہیں تھی۔ وہ اپنے کمرے میں کھڑا کھڑکی سے باہر کا منظر بے دلی کے ساتھ دیکھ رہا تھا جب دروازے کے باہر دستک کی آواز سن کر وہ چونک سا گیا۔ اس نے لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ کر چٹخنی گرائی تو سامنے شور مچاتی ماما کو کھڑے پایا۔

"شاہ زیب! یہ کیا؟ تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ مہمان تو آنا بھی شروع ہو گئے ہیں۔" ماما کے ہاتھ میں ہینگر پر لٹکا ایک خوب صورت اور قیمتی لباس تھا۔ "یہ لو اپنے کپڑے اور پانچ منٹ کے اندر اندر تیار ہو کر نیچے آجاؤ' سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" انہوں نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہینگر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"مگر ماما..... میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ تیار ہونا کپڑے بدلنا کوئی ضروری نہیں ہے....."

"مجھے کچھ نہیں سننا' حویلی کی پہلی خوشی میں میں اپنے بیٹے کو سب سے زیادہ حسین اور منفرد دیکھنا چاہتی ہوں۔ بس تم کچھ بھی سوچنے اور کہنے میں وقت برباد مت کرو۔ جلدی سے تیار ہو کر نیچے آجاؤ۔" ماما اس کی اگلی بات سنے بغیر واپس لوٹ گئیں۔

"جہاں اور سب حکم پورے کیے ہیں وہاں یہ بھی سہی۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا تیار ہونے لگا۔ وہ شاہی کھسے پہنے کڑھائی والے قیمتی شلوار سوٹ میں نپے تلے قدم اٹھاتا حویلی کے لان میں داخل ہوا' جہاں مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام اور دولہا' دلہن کے لیے اسٹیج سجایا گیا تھا۔ برقی قمقموں کی جگمگاہٹ رات کے اندھیرے میں بھی دن کے اجالے کا سماں پیدا کر رہی تھی۔ سامنے اسٹیج پر بھاری بھر کم سرخ جوڑے اور قیمتی زیورات سے لدی پھندی نور بانو' سر جھکائے جنت سے اتری کسی حور کی مانند چار سو نور پھیلاتی اپنے دولہا کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

"بارات آگئی۔ دولہا آگیا۔" ایک آواز بلند ہوئی اور وہاں موجود مختصر مہمانوں کی نظریں اس پر اور اس کی نظریں اپنے عقب سے کسی کی متوقع آمد کو دیکھنے کے لیے مڑیں' مگر وہاں تو کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اس نے ناگواری کے ساتھ اعلان کرنے والے کی طرف دیکھنا چاہا' مگر ایک دم اچانک اس کے بابا اور ماما' دادی جان اور مہو پھپھو سمیت اس کے دائیں بائیں جمع ہو گئے۔

"پیچھے کسے تلاش کر رہے ہو نوشے میاں! تم ہی آج کی بارات کے دولہا ہو اور ہم باراتی ہیں۔" دادی جان کی بوڑھی کانپتی آواز مارے خوشی کے کھنک رہی تھی۔

"اور ہم اس رات کے استقبال کے لیے کھڑے ہیں۔" احسان انکل اور گاؤں کے چند معتبر لوگ آگے بڑھ کر انہیں پھولوں کے ہار پہنانے لگے۔ شاہ زیب کو اس تمام صورت حال کو سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اسٹیج اور مولانا صاحب سمیت دلہن تیار تھی۔ اس کے ہر سوال کے جواب میں بابا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ حویلی کے بیرونی دروازے سے ایک تیز رفتار جیپ سب کچھ روندتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ ٹھیک نکاح ہو جانے کے بعد بالکل کسی فلمی سین کی طرح گن اٹھائے ہوئے چند لوگ سکندر لاشاری کے ہمراہ اسٹیج پر چڑھ آئے۔ سب بوکھلا اٹھے۔

"یہ ہی وجہ تھی دولہا کا نام سیکرٹ رکھنے کی۔ اگر میں دولہا کا نام پہلے ہی ڈکلیئر کر دیتا تو یہ طاقت اور عقل کے اندھے کل سے گاؤں کے داخلی راستے پر گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اس تقریب کے دولہا کی موت پر مہر لگانے کے لیے۔" احسان الحق نے شاہ زیب سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جو ہونا تھا وہ تو اللہ کے حکم سے عافیت کے ساتھ ہو گیا۔ اب کھسیانی بلی کھمبا نوچے یا دولہا میاں اپنی دلہن کو اس کے غضب سے بچائیں ہمارا کام تو ختم ہوا۔" احسان الحق نور بانو کا نرم و نازک ہاتھ شاہ زیب کے ہاتھ میں دے کر اسٹیج سے نیچے اتر آئے۔

"نور بانو میری پسند ہے اس پر صرف اور صرف میرا حق ہے۔ کوئی سکندر سے اس کا حق چھین لے یہ ہو نہیں سکتا۔ پہلی بار کسی نے سکندر کو دھوکہ دینے کی جرات کی ہے۔ آج اس دھوکہ بازی کا انجام یہ سارا گاؤں اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔" اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے مارے غصے کے۔

"کیوں جناب! آپ کے ساتھ کوئی عہد و پیماں کیے تھے میری دلہن نے یا میرے سسر نے تمہیں اس کا ہم سفر بنانے کے لیے زبان دی تھی۔" شاہ زیب کے لبوں پر ابھی بھی مسکراہٹ برقرار تھی۔

"سکندر نے جس چیز کو پسند کر لیا وہ اس کی ہو گئی یہی ہوتا آیا ہے آج تک تم درمیان سے ہٹ جاؤ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔" وہ اپنی دانست میں بڑی شریفانہ آفر دے رہا تھا۔

"اچھا! یہ بات ہے؟ بڑا دم ہے جاگیردار صاحب! آپ کے اندر میں تو ڈر گیا۔" شاہ زیب نے ڈرنے کی اداکاری کی۔

نور بانو کسی دلچسپ تماشے کی طرح یہ سارا منظر بڑے اطمینان کے ساتھ مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ڈر اور خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس شخص پر بھروسے اور یقین کی چمک تھی جس کے ہاتھ میں اس کی زندگی کی باگ ڈور تھمائی گئی تھی۔ وہ کوئی معمولی محافظ نہیں تھا اور اگلے ہی لمحے سکندری لاشاری کی گن شاہ زیب کے ہاتھ میں تھی۔

"بات کچھ یوں ہے جناب سکندر صاحب!" وہ گن کے اشارے سے اس کے زر خرید غلاموں کو ہتھیار پھینکنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس کے گرد چکر لگاتا ہوا بولا۔ اپنے خالی ہاتھ اوپر کیے وہ خود اپنے آدمیوں کو گن پھینکنے کا حکم دینے لگا۔ سب نے بلا چوں و چرا اپنے اپنے ہتھیار شاہ زیب کے قدموں میں ڈال دیے۔

"دیکھو شاہ زیب! تم اچھا نہیں کر رہے۔۔۔ اس علاقے کی پولیس کو میں ایک اشارہ کروں گا تو تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے نظر آؤ گے۔ پانی بھرتی ہے پولیس ہمارے سامنے۔" اس نے ایک بار پھر اپنے اثر و رسوخ سے اسے مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

"چلو یہ شوق بھی پورا کر لو۔ یہاں تمہارے جتنے بھی باپ ہیں ان سب کو بلاؤ ان سب کے لیے تمہارا یہ

ایک باپ ہی کافی ہے۔ یہ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔" شاہ زیب طیش میں آئے بغیر بڑے اطمینان سے بولا۔ اس کی جیب سے فون نکال کر علاقے کے ایس ایچ او کا نمبر ملا کر اس کے کان سے لگا دیا۔

"فوراً" یہاں شاہ میر کی حویلی میں پہنچو..... تمہاری ضرورت ہے۔" اس نے ایس ایچ او کو آرڈر دیا۔ آگے اس نے کیا جواب دیا یہ تو سکندر لاشاری کے چہرے کی اڑتی رنگت دیکھ کر سب ہی اندازہ لگا چکے تھے۔

"کیوں ٹائم برباد کر رہے ہیں جاگیردار صاحب! اپنا راستہ ناپیں اور اس بے چارے دولہا کو اپنی دلہن کو جی بھر کر دیکھنے کا موقع دیں۔ آپ کی غنڈہ گردی کے خوف کی وجہ سے ویسے ہی میرے سسر جی نے پچھلے ایک ہفتے سے میری سانسیں روک رکھی ہیں۔"

سکندر لاشاری اپنا سامنہ لے کر یہ کہتے ہوئے اسٹیج سے نیچے اتر گیا۔

"ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔"

"بعد میں دیکھ لینا بھائی، مگر ابھی تو جاؤ یہاں سے۔" شاہ زیب بے قراری سے اس کے جانے کا انتظار کرتے ہوئے بولا۔

شاہ زیب کے کمرے میں پہنچنے سے پہلے نور بانو بھی اپنے رب کی بارگاہ میں سجدہ ریز تھی۔ عروسی لباس میں ملبوس پھولوں کی سیج کی بجائے جائے نماز پر اپنے پروردگار کے سامنے اس گھڑی کے ملنے پر شکرانہ ادا کرنے اور ملن کی اس انوکھی شب آرزو کی سلامتی کے لیے اپنے رب کے سامنے شکر ادا کر رہی تھی کہ اس نے جسے چاہا قدرت نے کسی بیش قیمت انعام کی طرح اسے اس کی زندگی کا ساتھی بنا دیا۔

"آپ نے مجھے ایک ہفتے کی مہلت دی تھی ایک سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے، پوچھیں گے نہیں، مہلت تو ختم ہو گئی۔" نور بانو نے اس کو بے خودی اور سرشاری عالم میں خود کو تکتے پا کر کمرے کی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"قدرت نے ہماری زندگی کی ہر الجھن بغیر کسی مشکل اور پریشانی کے خود ہی سلجھا دی نور بانو! تمہیں نہیں لگتا کہ یہ اس کا ہم پر خاص کرم ہے۔" اس نے ہوش کی دنیا میں لوٹتے۔ اس کے سوال کا جواب دیا۔

"بے شک..... نور بانو مشکل سے مشکل حالات میں بھی کبھی اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوئی۔

یقین تھا مجھے کہ جتنا برا میرے ساتھ ہو چکا ہے۔ آپ سے ملنے کے بعد اب کچھ برا نہیں ہوگا۔" نور بانو شرم و حیا کے بوجھ سے جھکی نگاہوں کے ساتھ دھیرے دھیرے الفاظ ادا کرتی اس سے مخاطب تھی۔

"واقعی؟ نور بانو اتنا بھروسہ تھا تمہیں اس راہوں میں ٹکرانے والے راہ گیر پر..... کبھی ظاہر تو نہیں ہونے دیا تم۔" وہ زیر لب تبسم لیے آنکھوں میں محبتوں کا ایک جہاں سمیٹے بے باک نظروں سے اس کے جھکے ہوئے چہرے پر نظریں گاڑ کے بولا۔

"بھروسہ؟ بھروسے کی بات کرتے ہیں تو نور بانو کو آپ پر خود سے بھی زیادہ بھروسہ تھا اور پروردگار کی اس عنایت پر یقین بھی کہ اس نے بلاوجہ آپ کو میرے تاریک راستوں میں یوں ہی نہیں لا کر کھڑا کیا۔"

"تمہیں شاید معلوم نہیں میرے لیے وہی شب آرزو تھی جس روز تم چلتی ہوئی ٹرین میں میرے سامنے آئی تھیں۔ اور تم دیکھو قدرت نے ہمارے ملنے کے لیے کیسے انوکھے لمحات میں حیرت انگیز اسباب پیدا کیے اور آج تم میری ہو صرف میری۔"

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- انمول

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ---------- موسیٰ رضا

عشنا کوثر سردار

ادھوری باتیں کرنا جانتی تھی بس۔ ایک بات ختم بھی نہیں ہوتی تھی کہ دوسری شروع بات ہو جاتی تھی۔ جیسے اسے عجلت پسندی سے کام لینا پسند تھا' مگر میں اکثر اس کی بے ربط باتوں کے معنی تلاش کرتا رہتا تھا۔ اس کی آدھی بات کے معنی کچھ اور ہوتے اور باقی کی آدھی بات کوئی اور معنی بیان کر رہی ہوتی تھی۔ اس کی باتوں میں کتنے رنگ تھے اور کتنے معنی' یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہتا تھا۔ مگر با معنی ادھوری باتیں اکثر میرے ذہن میں کہیں بھٹکتی رہتی تھیں۔

ناولٹ

"رامین شاہ! تم عجیب ہو۔" میں اسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہتا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا کرتی تھی۔

"ہاں عجیب ہوں' تب ہی تو تمہاری دوست ہوں۔ اگر عجیب نہیں ہوتی تو تمہارے جیسے عجیب بندے کی دوست کیسے ہوتی؟" وہ شرارت سے مجھے دیکھتی تھی اور میں مسکرا دیتا تھا۔

"تم احمق ہو رامین شاہ... ایسی ہی رہنا۔" میری چاہ تھی وہ اپنی انفرادیت کے ساتھ باقی رہے۔

وہ بھولی بھالی تھی۔ اس کی باتوں میں بے فکری تھی۔ تسلسل کو عادت نہیں بناتی تھی۔ جب بولتی تھی تو دل سے بولتی تھی۔ اس کا دل اس کے چہرے پر تھا اور اس کا چہرہ چمکتا ہوا آئینہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی طرح... وہ جب بولتی تھی اس کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں اور جب اداس ہوتی تھی اس کی آنکھیں یک دم بجھنے لگتی تھیں۔ میں جیسے اس کا چہرہ پڑھنے کا عادی ہو رہا تھا' مگر اس کی باتوں کے معنی بدلتے جا رہے تھے۔

"محبت ایسی کیوں ہوتی ہے اجلال؟" اس نے مجھ سے پوچھا تھا اور میں چونک گیا تھا۔

"محبت... تمہیں محبت کے بارے میں کیسے پتا؟ کیسی ہوتی ہے محبت؟" میں نے حیرت سے کہتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور وہ مجھ سے نگاہ پھیر گئی تھی۔

"محبت وقوع پذیر ہونے والی تبدیلی نہیں ہے' نہ کوئی حالات حاضرہ جس کے بارے میں کوئی اور آپ کو آگاہ کرے۔"

وہ مدھم لہجے میں بولی تھی اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ اس کی باتوں کے رنگ بدلنے لگے تھے۔ معنی بھی بدل گئے تھے۔ وہ مختلف موضوعات پر بات کرنے کی عادی رہی تھی۔ محبت اس میں شامل نہیں تھا۔ تب ہی شاید میں چونکا تھا۔ مگر وہ میری طرف سے دھیان پھیر کر مدھم لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”محبت بے توجہی برتے تو اچھا نہیں لگتا اجلال ملک! محبت جب نظر انداز کرتی ہے تو بے چینی بڑھا دیتی ہے اور ذہن میں سوال بھی....“

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی تھی اور میں ساکت سا اسے دیکھنے لگا تھا۔

”تمہیں محبت کا ادراک کیسے ہوا رامین شاہ؟ کس نے ذکر کیا؟“

میں اس چھوٹی سی لڑکی کو جانچتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

میں تقریباً دس برس بڑا تھا اس سے۔ وہ اٹھارہ برس کی لاابالی لڑکی تھی اور میں اٹھائیس برس کی میچور عمر میں تھا۔ میں اپنی اسٹڈی مکمل کر کے ایک ادارے سے وابستہ ہو گیا تھا، مگر جاب پسند نہیں آئی تھی تو خیرباد کہہ کے اپنا بزنس شروع کر دیا تھا، مگر وہ کمپنی بھی بیچ ڈالی تھی۔ میری طبیعت پارا صفت تھی۔ میں کمپنی سولڈ آؤٹ کر کے آنٹی کے پاس آ گیا تھا۔ فرانس میں، میں بہت کم لوگوں کو جانتا تھا۔ کچھ دوست تھے، مگر ان کی مصروفیت کے باعث ان سے ملنا بہت کم ہوتا تھا۔ سو اکثر جب میں فارغ ہوتا، رامین شاہ سے باتیں کرنا میری ہابی بن گیا تھا۔ اس نے ہائی اسکول ختم کر کے یونی ورسٹی جوائن کی تھی۔ وہ ایک دلچسپ لڑکی تھی۔ میں اس کے ساتھ باتیں کرنے بیٹھتا تھا تو وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کے شوق لڑکوں والے تھے۔ وہ گیمز میں دلچسپی رکھتی تھی۔ کسی بھی موضوع پر اس سے بات کرنا آسان تھا۔ اس کے پاس معلومات تھیں، کتابوں سے لے کر میوزک تک اور حالات حاضرہ سے لے کر تاریخ تک.... وہ بہت اعتماد سے بات کرتی تھی۔ مجھے گھمانے باہر لے جاتی تھی۔ جب میں نیا نیا آیا تھا تب میں جگہوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ تب وہی مجھے ہر جگہ لے کر جاتی تھی۔ ہم اچھے دوست بن گئے تھے۔ مگر مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ اس کو کسی سے محبت ہو گئی ہے۔ وہ ہر چھوٹی چھوٹی بات مجھ سے شیئر کرتی تھی۔ فیلوز کی، یونی ورسٹی کی، ٹیچرز کی، مگر ان باتوں میں محبت کا ذکر ناپید تھا۔ پھر اسے محبت کب ہوئی تھی؟ اور کس سے؟ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا اور جانے کب اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں، میں ساکت رہ گیا تھا۔

کسی نے اسے اس درجہ ہرٹ کیا تھا؟ وہ اس قدر انوالوڈ تھی کسی کے ساتھ؟ اس کی دلی وابستگی اتنی زیادہ تھی کہ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں؟ کسی نے ایسا کیا کہہ دیا تھا اسے؟ میں نے اسے فوری طور پر کچھ نہیں کہا تھا۔ اسے آنسو بہانے دیے تھے۔ وہ میرے شانے پر سر رکھ کر کئی لمحوں تک آنسو بہاتی رہی تھی اور پھر آہستگی سے علیحدہ ہو کر چہرے کا رخ پھیرتے ہوئے آنکھیں رگڑنے لگی تھی۔ میں اسے بغور دیکھنے لگا تھا۔

”یہ کیا ہے رامین شاہ؟ واٹ ہیپنڈ؟ تمہیں کس نے ہرٹ کیا؟ یو نیور ٹولڈ می دیٹ یو لو سم ون۔ کون ہے وہ؟“ میں نے مدھم لہجے میں کہتے ہوئے اسے جتایا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ آئی ایم ناٹ ان لو۔“

اس نے تردید کرتے ہوئے کہا تھا اور پھر اٹھ کر یک دم ہی باہر نکل گئی تھی۔

اور میں الجھنے لگا تھا۔ مجھے اس چھوٹی لڑکی سے ہمدردی تھی۔ اس کے دل دکھنے کا احساس مجھے برا لگ رہا تھا۔ وہ ایک تکلیف دہ احساس سے گزر رہی تھی شاید۔ مگر میں یا کوئی اور اس کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس لمحے خود اپنی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے افسوس تھا، مگر اس وقت کو اسی طور گزرنا جیسے۔ میں نے اس سے مزید کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کے بعد ہم نے بات کی تھی، مگر موضوع وہ نہیں تھا اور میں نے اسے کریدا نہیں تھا۔

میں محبت پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ میری کچھ اچھی

دوست رہی تھیں، مگر محبت والی کوئی بات نہیں تھی۔

بقول اماں کے میں پارہ صفت تھا۔ ایک جگہ ٹک نہیں سکتا تھا۔ پھر محبت کیسے ممکن تھی۔ محبت کے ممکن ہونے کے لیے انسان کا مستقل مزاج ہونا ضروری ہے۔ یہ میری رائے تھی اور میں اتنا مستقل مزاج واقع نہیں ہوا تھا۔

میں وقت کو اپنے اشاروں پر موڑنا چاہتا تھا۔ مجھے اچھا لگتا تھا وقت کو حکم دے کر اپنے اصولوں پر چلانا۔ میں جب جو چاہتا تھا وہ کرتا تھا۔ میں لگی بندھی زندگی جینے والا بندہ نہیں تھا۔ پاکستان سے فرانس آنا اور پیرس میں نئی زندگی کو نئے زاویوں سے شروع کرنا میرے مقاصد میں سے تھا۔ میں بزنس ایمپائر کھڑی کرنا چاہتا تھا۔ میں ارادوں کا مضبوط تھا' سو ایسا کرنا میرے لیے ناممکن نہیں تھا۔ میں مختلف پروجیکٹس کی فائلز بنا کر انہیں آزمانے کا پلان بنا رہا تھا۔ مجھے محبت اور محبت کا ذکر ایک فضول بات لگی تھی۔

مگر مجھے رامین شاہ کا افسردہ ہونا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں اسے افسردہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ سو شام میں اسے باہر لے گیا تھا۔ ہم نے ڈنر باہر کیا تھا۔ میں اس بارے یا اس دن کے حوالے سے کوئی ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ رامین نے کوئی بات کی تھی۔ مگر تب ہی وہ کسی بات پر مسکراتی ہوئی لب بھینچ گئی تھی۔ میں نے اس کو حیرت سے دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟ تمہاری مسکراہٹ کہاں غائب ہو گئی؟" میں نے حیرانی سے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

"نہیں کچھ نہیں۔"

"تم کچھ چھپا رہی ہو رامین۔" میں نے اسے کریدا' مگر اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ میں بغور اسے دیکھنے لگا تھا۔

"تم میری اچھی دوست ہو نا رامین شاہ؟" میں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا اور اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"پھر؟" میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"کچھ نہیں ہے اجلال ملک۔ تم میرے اچھے دوست ہو' اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ مگر اس وقت میرے پاس شیئر کرنے کو کچھ نہیں ہے۔"

میں جانتا تھا وہ مجھ سے جھوٹ بول رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت بہت کچھ تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ مجھے بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اور میں اس سے زبردستی اگلوا نہیں سکتا تھا۔ دوستی زبردستی نہیں ہوتی اور میں اپنی اس چھوٹی سی دوست پر زبردستی نہیں کر سکتا تھا۔

اس شام ہم مختلف باتیں کرتے رہے تھے اور میں اس کی آنکھوں کی ویرانیوں میں الجھتا گیا تھا۔ اس کی اداس آنکھوں میں جو کیفیت تھی وہ سمجھ میں نہ آنے والی تھی۔ آخر اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ اور اسے کس نے اس درجہ تکلیف دی تھی؟

وہ محبت کی بات کر رہی تھی اور محبت کرنے والے اس درجہ تکلیف نہیں دیتے۔ کہیں وہ یک طرفہ محبت کا شکار تو نہیں تھی؟ مجھے خیال آیا تھا' مگر میں اس سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا۔ وہ دلبرداشتہ ہوئی تھی۔ سو میں نے اس چھوٹی لڑکی کا خیال کرتے جو بھی سوچیں ذہن میں تھیں۔ انہیں ایک طرف رکھ دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

میں نے کئی جگہوں میں پیسے لگائے تھے۔ ساتھ ہی اپنی کمپنی بھی رجسٹرڈ کر ڈالی تھی اور کام کا آغاز کر دیا تھا۔ ان تمام امور نے مجھے اس قدر مصروف رکھا تھا کہ میں رامین شاہ سے بہت دنوں تک تفصیلاً" کوئی بات نہیں کر سکا تھا۔ کئی بار سرسری بات چیت ہوئی تھی۔ مگر اس میں معمول کی باتوں کے علاوہ کوئی بات زیر بحث نہیں آئی تھی۔ مجھے اس چہرے کو جاننے یا آنکھوں کو پڑھنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ اس کے بعد بھی میں بزنس کے جھمیلوں میں الجھا رہا تھا۔ مختلف شہروں میں یہاں وہاں سفر کرتا رہا تھا۔ مجھے وقت نہیں ملا تھا اس چھوٹی

سی لڑکی کی بے ربط باتوں کو سمجھنے اور معنی ڈھونڈنے لگا۔
اس وقت جب وہ مجھ سے ملی تو شکوہ کرنے لگی تھی۔

"تم تو اتنے بزی ہو' چہرہ دکھانے سے بھی گئے۔ خود کو کتنا مصروف کرلیا ہے تم نے۔" اور میں مسکرا دیا تھا۔

"آئی ایم سوری لٹل گرل' میں اتنا وقت نہیں دے پایا۔ مصروفیت زیادہ رہی۔"

"کیا لٹل گرل؟ آئی ایم گوئنگ ٹو نائنٹین اینڈ یو آر کالنگ می لٹل گرل؟" (میں انیس سال کی ہو رہی ہوں اور تم مجھے چھوٹی لڑکی کہہ رہے ہو۔)

اسے میرے طرز تخاطب پر اعتراض ہوا تھا۔ میں مسکرا دیا تھا۔ جس عمر میں وہ تھی وہاں بچوں کی عادت ہوتی ہے خود کو بڑا سمجھنے کی۔ میں واقف تھا' کیونکہ جس دور سے وہ گزر رہی تھی اس سے میں نو دس برس قبل گزر چکا تھا۔ تب ہی میں پرسکون انداز میں سر ہلاتے ہوئے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"آئی نو! تم بڑی ہو گئی ہو' مگر مجھے تمہیں چھوٹی لڑکی پکارنا اچھا لگتا ہے۔"

"کیوں؟" اس نے اپنی آنکھوں کو مجھ پر مرکوز کرتے ہوئے پوچھا تھا اور اس کی آنکھوں میں تیرتی الجھنوں میں ڈوبے سورج کے عکس کو میں حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔

"کیونکہ تم ڈول (گڑیا) جیسی لگتی ہو۔" میں نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی تھی۔

"میں ڈول نہیں ہوں' میں رامین شاہ ہوں۔" وہ جتانے لگی تھی۔

"وہ تو تم ہو' مگر رامین شاہ گڑیا جیسی لگتی ہے نا۔" میں مسکرایا تھا۔

"نہیں رامین شاہ گڑیا نہیں ہے۔ گڑیا ٹوٹ بھی جاتی ہے اور رامین شاہ اتنی کمزور نہیں ہے۔" وہ جیسے احتجاج کرتی دکھائی دی تھی۔ اسے اس طرح احتجاج کرنے کی ضرورت کیوں پڑی تھی؟ کیا ہوا تھا کہ وہ اپنے اندر کی کمزوری کو چھپا کر خود کو مضبوط کرنا چاہتی تھی؟

میں اس کے ان رویوں سے الجھنے لگا تھا۔

"کیا ہوا رامین شاہ؟ مجھے بتاؤ!" میں نے کہتے ہوئے اسے شانوں سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف پھیرا تھا۔ مگر اس نے میری طرف نہیں دیکھا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا۔" وہ میری طرف دیکھنے سے کترا رہی تھی۔ اور میں جاننے کے لیے مزید متجسس ہو رہا تھا۔

"کوئی بات تو ضرور ہے رامین شاہ۔ تم مجھے دوست کہتی ہو نا؟ پھر اپنے دوست کو بتا نہیں سکتیں؟" میں نے جیسے اسے اعتماد میں لینا چاہا تھا اور وہ خاموشی سے رخ پھیر گئی تھی۔

"میرے پاس تمہیں بتانے کو کچھ نہیں ہے اجلال ملک! کوئی خاص بات نہیں ہے۔" وہ مجھے ٹال رہی تھی۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ اپنی طرف پھیرا تھا اور مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"آئی نو مجھے تمہارے پرسنل ایشوز کو ڈسکس کرنا زیب نہیں دیتا' میں ایسا کوئی حق نہیں رکھتا' مگر ایک دوست ہونے کے ناتے میں تمہیں ان الجھنوں سے نکالنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا تھا اور وہ خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"تمہیں محبت ہے کسی سے؟" میں نے ایک دم سوال کیا۔ اور وہ چونکتے ہوئے مجھے دیکھنے لگی تھی۔

"میں جانتا ہوں تم ایک سمجھ دار لڑکی ہو رامین شاہ۔ تم اپنے معاملات سلجھا سکتی ہو' لیکن جو الجھنیں تمہارے اندر ہیں وہ تمہیں اسی طرح پریشان کرتی رہیں گی اگر تم کسی اور سے شیئر نہیں کرو گی۔"

میرے کہنے پر وہ چہرہ پھیر گئی' پھر مدھم لہجے میں بولی تھی۔

"تمہیں ہمیشہ لگتا تھا نا کہ میں ادھوری باتیں کرتی ہوں؟ میری ادھوری باتوں کے معنی بھی ادھورے تھے نا؟ اور اب محبت نے مجھے ادھورا کر دیا ہے۔"

"محبت مگر کس سے؟" میں پوچھنا چاہتا تھا تب ہی وہ بول پڑی تھی۔

"میں اس محبت کے ذکر کو بانٹتے ہوئے الجھ رہی

ہوں۔ میں اس راہ میں تنہا ہوں اور جب محبت ختم ہوجائے تو اس کے ذکر کو دہراتے رہنا معنی کھو دیتا ہے۔"

"اگر وہ محبت باقی نہ ہوتی تو تم اس طرح الجھی نظر نہ آتیں۔" میں نے جتایا تھا' تب ہی وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"اجلال ملک! اسے مجھ سے محبت نہیں تھی۔ وہ محبت کی خبر نہیں رکھتا تھا۔ یا بات کوئی اور تھی! میں نہیں جانتی۔ مگر میں اس کی طرف حد درجہ کھنچتی چلی گئی تھی۔ وہ عجیب کشش رکھتا تھا اور میں اس سے منکر نہیں ہو پا رہی۔ آج اس نے مجھے سب سے زیادہ تکلیف دی ہے۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا اور میں چونکا تھا۔

"کیا کیا اس نے تمہارے ساتھ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ میری طرف دیکھے بنا بولی تھی۔

"ہم الگ خیالات کے ہیں۔ میں اس کی طرف مائل تھی اور وہ کسی اور کی طرف۔ میں اس کی طرف سے توجہ ہٹا نہیں پاتی تھی کوئی شے تھی جو مجھے اس کی طرف کھینچتی تھی۔ مگر اینول پارٹی کے لیے اس نے اپنے ہمراہ مجھے چنا تھا۔ یہ بات میرے لیے حیران کن تھی۔ مگر جب ہم پارٹی میں گئے اور وہ میرے ساتھ ڈانس کررہا تھا تب ہی اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی کہ اسے مجھ سے محبت ہے اور اس کا مجھے یہ کہنا کوئی اور معنی رکھتا تھا۔ وہ ایک طرف تاریکی میں مجھے لے گیا تھا اور تب مجھ پر کھلا' محبت ایسی نہیں ہوتی۔" وہ کہہ کر چپ ہوئی تو میری رگیں تننے لگیں۔

"رامین شاہ!" میں جانے کیوں یک دم غصے میں آیا تھا۔ "تم نے محبت کے لیے اسے وہ سب کرنے دیا۔ میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔" میں نے غصے سے تنی رگوں کے ساتھ کہا تھا۔ مگر وہ تب ہی نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی تھی۔

"میں نے اسے ایسا کچھ کرنے نہیں دیا۔"

"پھر تم خاموش کیوں تھیں' جب میں نے پوچھا تھا؟" میں چیخا تھا۔

"کیونکہ اس نے جو کیا وہ میری عزت اور وقار پر اس سے بڑا تازیانہ تھا۔"

"واٹ... واٹ ہی ڈڈ۔ ڈو یو ٹیل می...؟ میں نا جانے اتنے غصے میں کیوں آگیا تھا اور وہ خاموشی سے مجھے دیکھتے ہوئے چہرے کا رخ پھیر گئی۔ پھر مدھم لہجے میں بولی تھی۔

"اس نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں اس کی طرف مائل تھی۔" وہ میری طرف دیکھ نہیں پا رہی تھی' اس کا مدھم لہجہ میرے اطراف میں گونج رہا تھا۔

"سو اس نے مجھے پورے کیمپس میں بدنام کردیا کہ میں اس کے ساتھ زبردستی کرنا چاہتی تھی۔ میں اس کے گرد منڈلاتی رہی' وہ مائل نہیں تھا اور میں نے موقع ڈھونڈا اور اس کو اپنی محبت کی تسکین کا ذریعہ بنانا چاہا۔ مجھے افسوس ہے میں نے اس انسان سے محبت کی جسے محبت کے معنی نہیں معلوم۔ وہ محبت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے محبت کو بے توقیر کردیا اور...."

"کیا نام ہے اس کا؟" میں نے تنی ہوئی رگوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"نہیں... تم کچھ نہیں کروگے۔" وہ یک دم خوف زدہ ہو کر بولی تھی۔

"نام بتاؤ اس کا۔" میں نے غصے سے پوچھا تھا۔ وہ میری طرف ساکت نظروں سے دیکھنے لگی تھی' پھر مدھم لہجے میں بولی تھی۔

"اجلال ملک! پلیز بات کو مت بڑھاؤ۔ مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اس کے کچھ کہہ دینے سے کچھ سچ نہیں ہوجاتا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم کسی سے الجھو۔ ڈیڈ کی بہت ریسپیکٹ ہے۔ ایسا کوئی بھی ایشو سب مٹی میں ملا سکتا ہے۔" وہ میرا غصہ دیکھ کر سہم کر بولی تھی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور اسے شانوں سے تھاما تھا۔

"چھوٹی لڑکی! تمہارے اس طرح بات ختم کرنے سے بات ختم نہیں ہوجاتی۔ سوچو' اس نے کس طرح

تمہارے امیج کو تباہ کیا ہے۔ کیمپس میں تم سب کی نظروں میں کس طرح اپنا امیج کھو چکی ہو۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی' تب ہی وہ بولی تھی۔

"مجھے دو چار لوگوں کے سامنے خود کو پارسا ثابت کر کے کچھ نہیں ملے گا اجلال ملک! میں کوئی تماشا نہیں چاہتی۔ اگر تمہیں میری عزت کی ذرا بھی پروا ہے تو تم کسی سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرو گے۔"

اس نے مدھم لہجے میں درخواست کی تھی اور میں مزید کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ جس عمر میں وہ تھی اس میں محبت ایک خوب صورت تتلی لگتی تھی۔ جو خوشنما رنگوں کے ساتھ دلکش خوابوں کا تعاقب کرتی تھی۔ اس کی ذرا سی غلطی نے اس کے امیج کو نقصان پہنچایا تھا۔ اور میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا تھا' مگر وہ مجھے اس کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ بات نہیں بڑھانا چاہتی تھی' کیونکہ اسے خود سے زیادہ اپنے خاندان کی عزت کا خیال تھا' مگر اس سے اس کی اپنی ذات کتنی متاثر ہو رہی تھی اور میں اس کی مدد نہیں کر پا رہا تھا۔

"محبت کچھ نہیں ہوتی رامین شاہ۔ فضول شے ہے۔ تمہیں اس طرح کے فضول بندے کی طرف اٹریکٹ ہونے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ بہر حال تم نے اتنی بڑی غلطی نہیں کی کہ تم خود کو الزام دیتی پھرو۔ اگر تمہیں لگتا ہے کہ وہ حماقت تھی تو تمہیں زیادہ اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ اگر تم دو چار لوگوں کے سامنے خود کو پارسا ثابت کرنا نہیں چاہتیں اور سمجھتی ہو اس سے فرق نہیں پڑتا تو اعتماد سے سب کا سامنا کرو۔ تمہیں سر جھکا کر نہیں سر اٹھا کر چلنے کی ضرورت ہے۔ جس عمر میں تم ہو' اس میں حماقتیں سرزد ہوتی ہیں۔ سو ان حماقتوں کی سزا تم خود کو مت دو۔ اگر تم خود کو ارزاں کرنا نہیں چاہتیں تو ہمت اور اعتماد سے ان لوگوں کا سامنا کرو اور اس لڑکے کو غلط ثابت کر دو۔" میں نے اسے پرسکون انداز میں سمجھایا تھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ تب ہی مجھے کسی بات کا احساس ہوا تھا اور میں نے پوچھا تھا۔

"تمہیں اس سے اب محبت ہے؟" اس نے میری طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر تھک کر سر جھکا لیا اور اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ اور میں نے اس کی مدھم آواز سنی۔

"مجھے اس سے محبت نہیں ہے اجلال ملک۔ ان فیکٹ مجھے محبت کے نام سے بھی خوف آنے لگا ہے۔ مجھے دوبارہ کبھی محبت نہیں کرنی' کبھی نہیں...." اس کی بھیگی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تھی اور میں ساکت رہ گیا تھا۔ اس کا درد میرا دل کاٹنے لگا تھا۔ میں ایسا نہیں تھا' مگر میں اس کے لیے ایسا کیوں بن رہا تھا؟ میں کسی سے غرض نہیں رکھتا تھا۔ کسی کے معاملات سے واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ کسی سے تعلق ظاہر نہیں کرتا تھا' کجا کہ کسی کی دل جوئی کرنا اور اس کے دکھ کو محسوس کرنا؟ میں اس کا کاندھا بن گیا تھا۔ میں اسے سمجھنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر اسے جاننے لگا تھا۔ اس کی ان کہی باتیں کی سمجھ میں آنے لگی تھی مجھے اور اس کے بنا کہے میں جیسے اس کے احساسات کو سمجھنے لگا تھا۔ یہ محض دوست ہونے کے باعث تھا' میں اس کا خیر خواہ تھا۔ میں اس سے نو دس برس بڑا تھا اور دنیا اور وقت کا اس سے زیادہ تجربہ رکھتا تھا۔

میں اسے جیسے گرم ہوا سے بھی محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ جیسے وہ کوئی چھوٹی سی گڑیا تھی اور میں اسے ٹوٹنے بکھرنے سے بچانا چاہتا تھا۔ اس کا میرا رشتہ جیسے بے نام تھا' انجان تھا' مگر پھر بھی خاص احساسات رکھتا تھا۔ میں اسے دوستی کا نام دیتا تھا اور وہ بھی عمر کے اس تقاضے کے ساتھ مجھے اچھا دوست مانتی تھی۔

میں اس سے زیادہ اس کے لیے نہیں سوچتا تھا اور وہ بھی شاید اس سے زیادہ میرے لیے نہیں سوچتی تھی۔

☆ ☆ ☆

گزرتے وقت نے مجھے بہت مصروف کر دیا تھا اور اسے پراعتماد اور پہلے سے زیادہ سمجھ دار' کبھی کبھی جب

میرے پاس وقت ہوتا میں اس کے ساتھ کافی پیتا اور باتیں کرنے بیٹھ جاتا تھا اور مجھے اچھا لگتا تھا اس نے میری نصیحتوں سے گزرے وقت کے ساتھ کچھ سیکھا تھا' جس سے اس کا اعتماد بحال ہو چکا تھا اور مجھے اس کا سمجھ دار ہونا اچھا لگا تھا۔ وہ محض انیس برس کی تھی اس وقت' مگر اس کی سوچ نشوونما پا چکی تھی۔ وہ کل کی کمزور سی بچی نہیں رہی تھی۔ اس کا کھویا ہوا اعتماد اسے جیسے واپس مل گیا تھا اور مجھے اس کی خوشی تھی۔ وہ اپنی اس خود اعتمادی کے ساتھ کیمپس میں لوگوں کا سامنا کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ میں اسے کیمپس پک کرنے گیا تھا۔ جب میں نے دیکھا وہ اپنے دوستوں کے ساتھ نہایت اعتماد سے کھڑی تھی۔ اس کی شخصیت مضبوط لگ رہی تھی اور مجھے خوشی تھی اس نے خود کو اتنا سنبھال لیا تھا۔

''تمہارا کوئی بوائے فرینڈ نہیں؟'' میں نے اسے لڑکیوں کے گروپ کے ساتھ دیکھا تھا جب ایک دوبار اس کو لینے گیا تھا تب ہی میں نے اس کو چھیڑا تھا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

اس نے مجھے جتا دیا تھا تب ہی میں نے کہا تھا۔

''تم کچھ زیادہ مجبور ہو رہی ہو رامین شاہ۔ لڑکے بھی دوست ہو سکتے ہیں۔ میں بھی تو تمہارا دوست ہوں نا' اور میں لڑکا بھی ہوں۔'' میں نے اسے جتایا تھا کہ دوستوں کی تضحیک کرنا مناسب نہیں ہے اور وہ مسکرا دی تھی۔

''جتانے کے لیے شکریہ.... مگر تم سے بات کرتے ہوئے میں نے کبھی نہیں سوچا کہ ہم دو الگ جینڈر کے لوگ ہیں۔'' وہ آنکھوں میں شرارت لیے تھی اور میں ہنس دیا تھا۔

''میں دنیا کو مختلف اینگل سے دیکھنے لگی ہوں اجلال ملک...'' اس نے مدھم لہجے میں کہا تھا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

''تم دنیا سے کٹ کر نہیں رہ سکتیں' رامین شاہ! تمہیں بھی اسی دنیا کے ساتھ رہنا ہے اور جینا ہے۔ اس طرح تم خود کو تنہا کر لو گی۔'' میں نے ایک خطرے کے پیش نظر کہا تھا اور اس نے سر انکار میں ہلا دیا تھا۔

''نہیں.... میں خود کو اس دنیا سے کسی ڈر کے باعث نہیں کاٹ رہی۔ مگر مجھے خود کو الگ رکھنا ہے۔ کیونکہ میں دنیا جیسی نہیں ہوں۔ میں منافقت کے کھیل نہیں کھیل سکتی۔ میں جھوٹ گھڑ کر کہانیاں نہیں سنا سکتی۔ مجھے یہ سب نہیں آتا۔'' اس نے تسلیم کیا تھا اور میں نے اس کے ہاتھ پر نرمی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور پھر اس کی سمت دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا تھا۔

''رامین شاہ! تم اثر پذیری کی قائل نہیں ہو' تمہیں کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم لوگوں جیسی نہیں ہو اور تمہیں ان جیسا بننا بھی نہیں چاہیے۔ تم جیسی ہو تم ویسی رہو۔ تمہارے لیے اچھا ہے۔ تم اس طرح مکمل ہو اسی طرح خوب صورت جو تمہیں دوسروں سے نمایاں کرتی ہے۔ کیونکہ یہ خوب صورتی تمہاری ظاہری خوب صورتی نہیں ہے رامین شاہ۔ یہ تمہارے باطن کی خوب صورتی ہے اور تمہارا باطن تمہارے ظاہر کی طرح اتنا ہی شفاف رہنا چاہیے۔ خود کو اسی طور باقی رکھو۔''

میں نے اسے صلاح دی تھی اور وہ مجھے خاموشی سے دیکھنے لگی تھی۔ وہ اچھی لڑکی تھی' میں اسے اسی طور دیکھنا چاہتا تھا اور مجھے امید تھی وہ اس رنگ ڈھنگ کے ساتھ ہمیشہ رہنے والی تھی۔

''تم بہت مصروف ہو گئے ہو' یا تمہیں کسی سے محبت ہو گئی ہے؟'' بہت دن بعد اس سے سامنا ہوا تھا تو اس نے برملا کہہ دیا تھا اور میں ہنسنے لگا تھا۔

''محبت کے اثرات ایسے ہوتے ہیں؟'' میں نے پوچھا تھا اور اس نے بے فکری سے شانے اچکائے تھے۔

''شاید مجھے نہیں پتا۔'' اس نے بغور دیکھا تھا۔

''نہیں ایسا کچھ نہیں۔ مگر کام نے بزی کر دیا ہے۔ چلو تم تیار ہو جاؤ آج ہم باہر جائیں گے۔'' میں نے کہا' مگر اس نے فوراً' نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

''نہیں۔ آج میں تمہارے ساتھ باہر نہیں جا سکتی۔ میں ممی ڈیڈی کے ساتھ کسی دعوت میں

جا رہی ہوں۔ تم چاہو تو ہمارے ساتھ چلو؟" اس نے مجھے دعوت دے ڈالی تھی۔

"نہیں چھوٹی لڑکی! میں بہت تھک گیا ہوں۔ میں تھوڑا آرام کروں گا' تم جاؤ۔"

"میں نے اس کے بال بکھیرتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ نظریں اوپر کرکے جیسے اپنے بکھرے بالوں کو دیکھنے کی سعی کرنے لگی تھی' پھر قدرے خفگی سے مجھے دیکھا تھا اور میں مسکرا دیا۔

"اس روز میں نے تمہیں ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔" اس کے کہنے پر میں چونکا تھا۔

"کون؟ کب؟ کس کے ساتھ؟" مجھے حیرت ہوئی۔

"ہوٹل کی لابی میں تھے تم۔ وہ تمہارے ساتھ تھی۔" اس نے مجھے یاد دلایا تھا۔

"اوہ اچھا۔ سمایا کی بات کررہی ہو تم! وہ خوب صورت لڑکی ہے؟ میں نے غور نہیں کیا۔ وہ ایک کمپنی کی اونر ہے اور ہم انویسٹمنٹ کے سلسلے میں ملے تھے۔" میں نے وضاحت کی اور ساتھ ہی پوچھا تھا۔

"تم وہاں کیا کررہی تھیں؟ اگر دیکھ لیا تھا تو مجھے متوجہ کیوں نہیں کیا؟"

"میں سیمی نار اٹینڈ کرنے گئی تھی' میرے کیمپس کے فرینڈز میرے ساتھ تھے اور تمہیں متوجہ کرنا ضروری نہیں تھا۔ تم وہاں کام کے سلسلے میں تھے۔" وہ پر اعتمادی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ تب ہی میں مسکرایا تھا۔

"چھوٹی لڑکی تم میری خبر رکھنے لگی ہو؟ کہیں میری اماں سے میری شکایت کرنے کا ارادہ تو نہیں تھا؟" میں نے چھیڑا تھا اور وہ مسکرادی تھی۔

"نہیں! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں نے بس خاموشی سے نوٹس کیا تھا۔ اینی وے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ آئی ہیو ٹو گو۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔ مجھے سمایا ہاشمی کے بارے میں خبر نہیں ہوئی تھی کہ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی مگر رامین شاہ نے غور کیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں ایسی کوئی حس نہیں رکھتا تھا۔ مگر میں کام کے سلسلے میں اس سے ملا تھا۔ اور اس پروفیشنل میٹنگ میں کسی کو اتنے غور سے دیکھا نہیں جاتا۔ میں گزرتے دنوں میں اتنا مصروف ہوگیا تھا کہ میری حسیات منجمد ہونے لگی تھیں۔

سمایا ہاشمی صرف ایک کاروباری شخصیت تھی' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ دو تین بار سمایا سے ملاقات رہی تھی اور پھر اس نے مجھے ڈنر پر بلایا تھا۔ اس کے ماں باپ کی علیحدگی ہوچکی تھی۔ ماں اور چھوٹے بہن' بھائیوں کی کفالت کررہی تھی جو دوسرے شہر میں تعلیم حاصل کررہے تھے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ ڈنر میں انواع واقسام کی ڈشز کا اہتمام تھا' مگر میں زیادہ کھا نہیں سکا تھا۔ سمایا اچھی لڑکی تھی۔ سلجھا ہوا مزاج تھا۔ شاید یہ ہی بات تھی کہ اس کے بعد بھی ہم دو ایک بار ملے تھے۔ وہ اچھی دوست بن گئی تھی یا پھر اس دوستی میں دوستی سے زیادہ بھی کچھ تھا۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ میری طرف کافی جھکاؤ رکھتی تھی۔ میں اس وقت انتیس برس کا تھا۔ تقریباً' تیس کا ہونے والا تھا۔ بزنس کے باعث میں نے اپنی زندگی کو اس طور سنجیدہ نہیں لیا تھا۔

✡ ✡ ✡

مجھے سمایا ہاشمی میں اگرچہ کچھ خاص اٹریکشن دکھائی نہیں دیتی تھی' مگر میں وقت کے فیصلوں کو ماننا چاہتا تھا۔ اتنا وقت اکیلے گزار لیا تھا اب اپنی زندگی کو کسی ڈگر پر ڈالنا چاہتا تھا۔ تب ہی میں اس تعلق کو وقت دینے لگا تھا۔ میں نے اسے آنٹی' انکل سے بھی ملوایا تھا۔ اس شام آنٹی نے اسے ڈنر پر مدعو کیا تھا' مگر رامین شاہ بہت بجھی بجھی دکھائی دی تھی۔ شاید وہ کسی بات کو لے کر پریشان تھی۔ میں فوری طور پر اس سے وجہ نہیں پوچھ سکتا تھا' سمایا ہاشمی کے جانے کے بعد میں اس کی طرف آیا تھا۔ مگر وہ کنی کترانے لگی تھی۔

"کیا ہوا تمہیں اچانک اپنے روم میں جانے کا خیال کیسے آگیا؟ اس وقت تو ہم ٹیرس پر بیٹھ کر چائے پیتے ہیں نا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے نیند آرہی ہے اور ایک اسائنمنٹ پر بھی کام کرنا ہے۔" اس نے گویا بہانا بنایا تھا۔

"رامین شاہ سب ٹھیک ہے نا؟ آل او کے؟" میں نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ میری سمت سے نگاہ چرا گئی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں اجلال ملک!" وہ مدھم لہجے میں بولی تھی اور میں نے اسے بغور دیکھا تھا۔

"ہم اچھے دوست ہیں نا رامین شاہ؟"

"پھر تم میری طرف کیوں نہیں دیکھ رہیں؟ ایسی کیا بات ہے، جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو؟" میں نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا تھا، مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ تب میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اسے توجہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کیمپس میں کسی نے تمہارے ساتھ بدتمیزی کی؟ کیا اسی لڑکے نے کچھ کہا ہے؟" میں نے بات کی تہ تک پہنچنے کی سعی کی تھی، مگر اس نے سر انکار میں ہلا دیا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے اجلال ملک..... میں پریشان نہیں ہوں اور کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔" اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ میں اس کے بدلے ہوئے انداز پر چونکا تھا۔ وہ الجھی ہوئی لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے اپنا ہاتھ میری گرفت سے نکالا تھا اور پھر آگے بڑھ گئی تھی۔

میں اس کا رویہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بات بانٹنے، کرنے کو تیار نہیں تھی۔ مجھ سے کترانے لگی تھی۔ میں نے اس کے بدلے ہوئے رویے کو محسوس کیا تھا۔ مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ دوبارہ بیٹھ کر تفصیل سے بات کر سکتا۔ آنٹی، انکل کو سمایا ہاشمی پسند آئی تھی۔ آنٹی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اماں کو اس بارے میں آگاہ کر کے ایک بار ان سے ملوا دوں۔ اماں یوں بھی فرانس آنے کا ارادہ ظاہر کر رہی تھیں۔ میں سنجیدگی سے سمایا ہاشمی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

"آپ کو سمایا ہاشمی سے محبت ہے؟" اس شام میں وقت نکال کر اس کے پاس بیٹھا تھا۔ تب ہی اس نے پوچھا تھا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

"محبت بچکانہ بات ہے رامین شاہ! میں اتنا بچہ نہیں رہا۔" میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

"محبت کے واقع ہونے کی عمر ہوتی ہے؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگی تھی اور میں نے لاپروائی سے شانے اچکا دیے تھے۔

"آئی ڈونٹ بلیو ان لو....." وہ الجھن سے میری طرف دیکھنے لگی تھی۔

"تم محبت کے بنا شادی کرو گے؟ محبت کے بنا زندگی گزارو گے؟" وہ میری سمت حیرت سے دیکھ رہی تھی اور مسکرا دیا تھا۔

"میں ٹین ایج گائے نہیں ہوں رامین شاہ! لک ایٹ می' آئی ایم ابو تھرٹی۔" (میں نو عمر نہیں ہوں رامین شاہ! میری طرف دیکھو میں تیس سے اوپر کا ہوں)

میں نے اسے جتایا تھا اور وہ اپنی شفاف آنکھوں میں حیرتیں بھر کر مجھے دیکھنے لگی تھی۔

"محبت صرف ٹین ایج کرتے ہیں؟ کہاں لکھا ہے کہ تیس سال کے بعد محبت کرنا منع ہے؟" اس نے بحث کا گویا آغاز کر دیا تھا اور تب میں نے پرسکون انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"رامین شاہ! محبت کس طور ہوتی ہے، کیسے ہوتی ہے، آئی ریلی ڈونٹ نو..... مجھے اس کی خبر نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ شادی کے لیے رائٹ ٹائم ہے۔ آئی ہو اچیوڈ مائے گولز..... جو بزنس پلانز میں یہاں لے کر آیا تھا' ان کو حاصل کر چکا ہوں' اب زندگی شروع کرنے کا وقت ہے اور میں زندگی کو شروع ہونے دینا چاہتا ہوں۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا تھا' تب ہی وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"محبت کے بنا؟ محبت کے بغیر؟" اس کی آواز میں ایسا کیا تھا کہ اس کا لہجہ کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کیا تیر رہا تھا جو میں پڑھ نہیں پا رہا تھا۔ میں نے اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں کو بغور دیکھا تھا۔

"محبت کیا دیتی ہے رامین شاہ؟ محبت نے تمہیں کیا دیا؟" میں اگرچہ اسے یاد نہیں دلانا چاہتا تھا' مگر انجانے میں ذکر کر گیا تھا اور وہ ساکت سی میری طرف دیکھنے لگی تھی۔ لمحہ بھر کو میری جانب خاموشی سے دیکھا اور پھر پر اعتماد لہجے میں بولی تھی۔

"میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی کہ مجھے تب محبت نے کیا دیا اور کیا لیا تھا۔ میں ایک خاص جذبے کے زیر اثر تھی" اور میں نے اس کا اظہار کھل کر ڈرے بغیر کر دیا تھا۔ مجھے نتائج کی پروا نہیں تھی۔ تب مجھ میں ہمت تھی اور سچ کہنے کی ہمت تھی۔ میرے ساتھ کیا ہوا؟ یہ بات اہمیت نہیں رکھتی۔ مگر اس ایک غلطی نے مجھے سیکھنے کا موقع دیا۔ میں نے ایک غلط لڑکے کے لیے جو محسوس کیا وہ میرے اندر باقی نہیں رہا۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے صاف گوئی سے کہا تھا۔

"تو پھر تم محبت کا ذکر کیوں کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا تھا اور تب ہی اس نے گویا اپنی غلطی کا احساس کر لیا تھا اور سر ہلاتے ہوئے میری طرف سے نگاہ ہٹائی تھی۔

"کچھ نہیں... فارگیٹ اٹ...." کہنے کے ساتھ ہی وہ پلٹی تھی اور وہاں سے نکل گئی تھی۔ ایسا کیا تھا جو اس کے رویے میں تھا؟ وہ اتنی الجھی ہوئی کیوں دکھائی دی تھی؟ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا اسے مجھے تشویش ہوئی تھی کہ نہیں اسے پھر سے کسی سے محبت تو نہیں ہو گئی؟ میں اسے پھر کسی نئی تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ تب ہی اس روز میں نے اسے روک لیا تھا اور وہ میرے ہاتھ تھامنے پر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

"تمہیں کسی سے محبت ہو گئی ہے؟" میں نے بغور اس کی سمت تکتے ہوئے کہا تھا اور وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی تھی۔

"بولو رامین شاہ... تمہیں کس سے محبت ہو گئی ہے؟ کون ہے وہ؟ آئی جسٹ کانٹ سی یو ان اینی ٹربل' ایسی کوئی بات ہے تو مجھے آگاہ کرو۔ میں اس لڑکے سے ملنا چاہوں گا۔ اگر وہ مجھے تمہارے قابل لگا۔ مگر تم اس طرح کوئی فیصلہ نہیں لے سکتیں۔" میں جیسے اپنے طور پر اس کی تمام ذمہ داری سنبھال چکا تھا کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ اسے دوبارہ کوئی ہرٹ نہ کر سکے۔ مجھے اس کا خیال تھا اور میں اسے ہر طرح سے تحفظ دینا چاہتا تھا۔ بچانا چاہتا تھا' مگر اس کی نظروں میں اس لمحے جو کیفیت تھی میں وہ سمجھ نہ پایا تھا۔ اس نے میری سمت دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ میری گرفت سے نکال لیا تھا

"کون ہے وہ رامین شاہ؟ تم اس کے متعلق مجھے بتا کیوں نہیں رہیں؟"

اور وہ تب بھی میری سمت اسی طور خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔ پھر پلٹ کر جانے لگی تھی' جب میں نے جانے کیوں اس کی کلائی پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ وہ میری اس حرکت پر دم بخود رہ گئی تھی اور حیران تو میں خود بھی رہ گیا تھا۔ میں نے ایسا کیوں کیا تھا' میں سمجھ نہیں پایا تھا۔ کیا میں اسے ایسے ڈانٹنا ڈپٹنا چاہتا تھا؟ اس کا خیال کر رہا تھا؟ اسے ڈانٹ کر اس حماقت سے باز رکھنا چاہ رہا تھا؟ مگر میں کچھ بھی بول نہیں پایا تھا اور وہ خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔ تب میں نے اس کی کلائی چھوڑ کر اسے آزاد کر دیا تھا اور وہ جو میرے بہت قریب آ گئی تھی دور ہونے لگی۔

یک ٹک وہ میری سمت دیکھتی ہوئی قدرے فاصلے پر جا کھڑی ہوئی اور پھر پلٹ کر وہاں سے تیزی سے نکل گئی تھی۔ یہ کیا تھا؟ اس ایک لمحے میں ایسا کیا ہوا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا اور اس کے لیے بھی ناقابل فہم تھا؟ میں اس کا خیر خواہ تھا' دوست تھا' اس کو تکلیف سے بچانا چاہتا تھا' مگر یہ کیوں تھا؟ صرف ایک دوست ہونے کے ناتے؟ میں نے اس کی کلائی کیوں تھام لی تھی' میں اس سے کیا کہنا چاہتا تھا' کس بات کی الجھن میں ایسا سرزد ہوا تھا؟ مجھے اس کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ مگر اگلے کئی دن میں بزنس ٹور کے سلسلے میں یہاں وہاں مصروف رہا کہ اس سے بات ہی نہ ہو سکی تھی۔ جب میں اٹلی کے ٹور سے واپس لوٹا تو اسے کسی اور کے ساتھ دیکھا۔ میں کسی کو اس کے ساتھ دیکھ نہیں

سکتا تھا کجا کہ وہ اس کے گھر میں اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ میں نے اس سے اس کی بابت نہیں پوچھا تھا۔ میں اسے بچوں کی طرح اپنے اشاروں پر نہیں چلانا چاہتا تھا۔ اسے حق تھا جو وہ بہتر سمجھتی کرتی۔ اس کے بعد میں کئی دنوں تک اس سے بات نہیں کرسکا تھا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ وہ کیا کررہی تھی اور وہ کس کے ساتھ روابط بڑھا رہی تھی۔ اگر وہ کسی کو گھر تک لے آئی تھی تو وہ قابل بھروسا بندہ تھا۔ مگر میں الجھنے کیوں لگا تھا؟ میں سمجھ نہیں پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

اماں پاکستان سے آئی تھیں۔ انہیں سمایا ہاشمی سے ملوایا تو انہیں وہ پسند آئی تھی۔ دو ایک بار ہماری مائیں ایک دوسرے کے گھر ڈنر کے لیے آئی گئی تھیں اور تب اماں نے عندیہ دے دیا تھا کہ اب مجھے شادی کرلینی چاہیے اور باقاعدہ رشتہ بھجوانا چاہیے اور ان کی اس بات پہ میری نامعلوم الجھنیں بڑھنے کیوں لگ گئی تھیں؟ مجھے شادی کرنا تھی یہ طے تھا، پھر کیوں میں الجھ رہا تھا؟

رامین شاہ مجھے نظرانداز کرنے لگی تھی۔ اس شام وہ تیار ہوکر گاڑی کی چابی تھامے نکل رہی تھی، جب میں نے اسے روک لیا تھا۔

"کہاں جارہی ہو تم؟" میں نے بنا تمہید کے پوچھا تھا۔ وہ مسکرادی تھی۔

"میں ڈنر کے لیے جارہی ہوں۔ عمار نے انوائٹ کیا ہے، میں تو اسے منع کررہی تھی، مگر وہ کہاں سنتا ہے اور..." اور میں نے اس کے روانی سے بولتے لبوں پہ شہادت کی انگلی رکھ کر اسے خاموش کرادیا تھا۔

"کون عمار؟" میں پوچھنے کا حق رکھتا تھا شاید نہیں، مگر میں کس استحقاق سے پوچھ رہا تھا۔ صرف اس کا دوست ہونے کے ناتے.... صرف ایک یہ ہی حوالہ تھا کیا؟ یا کچھ اور بھی تھا؟ مگر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا، تب ہی وہ میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

"عمار میرا دوست ہے۔ ایک فیملی گیدرنگ میں ملے تھے.... وہ نائس ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے، میں نے ممی ڈیڈی کو اس سے ملوایا ہے، انہیں وہ پسند آیا ہے، اب آگے ان پر منحصر ہے جو وہ فیصلہ کریں۔" وہ شانے اچکا کر بے نیازی سے بولی اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اتنا کچھ ہوگیا اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔" میری آواز میں حیرت تھی اور وہ میری طرف خاموشی سے دیکھے گئی تھی، پھر دھیمے سے مسکرائی تھی۔

"تمہارے پاس وقت نہیں تھا اجلال ملک.... اور میں نے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔" وہ قدرے رکھائی سے بولی تھی اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"تم واقعی سمجھتی ہو عمار اس قابل ہے کہ تم اس کے ساتھ زندگی گزار سکو؟ میں کیوں معاملے میں اس قدر دخل انداز ہورہا تھا۔ میں جانتا تھا یہ آداب کے خلاف ہے۔ وہ دوست تھی، کزن تھی، مگر اس کی اپنی زندگی تھی۔

"محبت کا ذکر یہاں کیوں اجلال ملک؟" اس کے پرسکون لہجے پر میں نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

"محبت کا ذکر کیوں نہیں رامین شاہ؟ تمہیں محبت پر یقین ہے نا؟"

"تم نے کہا تھا محبت کچھ نہیں ہوتی۔" وہ مجھے میرا کہا یاد دلا رہی تھی۔

"میں نے کہا تھا وہ میرا معاملہ تھا۔ آئی ڈونٹ بلیو ان لو۔ (میں محبت پر یقین نہیں رکھتا۔) مگر تم تو! تمہیں تو یقین تھا نا؟.... میں نے کہا اور وہ میری طرف خاموشی سے دیکھنے لگی تھی۔

"ڈو یو ہم؟ محبت کرتی ہو اس سے؟" میں نے کریدتے ہوئے پوچھا تھا۔ تب ہی وہ نفی میں سر ہلاتے بولی تھی۔

"میں اس سے محبت نہیں کرتی اجلال ملک.... اور محبت ضروری نہیں ہے، زندگی ساتھ گزارنا ہو تو اور بہت سی باتوں کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ وہ اچھی نیچر کا ہے

اپنے قدموں پر کھڑا ہے، مجھے سمجھتا ہے..... اور.....

"اور یہ کافی ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے روانی سے پوچھا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پراعتماد انداز میں سراثبات میں ہلا دیا تھا۔

"یہ کافی ہے اجلال ملک....." اس کے ساتھ ہی وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر وہاں سے نکل گئی تھی، یہ کیسا عجیب رویہ تھا اس کا؟ اور میں، میں کیا؟ میں خود کو خود نہیں سمجھ پایا تھا۔ میرا اس معاملے میں کوئی واسطہ بنتا تھا؟ میں اس کے جانے پر اپنی سوچوں سے الجھنے لگا۔ رامین شاہ کو میں اتنی اہمیت کیوں دیتا ہوں؟ اور رامین شاہ میری سوچوں پر کیوں حاوی ہو رہی تھی؟ وہ ہر طرح سے میرے حواسوں پر کیوں سوار تھی؟ میں اہم ترین میٹنگز میں بات کرتے ہوئے اہم امور ڈسکس کرتے ہوئے اس کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک کیوں نہیں پا رہا تھا؟ وہ لڑکی میرے آس پاس کیوں رہنے لگی تھی؟ جب میرے اردگرد نہیں ہوتی تھی، تب بھی میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

اماں نے باقاعدہ رشتے کی بات کردی تھی۔ سمایا ہاشمی بہت خوش تھی۔ میرے ساتھ اپنی آئندہ زندگی پلان کر رہی تھی۔ اس کے پاس بہت سے پلانز تھے اور میں اس کی باتوں کو توجہ سے سن کیوں نہیں پا رہا تھا؟ جب سمایا ہاشمی میرے پاس تھی اور جب میں اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی تیاریوں میں مصروف تھا اور ایک رشتہ بنانے جا رہا تھا، تب میرے حواسوں پر رامین شاہ کیوں سوار تھی، اس کی الجھی آنکھوں میں ایسا کیا تھا جو مجھے اپنی طرف مائل کر رہا تھا؟

☆ ☆ ☆

میں سمایا کے ساتھ تھا جب وہ انگوٹھی پسند کر رہی تھی، ہم جلد منگنی کرنے والے تھے اور ان دنوں اس کی تیاریاں چل رہی تھیں جب رامین شاہ نے خبر دی کہ وہ منگنی کرنا چاہتی ہے۔ عمار نے گھر آکر بات کی تھی، انکل آنٹی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، مگر میں اس سے اتنا الجھ کیوں رہا تھا۔

"رامین! تم یہ منگنی نہیں کرسکتیں۔" اس شام میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا اور وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔

"کیوں نہیں؟" اس کا سوال یقیناً درست تھا، مگر میں اس سے الجھتے انداز میں کہنے لگا تھا۔

"کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ عمار کس طرح کا لڑکا ہے، اس کی فیملی بھی یہاں نہیں ہے، آنٹی بتا رہی تھی کہ وہ کسی رشتے دار کے ساتھ یہاں رہتا ہے، تم اس کے بارے میں اور اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔" میں نے اپنے طور پر ٹھوس وجہ بیان کی، مگر وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی تھی، میں اس کے مسکرانے پر چونکا تھا اور وہ بولی تھی۔

"اجلال! تم بھی تو ہمارے ساتھ رہتے ہو نا؟ سمایا ہاشمی نے تم پر اعتبار کیسے کیا؟" وہ مجھ سے پوچھنے لگی تھی اور میں لاجواب ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ مگر مجھے اسے قائل کرنا تھا۔ تب ہی میں گویا ہوا تھا۔

"میری بات اور تھی رامین شاہ..... سمایا ہاشمی تمہاری طرح کوئی کم عمر بچی نہیں ہے، وہ ایک میچور لڑکی ہے، وہ جانتی ہے کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔" میں نے رامین کو جتلانا چاہا تھا، مگر وہ پرسکون انداز میں میری طرف دیکھنے لگی تھی۔

"بس یہ ہی ایک وجہ ہے یا کچھ اور بھی؟" وہ بہت اعتماد سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی تھی اور میں چونک گیا تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا؟ اس بے وقوفانہ سوال کی کیا تک بنتی تھی یہاں؟

میں نے اپنے طور پر سوچتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

"رامین شاہ تم اتنی میچور نہیں ہو کہ لوگوں کی پہچان رکھو — عمار کیسا ہے؟ کس قسم کا انسان ہے، تم اس بارے میں کچھ شاید نہیں جانتی ہو۔ تمہارے لیے یہ منگنی کرنا رسک ہے۔" میں نے باور کروانے کی کوشش کی تھی۔

"اور تم بھی تو یہ رسک لے رہے ہو نا؟ تم کتنا

جانتے ہو سمایا ہاشمی کو؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال داغ دیا تھا۔

"میری بات یہاں نہیں ہو رہی، تم اپنی بات کرو رامین شاہ!"

"میں سمجھ دار ہوں۔۔۔ اور۔۔۔"

"تم نے سمجھ داری کا سرٹیفکیٹ لے رکھا ہے؟" اس نے میری بات کاٹ کر تیزی سے کہا تھا۔

"میں تم سے بڑا ہوں اور کہیں زیادہ دنیا کو جانتا ہوں۔"

"کتنے بڑے ہو اجلال ملک؟ اتنے بڑے ہو کہ میری انگلی تھام کر چل سکتے ہو؟ کب تک تم میرا سہارا ہو گے؟ کب تک یہ خیال، یہ کیئر، یہ کنسرن رہے گا؟ کل جب تم اپنی زندگی میں بزی ہو جاؤ گے تو کیا تب بھی میری انگلی تھام کر ایسے ہی میرے ساتھ چلو گے؟ تب بھی اتنا ہی کنسرن شو کرو گے؟ تم کیا کر رہے ہو اجلال ملک؟ یہ سب کس کے لیے ہے؟ کیا تم خود اس کا مطلب جانتے ہو؟ جب ایک رشتہ تم بنا رہے ہو؟ تو تم اس کے لیے آزاد ہو، تو میں کیوں نہیں اپنی مرضی کر سکتی؟ اچھا مان لو میں یہ منگنی نہیں کرتی۔ یہ رشتہ نہیں بننے دیتی تو اس کے بعد کیا ہو گا؟ کیا تم تب بھی اپنے فیصلے مجھ پہ تھوپتے رہو گے؟ اگر میرے لیے عمار ٹھیک انتخاب نہیں، پھر مجھے بتاؤ رائٹ انتخاب کون ہے؟ تم اگر صحیح غلط کا فیصلہ میرے لیے کر سکتے ہو تو مجھے بتا دو ہواز داون فور می؟ ٹیل می۔۔۔

کون ہے وہ جو میرا اتنا خیال رکھے گا، میری اتنی فکر کرے گا۔ مجھے کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھال کر رکھے گا کہ مجھے کسی شے سے کوئی ٹھوکر نہ لگے۔ کوئی ٹھیس نہ لگے۔ کہیں ہرٹ نہ ہو جاؤں۔ کون کرے گا یہ؟ کیا تم کرو گے؟ تم ہو وہ ایک؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا اور میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ درست ہی تھی یہ سب کہنے میں۔۔۔ میں اس کی زندگی کو روک کر کیا ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کیا حق تھا؟ میں ایسا کیوں کر رہا تھا۔ میں وجہ نہیں جانتا تھا، مگر

میں اسے عمار کے ساتھ محفوظ تصور نہیں کرتا تھا، تو پھر واقعی کون تھا اس کے لیے جو اس کو اس قدر سنبھال کر رکھتا؟

یہ کیا تھا؟ میں خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا، جب وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"تمہیں سب تلاش کرنے کی ضرورت ہے اجلال ملک! اس کے بغیر تم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ ایسا ممکن نہیں ہو گا۔" وہ پرسکون لہجے میں بولی تھی اور پھر پلٹ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کے سوال میرے اردگرد گونجتے ہوئے مجھے چاروں سمت سے گھیر رہے تھے۔ میں اپنے اندر کی کیفیت پر حیران تھا۔ دل کو ٹٹولا تھا۔ احساس ہوا تھا، وہاں کچھ ہے۔ میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ کیا ہے۔ مگر اس شام جب میں سمایا ہاشمی سے ملا تھا، اس نے پوچھا تھا۔

"تم نے کبھی جتایا نہیں، کبھی کہا نہیں۔۔۔ مگر اب جب ہم ایک رشتے میں بندھنے جا رہے ہیں، تو میں یہ سننا چاہوں گی کہ تمہارے دل میں کیا ہے؟ کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟" وہ کہہ کر مسکرائی تھی، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی تھی۔

"میں جانتی ہوں یہ بہت بچکانہ سوال ہے، مگر میں ایک لڑکی ہوں اور میں اپنے ہم سفر کے دل میں بھی راج کرنا چاہتی ہوں، آئی نو یو لائیک می۔۔۔ مگر کیا یہ محبت ہے؟" اس کے پوچھنے پر میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگا تھا اور تب میری آنکھوں کے سامنے رامین شاہ کا چہرہ آ گیا تھا۔ میں اس کے خیال سے دامن نہیں چھڑا سکا تھا، مگر میں خود کو جھٹلانا چاہتا تھا، میں نے اس خیال کو جھٹکتے ہوئے سمایا ہاشمی کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"سمایا ہاشمی! محبت کے بارے میں، میں زیادہ نہیں جانتا، مگر آف کورس سب تمہارا ہو گا۔" میں اسے یقین دلانا چاہتا تھا، مگر میرے اندر کوئی مجھے جھٹلانے لگا تھا اور وہ کوئی نہیں میرا دل تھا۔ میں کیوں سوچ رہا تھا۔ یہ کیا تھا؟ میں سمایا ہاشمی کے مدمقابل ہوتے ہوئے رامین شاہ کو کیوں سوچ رہا تھا؟ میں سمایا کی باتوں میں رامین شاہ کو کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟ رامین شاہ مجھ پر اتنی

کیوں چھا رہی تھی؟ وہ مجھ سے نو دس برس چھوٹی لڑکی جسے میں محض ایک کانچ کی گڑیا کی طرح برتتا آیا تھا۔ اب اس کے حوالے میری ذات پر اس طرح کیوں چھانے لگے تھے۔

"کیا ہوا؟ تم کیا سوچنے لگے؟" سمایا ہاشمی نے پوچھا تھا اور میں نے سر انکار میں ہلا دیا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ آیا تھا، مگر وہ کیفیت ختم نہیں ہوئی تھی۔ رامین شاہ اسی طور میرے حواسوں پہ چھائی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

میں تاریکی میں ٹیرس پہ کھڑا تھا۔ جب وہ کافی لے کر وہاں آگئی تھی۔ اس نے خاموشی سے میری طرف کافی کا ایک کپ بڑھایا تھا اور میں نے تھام لیا تھا۔ وہ خاموشی سے ریلنگ کے ساتھ لگ کر کافی کے گھونٹ لینے لگی۔ تب میں نے اس کی سمت دیکھا تھا۔

"کیا ہوا اس طرح کیا دیکھ رہے ہو اجلال ملک؟" وہ مسکرائی تھی۔ اس کا اطمینان مجھے چونکا گیا — کیا وہ واقف تھی کہ میں اس کے بارے میں سوچنے لگا ہوں۔

"تم سمایا ہاشمی سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہو اجلال ملک؟ کیا تم اسے وہ زندگی، وہ تحفظ دے سکو گے وہ جو تم سے توقع رکھتی ہے؟ مجھے لگتا ہے تم اس کے ساتھ نباہ کر لوگے، مگر محبت؟ کیا تم اس سے محبت کر سکو گے؟ تمہیں نہیں لگتا تم منافق بن جاؤ گے؟ اور ساری زندگی منافقت کرتے رہو گے؟" جانے کیوں وہ اس حساس موضوع پہ بات کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔ وہ مجھ سے کیا سننا چاہتی تھی؟ یا وہ میری تمام سوچوں کو پڑھ رہی تھی، مجھ سے کیا اگلوانا چاہ رہی تھی؟ میں خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا جب وہ بولی تھی۔

"تم محبت پر یقین نہیں رکھتے تھے، محبت کی کھل کر مخالفت کرتے دکھائی دیتے تھے ہمیشہ، آج کیوں چپ ہو؟ بولو کچھ اور مجھے غلط ثابت کر دو......" وہ اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

"اجلال ملک...... محبت زندہ حقیقت ہے اور تم زور آور ہے۔ تم اس کی نفی کرتے رہے ہو، مگر تم اب جان چکے ہو، سو تم انکار نہیں کر پاؤ گے۔ تم یقیناً خود سے جھوٹ نہیں بول سکو گے۔ ہم اچھے دوست رہے ہیں اور اگرچہ میں تم سے نو، دس برس چھوٹی ہوں، مگر میں تمہیں اتنا ہی جانتی ہوں، جتنا کہ تم مجھے۔ تم نے کبھی اس حقیقت کو نہیں جانا، نہیں مانا۔ تمہیں میں ایک امیچور اور بے وقوف لڑکی لگتی ہوں، مگر تم جانتے ہو ایسا نہیں ہے۔" وہ مجھے جتاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ میں اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اگر میں چاہتا تو اس کے کہے کی نفی اب بھی کر کے اسے خاموش کر سکتا تھا، مگر میں اسے رعایت دے رہا تھا۔

"تم مجھے یہ رعایت کیوں دے رہے ہو اجلال ملک! اس لیے کہ میں تم سے محض عمر میں چھوٹی ہوں؟ اس لیے میں برا مان جاؤں گی اور تمہیں میری ناراضی کی فکر ہے؟" وہ مسکرائی تھی اور میں اس کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا تھا۔ "میں جانتی ہوں تم سمایا ہاشمی سے کوئی وابستگی نہیں رکھتے اجلال ملک...... جس سے رکھتے ہو اس بارے میں تم کوئی بات اس لیے نہیں کرنا چاہتے کہ تمہیں لگتا ہے یہ غلط ہو گا۔ تم اپنی سوچوں میں خود سے کئی طرح کے نظریے اخذ کر کے ایک سوچ بنا چکے ہو۔ اس سوچ میں تم کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرنا چاہو گے، مگر اس طرح کرنے سے تم خود کو جھٹلا نہیں سکو گے۔" وہ پر یقین لہجے میں بولی تھی۔

"رامین شاہ! ان باتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔" میں نے خود کو اور اسے جھٹلانا چاہا تھا۔ اور وہ مسکرائی تھی۔

"کوئی جواز ڈھونڈنا چاہو تو ڈھونڈ لو۔ محبت تمہارے تعاقب میں ہے اور تب تک تعاقب میں رہے گی، جب تک تم اس کا اقرار نہ کر لو۔" وہ پر یقین لہجے میں کہتے ہوئے مجھے جیسے جتا رہی تھی اور میں اس کی سمت سے نگاہ پھیر کر بولا تھا۔

"میں دو دنوں میں سمایا ہاشمی سے منگنی کرنے والا ہوں چھوٹی لڑکی! میں ان باتوں کے بارے میں فی الحال سوچنا نہیں چاہتا۔" اور وہ پر سکون انداز میں مسکرائی

تھی۔

"میں بھی کل منگنی کر رہی ہوں۔ تم انتظام کرنے میں میری مدد نہیں کرو گے؟" وہ اطمینان سے بولی تھی۔ کیا وہ جان گئی تھی کہ میں کیا محسوس کر چکا ہوں؟ اور میرے دل میں کیا ہے۔

وہ میری عمر سے نو دس برس چھوٹی لڑکی کس قدر حیران کن تھی۔

"تم منگنی کیوں کر رہی ہو رامین شاہ' یہ کیا بچپنا ہے؟ کیا کھیل کھیل رہی ہو تم؟ یہ سب کیا ہے؟" میں نے اسے ڈپٹا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

"کیا غلط ہے اجلال ملک؟ میں منگنی کیوں نہیں کر سکتی؟ اس میں کیا غلط ہے۔ منگنی کرنے پہ صرف تمہاری اجارہ داری ہے کیا؟ یا تم منگنی کے تمام کاپی رائٹ رکھتے ہو؟" وہ حیران ہو کر بولی تھی۔ اس کا پر مزاح انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس صورت حال سے محظوظ ہو رہی تھی۔ جیسے وہ مجھے جتانا چاہتی تھی کہ میں اس سچ کو قبول کر لوں جو میرے اندر ہے اور وہ کہہ رہی تھی۔

"محبت کا کوئی واضح اشارہ مت دو اجلال ملک! مگر اتنا بتا دو۔ تم مشکل میں ہو اور اس مشکل سے نکلنا چاہتے ہو۔ میں ہاتھ تھام کر تمہیں اس مشکل سے نمٹنے کی ہمت ضرور دوں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی' کپ ایک طرف رکھا تھا اور وہ پلٹ کر جانے لگی تھی' جب میں نے اس کا ہاتھ غصے سے تھام کر اسے اپنی طرف کھینچا تھا اور اس کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا تھا۔

"لڑکی! اتنی عجیب باتوں کے معنی میرے اندر تلاش مت کرو۔ یہ بے سبب ہے اور اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔" میں نے مکرنے کی حد کر دی تھی۔

"اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو؟ بڑے لوگوں کو غصہ کرنا جائز نہیں۔ بی پی ہائی ہو جاتا ہے۔ دل پر بن آتی ہے اور دل پر بن آنا تم افورڈ نہیں کر سکتے نا؟" وہ مذاق کر رہی تھی۔ محض اس لیے کیونکہ میں اسے بچوں کی ٹریٹ کرتے رہنا چاہتا تھا اور میں اس سچائی کو جھٹلانا چاہتا تھا جو ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔

"تم منافق ہو۔ جاؤ منافقت کرو۔ میں بھی کل منگنی کروں گی۔" وہ اس کھیل میں بازی لے جانا چاہتی تھی۔ مجھ سے سچ اگلوانا چاہتی تھی اور میرا ردعمل جس قدر جارحانہ تھا اور جس سختی سے میں اس کی کلائی تھامے ہوئے تھا اس سے کیا ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کی اطمینان بھری مسکراہٹ سب راز کھول رہی تھی۔

"تم مجھ سے اتنے بڑے نہیں ہو عمر میں' جتنا بڑے بنتے ہو۔ اور محبت کوئی جرم نہیں ہے۔ تم اپنے آپ کی نفی نہیں کر سکتے اجلال ملک..... چھوٹی سی غلطی سے تم اپنی' میری اور سمایا ہاشمی کی زندگی برباد کر دو گے۔" وہ مجھے میری غلطیوں کا احساس دلا رہی تھی۔ اس کے مدھم لہجے میں خوف تھا اور کئی خدشے تھے۔ جیسے اس کی آنکھیں مجھ سے درخواست کر رہی تھیں کہ اس رشتے کو کئی زاویوں میں بٹنے سے روک دو۔ دل میں اس شام خاموش رہا تھا۔ مجھے ادراک ہو چکا تھا اور اسے اس ادراک کا احساس ہو چکا تھا' مگر میں منکر رہنا چاہتا تھا۔ میں ہر بات کی نفی کرنا چاہتا تھا۔

"تم اتنے قنوطی کیوں ہو رہے ہو اجلال ملک؟ ہماری عمروں کا ڈیفرنس اتنا زیادہ نہیں ہے۔ محبت کو ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا۔ میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔" وہ مجھے قائل کرنا چاہتی تھی اور میں اس کی کلائی کو سختی سے تھامے اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ تب ہی وہ مسکراتے ہوئے مدھم لہجے میں بولی تھی۔

"دیکھو تم مجھے کھونا نہیں چاہتے' تب ہی میرا ہاتھ اس درجہ سختی سے تھامے ہوئے ہو۔ تم مجھے گنوانا نہیں چاہتے' کیونکہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ جب میں کسی اور کے ساتھ ہوتی ہوں' تم ان سیکیور ہوتے ہو۔ تمہیں میری فکر ستانے لگتی ہے۔ کوئی اس طور میرا خیال رکھ پائے گا یا نہیں۔ تم مجھے ٹوٹتے بکھرتے نہیں دیکھنا چاہتے۔ یہ کیا ہے اجلال ملک اگر محبت نہیں؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتی بول رہی تھی۔

اور میں نے رامین شاہ کے عقب میں کھڑی سمایا ہاشمی کو دیکھ لیا تھا جو جانے وہاں کب آئی تھی۔ وہ رامین کی باتوں کو سن چکی تھی کہ نہیں؟ میں رامین کا ہاتھ

مضبوطی سے تھامے اس کے کس قدر قریب کھڑا تھا۔ سمایا ہاشمی کو دیکھ کر میرے ہاتھ کی گرفت رامین شاہ کے ہاتھ پر ڈھیلی پڑ گئی تھی اور اس نے پلٹ کر سمایا ہاشمی کو دیکھا تھا۔

سمایا ہاشمی میری طرف کس قدر بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ یک دم وہ مڑی تھی اور تیزی سے وہاں سے نکل گئی تھی میں رامین کو چھوڑ کر اس کی سمت بڑھا تھا۔

میں کیا کر رہا تھا؟ کیوں کر رہا تھا؟ اس سب کا مقصد کیا تھا؟ اس سے کس رشتے کی تسکین ہونا تھی؟ کس رشتے کا وجود باقی رہنا تھا؟ یہ منافقت ہی تو تھی' رامین شاہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں سب جھٹلا رہا تھا' منکر تھا' مگر میرے جھٹلانے سے حقیقت بدل نہیں رہی تھی۔ رامین کو مجھ سے محبت تھی۔ مجھے رامین سے محبت تھی جانے کب سے... مگر میں سمجھ نہیں پایا تھا۔

"تمہارے پاس مجھے دینے کو کچھ نہیں ہے اجلال ملک! تم یہ رشتہ کیوں بنانا چاہتے ہو؟" سمایا ہاشمی نے پوچھا تھا اور میں خود کو ایک عجیب دنیا میں محسوس کرنے لگا تھا۔ میں اپنی مرضی کے فیصلے چاہتا تھا' مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ سو میں تھک کر بولا تھا۔

"سمایا ہاشمی۔ آئی ایم سوری میں اس رشتے میں تمہارے ساتھ کسی طور مخلص نہیں رہ پاؤں گا۔ تم سے محبت کرنا میرے اختیار میں نہیں ہوگا اور میں تمہاری توقعات پر کبھی کھرا نہیں اتر سکوں گا۔ میں تمہیں ایک آدھی ادھوری زندگی نہیں دے سکتا۔ میں جانتا ہوں یہ تمہارے لیے تکلیف دہ ہے' یہ سچ ہے کہ اس رشتے کو یہیں ختم ہونا ہے۔" میں خود کو مزید گھسیٹنا نہیں چاہا تھا۔

سمایا ہاشمی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ یقیناً" ایک کرب کے احساس سے دوچار تھی' مگر کل اسے مزید دکھ دینے سے بہتر تھا' میں آج کا یہ رشتہ اس طور پر ختم کر دیتا۔ میں سمایا ہاشمی کو چھوڑ کر لوٹ آیا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں رامین شاہ کی طرف پلٹ رہا تھا۔ میں اس کی سمت پیش قدمی کیسے کر سکتا تھا۔ آنٹی کیا سوچتیں۔ میں نے ان کے گھر میں رہ کر نقب زنی کی۔

میں گھر لوٹا تو وہ جاگ رہی تھی۔ میں آگے بڑھ جانا چاہتا تھا' جب اس نے مجھے آواز دے کر روک لیا تھا۔ اور وہ میرے مقابل آن رکی تھی۔

"تمہیں یہ سب اتنا عجیب کیوں لگتا ہے اجلال ملک؟ اس میں عجیب کیا ہے؟ کیا کوئی رشتہ قائم کرنا اتنا مشکل ہے؟ میں تمہارے حق میں فیصلہ دے چکی ہوں' کیا یہ اہم نہیں ہے؟" وہ بولی تھی اور میں نے تھکے ہوئے انداز میں ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا تھا۔

"پلیز رامین شاہ! بند کرو یہ ڈراما۔ تم بچوں والی سوچ رکھتی ہو اور میں تمہیں اس کے لیے ایبری شی ایٹ نہیں کر سکتا' نہ ان حماقتوں میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔ تم چپ چاپ یہ منگنی کر و کل...."

میں نے فیصلہ کن انداز میں کہہ رہا تھا۔ تب ہی اس نے حیرت سے مجھے دیکھا تھا۔

"تم نے یہ ہی فیصلہ کرنا تھا' پھر خود سمایا سے رشتہ کیوں توڑا؟" اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا تھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ میں نے سمایا سے رشتہ توڑ دیا ہے؟" میں چونکا تھا۔ یہ محض قیاس آرائی تھی یا وہ واقعی مجھے پڑھنے کا ہنر رکھتی تھی؟

میں حیران رہ گیا تھا اور وہ میری طرف سے نگاہ ہٹا گئی تھی۔

"میں جانتی ہوں تم نے یہ رشتہ ختم کر دیا ہے اجلال ملک۔ مگر تم اس نئے رشتے کی داغ بیل ڈالنے سے ہچکچا رہے ہو۔ جواز بڑا نہیں ہے۔ مگر تم نے اپنی سوچوں میں اسے بڑا بنا دیا ہے۔" وہ افسردہ دکھائی دے رہی تھی اور میں نے گہری سانس خارج کی تھی۔

"رامین شاہ میں بچوں والے فیصلے نہیں کر سکتا۔ میں نے سمایا ہاشمی سے رشتہ ختم کیا' کیوں کہ میں منافقت نہیں کرنا چاہتا تھا' مگر میں تم سے کوئی رشتہ نہیں بنا سکتا۔ تم کل منگنی کرو گی۔" میں نے کہہ دیا تھا'

مگراس نے سر انکار میں ہلا دیا تھا۔

"میں وہ منگنی اسی لیے کر رہی تھی' کیونکہ تم سمایا ہاشمی سے منگنی کر رہے تھے۔ اب جب تم وہ منگنی نہیں کر رہے تو میں بھی یہ منگنی نہیں کروں گی۔" وہ عجیب پاگل پن سے بولی تھی اور میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔

"آر یو کریزی رامین شاہ؟ یہ کیا بچپنا ہے؟ تم اپنی زندگی سے اس طرح کیسے کھیل سکتی ہو؟" میں نے اسے غصے سے دیکھا تھا۔

"میں کھیل سکتی ہوں' کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اجلال ملک! میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگا رہی تھی' کیونکہ تم کسی سے رشتہ قائم کر رہے تھے۔ اب اگر تم میرے ساتھ زندگی گزارنا نہیں چاہو گے تو میں بھی تب تک تنہا رہوں گی جب تک تم اس بات کا احساس نہیں کر لیتے کہ تم غلط ہو۔" وہ عجیب سرپھری لڑکی تھی۔ میں نے سر تھاما تھا۔

"کب تک ایسا کرو گی؟ پاگل ہو تم؟" میں نے اسے غصے سے دیکھا تھا۔

تب وہ خاموش ہو کر میری سمت دیکھنے لگی تھی۔

"میں کسی رشتے میں منافق بن کر نہیں جی سکتی اجلال ملک! میں عمار سے محبت نہیں کرتی۔ میں اسے یہ بات کہہ چکی ہوں اور میں نے ممی ڈیڈی کو بھی بتا دیا ہے۔ میں کل منگنی نہیں کروں گی۔ چاہے میں تمہارے ساتھ رہ سکوں یا نہیں۔ مگر میں اس طرح کسی اور کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں خود کو اس طرح سزا نہیں دے سکتی۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ سو میں نے ایک فیصلے پر پہنچ کر وہ رشتہ وہیں ختم کر دیا تھا۔" وہ مدھم لہجے میں بولی تھی۔ جب جانے کیوں میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ پلٹ کر مجھے دیکھنے لگی تھی۔ میں فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ وہ بھی کچھ نہیں بولی تھی۔ کئی لمحے اس خاموشی میں گزر گئے تھے اور تب میں نے اس خاموشی کو توڑا تھا۔

"رامین شاہ! تم ضدی ہو اور یہ عادت ٹھیک نہیں ہے۔"

"پھر بتاؤ' کیا ٹھیک ہے؟ مجھے ٹھیک اور صحیح کی پہچان نہیں۔ تم کرا دو۔" وہ میری سمت بغور دیکھتے ہوئے بولی تھی اور تب میں نے اس کی معصومیت پر اس کی چھوٹی سی ناک پر انگلی رکھ کر دبا دی تھی۔

"تم پاگل ہو رامین شاہ! لیکن زندگی میں یہ پاگل پن بھی ضروری ہوتا ہے۔ تم نے مجھے زندگی کا ایک نیا احساس دیا ہے۔ ہم بے سبب نہیں ملے تھے۔ میں پاکستان سے سفر کرتا ہوا تمہارے لیے یہاں آیا تھا اور یہاں آ کر تم نے مجھے کئی رنگوں سے روشناس کروایا ہے۔" میں نے حقیقت کو قبول کیا تھا۔

"اس سب کے کہنے کا کیا مطلب ہے؟" وہ نا سمجھی سے بولی تھی اور میں اس کا ہاتھ تھام کر مسکرا دیا تھا۔

"مطلب یہ ہے کہ مجھے اس چھوٹی سی لڑکی سے اس کی تمام حماقتوں سمیت محبت ہو گئی ہے اور میں اس بے وقوف سی لڑکی کے ساتھ عمر بھر کا سفر کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا تھا اور وہ ہاتھ کا مکا بنا کر مجھے مارنے لگی تھی۔

"اتنی سی بات تھی تو پہلے کیوں نہیں کہا؟" اور میں نے مسکراتے ہوئے بے فکری سے شانے اچکا دیے تھے۔ تب وہ بھی مسکرا دی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک ایک دلکشی لیے ہوئے تھی اور میں نے عزم کر لیا تھا کہ اس دلکشی کو ہمیشہ برقرار رکھوں گا۔

☆

فرزانہ کھرل

چر... چوں... ں... ں تقریباً" دسویں بار اس کی نازک سماعت سے یہ آواز ٹکرائی تو بے ساختہ اسے مڑ کے دیکھنا پڑا اور وہ اپنے اندازے کے سو فیصد سچ ہونے پر محض ٹھنڈی آہیں ہی بھر سکتا تھا... اور وہ بھی بے حساب...

"اوفوہ نفیسہ! یار حد ہوتی ہے۔ اس خواہش پر تمہارا اچھلنا ہمیشہ کی طرح تمام حدود و قیود پھلانگ جاتا ہے..." عمیر نے سر کھجاتے ہوئے وال کلاک پہ نظر ڈالی' رات کے دو بج چکے تھے۔

"سو جاؤ... میری ملکہ... ایک تو بکروں کی ہاں... ہاں... بلکہ بیں بیں سونے نہیں دیتی اور پھر تم کھڑکی کے سروں کو رات گئے تک چھیڑتی رہتی ہو۔" عمیر نے اپنی لال گلابی آنکھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی طرف سے اسے سمجھایا تھا مگر نفیسہ کو لگا جیسے الفاظ کی صورت عمیر نے اسے چابک مارا ہو... اس نے تلملا کر ٹھاہ سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔

"اف..." عمیر کراہا... نفیسہ کی صورت ایک شامت اسے اپنے قریب آتی دکھائی دی۔

"ہاں! میں پاگل ہوں جو اپنی خواہشوں کو بے لگام چھوڑا ہوا ہے۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "آپ کو میرے دل کی کیا خبر... جب سے انوری کے ہاں گائے جتنا بکرا آیا ہے۔ ہلکے سے کھٹکے پر بھی میرا دل دھڑک دھڑک جاتا ہے کہ وہ موٹی سانڈ لہراتی اتراتی ابھی کہ ابھی میرے سر پر آن پہنچے گی اور تو اور شام کو سامنے والے گھر میں بھی بکرا آچکا ہے۔ وہ بھی چاند جیسا... ہاں۔" ہر جملے کے اختتام پر ہاں... لگانا اس کا تکیہ کلام تھا... آنسوؤں کی نمی سے گھلی آواز میں وہ عجیب پھس پھس کر کے بولی... عمیر نے بہ مشکل ہنسی پہ قابو پایا کہ اس کا ہنسنا غضب ہو جاتا۔ "آپ تو بالکل ٹھس پڑے ہیں۔ امید کا کوئی جگنو ہی تھما دیں... ہاں۔" وہ سوں سوں کرتی بولی تو عمیر ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"میں جب بھی اپنی اکلوتی بیوی کو جگنو تھماؤں گا تو وہ چاند جیسے چمکتے دمکتے ہوں گے' یہ اندھے گانے امید کے جگنو تمہارے شایانِ شان نہیں ہیں چندا۔" وہ مجسم مسکرا رہا تھا... نفیسہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"سارے جہاں کا درد دل میں بسا رکھا ہے سوائے مجھ غریب کے۔" نفیسہ کے لہجے میں بے چینی کروٹ بدل رہی تھی۔

"بھئی تم تو میرے قریب ہو پھر درد کا سوال کیوں جبکہ یہ درد تو ہجر کی علامت ہوتا ہے۔" عمیر اس کی جانب مزید کھسکا۔

"آپ سے تو بات کرنا ہی اندھے کے آگے بین بجانا ہے۔" وہ غلط محاورہ بول کر پیر پٹختی واش روم میں جا چکی تھی۔

"عمیر میاں! اب سونے میں ہی عافیت ہے کیونکہ بجلی اور بیوی کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا... "غلط" بجلی کے آنے کا تو پھر بھی ایک شیڈول ہے... مگر بیوی۔" اس نے زور سے آنکھیں میچیں اور سونے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

ایسا نہیں تھا کہ عمیر بکرا افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بینک میں اچھی پوسٹ پر تھا اور اپنی کمائی میں حرام کا

ایک روپیہ بھی شامل کرنا گناہ کبیرہ سمجھتا تھا۔ اس کے والدین اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ سکھر میں رہائش پذیر تھے سو ہر بقر عید پر انہیں بکرے کے پیسے بھجوا تاتھا۔

اس کی چھوٹی بہن جس کے شوہر کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ قربانی کر سکیں اس لیے وہ ہر سال انہیں بکرا گفٹ کرتا تھا تاکہ بہن اور بہنوئی کی خواہش بھی پوری ہو جائے اور انہیں کسی کمی کا احساس بھی نہ ہو۔ جہاں تک اس کی اپنی ذات تھی تو وہ گائے میں حصہ ضرور ڈالتا تھا۔ نفیسہ سے اس نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔ اولاد خدا کے اختیار میں تھی۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں کوئی کمی نہیں تھی مگر ہر سال بکرے کا خناس اس کے دماغ سے چپک جاتا تھا۔ خیر عمیر اسے کسی نہ کسی طرح بہلا ہی لیتا تھا۔ وہ لوگ چھوٹی عید سکھر اور بڑی عید کراچی ہی میں کرتے تھے۔

✡ ✡ ✡

نفیسہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ بھائیوں کے تمام مشاغل میں اس کا شامل ہونا ضروری ہوتا تھا۔ جب بقر عید قریب ہوتی تو وہ محلے کے بچوں کے ساتھ پورا دن ان کے بکروں کے ساتھ گزارا کرتی انہیں نہلاتی دھلاتی خوب صورت رنگوں سے انہیں سجاتی حتیٰ کہ ان کو چارہ بھی ڈالتی تھی۔ اس کے ابا معمولی سے کلرک تھے۔ وہ لوگ بکرا خریدنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے ہر سال بکرے کی خواہش پر اماں سے ٹکا سا جواب ملتا۔ "شادی کے بعد سسرال میں بکرے کی قربانی کیا کرنا" اور اماں کے جواب پہ وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔

گلی محلے سے ان کے گھر ہمیشہ بڑا گوشت آتا تھا اور گلی میں جن بکروں کو وہ سجاتی سنوارتی تھی ان کے گوشت کی خوشبو تک وہ سونگھ نہ پاتی۔ پتا نہیں وہ خود کھا جاتے تھے کہ اپنے دوستوں اور عزیزوں میں بانٹ دیا کرتے تھے۔ نفیسہ اس ناانصافی پر اماں سے جی بھر کے بحث کیا کرتی تو اماں کے چہرے پہ ایک انوکھی سی مسکراہٹ دوڑ جاتی.... "اصل میں قربانی کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ غریب غرباء جو سارا سال چھوٹا گوشت نہیں کھا سکتے سال بعد تو ان کے گھر گوشت کی ہنڈیا چڑھے۔ مگر اس عظیم قربانی کو بھی لوگوں نے میل ملاپ اور تعلقات بڑھانے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ مگر تو ابھی نہیں سمجھے گی۔" اماں سر جھٹکتی اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتیں تو وہ کھڑکی کھول کر گلی کا نظارہ کرنے لگتی کیونکہ اب باہر جانے پہ پابندی لگ چکی تھی۔

✡ ✡ ✡

بقر عید محض تین دن کے فاصلے پر تھی۔ بدقسمتی سے آج اتوار تھا اور جن گھروں میں قربانی کے جانور

نہیں آئے تھے وہاں کے مردوں کے لیے یہ اتوار قیامت کے دن جتنا لمبا ہو چکا تھا۔ عمیر نے متوقع لڑائی سے بچنے کے لیے بلاوجہ ہی اپنی آنکھیں ماتھے پہ رکھی ہوئی تھیں۔ "آج انڈے میں نمک زیادہ کیوں....

ل.....ں ہے۔" کیوں کو خاصا لمبا کھینچا گیا.... مگر دوسری طرف ہنوز اطمینان....

"یہ میں کھا لوں گی' آپ کے لیے اور بنا دیتی ہوں۔"

"چائے میں اس قدر چینی؟" عمیر بھنایا۔

"اوئی اللہ.... چینی تو میں ڈالنا بھول ہی گئی۔"

عمیر نے خجل ہو کر اپنی بغلیں جھانکیں۔

"یہ لیجیے۔" کپ میں ڈالی گئی چینی سے زیادہ' لہجے میں شیرینی تھی۔ اب کے عمیر کا ماتھا ٹھنکا اور ماتھے پہ دھری آنکھوں کو اس نے ان کی صحیح جگہ پہ فٹ کیا۔ نفیسہ جب کوئی فیصلہ کر لیتی تھی تو اس طرح پرسکون ہو جایا کرتی تھی۔ اب عمیر نے خود کو دوسری طرح تیار کیا کیونکہ اب زوجہ محترمہ کو اپنا فیصلہ سنانا تھا تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ وہ چائے کا کپ تھامے اس کے ساتھ آ بیٹھی.... اور ہولے سے کھنکھاری۔

"عمیر پتا ہے....." وہ پر جوش لہجے میں بولی۔

"نہیں مجھے کچھ پتا نہیں۔" وہ بالکل انجان بن کر بھولپن سے بولا۔

"او.... ہو.... وہی تو میں بتانے والی ہوں۔" وہ ہمہ تن گوش تھا مگر نظریں ٹی وی پہ مرکوز رکھیں....

"میں کل ہاجرہ کی طرف گئی تھی۔" (نفیسہ کی اکلوتی دکھ سکھ کی ساتھی دوست)۔

"وہ تو تم اکثر جاتی رہتی ہو؟ پھر۔" عمیر نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے اکسانے بلکہ کچھ اگلوانے کی کوشش کی۔

"اچھا سنو تو سہی ہم نے سانجھا.... بکرا.... خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔" وہ اٹک اٹک کر بولی "اُف خدایا!"

عمیر نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھاما۔

"ہو سکے تو تھوڑی عقل کسی سے تو ادھار لے لو۔ میری لاڈلی ملکہ.....!" اور تاسف سے اسے دیکھا۔

"کیوں جب گائے میں حصے پڑ سکتے ہیں تو بکرے میں کیوں نہیں؟" نفیسہ نے ابرو چڑھا کر تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"ارے نیک بندی.... گائے اور بکرے کے حدود اربعہ میں بہت فرق ہوتا ہے۔" عمیر نے اسے سمجھانا چاہا۔

"اب آگے بھی تو سنو...." نفیسہ نے جیسے کان پر سے مکھی اڑائی۔

"ابھی آگے اور بھی کچھ ہے۔" عمیر نے ٹی وی کی آواز بند کی اور اس کی طرف رخ موڑ کر پوچھا۔

"پانچ پانچ ہزار ہم نے ڈالے ہیں جبکہ تیسرا حصہ خالہ بتول نے ڈالا ہے۔" جوش بھرے لہجے میں بولی۔

"لو جی.... یک نہ شد تین شد....." عمیر نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر لمبا گہرا سانس لیا۔

"چلو یہاں تک تو ٹھیک ہے اب اس کا بٹوارہ کیسے ہو گا؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے لہجہ دھیما رکھا۔

"جب پورا بکرا تین حصوں میں تقسیم ہو گا اور پھر ہر فریق مزید تین حصے کرے گا تو باقی کتنا گوشت بچے گا۔"

عمیر نے اس کے چہرے پہ نظریں ٹکا کر پوچھا۔

"کمال کرتے ہو' حصہ نہ ہوا ریاضی کا سوال ہو گیا زیادہ نہ سہی ایک ہانڈی تو بن جائے گی ورنہ تو ہر سال دوسرے دن بکرے کا سالن نصیب ہوتا ہے۔"

نفیسہ نے معاملے کی گہرائی میں اترنے کے بجائے خیالوں ہی خیالوں میں مٹن ہانڈی چڑھائی۔

"بکرے کے حصوں کا معاملہ پہلی مرتبہ سنا ہے۔ میں ذرا مولوی صاحب سے رائے لے لوں۔" عمیر نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا اور اسے اپنے فیصلے سے باز رکھنے کے لیے ایک نکتہ نکالا.....

"رہنے دیں عمیر صاحب! آپ سے تو میری خوشی برداشت ہی نہیں ہوتی۔ اب مولوی کے پاس جائیں یا مفتی کے پاس' سانجھا بکرا تو ضرور آئے گا کیونکہ خالہ بتول کا شوہر سانجھا بکرا خریدنے جا چکا ہے۔" نفیسہ نے پرزور لہجے میں بات کر کے عمیر کی بولتی بند کرا دی اور ٹیبل سے چائے کا خالی کپ اٹھا کر یہ جا وہ جا۔

دوپہر تک بکرا آچکا تھا۔ طے یہ ہوا کہ آج بکرا ہاجرہ کے گھر بندھے گا۔ دوسرے دن نفیسہ میزبانی کے فرائض انجام دے گی جبکہ قربانی کے دن خالہ بتول اسے اللہ کے سپرد کریں گی۔ ذبح کے وقت تینوں حصے دار قصائی کے پاس موجود ہوں گے.... نفیسہ کی خوشی دیدنی تھی یہ ماہ ذی الحج کی پہلی رات تھی جب ان کی کھڑکی نے چہ.... چوں جیسے نغمے نہیں چھیڑے تھے اور نفیسہ تمام رات مدہوش ہو کر سوئی تھی۔ آج بکرا ان کا مہمان تھا۔ نفیسہ نے بکرے کے ناز نخرے اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور گاہے بہ گاہے عمیر کے خدشات سن کر بے دھیانی میں سرہلاتی رہی.... عمیر نے اس کی سوچ پہ دل ہی دل میں جی بھر کے اسے کوسا

"خالہ بتول جیسی چلتر عورت سے واسطہ پڑا ہے۔ منہ کی نہیں کھائی تو میرا نام بدل کر رکھ دینا۔" وہ منہ میں کچھ بڑبڑاتا بکرے سے لاڈ دلار کرتی بیوی پہ ایک نظر ڈالتا باہر نکل گیا۔

آج عید کے دن کا سورج اپنی قسمت پہ نازاں و فرحاں پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ عمیر تیار ہو کر مسجد چلا گیا تو وہ بھی بڑی فرصت سے تیار ہوئی۔ اس نے رات کو ہی کھیر بنا کر رکھ لی تھی۔ آئینے میں اپنا جائزہ لینے کے بعد وہ کچن میں چلی آئی۔ اس نے کیبنٹ کھولا اور چیک کیا کہ نہاری مسالا موجود ہے۔ سامنے ہی مٹن چانپ مسالا.... مٹن تکہ مسالا اور بہاری مسالا اپنے موجود ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی اب وہ پیاز لہسن اور ٹماٹروں کو نہایت انہماک سے کاٹ رہی تھی۔ دس بج چکے تھے۔ عمیر ابھی تک نہیں آیا تھا۔

"ایک تو میرا شوہر بھی نا.... محلے کے بزرگوں کے ساتھ گپیں لگانے بیٹھ گیا ہو گا۔" تب ہی دروازے کی گھنٹی بجی۔ ساتھ والوں کا بچہ ٹرے تھامے کھڑا تھا۔

"باجی! یہ گوشت اماں نے بھجوایا ہے۔" نفیسہ نے ایک تیکھی سی نظر بچے پہ ڈالی اور ٹرے تھام لی گوشت گائے کا تھا....

"سیفی! تم لوگوں نے تو بکرا کٹوانا تھا؟" بچہ اس کے ساتھ ہی کچن میں چلا آیا۔

"جی باجی بکرا تو سویرے سویرے ہی کٹ گیا تھا۔" بچہ پرجوش ہو کر بولا" نفیسہ نے مڑ کر خالی برتن اسے پکڑایا۔ اور جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا تو پھر بڑا گوشت کیوں....؟ بچہ کافی سمجھ دار تھا.... فوراً" معاملے کی تہہ تک پہنچا۔

"ابا نے اپنے آفس کے دوستوں کی طرف بھجوادیا ہے مگر آپ کو بھی تو اچھا والا دیا ہے۔ نفیسہ نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ انداز ایسا تھا کہ اب کھڑے کیوں ہو.... اپنا چہرہ گم کرو.... تیز طرار بچے نے فوراً" سے بیشتر اپنا مٹکے جیسا منہ گم کرنے میں ذرا دیر نہیں کی۔

"ہنہ.... ابا نے آفس بھیج دیا۔ افسروں کی خوشامد درکار ہو گی.... گلی والوں کو تو جیسے چھوٹا گوشت ڈاکٹروں نے منع کر رکھا ہے۔" نفیسہ کی بڑبڑاہٹیں عروج پر تھیں۔

"پتا نہیں لوگ ثواب کو اپنے لیے عذاب کیوں بناتے ہیں۔"

"ہا.... ہائے باجی! آپ کس سے باتیں کررہی ہیں۔" کام والی نے تو اچانک آکر اسے سچ مچ ڈرا دیا تھا۔

"تم بھی عجیب مخلوق ہو.... اگر ابھی میرا سانس رک جاتا تو۔" نفیسہ نے غصے بھری نظر اس پہ ڈالی۔

"وہ باجی میں تو جب دروازے پر پہنچی تو ایک لمبے تڑنگے سے آدمی نے یہ گوشت کا ٹوکرا مجھے پکڑایا اور یہ جا وہ جا۔"

"اچھا' اچھا اب باتیں کم کرو اور اس گوشت کے تین حصے کرو۔" نفیسہ کے غصے کا گراف تھوڑا کم ہوا.... وہ لوگ ہر سال گھر کا حصہ یتیم خانے میں دے آیا کرتے تھے اور غریبوں کا حصہ کام والی اپنی بستی میں بانٹ دیتی.... باقی برادری کا حصہ گلی میں تقسیم ہو جاتا۔

"یوں کرتی ہوں' پیاز بھون لیتی ہوں اور ٹماٹر بھی ہلکے سے گلا لیتی ہوں۔" آج وہ خود کلامی میں پروین شاکر کو بھی مات دے رہی تھی.... پیاز ہلکی گلابی ہوئی تو اس نے پانی کا چھینٹا مارا اور چولہا بند کر دیا۔

"چلیں جی اب گوشت ہلکا سا فرائی کر کے پھر تمام مسالے ڈالوں گی۔" لاؤنج کا کلاک گیارہ بجا رہا تھا۔

"یقیناً" خالہ بتول کی طرف قصائی لیٹ آیا ہو گا اپنے موبائل کی ٹون اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ بیڈ روم کی جانب بڑھی۔ اس کی بھابی کا فون تھا" چلو ذرا شو ہی مار لوں گی۔"

"ہاں.... ہاں ثمرہ' کہو قربانی ہو گئی.... ہاں ہاں ہمارا بکرا بھی بس ابھی' ابھی ذبح ہوا ہے۔" بھابی سے پورے بیس منٹ بات کرنے کے بعد جب وہ لاؤنج میں آئی تو عمیر صاحب پاؤں پسارے آرام فرما رہے تھے۔

"آپ آگئے' گوشت کہاں ہے؟" اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی' عمیر نے بڑی تسلی سے اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔

"واؤ! کیا کلر پہنا ہے۔ غضب ڈھا رہی ہو۔" اس کے لہجے میں ستائش تھی۔

"میری تعریف کے لیے پورا دن پڑا ہے ابھی تو....؟" عمیر نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے کھینچ کر اسے اپنے پہلو میں بٹھایا۔

"سوچ لو پھر تمام دن یہ پل لوٹ کر نہیں آئیں گے۔" اس کی بھوری آنکھوں میں شرارت رقصاں تھی.... عمیر نے اس کی چوڑیوں کا جلترنگ انگلی سے بجایا۔ مگر نفیسہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"یوں جنگلی ہرن کی طرح مت گھورو ورنہ یہیں بیٹھے' بیٹھے بوڑھا ہو جاؤں گا.... "ہاں...." اس کے لہجے میں پھلجھڑیاں پھوٹ رہی تھیں۔

"عمیر تم گوشت لینے گئے تھے یا کسی حکیم کے پاس.... جس نے تمہیں رومینٹک سیرپ پلا کر بھیج دیا ہے؟" وہ زچ ہو کر بولی۔

"ہاہاہا...." عمیر کا بلند و بانگ قہقہہ گونجا۔

"شکر کرو مسز عمیر کہ سیدھا ہی گھر آیا ہوں.. ورنہ۔"

"پلیز تھوڑا دھیان کریں۔ کام والی کچن میں موجود ہے۔" نفیسہ نے سے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

"اور ہاں وہ گوشت۔" وہ پھر منمنائی۔

"اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم بکرے کے گوشت کی اس قدر شوقین ہو تو میں بینکر بننے کے بجائے قصائی بن جاتا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"سلمان.... نے بھی کافی مٹن دیا ہے میں فریزر میں رکھ آیا ہوں۔" وہ اس کے ساتھ قدم ملا کر کچن کے دروازے تک آیا اور پھر چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"اپنے سانجھے بکرے کا دیدار ذرا دل گردے سے کرنا۔" نفیسہ نے نا سمجھنے والے انداز سے اسے دیکھا اور پھر جیسے ہی سامنے نظر پڑی ایک دم چیخ مار کر عمیر سے لپٹ گئی۔

"نہیں بھئی۔ یہ عید ملنے کا کون سا طریقہ ہے۔ آؤ ہم ذرا سبھاؤ سے ملتے ہیں۔" عمیر نے اسے بمشکل خود سے الگ کیا۔

"یہ کیا مذاق ہے عمیر؟" وہ تقریباً" رو دینے کو تھی۔

"تو کیا خالہ بتول نے یہ ہمارا حصہ نکالا ہے۔"

"ہاں جی بیگم صاحبہ اور بیچاری ہاجرہ کے حصے میں پائے آئے ہیں اور وہ تمہاری چلتر خالہ کہہ رہی تھیں کہ باقی کا گوشت تین حصوں میں بانٹ دیں گی' سانجھا ثواب ملے گا۔" عمیر نے ہنستے ہوئے اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا.... نفیسہ نے ڈرتے.... ڈرتے دوبارہ سلیب کی جانب دیکھا جہاں بکرے کا دو لمبے سینگوں والا سر' بڑی بڑی حیرت زدہ کھلی آنکھیں' لٹکتی ہوئی لال زبان.... سانجھا بکرا بیچارہ خود اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہا تھا.... نفیسہ نے بے اختیار ٹھنڈا لمبا سانس بھرا۔

"شاید مجھے سانجھا ثواب مل ہی جائے مگر میں خالہ بتول کو چھوڑوں گی نہیں۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ام سعدی

میں تنہا نہیں

دوپہر کی تمازت جب سہ پہر کا زینہ پھلانگ کے شام کی سرحد پر آن کھڑی ہوئی تو کالونی کے بیچوں بیچ بنے اونچی ڈھلوانی چھت اور وسیع آنگن والے اس پرکشش اور خوب صورت گھر کے عین درمیان کھڑا، دوپہر کی حدت سے مرجھایا ہوا چنار کا سال خوردہ درخت اس وقت کھل اٹھا، جب آگے پیچھے نوجوان

لڑکے لڑکیوں کا ایک غول، ہاتھوں میں گیند بلا تھامے گول برآمدے کی چار سیڑھیاں ایک جست میں عبور کرتا برآمد ہوا اور صحن میں میچ کھیلنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

نوجوانی کی حدود کو چھوتے پھلانگتے یہ تمام بچے، اسی چنار کی مشفق چھاؤں میں کھیل کر بڑے ہوئے تھے اور اس وسیع آنگن سے پرے "گول برآمدے کو عبور کرکے، وسیع راہداریوں اور پیچ در پیچ کمروں سے گھومتے گھماتے گھر کے مشرقی رخ پر بنے "اس گھر کے سب سے وسیع ہال نما کمرے میں بابا جانی کے رنگین پایوں والے کشادہ پلنگ کے عین سامنے بچھی افغانی طرز کی فرشی بیٹھک پر اس وقت بابا جان اپنی چار بیٹیوں، دو بیٹوں اور بہوؤں کے ساتھ بیٹھے تھے۔

بابا جان، سید سبط نبی شاہ، اپنی اہلیہ سیدہ زہرہ بی بی کے جانے کے بعد تنہائی اور اداسی کی گھمن گھیریوں میں کچھ اس طرح سے الجھے کہ وہ تو ہنسی اور مسکراہٹ کا مفہوم ہی بھول جاتے جو اگر آج چاروں بیٹیاں یوں یک دم دھاوا نہ بول دیتیں۔ بیٹیوں اور نواسے نواسیوں کی آمد نے آج سبط نبی شاہ کو ایسی خوشی سے ہم کنار کیا، جو آج سے قبل کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔

انہیں لگا کہ ان کے اس اونچی چھت اور بلند دیواروں والے وسیع کمرے کے رنگین شیشوں والے روشن دانوں کے پاس پر پھیلائے اونگھتا، اداسی اور قنوطیت کا بوڑھا بے زار گدھ ہڑبڑا کے جاگا اور پر پھڑپھڑاتا ہوا، پھر سے اڑ گیا ہو۔ وہ خود کو ویسا ہی تازہ دم اور توانا محسوس کرنے لگے۔ جیسے چار بیٹیوں کے بعد پیدا ہونے والے باسط علی شاہ اور مصباح شاہ کی پیدائش پر کیا تھا۔

گفتگو خاندانی سیاست اور سیاسی خاندانوں سے

ہوتی، معاشرے میں فروغ پاتی بے حیائی و مہنگائی کو چھوتی، اسلامی ریاستوں کے کمزور ڈھانچوں اور اہل مغرب کی بڑھتی اجارہ داری کو پھلانگتی "اسلام کی بنیادی تعلیمات سے سفر کرتی "اسلام میں عورت کے مقام تک آکر رک سی گئی۔

اور جس وقت بھابیاں زندگی میں پہلی بار بحیثیت عورت، نندوں کی حمایت میں زور و شور سے بول رہی تھیں، ٹھیک اسی وقت ٹین کی چھت پر گیند زور سے آکے لگی۔ لکڑی کی سیلنگ کے اوپر آواز گونجی اور پھر ڈھلوان ہونے کے سبب گیند خود ہی ٹپاٹپ نیچے گر گئی۔ کمرے میں یک دم خاموشی سی چھا گئی۔

پھر عفت آرا، سبط نبی شاہ کی سب سے بڑی بیٹی نے ہولے سے کھنکھار کے اس خاموشی کو توڑا اور گویا ہوئیں۔

"اسلام پر بحث کرنے میں تو ہم سب آگے آگے ہوتے ہیں مگر عمل کوئی نہیں کرتا۔"

بڑی بھابی، سبینہ بی بی کچھ کہنے لگی تھیں کہ عفت آرا کے اٹھتے ہاتھ نے انہیں خاموش اور باقی سب کو حیران کردیا تھا تو کیا گفتگو سنجیدہ رخ مڑنے والی تھی۔

عفت آرا چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنی ازلی ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئیں۔

"جیسا کہ ہمارے شرعی اور جائز حق سے آپ سب کی چشم پوشی؟ آج ہم اسی لیے آئی تھیں کہ بالا ہی بالا مسئلہ نمٹانے کا نہ سوچا جائے گو کہ اماں جانی کے بعد اس کشادہ "شاہ ہاؤس" کے مکینوں کے دل تنگ پڑنے لگے ہیں۔"

ایک لمحہ رک کر سب پر نگاہ کی، بہنیں آگاہ تھیں، بھابیاں پریشان بھائی حیران۔

منجھلی فرحت آرا وقفہ غنیمت جانتے ہوئے بولیں۔

"اور اگر مسئلہ مل بیٹھ کے نہیں نمٹتا تو عدالتیں موجود ہیں۔ ہمارے حق سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔"

شوہر سول جج تھے، طنزیہ نگاہ بابا جان کے جھکے سر پر ڈالی اور بات جاری رکھی۔

"نقد حصہ ہمیں دے دیں اگر حیثیت نہیں تو قرضہ لے لیں، نہیں تو گھر بیچ بھی سکتے ہیں۔"

یہ کہتے ان کا دل کانپا یا نہیں، بابا جان کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزا تھا، لمحے بھر کو تو تھم سا گیا پھر تھم تھم

کر چلنے لگا۔ زہرہ بی بی تو کہتی تھی یہ بیٹیاں غم گسار و ہمدرد ہوں گی' آپ کی طاقت بنیں گی' میں جو تاعمر بیٹیوں سے ایک فاصلے پر رہا' انہیں حقیر جانا تو کیا ٹھیک کیا؟ دیکھو تو زہرہ بی بی! یہ آج چھت چھیننے چلی آئیں تمہاری شاہزادیاں' کیا اب سید سبط نبی شاہ کی پگڑی کچہریوں کے دھکے کھائے گی' وہ بھی ان بیٹیوں کے ہاتھوں۔

وہ خاموش بیٹھے تھے اور سوچیں تھیں کہ حملہ آور۔ دل نامی بستی میں کہیں درد چٹکیاں لیتا تھا۔ انہیں لگا جیسے اداسی و تنہائی کا بوڑھا گدھ کسی دھندلے شیشے کے پار سے انہیں جھانک کر تمسخرانہ ہنستا ہو اور کہہ رہا ہو۔

"مان لے میرے بوڑھے دوست' تمہارا یارانہ میرے ساتھ ہی جچے گا۔"

انہوں نے اک نگاہ اس وسیع کمرے پر دوڑائی یہ کمرہ ان کی ڈھیروں یادوں کا امین' یہاں ان کی اولین محبت زہرہ بی بی کے مہندی رچے ہاتھوں کی خوشبو پھیلی تھی' یہیں بچوں کا بچپن ہنستا روتا رخصت ہوا' یہیں سے آنسوؤں اور دعاؤں کی بارش میں بیٹیوں کے ڈولے اٹھے' یہیں بیٹیوں کی شادیوں کی شہنائی بجی۔ یہیں زہرہ بی بی نے انہیں جدائی کے ہر دم سلگتے انگارے جیسا دکھ دیا اور کیا اب اس کمرے سے جدا ہو کے وہ خوش' بلکہ خوشی کیا معنی وہ زندہ رہ پائیں گے اور بیٹیاں تو ان کے دکھ سے ناآشنا ہیں۔ انہوں نے ایک آزردہ نگاہ بیٹیوں کے مطمئن مگر خود غرض چہروں پر ڈالی۔

"ہم یہ سب نہیں چاہتے باسط علی شاہ۔" یہ عفت آرا ہی تھیں۔ بردبار لہجے میں مقابل کو زیر کر دینے والی۔

مان سمیٹے سندیسوں کی منتظر رہتی ہیں۔ ہمارا انتظار لاحاصل ہی رہا۔ میکے سے کیا گیا ایک فون سسرال میں فخر کے دس تمغے سجاتا ہے مگر ہمارا فخر مٹی میں ملتا رہا۔"

بھائی شرمندہ' بابا جان پشیمان اور بھابیاں "اونہہ"

تو گویا زہرہ بی بی تمہاری جدائی نے تمہاری شاہزادیوں کو بھی تنہا کر دیا اور میں' میری کیا اتنی حیثیت تھی میں جو تاعمر سر اٹھائے چلتا رہا۔ بیٹیاں اتنی حقیر مخلوق کہ جھک کر نظر نہ ڈالی کہ شملہ نہ گر جائے۔

عفت آرا کی آواز پھر سے اس اونچے کمرے کی چھت سے ٹکرا کر گونجنے لگی۔

"ہم آپ سب کو یاد دلانے آئے ہیں کہ۔" بابا جان کی طرف ایک نگاہ ڈال کر گویا انہیں بھی شامل کیا کہ "کہ ہم سب بابا جان کی اس واحد جاگیر' اس "شاہ ہاؤس" میں برابر کے حصے دار ہیں۔ مگر تاحیات بابا جان کہ خدا اور دراز کرے۔" عقیدت سے دعا کی۔

"اس تقسیم کی بات خلاف شرع ہے مگر۔" بھائیوں' بھابیوں کی طرف نگاہ کی جو دم سادھے سن رہے تھے۔ ان کے تئیں کوئی رکاوٹ نہ تھی بابا جان گھر ان کے نام کر دیتے اور سب مسئلے ختم۔ مگر یہ بہنیں؟ پھر حصے کی رقم اور کورٹ کی دھمکی نے سارے کس بل نکال دیے سوچنے پر مجبور تھے۔

"ہم سب بہنیں بہت ممکن ہے کہ اپنا اپنا حصہ بھائیوں کو ہبہ بھی کر دیں۔"

بھائیوں' بھابیوں کے چہرے پر امید' روشنی بن کر چمکی اور بابا جان نے جھکا سر اٹھایا تو کیا یہ حصہ لینے نہیں آئیں تو پھر "ان کی سوچ کو پھر عفت آرا کی آواز نے منتشر کیا لگتا تھا یہاں آج صرف وہ بولنے آئی ہیں۔

"ہم سب بخوشی ہبہ کر دیں گے مگر مناسب وقت آنے پر جب حسب شرع جائیداد کی تقسیم کا وقت آئے گا۔ مگر بشرطیکہ ہمارے عزت و احترام اور فخر و مان میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔ دنیا دکھاوے کو ہی سہی' اماں جان والی ساری روایات کی ذمے داری و پاس داری آپ پر عائد ہوتی ہے اور آپ انہیں نبھائیں گے۔"

"فرحت آرا تو سدا کی جذباتی اور نادان ہیں۔ ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں بلکہ ہمیں تو یہاں آنے پر آپ سب نے مجبور کیا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔ گزرے ڈیڑھ برس کی بیتی عیدیں' شبراتیں کہ جب بیٹیاں میکے سے روانہ کیے گئے عزت

وہ بطور خاص بھائیوں بھابیوں سے مخاطب تھیں۔
"اور سب سے اہم' باباجان کا یہ کمرہ ہمارے نام سے منسوب کردیا جائے گا۔ اس پر ہم سب کا حق تسلیم کیا جائے اور ہم سب کی باہمی رضامندی و اجازت سے یہاں سے ایک پتا بھی نہ ہلایا جائے گا۔"
"مگر آپا! اگر پچھلا پورشن آپ سب کے لیے تیار کردیا جائے تو۔ میرا مطلب ہے' یہ کمرہ تو" بڑی بھابی نے کچھ کہنے کی کوشش میں بات گنوائی۔
"نہیں سبینہ بی بی' ہم ماننے نہیں' منوانے آئے ہیں۔"
اور فکر کے ڈوبتے ابھرتے بھنور میں غوطے کھاتے باباجان نے سر اٹھایا۔
"تو کیا یہ سب اپنے فخر' سسرال میں نام نہاد عزت کے لیے کررہی ہیں یا پھر؟ اور اگر یہ سب سچ ہے تو پھر اس کمرے کا ذکر؟ کیا کبھی کبھی کی جائے پناہ' یا پھر یہ میرے دکھ سے آشنا' میرا غم بٹانے آئی ہیں۔ کاش یہی سچ ہو۔"
"ہمیں سب منظور ہے آپا۔" باسط علی شاہ نے سبینہ بی بی کو آنکھوں آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا کہ یہ تو منافع بخش سودا تھا بہرحال "آپ کی سب باتیں سر آنکھوں پر' آپ کی عزت و تکریم ہمارا فرض ہے۔ ہم گزشتہ کوتاہیوں کے لیے معافی چاہتے ہیں۔ باباجان نے بھی ہمیں احساس نہ دلایا۔"
"تو کیا میری اتنی حیثیت تھی؟" باباجان نے یک دم انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں سوالیہ حیرت سے نگاہیں چراتے باسط علی شاہ اٹھ کھڑے ہوئے کہ اب بیٹھنا فضول تھا۔ سبینہ بی بی اور چھوٹی بی بی نے پیروی کی۔ مصباح شاہ وہیں ایک کونے میں بیٹھے رہ گئے اور پیچھے کمرے میں اپنے ہی احساس سے ابھرتی ڈولتی خاموشی کو عفت آرا کی مانوس آواز نے ہی سہارا دیا جو اب سر اور نگاہیں جھکائے باباجان کے زانو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ۔
"اگر ہم نے آپ کا دل دکھایا ہو تو ہمیں معاف کردیں باباجان! ہمارا مقصد کسی طور آپ کو دکھ دینا نہ تھا۔ ہم بفضل خدا اور آپ کے سمجھ دار فیصلوں کی بدولت انتہائی معزز خاندانوں میں عزت کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ مگر یہ سب ضروری تھا۔ ناگزیر ہوگیا تھا اور آپ۔"
زانو پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا اور مضبوط لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ اتری۔ "آپ کیوں چپ رہے باباجان' کیوں خاموشی اختیار کی۔ یہ حق تو مذہب نے بھی آپ کو نہیں دیا کہ اپنی زندگی میں اپنا اختیار بیٹوں کے حوالے کردیں۔ اور ہمیں مطلع تک نہ کیا۔ اور یہ کمرہ آپ کا غم گسار و دم ساز' چپ چاپ آپ نے اس سے جدائی گوارا کرلی کہ اسے جدید ڈرائنگ روم کے نام پر نئی نسل کے بے ہنگم مواقعوں کے لیے مخصوص کردیا جائے' دن رات یہاں غل غپاڑہ مچے اور آپ کے لیے اذیت کا سامان مہیا کیا جائے۔" عفت آرا کے لہجے میں تلخی اتری اور نم آنکھوں کے ساتھ باباجان کا ضبط ڈولا۔
وہ کانپتی آواز میں بولے۔ "میں بوڑھا' مجبور' تنہا کب تک جوان پوتے پوتیوں اور بااثر بیٹے بہوؤں کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہوتا۔"
چاروں بیٹیوں کا دل کانپ سا گیا۔ وہ دائرے کی صورت یوں باباجان کے گرد آ بیٹھیں۔ گویا کسی ننھے بچے کی طرح انہیں ہر آفت سے بچالینا چاہتی ہوں۔
عفت آرا پھر بولیں۔ "ہم بیٹیوں کے ہوتے ہوئے آپ تنہا باباجان! یہ آپ کی ہی نہیں باقی سب کی بھی غلط فہمی تھی۔ جو کہ یقیناً "ختم ہوگئی ہوگی' کوئی اب آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔"
وہ مصباح شاہ کی طرف دیکھ کر بولیں جو مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔
"باباجان کو نہ ہو' مگر مجھے آپ سب کی طاقت پر بھروسا تھا آپا!"
وکٹری کا نشان بناتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے نکلتے ہی چاروں بیٹیاں' باباجان کے جھکے کندھوں کے ساتھ آلگیں اور انہیں محسوس ہوا کہ زہرہ بی بی ٹھیک کہتی تھیں۔ یہ ہی تو اصل طاقت ہیں۔ ہر دکھ درد کی ساتھی۔

☆

آتشِ رفتہ کا سراغ

آگ کیسی لگی ہے تن من میں
کیسے شعلوں میں جل کے آئے ہیں
قطرہ قطرہ پگھل کے آئے ہیں
تیری محفل میں حاضری کے لیے
کیسے کیسے جتن کیے ہم نے
روپ کیا کیا بدل کے آئے ہیں
یوں نہ کر اب سوال کی توہین
یہ ادھورے جواب رہنے دے
تجھ سے ممکن نہیں جو چارہ گری
درد کو بے حساب رہنے دے
دل سے لے جا ہر ایک یاد اپنی
بجھتی آنکھوں میں خواب رہنے دے
اس قدر مفلسی میں پاس مرے
یہ دھواں چھوڑتا چراغ سہی
کچھ تو خانہ خراب رہنے دے

امجد اسلام امجد

اے دل وہ عاشقی کے زمانے کدھر گئے
وہ عمر کیا ہوئی، وہ فسانے کدھر گئے

ویراں ہیں صحن و باغ، بہاروں کو کیا ہوا
وہ بلبلیں کہاں، وہ ترانے کدھر گئے

تھے وہ بھی کیا زمانے کہ رہتے تھے ساتھ ہم
وہ دن کہاں ہیں، اب وہ زمانے کدھر گئے

ہے نجد میں سکوت، ہواؤں کو کیا ہوا
لیلائیں ہیں خموش، دوانے کدھر گئے

صحرا و کوہ سے نہیں اٹھتی، صدائے درد
وہ قیس و کوہ کن کے ٹھکانے کدھر گئے

دن رات میکدے میں گزرتی تھی زندگی
اختر وہ بے خودی کے زمانے کدھر گئے

اختر شیرانی

تم ہی یاد آتے ہو

بارشوں کے موسم میں، رنجشوں کے عالم میں
سیاہ ابر کے ٹکڑے
جب آسماں پر چھاتے ہیں
دل کے صحن میں یادیں
جب بوند بوند گرتی ہیں
تم ہی یاد آتے ہو

رات کے اندھیرے میں
سیاہ بڑی سی چادر پر
چاند تاروں کے موتی
دل کی فگار انگلی سے
آنسوؤں کے ریشم کو
جب [illegible] کاڑھتی ہوں
تم ہی یاد آتے ہو

جب بھی کام کرتے وقت
دھیان کی بھٹکی رو ہو
تم سے جا الجھتی ہے
اک سرخ چھالہ سا
سسکی کی صورت میں
جب ہاتھ پہ ابھرتا ہے
تم ہی یاد آتے ہو

جب شام ڈھلتے ہی
زندگی کے میلوں سے تھک کر ہر کوئی
گھر کو لوٹ جاتا ہے
تمہاری واپسی کی خاطر
جوڑی ہوئی ہتھیلی پر
دعاؤں کے بھیگے پھول
جب ڈھیرے ڈھیرے گرتے ہیں
تم ہی یاد آتے ہو

اُمِ ثمامہ

پھول، پتے، شجر اور حسیں لڑکیاں
خوشبوؤں کے نگر کی مکیں لڑکیاں

دل کی سنتی نہیں، دل کی کہتی نہیں
بولنے میں مگن دل نشیں لڑکیاں

اپنی مرضی کی 'ہاں' جو نہیں سن سکیں
بھولتی ہی نہیں وہ 'نہیں' لڑکیاں

اپنی عادت سے اکثر رہیں بے خبر
سرمئی دھوپ سی ریشمیں لڑکیاں

بارشوں کی مہک سے مہکنے لگیں
گیلی مٹی سی وہ عنبریں لڑکیاں

اپنے ظاہر سے واقف، نہ باطن سے ہی
یہ سنہری بدن، صندلیں لڑکیاں

سید کامی شاہ

پہچان

وکیل استغاثہ نے گواہ پر جرح شروع کی۔ گواہ قصبے کی سب سے قدیم مائی تھی۔

وکیل بھرپور اعتماد سے مائی کی طرف بڑھا اور اس نے پوچھا۔ ”مائی بشیراں کیا تم مجھے جانتی ہو؟“

مائی بشیراں: ”ہاں قدوس! میں تمہیں اس وقت سے اچھی طرح جانتی ہوں جب تم ایک بچے تھے اور سچ پوچھو تو تم نے مجھے شدید مایوس کیا ہے۔ تم جھوٹ بولتے ہو اپنی بیوی کو دھوکا دیتے ہو۔ تم لوگوں کو استعمال کر کے پھینک دیتے ہو اور پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتے نہیں تھکتے۔ تمہاری کھوپڑی میں مینڈک جتنا دماغ بھی نہیں ہے۔ ہاں میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“

وکیل ہکا بکا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا پوچھے۔ گھبراہٹ میں اس نے وکیل دفاع کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا۔

”مائی بشیراں! تم اس شخص کو جانتی ہو؟“

مائی بشیراں: ”او نہیں تو کیا عبدالغفور کو نہیں جانتی؟ اسے اس وقت سے جانتی ہوں جب یہ لنگوٹ میں گھومتا تھا اور سارا محلہ ناک پر ہاتھ رکھ کر اس سے دور بھاگتا تھا۔ یہ یہاں کا ست ترین بندہ ہے اور ہر ایک کی برائی ہی کرتا ہے۔ اوپر سے یہ ہیروئنچی بھی ہے۔ کسی بندے سے یہ تعلقات بنا کر نہیں رکھ سکتا اور شہر کا سب سے نکما اور ناکام وکیل یہ ہی ہے۔ چار بندیوں سے اس کا افیئر چل رہا ہے۔ جن میں سے ایک تمہاری بیوی بھی ہے۔“

”ہاں اس بندے کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“

جج نے دونوں وکیلوں کو اپنے پاس بلایا اور آہستہ سے بولا۔

”اگر تم دونوں احمقوں میں سے کسی نے مائی بشیراں سے یہ پوچھا کہ وہ مجھے جانتی ہے تو دونوں کو پھانسی دے دوں گا۔“

(افشاں خان... شاہ پور چاکر)

اخبار

”میری پرنٹ یا الیکٹرونک میڈیا سے زیادہ وابستگی تو نہیں... لیکن اپنے تجربے کی بنیاد پر بتا رہا ہوں کہ پاکستان کے نیوز پیپرز میں سب سے اچھے دو اخبار ”نوائے وقت“ اور ”جنگ“ ہیں۔“

”نوائے وقت“ میں پراٹھے دیر تک گرم رہتے ہیں جبکہ ”جنگ“ پکوڑوں میں سے تیل چوسنے میں ثانی نہیں رکھتا۔

عطیہ حق نواز... شاہ پور چاکر

سبق

ایک خاتون خریداری کرنے مال میں گئیں۔ کیش کاؤنٹر پر ادائیگی کرنے کے لیے انہوں نے پرس کھولا تو دکان دار نے خاتون کے پرس میں ٹی وی کا ریموٹ دیکھا۔ دکان دار سے رہا نہیں گیا تو اس نے پوچھا۔

”آپ ٹی وی کا ریموٹ ہمیشہ اپنے ساتھ لے کر چلتی ہیں؟“

”نہیں... ہمیشہ نہیں... لیکن آج میرے شوہر نے خریداری کے لیے میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا۔ تو میں ٹی وی پر ’ہندی‘ چینل لگا کے آئی ہوں۔“

دکان دار ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں تمام سامان واپس رکھ لیتا ہوں کیونکہ آپ کے شوہر نے آپ کا کریڈٹ کارڈ بلاک کر دیا ہے۔“

پہلا سبق.... اپنے شوہر کے شوق کا احترام کریں۔
لیکن کہانی ابھی جاری ہے۔

خاتون تھوڑا ہنسی، پھر اپنے پرس سے اپنے شوہر کا کریڈٹ کارڈ نکالا اور تمام بلوں کی ادائیگی کر دی۔

(شوہر نے بیوی کا کارڈ بلاک کیا تھا' اپنا نہیں)

دوسرا سبق.... عورت کی طاقت کو کبھی کم نہیں سمجھنا چاہیے۔

فوزیہ ثمروٹ.... گجرات

کارکردگی

ایک صحافی نے جائے واردات پر پہنچ کر تفتیشی افسر سے پوچھا۔

"آپ کو ملزمان کے سلسلے میں کوئی کامیابی حاصل ہوئی؟"

"جی ہاں! ہمیں سب معلوم ہو گیا ہے۔" تفتیشی افسر نے جواب دیا۔ "چند نامعلوم مسلح افراد ایک نامعلوم کار میں آئے اور ڈکیتی کرنے کے بعد نامعلوم مقام کی جانب روانہ ہو گئے۔"

ملائکہ کوثر.... بسم اللہ پور

باخبر

حمید صاحب، سلمان سے کہہ رہے تھے۔ "جب تم نے سلمیٰ سے شادی کی درخواست کی تو تمہیں یہ بھی کہہ دینا چاہیے تھا کہ تم اپنے آپ کو اس کے قابل نہیں سمجھتے۔ اس طرح عورت ذرا خوش ہو جاتی ہے۔"

سلمان میاں قدرے بے چارگی سے بولے۔ "میں یہ بات کہنے ہی لگا تھا.... لیکن اس نے میرے بارے میں یہ بات مجھ سے پہلے ہی کہہ دی.... کہ وہ مجھے اپنے قابل تو نہیں سمجھتی ہے لیکن والدین کے مجبور کرنے پر ہاں کہہ دی ہے۔"

ارم کمال.... فیصل آباد

حسن شناس

ایک صاحب نے خواتین کے دل میں گھر کرنے کے لیے یہ نسخہ اپنایا ہوا تھا کہ وہ ہر خاتون کو حسین قرار دیتے اور ان کے حسن کی خوب تعریف کرتے تھے۔

ایک محفل میں وہ کہہ رہے تھے۔ "ہر عورت خوب صورت ہوتی ہے۔ اگر اس میں خوب صورتی تلاش کی جائے تو ضرور مل جاتی ہے۔ میں نے تو زندگی میں کوئی ایسی عورت دیکھی ہی نہیں جسے میں بدصورت کہہ سکوں۔"

ان کی ہمت افزا باتیں سن کر ایک خاتون نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا، جن کی ناک بالکل چپٹی تھی۔ وہ اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

"میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ صاحب بلا تامل بولے۔ "بے شمار دوسری عورتوں کی طرح آپ بھی حسن کا ایک شاہکار ہیں، جو آسمان سے زمین پر اترا ہے.... فرق بس یہ ہے کہ آپ شاید جلدی اور گھبراہٹ میں ناک کے بل زمین پر اتری ہوں گی۔"

ثمرہ جاوید.... بسم اللہ پور

فیصلہ

آنریری جج نے ملزم کے مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں جیل کا آرام و آسائش کبھی نہ دوں گا۔ میں نے حکم دیا ہے۔ تمہیں آزاد کر دیا جائے، تاکہ تم سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے پھرو، واپڈا والے تمہیں غلط بل بھیجیں اور تم ان کے دفتروں میں سارا سارا دن دھکے کھاؤ۔ بیروزگاری تمہارا کچومر نکال دے۔ کھانے پینے کی اشیا تمہیں ملاوٹ شدہ ملیں۔ سیاسی لیڈر تمہارا ناطقہ بند کر دیں۔ پولیس بار بار آوارہ گردی میں تمہارا چالان کرے اور لوڈشیڈنگ رات بھر تمہیں سونے نہ دے۔"

ساجدہ افتخار۔ کراچی

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک آدمی نے کہا۔" اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا۔"

تو اللہ عزوجل نے فرمایا۔" کون ہے جو مجھ پر اس بات کی قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں شخص کو نہیں بخشوں گا، بے شک میں نے اس کو بخش دیا۔ اور تیرے عمل میں نے برباد کر دیے۔" (مسلم)

سیدنا حسین بن علی کی سخاوت،

ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ بیس یا تیس اونٹ لے کر مدینہ حاضر ہوا تاکہ لوگوں سے کھجوروں کا سوال کروں تو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ عمرو بن عثمان اور حسین علی رضی اللہ عنہ اپنے باغوں میں ہیں اس لیے ان سے جا کر مانگو۔

چنانچہ سب سے پہلے میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے فرزند حضرت عمرو بن عثمان کے پاس پہنچا۔ انہوں نے دو اونٹ بھر کر کھجوریں عطا فرمائیں۔ پھر کسی شخص نے مجھے مشورہ دیا کہ تم حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ۔ چنانچہ میں ان کے باغیچے میں پہنچا۔ میں انہیں پہچانتا نہیں تھا۔ دیکھا کہ ایک صاحب زمین پر بیٹھے ہیں اور ان کے اردگرد غلام بیٹھے ہیں۔ درمیان میں ایک بڑا پیالہ ہے جس میں موٹی روٹی اور گوشت ہے۔ اور وہ سب مل کر کھا رہے ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا اور دل میں سوچا کہ یہ ــــ تو شاید کچھ نہ دیں۔ بہرحال حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مجھے پاس بلایا اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ پھر پانی کی ایک چھوٹی نہر کی طرف گئے۔ پانی پیا اور ہاتھ دھوئے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"کیسے آنا ہوا؟"

میں نے عرض کیا کہ "میں اپنے کچھ اونٹ لے کر یہاں حاضر ہوا تھا۔ میرا ارادہ آپ حضرات سے کھجوریں لے کر انہیں بھر کر لے جانے کا ہے۔"

حضرت حسین نے فرمایا۔" جاؤ اپنے اونٹ لے آؤ۔"

چنانچہ میں لے کر حاضر ہوا تو فرمایا۔

"اس کوٹھڑی میں چلے جاؤ۔ اس میں کھجوریں رکھی ہوئی ہیں۔ جتنا بھر سکو بھر لو۔"

راوی کہتے ہیں کہ میں نے اپنی ساری اونٹنیاں بھر لیں اور چلا آیا۔ اور دل میں سوچنے لگا کہ واقعی یہ ہے سخاوت۔ (مکارم الاخلاق)

موتی مالا،

☆ بد دعا رب سے اعتماد اٹھا دیتی ہے اور جو دعا کے قریب نہیں جا سکتا، وہ خدا کے قریب نہیں جا سکتا۔ (واصف علی واصف)

☆ ہر مشکل انسان کی ہمت کا امتحان لیتی ہے۔ (سقراط)

مصباح صفدر۔ سمندری

حلال اور حرام،

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا۔" ذبح کیے ہوئے جانور اور مردہ جانور کے گوشت میں فرق کیسے کیا جائے؟"

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔" اگر گوشت آگ کی تپش سے سکڑتا ہے تو ذبح کا ہے لیکن اگر پھیلتا ہے تو مردار کا ہے۔"

صدقے کی برکت،

حکیم الامت حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ جلال آباد کے ایک رئیس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ جب بیمار ہوتے تو حکیم کو بلاتے۔ اس کے لیے گاڑی بھیجتے فیس دیتے اور حکیم جی سے کہتے کہ آپ بلا تامل جتنے کا چاہیں نسخہ لکھیے۔ دس کا، بیس کا، پچاس کا۔ چنانچہ حکیم جی نسخہ لکھ دیتے۔ ملازم کو دیتے کہ جاؤ بھائی عطار کو دکھاؤ کتنے کا ہے۔ عطار کہتا کہ پچیس روپے کا ہے تو وہ کہتے۔ لاؤ صندوقچی "اسی وقت پچیس روپے گن کر دیتے کہ جاؤ خیرات کر دو مساکین کو۔" میری یہی دوا ہے۔ چنانچہ جب یہ عمل کرتے تو فوراً اچھے ہو جاتے۔

(خطبات حکیم الامت)

ثمرہ، اقرأ۔ کراچی

آرام طلبی،

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں "اہل مروت کے لیے دنیا میں آرام طلبی ٹھیک نہیں۔ کیونکہ ایسے لوگ تمام زمانہ مصیبت میں رہتے ہیں۔" نیز فرمایا۔ "جب تیرے دوست کو اقتدار مل جائے تو جس قدر محبت اس کو تجھ سے پہلے تھی اس کے بیسویں حصے پر راضی ہو جا، جس نے زندگی بھر تیرے ساتھ نیکی نہ کی ہو۔ اس کی موت پر تیری آنکھ کو رونا نہیں چاہیے۔

(مخزن صفحہ نمبر 193)

میٹھی زبان،

حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ زندگی کو سادہ رکھو، مگر خیالات کو بلند۔ ظلم کرنا آسان ہے مگر سہنا بہت ہی مشکل... میٹھی زبان بے شمار دشمنوں سے بچاتی ہے!"

ابن جدعان کی بے سود فیاضی،

عبداللہ بن جدعان بن کعب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا رشتے میں چچا لگتا تھا۔ اس کا شمار زمانہ جاہلیت کے ان لوگوں میں ہوتا تھا جو لوگوں کو کھانا کھلاتے اور امداد فراہم کرنے میں صف اول میں گنے جاتے تھے۔ شروع شروع میں یہ فقیر اور کنگال تھا۔ بد چلنی اس کی عادت تھی اور معصیت و گناہ کے کاموں میں بکثرت ملوث رہنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔

اس کی اخلاقی پستی اور شرارتوں سے تنگ آکر اس کے خاندان اور اس کے قبیلے والے اسے نفرت سے دیکھتے تھے۔ اس کا گھرانہ بلکہ اس کا باپ بھی اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔ گھر، خاندان اور قبیلے کی نفرت انگیز نگاہوں کی تاب نہ لاکر وہ ایک دن مکہ مکرمہ کی گھاٹیوں کی طرف نکل پڑا۔ اس کی نظر پہاڑ کی ایک کھوہ پر پڑی۔ سوچا ممکن ہے اس کے اندر کوئی موذی جانور ہو۔ جو مجھے موت کے گھاٹ اتار دے۔

چنانچہ جان بوجھ کر کھوہ کی طرف بے خوف بڑھا تاکہ خود کو موت کے منہ میں ڈال دے۔ جب وہ غار کے قریب پہنچا تو اسے ایک اژدہا نظر آیا۔ جو لگتا تھا جیسے اس کی طرف بڑھنے کے لیے چھلانگ مارنے ہی والا ہے۔

یہ دیکھ کر وہ کسی خطرے کی پروا کیے بغیر اس کی جانب بڑھنے لگا۔ جب اژدہا کے قریب ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ سونے کا بنا ہوا ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں یاقوت لگے ہوئے ہیں۔ وہ چمک رہے تھے۔

وہ غار کے اندر داخل ہوا۔ غار میں قبیلہ جرہم کے بادشاہوں کی قبریں تھیں۔ ایک قبر حارث بن مضاض کی بھی تھی جو ایک طویل مدت پہلے غائب ہو گیا تھا۔ اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ آخر وہ کدھر گیا؟ آیا اسے آسمان نے اچک لیا یا زمین کھا گئی۔

عبداللہ بن جدعان کو ان قبروں کے سرہانے سونے کا ایک تختہ ملا، جس پر ان بادشاہوں کی تاریخ وفات اور مدت حکومت کی تفصیل درج تھی۔

نیز ان کی قبروں کے پاس ہیرے، جواہرات اور سونے چاندی کا انبار تھا۔ عبداللہ بن جدعان نے غار کے اندر سے حسب خواہش جواہرات لیے اور غار کے منہ پر پہچان کے لیے نشان لگا کر نکل گیا۔

جب وہ لوٹ کر اپنی قوم کے پاس آیا تو انہیں دولت سے نوازا۔ چنانچہ لوگ اس کو محبوب جاننے لگے۔ اور اپنا سردار بھی تسلیم کر لیا۔ عبداللہ بن جدعان لوگوں کو کھانا کھلاتا اور جب کبھی اس کے پاس دولت ختم ہو جاتی تو حسبِ خواہش غار سے ہیرے جواہرات اور سونا چاندی نکال لاتا۔

لوگوں کو کھانے میں کھجور اور ستو دیتا اور پینے میں دودھ کا بندوبست کرتا۔ عبداللہ بن جدعان نے ملکِ شام کی طرف دو ہزار اونٹ بھیجے تھے جن پر گیہوں، شہد اور گھی لاد کر مکہ لایا گیا۔

پھر اس نے ایک منادی کرنے والے کی ذمہ داری لگا دی کہ وہ ہر رات خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر لوگوں میں کھانے کے لیے دعوتِ عام کا اعلان کرے۔ چنانچہ۔ ہر رات منادی کرنے والا اعلان کرتا۔

"ابن جدعان کی دیگ کی طرف آؤ" (یعنی دعوت عام کو قبول کرو) "صحیح مسلم کی شرح میں ابن قتیبہ کہتے ہیں۔

"عبداللہ بن جدعان کی دعوت طعام والی دیگ اس قدر بڑی تھی کہ اس سے اونٹ سوار سواری کی پیٹھ پر ہی کھانا لے کر کھا لیتا۔"

اس دیگ سے کھانا نکالنے کے لیے سیڑھی کی مدد لی جاتی تھی۔ مگر اس قدر سخاوت اور فیاضی کے باوجود اللہ تعالیٰ کے دربار میں سرخرو نہ ہو سکا کیونکہ اس کے دربار میں سرخروئی کا جو قاعدہ ہے، اسے اس نے یکسر فراموش کر رکھا تھا۔ صحیح مسلم میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے۔ دریافت کیا۔

"اے رسول خدا! ابن جدعان زمانہ جاہلیت میں صلہ رحمی کرتا تھا۔ اور مسکینوں کو کھانا کھلاتا تھا۔ کیا یہ سب کام اس کے حق میں نفع بخش ثابت ہوں گے؟"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نہیں، یہ سب اس کے کچھ کام نہیں آئیں گے کیونکہ اس نے کبھی بھی (اپنی بندگی اور عبودیت کا اظہار کر کے) یہ نہیں کہا "اے میرے پروردگار! قیامت کے دن میری خطاؤں کو معاف کرنا۔"

اللہ کی تدبیر

بھائیوں نے یوسفؑ کو مارنا چاہا مگر ناکام رہے باپ کی نگاہوں سے دور کیا مگر محبت اور بڑھ گئی۔ غلام بنا کر فروخت کر دیا مگر بادشاہ بن گئے۔ اس لیے

وفا

اگر وفا کرنی ہو تو ندی کنارے لگی گھاس کی طرح کرو کہ کبھی کوئی ڈوبتا ہوا اس کا سہارا لے تو اسے بچا لیتی ہے یا پھر خود بھی کناروں سے ناتا توڑ کر اس کے ساتھ ڈوب جاتی ہے۔

(شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ)

کائنات اصغر لونڈوار۔ ڈہرکی

لوگوں کی سازشوں اور خفیہ تدبیروں سے تم پریشان نہ ہو۔ اللہ کی تدبیر اور چاہت سب پر بھاری ہے۔

(آزاد احمد)

عائشہ۔ گوجرہ

موتی مالا

- بدلہ لینے سے انسان مخالف کا ہم سفر بن جاتا ہے اور معاف کر دینے سے اعلیٰ بن جاتا ہے۔
- اگر تم غلطیوں کو روکنے کے لیے دروازے بند کر دو گے تو سچ بھی باہر رہ جائے گا۔
- جو آدمی جتنا زیادہ بولتا ہے وہ اتنا ہی کم عقل ہوتا ہے۔
- مغرب کے ساتھ اس وقت مقابلہ کرو جب خود مشرق بن جاؤ۔
- حملہ آور دشمن سے زیادہ خوشامدی دوست سے ڈرنا چاہیے۔

انیلہ بتول، الوین فاطمہ۔ ملتان

فرزانہ سہیل ———— میاں چنوں

دیکھ لے تیری محبت نے ہمیں بخشا ہے کیا
درد کا تازہ سفر خالی زمینوں کی طرح
بے گھری کا اک نوشتہ اس کی پیشانی جبیں
اور ہم بھی دربدر خالی ذہنوں کی طرح

سندس زریاب منیر ———— پنڈی گھیپ

لبوں پر وہ جو تبسم سجائے پھرتا ہے
بے چارہ رات کی نیند یں چرائے پھرتا ہے
بجھا بجھا سا وہ بے کیف سا چہرا
نہ جانے کتنے غموں کو چھپائے پھرتا ہے

تحریم، اقصیٰ ———— پنڈی گھیپ

نازکی اُن کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

نوشین اقبال نوشی ———— گاؤں بدر مرجان

ہم عجیب طرح کے لوگ تھے کہ ہمارے اور ہی روگ تھے
میں خزاں میں تھا اس کا منتظر، اُسے انتظارِ بہار تھا
کبھی لمحہ بھر کی گفتگو بھی میری اس کے ساتھ نہ ہو سکی
مجھے فرصتیں نہ مل سکیں وہ ہوا کے رتھ پر سوار تھا

رابعہ یاسین ———— کراچی

اس کے بنا بھی زندگی کٹ ہی جائے گی دانش
حسرت زندگی تھا وہ، شرط زندگی تو نہیں

سعدیہ سلیم ———— شریف آباد

میرے حاصل یہ محرومی عجب محسوس ہوتی ہے
تجھے پا کر بھی کیوں تیری طلب محسوس ہوتی ہے
تمہارے ساتھ دیکھی تھی وگرنہ زندگی ہم کو
نہ تب محسوس ہوتی تھی، نہ اب محسوس ہوتی ہے

رخسانہ جمیل ———— نیا آباد کراچی

تم نے اندازِ محبت تو دیکھا ہے، اندازِ وفا نہیں
پنجرہ کھلنے کے باوجود بھی کچھ پنچھی اُڑا نہیں کرتے

ثمرہ، اقرا ———— کراچی

جو حرف حق تھا وہی جا بجا کہا سو کہا
بلا سے شہر میں میرا لہو بہا سو بہا
شکست و فتح مرا مسئلہ نہیں ہے فراز
میں زندگی سے نبرد آزما رہا سو رہا

ثریا شاہ ———— کہروڑ پکا

ایک تو دل کے رشتے دشوار بہت تھے
پھر میں پیاسا اپنے سائیں دھوپ بہت ہے
کون تھا جس سے دل کی حالت کہتا میں
کس سے کہتا اپنے سائیں دھوپ بہت ہے

ندا سحر سلیم، حور شہزادی ———— کراچی

نظر کا چین دل کا سرور ہوتے ہیں
کچھ لوگ ایسے جہاں میں ضرور ہوتے ہیں
سدا چمکتا رہے ان کی عید کا تہوار
قریب رہ کے بھی ہم سے جو دور ہوتے ہیں

ام کمال ———— فیصل آباد

خط میں لکھا تھا عید کب ہو گی
ہم کو تاریخ لکھ کر بھجوائیں
چونکہ جھگڑا تھا اس لیے ہم نے
لکھ دیا آپ جب بھی آ جائیں

آمنہ حسین ———— شہداد پور

مجھ سے گلے ہیں مجھ پہ بھروسا نہیں اسے
یہ سوچ کر ہم نے بھی ٹوکا نہیں اسے
ساغر یہ محبت نہیں اصول وفا ہے
ہم جان تو دیں گے مگر دھوکا نہیں اسے

سیدہ نسبت زہرا ———— کہروڑ پکا

مہکا آنچل اُڑتا جائے، بجتا جائے زیور بھی!
دل کے اندر پھول کھلے ہیں، ایک بہار ہے باہر بھی

بینا ـــــ کراچی

تیرے پیار کو ترس گئے ہیں ہم
محبت کی آگ میں جھلس گئے ہیں ہم
کس کس کو بتلاتے جدائی کا سبب ہم
رو دھو کر خود پر ہی برس گئے ہم

عائشہ ماجد ـــــ اکبیر والا

اندھیری رات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
ہم اپنی ذات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
تمہارے بعد دکھوں نے بانٹ لیا ہے ہمیں
تمہارے ہاتھ میں رہتے تو کتنا اچھا تھا

نسبت زہرا ـــــ کہروڑ پکا

اس شب کتنا ٹوٹ کے روئے، چاند، ہوا اور زمین
تینوں ہی اک ساتھ اجڑے تھے چاند، ہوا اور میں
سارے خواب عذاب ہوئے اور سب خیال زوال
کس برتے پر سپنے بنتے چاند، ہوا اور میں

گڑیا شاہ ـــــ کہروڑ پکا

اب فیصلہ ہے اپنا آواز نہیں دینی
ہم بھی تو دیکھیں، طلب گار ہے وہ کتنا

عائشہ ـــــ گوجرہ

الجھ گئی ہے زندگی اپنی
چار دنوں کی دو دنوں میں

عظمیٰ شفیق، امامہ شفیق ـــــ جڑانوالہ

وہ میری کہانی کو غلط رنگ نہ دے دیں
افسانہ نگاروں سے مرا ذکر نہ کرنا

کہکشاں صابر ـــــ کویت

جان لینے والے بھی کبھی
جان کہا کرتے تھے

حزیمہ ریاض ـــــ گجرات

ڈھل گیا اب وہ خواب کا موسم
پھر سے دل پہ اترا عذاب کا موسم
بے چارے گلابوں پر ستم ڈھا رہا ہے
عجب سا، یہ بند کتاب کا موسم

حرا قریشی ـــــ ملتان

دریا میرے سامنے تھا لیکن
میں پیاس سے جاں بلب کھڑی تھی
دیکھوں گی میں آج اس کا چہرہ
کل خواب میں روشنی بڑی تھی

نور آمنہ ـــــ رحیم یار خان

کبھی عرش پہ کبھی فرش پہ کبھی ان کے در کبھی در بدر
غم زندگی تیرا شکریہ، میں کہاں کہاں سے گزر گیا

لبنیٰ یوسف ـــــ مانسہرہ

یاد رکھنا اگر ٹوٹے ہم تو بکھر تم بھی جاؤ گے
ہم نے تم کو پرویا ہے خود میں تسبیح کی طرح

ردا یوسف نبی ـــــ کراچی

بس اب کچھ دیر میں محسن وہ پتھر ٹوٹ جائے گا
میں اس کی سرد مہری پر محبت مار آیا ہوں

آصفہ، عائشہ ـــــ کمالیہ

میری انگلی پکڑ لینا، مجھے تنہا نہیں کرنا
یہ دنیا ایک میلہ ہے تمہیں کھونے سے ڈرتا ہوں

قوال افضل گھمن ـــــ لاہور

اے گردش حیات! کبھی تو دکھا وہ نیند
جس میں شب وصال کا نشہ ہو وہ نیند
امجد ہماری آنکھ میں لوٹی نہ پھر کبھی
اس بے وفا کے ساتھ گئی بے وفا وہ نیند

فاخرہ طفیل ـــــ صادق آباد

مانا کہ ہم فراق میں روئے کبھی نہ تھے
لیکن وہ یاد آئے بھی اتنے کبھی نہ تھے
اے دل تمہارے ساتھ یہ کیا بات ہوگئی
تم مضطرب تو تھے مگر ایسے کبھی نہ تھے

مہوش ـــــ جام پور

وہ جو اک عمر سے معروف عبادات میں تھے
آنکھ کھولی تو ابھی عرصۂ ظلمات میں تھے
اس سبب سے بھی تو میں قابل نفرت ٹھہرا
جتنے جوہر تھے محبت کے، میری ذات میں تھے

پاکیزہ ہاشمی ـــــ بہاولپور

خود وقت میرے ساتھ چلا وہ بھی تھک گیا
میں تیری جستجو میں بہت دور تک گیا
میں سوچتا ہوں شہر کے پتھر سمیٹ کر
وہ کون تھا جو راہ کو پھولوں سے ڈھک گیا

*

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں
آپ کی صحت' عافیت' سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو' ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین۔

پہلا خط لاہور سے بہن عطیہ خالد کا ہے۔ عطیہ خالد ابھرتی ہوئی باصلاحیت مصنفہ ہیں۔

ایک خط اپنے دل کے مطابق لکھ رکھا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو بھجوائیں گے۔ شعاع اور خواتین ڈائجسٹ جیسے جیسے ترقی کی طرف بڑھ رہے ہیں' وہ حیران کن بھی ہے اور قابل تعریف بھی۔ یہی کیا کم ہے کہ اس ادارے نے ایک نہیں کتنے ہی بڑے اور منجھے ہوئے نام پیدا کیے ہیں۔ آج اس ادارے کی رائٹرز ٹی وی اور فلم پر چھائی ہوئی ہیں۔ یہ یقیناً" اس ادارے کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

وہ قارئین بہنیں جو شکایت رکھتی ہیں کہ شاید ان کی کہانیاں ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جاتی ہیں تو ان سے میں یہ کہنا چاہوں گی کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو میری پہلی ہی کہانی فورا" شائع نہ ہو جاتی۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ ایڈیٹر صاحبہ ہروقت اچھی' نئی اور اچھوتی کہانیوں کے انتظار میں رہتی ہیں۔ ہاں تھوڑی محنت کریں۔ تھوڑا دھیان دیں۔ تخلیق کار بن جانا کوئی ایسا آسان تو نہیں۔ بس ارتکاز ہو اور رب کی عطا ہو۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ان ڈائجسٹوں میں گھسی پٹی خواتین طرز کی کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ مجھے اس بات سے اختلاف۔ بلکہ یہ تو وہ ڈائجسٹ ہیں جنہوں نے قارئین کی سوچ کو نہ صرف مثبت رخ پر بدلا بلکہ اتنا مجبور کر دیا کہ انہوں نے بشریٰ سعید کے سفال گر کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور اب ایمل رضا کے پیال ساز کو۔ اس وقت خط لکھنے کا مقصد پیال ساز کے متعلق چند لفظ لکھنا ہے۔

حوادث زندگی پر مشتمل یہ تحریر غم ویاس سے مجنون ہے۔ کیا ہر دکھ بیان ہونا چاہیے کیا ہر ظلم کا ذکر ضروری ہے۔ شاید ہاں کہ بغیر جراحت کا عمل اس کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر ماں کا درجہ پا کر بھی گلناب عالم جیسی عورتیں ماں نہ بن سکیں تو ان کے گھر زیان عالم جیسا کیچڑ اس جیسا گدھ ہی پیدا ہوگا۔ اور نگار ایک بیٹی کیوں ایسی بے باک زبان استعمال کرتے ہوئے نہ جھجکی جبکہ پروفیسر ربانی جیسے اساتذہ راہنمائی کے لیے موجود تھے۔ انتقام کے کالے موتیے نے ایک اندھے مفلس مرد کے اندر پلتے شیطان کو جگا دیا۔ عورت' بیٹی' جسے ایک پردے کی' حجاب کی چیز بنایا گیا۔ حجاب ہر چیز کا۔ آنکھ کا' بدن کا اور زبان کا۔

کیسی درندگی دکھائی زیان' یشب اور سلیم نے۔ خوفناک کھیل' اور نگار کے ماں باپ اور بھائی۔ تف ہے ان پر جو بیٹی کو سنبھال نہ سکے نہ اس کی ہلاکت سے پہلے نہ بعد میں۔ عادل کے یہاں' منصف کے یہاں' دیر ہے اندھیر نہیں۔ کچھ لوگ یہ بھول جاتے ہیں۔ خوف سے عاری لوگ۔ ایمل نے اس کی عدالت میں ہونے والا فیصلہ کچھ بیان کر دیا... کچھ باقی ہے... ہم کو اس کی فکر نہیں..... بس..... ہر بیٹی جان لے کہ احتیاط کس قدر ضروری ہے۔ ہر ماں جان لے کہ اس کا مرتبہ کیا ہے۔ اس کی دلچسپی اس کا محور کیا ہونا چاہیے کہ نقصان کے بعد' راہزنی کے بعد' انتقام کے بعد'

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حنا ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کیچڑ اچھل جانے کے بعد کا زیاں پورا کیا جانا ممکن نہیں۔

ج : پیاری عطیہ! اجازت کی کیا ضرورت ہے' آپ نے ہمیں خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے ہماری ترجمانی کی' بے حد شکریہ۔ اس میں شک نہیں کہ اچھی تحریروں کا ہمیں ہمیشہ انتظار رہتا ہے اور بلاشبہ تخلیق کا ہنر رب کی عطا ہے وہ جسے چاہے نواز دے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ لوگ اسے لاپروائی میں گنوا دیتے ہیں اور کچھ لوگ محنت اور مطالعہ سے اپنی صلاحیت کو جلا دیتے ہیں۔ "پیال ساز" پر آپ کا تبصرہ جامع ہے۔ ایمل نے ہمیں بھی حیران کیا ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے مختصر افسانے لکھے تھے جس میں ان کی صلاحیت پوری طرح سامنے نہیں آئی تھی۔ "پیال ساز" میں ہر کردار پر انہوں نے پوری محنت کی ہے اور بڑے متوازن انداز میں کہانی لکھی ہے۔ وہ واقعی فطری قلم کار ہیں۔

عطیہ! آپ ہمارے دوسرے سلسلوں میں بھی شرکت کریں، ہمیں خوشی ہوگی۔ "حرف سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ" یہ سلسلہ خواتین میں مصنفوں کے لیے ہی شروع کیا گیا ہے۔ آپ اس میں لکھیں۔

سمیرا بلوچ گاؤں حسین آباد ضلع بھکر سے شرکت کر رہی ہیں لکھا ہے

شعاع کا ساتھ 8th کلاس سے ہے اور آج میں بی ایس سی کی طالبہ ہوں۔ صائمہ اکرم' سائرہ رضا اور مصباح علی بہت زبردست لکھاری ہیں' ایسے لکھتی ہیں جیسے بالکل حقیقت ہو' ہمارے اردگرد کا ہی کوئی کردار اٹھا کر دے دیا ہو۔ کچھ رائٹرز صرف فلسفہ لکھتی ہیں۔ پلیز کچھ ہمارے جیسے قاری بھی ہیں جو ادب سے بہت دور ہیں تو الفاظ تھوڑا سادہ رکھا کریں۔ بجھ سے ناتا جوڑا ہے سلسلہ تو بہت اچھا ہے پر کچھ بور کر دینے والا ہے۔ میں اپنی بہنوں کو جب کسی کی باتیں پڑھ کر سناتی ہوں تو وہ کہتی ہیں ایسا لگتا ہے۔ کسی نے ہمارے گھر کی کہانی لکھ دی ہو۔ یہ ساری تکلیفیں ایک جیسی ہیں۔ کہیں بہو' کہیں بیوی اور کہیں ساس ان جیسے حالات کا شکار ہے۔ عورت چاہے دیہات کی ہو یا شہر کی تکلیف ایک جیسی ہے۔ بس طریقہ تھوڑا تبدیل ہوتا ہے پھر قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے۔ شعاع میں لکھے گئے خطوط بھی بہت زبردست ہوتے ہیں۔

ج : پیاری سمیرا! جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ یہ سلسلہ ہم نے اسی لیے شروع کیا ہے کہ ہم احساس کر سکیں کہ ہمارے معاشرے میں بہو' بیوی اور ساس کس کرب و اذیت کا شکار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شہر ہو یا گاؤں ہر عورت کو کوئی نہ کوئی تکلیف ہوتی ہے اور اپنے گھر کے لیے قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے۔ لیکن اگر ہم چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھیں۔ دوسروں کی دل شکنی نہ کریں اور اپنے دل تھوڑے سے بڑے کر لیں تو ان تکلیفوں میں کمی ہو سکتی ہے۔ انسان کو انسان کے ہاتھوں تکلیف نہیں پہنچنا چاہیے۔ باقی مقدر پر تو کسی کا اختیار نہیں۔

آپ کا اس سے پہلے کوئی خط نہیں ملا' ورنہ ہم جواب ضرور دیتے شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شمائلہ کرن' عروج شکیل اور نوشین کنول بوہڑی والہ موہڑہ ٹکال سے لکھتی ہیں

سائرہ رضا کا مکمل ناول سیدھی بات گنوادی اور نایاب جیلانی کا ناول آزمائش محبت بہت اچھا اور خوب تر تھا۔ ایمل رضا کا ناول پیال ساز عفت سحر کا ناول خواب شیشے کا اور نبیلہ عزیز کا ناول بھی رقص بسمل خوب سے خوب تر تھا۔ پیارے نبی کی باتیں بھی دل کو موہ لیتی ہیں۔ خدا ہم سب کو نبی پاک کی تعلیمات پر عمل کی توفیق بھی عطا فرمائے آمین۔ تاریخ کے جھروکے سے سومنات کا مندر' محمود غزنوی کا کردار' اکبر بادشاہ اور شیر شاہ کا قصہ بھی لاجواب تھا۔ فائزہ جبیں' آمنہ آنٹی' نگہت اور پیاری سی امی جان کی طرف سے آپ کو سالگرہ نمبر کی پرخلوص مبارک باد۔

ج : شمائلہ' عروج اور نوشین آپ سب کو بھی سالگرہ نمبر کی مبارک باد' شعاع آپ کا پرچا ہے اور آپ سب کے پرخلوص تعاون سے ہی آگے بڑھ رہا ہے۔ فائزہ جبیں' آمنہ آنٹی اور اپنی پیاری سی امی جان کو ہماری جانب سے سلام کہہ دیں۔

خط لکھ کر اپنی رائے پہنچانے کا شکریہ۔

ثوبیہ نور کشن گڑھ بھاول نگر سے شریک محفل ہیں

ساون کا مہینا شروع ہو چکا ہے۔ کھٹے میٹھے پکوان' پکوڑے' گلگلے' دھیمے دھیمے جلتا دل' ہولے ہولے برستی بارشیں کی بوندیں اور پس منظر میں ہلکے سروں میں چلتا

"پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے" ایک مکمل منظر..... مگر افسوس کہ ایسا کچھ نہیں ہے کتابیں ہیں (جو اگر سلیبس کی نہ ہوتیں تو اچھا ہوتا) ہم ہیں' ہماری سستی ہے (ازلی سنگی ساتھی) اور مچھر کا لاک کھیرویں۔ کسی زمانے میں ہوتا ہوگا ساون رومانٹک وغیرہ' مدت ہوئی اب تو مر گیا ہے غالب۔"

اسکول بس شروع ہوا ہی چاہتے ہیں (ٹینشن ہی ٹینشن اور پیپر بھی) ہائے یہ غریب عوام جائیں تو کدھر جائیں اور ہمیں تو ساون رت کے ساتھ بانگ درا کی بانگیں' ضرب کلیم کی ضربیں' اسرار خودی کے اسرار یاد آرہے ہیں۔ بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ نہیں یاد آرہے۔ کوئی بے خودی سی بے خودی ہے اور خضر راہ ہے کہ ملتا ہی نہیں۔ یار صائمہ اکرم' ثمینہ عظمت کدھر ہو آپ؟ کوئی نسخہ ہی بتائیے۔ 'اقبالیات کو کیسے پڑھا جاتا ہے؟

ج: پیاری ثوبیہ! خضر راہ کی تلاش کے لیے سب سے پہلے اپنے اندر کو اجالنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے بصارت نہیں بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھے لوگ ہمارے درمیان ہی ہوتے ہیں لیکن ہم انہیں پہچان نہیں پاتے کیونکہ ہماری آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوتی ہے۔ ہم صحیح فیصلے اور تجزیے سے محروم لوگ ہیں تو پھر نتائج بھی سامنے ہیں۔

اقبالیات کو کیسے پڑھا جاتا ہے' اس کا جواب کیا دیں کہ اقبال تو ہماری سمجھ میں بھی بڑی مشکل سے آتے ہیں۔

اب ساون کے ساتھ منسوب یہ باتیں صرف افسانوں میں ہی پائی جاتی ہیں' حقیقت میں تو پہلی بوند پڑتے ہی پریشانیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ خط بہت اچھا لکھا ہے آپ نے۔ افسانوں پر بھی توجہ دیں۔ آپ میں صلاحیت ہے۔

رفعت مشتاق لاہور سے شریک محفل ہیں۔ لکھا ہے

مجھے آج ہی شعاع اور خواتین ملے ہیں۔ ابھی تو میں نے رقص بسمل والی سٹوری پڑھی ہے۔ جو بے حد اچھی جا رہی ہے۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ کیونکہ ہمارے گھر میں رسالے پڑھنے پر سخت پابندی ہے۔ اس لیے بڑی مشکل سے اپنے چھوٹے بھائی کو منا کر خط بھیج رہی ہوں۔

ج: پیاری رفعت! ہمیں احساس ہے کہ آپ نے بڑی مشکل سے خط لکھا اور پوسٹ کرایا ہے لیکن اتنا مختصر کہ صرف ایک سلسلے وار ناول پر تبصرہ کیا ہے آئندہ ہمیں خط لکھیں تو تفصیل سے ہر کہانی کے بارے میں لکھیے گا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بنت حوا نے چوک سرور شہید سے لکھا ہے

بنت سحر کی کمی محسوس ہوئی۔ قانتہ رابعہ کے افسانے مجھے بہت پسند ہیں۔ سعدیہ عزیز آفریدی سے بھی لکھوائیں نا۔ سائرہ رضا اور نایاب جیلانی بہت اچھوتے انداز میں لکھتی ہیں۔ اس بار دونوں کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کوثر خالد کو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ یہ ایک مثبت تبدیلی (ناتا جوڑا میں) لڑکیوں کے لیے اچھا سبق کہ خدمت اور مرتبہ کیسے ملتا ہے "رقص بسمل" میں کب سے چھوڑ چکی۔ ہاں یاد آیا نبیلہ ابر راجہ کہاں گئیں؟ اور یہ نایاب جیلانی اور خالدہ جیلانی آپس میں کوئی تعلق؟ مطلب رشتہ داری؟ مجھے کوثر خالد کے خاوند کا اور ثمینہ اکرم کے بیٹے کا دکھ بہت دکھی کرتا ہے..... اس کے علاوہ فوزیہ ثمریٹ..... بہت اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔ لگی لپٹی کے بغیر' جو حق ہو بول دیتی ہیں..... صائمہ اکرم اب آپ کسی اچھے سے اسلامک موضوع (نماز یا پردہ) پر کہانی لکھیے گا۔

18 مئی 2013ء کو میرے بڑے بھائی (سولہ سال کا) کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ سر پر گہری چوٹ آئی۔ ہم سب دو ماہ دعائیں کرتے رہے۔ ڈھائی ماہ بعد ہوش آیا۔ ایک معجزہ ہی لگتا ہے دعاؤں پہ اللہ کے سننے پہ یقین پختہ کر دیا۔

ج: بنت حوا! ہم سب حوا کی بیٹیاں ہیں لیکن ہمارا ایک نام بھی ہے' جو ہماری شناخت ہے' آپ کا بھی کوئی نام ضرور ہوگا۔ اپنے نام سے خط لکھا کریں۔ اگر اصلی نام نہیں لکھنا چاہتیں تو کوئی قلمی نام رکھ لیں۔ نایاب جیلانی اور خالدہ جیلانی میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ نایاب ہماری مصنفہ ہیں اور خالدہ جیلانی ہمارے ہاں شعبہ اشتہارات سے منسلک ہیں۔ بھائی کی صحت یابی پر مبارک باد..... اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں قبول کرتا ہے اور جو دعائیں قبول نہیں ہوتیں اس میں یقیناً "اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔

راولپنڈی سے مہر ملک نے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

مجھے جس افسانہ نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا' وہ بہن "شبینہ گل" کی تحریر "پانی پر محل" ہے۔ شبینہ نے دو صفحات میں بہت بڑی بات لکھ دی۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں

کہ یہ ہمارے معاشرے کے تنگ دل' تنگ نظر اور چھوٹے ظرف کے لوگوں کی سوچ کی عکاسی ہے کہ بڑی عمر کی بہو نہیں لانی اور اگر کسی وجہ سے لڑکی کی مناسب عمر میں رشتہ نہ ملنے پر شادی میں تاخیر ہو جائے تو خوامخواہ کی فضول باتیں۔ میں بتانا چاہوں گی کہ ہم نے ابھی حال میں ہی بھائی کا رشتہ کیا ہے۔ بھائی 27 سال کا اور بھابھی 34 سال کی ہیں ہم نے بھابھی کی تعلیم' تربیت' شرافت اور کردار کی بنیاد پر اپنی آئندہ نسل کی بھلائی اور بہتری کو مدنظر رکھ کر رشتہ جوڑا ہے۔

صائمہ اکرم چودھری کا "سیاہ حاشیہ" آپا صالحہ کی زندگی بلاشبہ جذباتی لڑکیوں کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ البتہ اس ناولٹ میں ماضی کو جتنا طویل چلایا گیا۔ اس کے مقابلے میں حال کو بہت جلدی سمیٹ دیا گیا۔ بلکہ یہ آخری قسط میں فاسٹ کا بٹن کچھ زیادہ ہی دب گیا۔

"رقص بسمل" نبیلہ عزیز اب اس میں سے کیا نکالنا ہے۔ پلیز اب اس کو ختم کریں۔ "خواب شیشے" کا بہت زبردست جارہا ہے۔ پیال ساز اچھا آغاز ہے' یہ قسط ابھی نہیں پڑھی۔

ج: پیاری مہر! آپ کی سوچ بہت اچھی اور مثبت ہے۔ عمروں کا فرق ۔۔ اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ دیگر صفات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے اور سب سے قیمتی چیز تو ایک لڑکی کی شرافت اور اس کا کردار ہوتا ہے کیونکہ وہ آئندہ نسلوں کی امین ہوتی ہے اور یہ کیا لکھ دیا آپ نے کہ خط شائع کردیں تو احسان۔ دوستی اور محبت میں احسان کیسا؟ اور یہ محفل ہم نے آپ کے خطوں کے لیے ہی تو سجائی ہے۔ آئندہ بھی آپ کے خط کے منتظر رہیں گے۔

ارم کمال' فیصل آباد سے لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ "رقص بسمل" چونکا دینے والے موڑ پر ہے دلچسپی کے عناصر بڑھتے جارہے ہیں۔ ایمل رضا کا "پیال ساز" ایک بہت ہی منفرد اور الگ طرز تحریر پر مشتمل ہے۔ کہانی پڑھتے پڑھتے سانس رک جاتا ہے "سیاہ حاشیہ" کی آخری قسط بے حد دلچسپ اور بھرپور رہی۔ ہر کردار سے خوب انصاف کیا گیا۔ سائرہ رضا اس دفعہ پھر بازی لے گئیں۔ نایاب جیلانی کی "آزمائش محبت" میں اگر اقرا نہ مانتی تو کیا ہوتا جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے میں کوثر خالد آپ تو چھا گئیں۔

ج: پیاری ارم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کوثر خالد اور مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔
آزمائش محبت میں اگر اقرا نہ مانتی تو کیا ہوتا؟ اس سوال کا جواب تو نایاب ہی دے سکتی ہیں کیونکہ ہیرو صاحب تو عقل سے فارغ تھے۔

نفیسہ ستار' مدثرہ ستار اور طلعت ریحان فورٹ عباس سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی کتنی دیر تو ہم کچھ اور دیکھ ہی نہیں سکے۔ اتنا خوب صورت ٹائٹل تھا سب سے پہلے "سیاہ حاشیہ" پڑھی۔ اینڈ بہت اچھا کیا صائمہ جی نے "خواب شیشے کا" بھی اچھی اسٹوری ہے۔ آگے جاکر زبردست ہوگی سائرہ جی نے کمال کردیا۔ اتنا شاندار ناول لکھ کر۔ بہت ہی زیادہ پسند آیا۔ رقص بسمل کو بھی تھوڑا تیز کردیں اور سب سے آخر میں پڑھا ایمل رضا کا "پیال ساز" ابھی تو کہانی کی شروعات ہے "لگتا ہی نہیں ہے کہ یہ نئی لکھنے والی رائٹر ہے" آپی ہماری لکھائی اچھی نہیں پر ہمارا آپ سے پیار بہت خالص ہے۔

ج: نفیسہ' مدثرہ اور طلعت! رقص بسمل اب اختتامی مراحل میں ہے۔ ناول کی چند اقساط باقی ہیں۔ آپ کا پیار خالص ہے یہ ہم جانتے ہیں لیکن ایک بات ہم آپ کو بتا دیں کہ آپ کے پیار کے ساتھ ساتھ آپ کی لکھائی بھی بہت اچھی ہے اور خط بھی بہت اچھا لکھا ہے آپ نے۔

فوزیہ ثمر بٹ' ام ہانیہ عمران۔ آمنہ سید گجرات سے تشریف لائی ہیں' لکھا ہے

سرورق پر دل وجان سے فدا۔

حمد باری تعالیٰ' نعت رسول مقبول' شعاع کی اولین پسند۔ پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح لاجواب۔ کاش ساری باتوں پر عمل کرسکوں۔ سب سے پہلے فیورٹ ناول کی لاسٹ قسط پڑھی۔ "سیاہ حاشیہ" کا اختتام حسب منشا ہی رہا صائمہ نے کسی بھی کردار کے ساتھ ناانصافی نہیں کی۔

"پیال ساز" شدت سے انتظار رائٹر کب نگار کی زندگی کا پردہ فاش کرتی ہیں۔ نگار پروفیسر صغیر کے پاس ہیں تو نانو پروفیسر کی بیوی ہوتیں۔ باسل اور یشار نگار کی اولاد نہیں ہو

سکتی۔ دل تو چاہتا ہے ادھر ناول شروع کریں اور ادھر اینڈ بھی کردیں۔ پر یہ کوئی فلم تو نہیں جو تین گھنٹے میں ختم ہو جائے۔

سیدھی بات گنوادی۔ ایک سبق ان والدین کے لیے جن کی بیٹیاں ان کے کیے کی سزا پاتی ہیں یا پھر ہر خاندان میں ایک لڑکی ایسی ضرور ہوتی ہے جو گھر بیٹھی ہے۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ مناسب رشتہ نہ ملا۔ یا پھر نصیب کی ہیرا پھیری۔ تحریر پڑھ کر دل بوجھل زیادہ ہوا۔

افسانہ ایک سے بڑھ کر ایک تھا۔ پرانی قمیص لوگ چیزوں پر رشتوں کو فوقیت دیتے ہیں۔ چیزیں تو سالوں صندوقوں میں ویسے ہی بند پڑی رہتی ہیں مگر انسان نہیں۔ محبت رائیگاں نہیں جاتی۔ عارفہ کے ہیرو شہیر پر رشک آیا اور دل سے ایک لمبی سی ہائے اور کاش۔ ش ش نکلی جب "تجھ سے ناتا جوڑا ہے" بہت اچھا لگا۔ کوثر آنٹی ۔ بہت مزہ آیا۔ رزلٹ تو ہم نے یہی نکالا کوثر صاحبہ ادھار رکھنے والوں میں نہیں۔ زندگی کی تمام سچائیاں بیان کیں۔ اچھا لگا مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے ان کا شعاع کے ساتھ سروے پڑھا ہو۔ اگر نہیں لکھا تو پلیز ضرور لکھیں۔

ہر مہینے میری امی جی میرا خط یہ سمجھ کر پڑھتی ہیں کہ یہ کہانی ہے۔ فرماتی ہیں۔ فوزی کیا اس ماہ بھی تمہاری کوئی کہانی آئی ہے اور امی جی کی یہ خوش فہمی میں نے کبھی دور نہیں کی۔ ہر بار پہلے ان کو خط دیتی ہوں پڑھنے کے لیے۔ وہ اپنی پوتی ہانیہ عمران اور نواسی آمنہ مہر کا نام پڑھ کر خوش ہوتی ہیں۔

ج : پیاری فوزیہ! عمر کا احساس 'نزع کا ذکر۔ کیا ہو گیا بھئی؟ ہمیں آپ کے خط میں ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ ہماری ذہن میں آپ کی جو تصویر ہے 'تصنع' بناوٹ سے بے نیاز' صاف گو اور ہنستی مسکراتی فوزیہ۔ ایسے اسی طرح رہنے دیں اور یہ مایوسی والی باتیں نہ کریں۔ تبصرہ تو آپ کا ہمیشہ ہی جامع ہوتا ہے۔ بہت اچھا لگا۔ شکریہ۔

مریم حسین اور عنبر حسین گجرات سے شریک محفل ہیں 'لکھا ہے

آپ کے اور ہمارے رسالے کا معیار ہمیشہ سے عمدہ رہا ہے۔ کبھی ہمیں اس کی تحریر کی تہذیب و شائستگی سے شکایت نہیں ہوئی ہمیشہ ہی لکھنے والوں نے اچھی اور مثبت بات ہی بتائی۔

"پہلی شعاع" سے آغاز ہوتا ہے ہمیشہ "کوزے میں بند دریا کو دیکھنا پڑھنا اور بوجھنا ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ حمد اور نعت ہمیشہ ہی اچھی ہوتی لیکن اس دفعہ "بہت اچھی" تھیں "پیارے نبی کی پیاری باتیں" پڑھ کر بہت سے ابہام دور ہو جاتے ہیں "سیاہ حاشیہ" صائمہ اکرم صاحبہ کی انتہائی مثبت تحریر اپنے اختتام کو پہنچی۔ کہیں بھی کوئی جلدی یا جھول نظر نہیں آیا۔ انتہائی سبق آموز اور پختہ تحریر بہت عرصے بعد پڑھنے کو ملی۔ صائمہ اکرم کے لیے بہت سی مبارک باد اور دعائیں۔

"پیال ساز" نام ہی بہت اٹریکشن لیے ہوئے ہے۔ ایمل رضا بہت اچھا لکھ رہی ہیں نئے انداز سے۔ امید ہے مستقبل میں اور زیادہ اچھا لکھیں گی۔ "نانو" کا کردار بہت اچھا ہے'۔

ج : مریم اور عنبر طوالت کے باعث آپ کا پورا خط شامل نہیں کر سکے لیکن بہت خوب صورت الفاظ اور سلجھے ہوئے انداز میں آپ نے خط لکھا اور نہایت عمدہ اور جامع تبصرہ کیا۔ آپ ہمارے شعاع کے تمام سلسلوں میں شرکت کریں ہمیں خوشی ہو گی۔

ہمیں افسوس ہے کہ سولہ سال سے آپ شعاع کی قاری ہیں اور آپ نے ایک بار بھی ہمیں خط نہیں لکھا۔ اپنے ابا اور اماں کو ہمارا سلام پہنچا دیں اور شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ بھی۔

ناظمہ زیدی نے ٹوبہ ٹیک اعظم سے لکھا ہے۔

ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ صبا خان شاباش اچھا لکھا آپ نے ایمل رضا "پیال ساز" بہت اچھا جا رہا ہے۔ نگار بھی سامنے آئی۔ ایمل جی ایک بات مجھے قابل اعتراض لگی۔ نگار کے ساتھ جب وہ حادثہ پیش آیا وہ باہر نکلی تو اس نے قرآن پاک اٹھا کے سینے سے لگایا کیا قرآن پاک اٹھانا اس کے لیے صحیح تھا؟ "نیر فہیم" خاتون رائٹر ہیں؟ بہت اچھا پوائنٹ اٹھایا ہے آپ نے۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ یہ یہودی پروپیگنڈہ ہے کہ مسلمانوں کو رمضان میں نماز روزہ کے بجائے ان بے ہودہ شوز میں الجھا دو تاکہ وہ اپنے خدا کو بھول جائیں۔ نایاب جیلانی کو تسلیمات' یہ میری فیورٹ ہیں۔ پرانی قمیص مگر نیا موضوع'

ویری گڈ زہرہ افضل' صائمہ جی مبارک ہو بہت اچھا ناول تھا' بس مجھے اس عورت کے بارے میں بتا دیں جس کو خانہ کعبہ نظر نہیں آتا' کیوں نہیں آتا؟ کیا بعد میں نظر آتا ہے؟ اس بات کو بیچ میں کیوں چھوڑا؟ "خواب شیشے کا" بھی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا ہے اچھی کہانی ہے ورنہ تو ہماری ساری کہانیاں فلسفے کے ملبے تلے دب گئی ہیں۔ شبینہ گل کا افسانہ اچھا تھا۔ "ناتا" بہت بہت بہت اچھا تھا' کوثر جی آپ سے ہمیں یہی امید تھی۔ "تاریخ کے جھروکوں سے" بہت اچھا سلسلہ ہے اس میں آپ قسط وار مسلمان بادشاہوں کے حالات زندگی دیں۔ اس سے ہمارے علم میں اضافہ ہوگا پکوان اچھے تھے۔ بغیر اوون کے کیک اور بنا بتائیں۔

ج: پیاری ناظمہ!

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ ایک افسانہ شائع نہیں ہوا تو مایوس نہ ہوں کوشش کرکے دوبارہ لکھیں۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ ہمارا خیال ہے آپ اچھا لکھ سکتی ہیں۔

حنا سلیم اعوان۔ گاؤں آخون باندی تحصیل و ضلع ہری پوری ہزارہ شرکت کررہی ہیں' لکھا ہے

میں شاید اب کی بار بھی اپنی سستی کے ہاتھوں بری طرح شکست کھا جاتی جو پیاری بہنا اقصیٰ طیب الرحمن صاحبہ خط لکھ کر یہ نہ کہتیں۔ "ہمارے ہری پور سے کبھی کوئی خط لکھا نہیں گیا یا آپ نے شائع نہیں کیا؟" بس نہ پوچھیں۔ ہماری حالت کیا سے کیا ہوگئی۔ دل کے ہزار ٹکڑے ہوئے۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ پیاری اقصیٰ کیا آپ مجھے ہری پور کی شہری نہیں سمجھتیں....؟ یا میرا خط کبھی نظر سے نہیں گزرا.... خوب صورت سوٹ میں ملبوس کسی مہارانی کی شان و شوکت اور عجب بے نیازی سے ٹائٹل پر براجمان ماڈل واقعی میں بے حد پیاری لگی۔ سب سے پہلے ہمیشہ کی طرح خطوط پڑھے۔ قارئین کی کھٹی میٹھی، تلخ و شیریں' تعریف و تنقید سے بھرپور باتیں اور خاص طور پر آپ کے جوابات من کو گدگداتے ہیں۔ کوثر خالد نے سلسلہ بہت اچھا لکھا۔ ویسے مجھے ان کے خطوط بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ "خواب شیشے کا" بس ٹھیک جارہا ہے ابھی کردار صحیح سے کھلے نہیں ہیں "سیدھی بات" سائرہ رضا نے ایک دم بیسٹ لکھا۔ "سیاہ حاشیہ" صائمہ جی اپنے تمام کرداروں کو ساتھ لے کر نہایت خوب صورتی سے اختتام تک پہنچی ہیں۔ بہت اچھا لکھا۔ جبین سسٹرز کو کہیں سے ڈھونڈ لائیے کہ ساون آیا ہے.... ثمرہ بخاری سے بھی شدید گلہ ہے۔ ہم محنتی' بہادر' بچی کھری.... اور عام سی لڑکی کی خاص کہانی کو بہت مس کررہی ہیں ثمرہ.... اب تو لوٹ آؤ۔

ج: پیاری حنا! آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ آپ ہمیں تو بہت اچھی طرح یاد ہیں۔ آپ ہمارے تمام سلسلوں میں شرکت کرتی رہی ہیں۔ یقیناً" ہماری دیگر قارئین کو بھی یاد ہوں گی۔

اقصیٰ طیب کا شکریہ انہوں نے نے خط لکھا تو ایک اچھی بات ہوئی کہ آپ کو جوش آیا اور آپ نے طے کرلیا کہ اب ہر ماہ باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیں گی۔

رخسار شفیق نے رسول پور فیصل آباد سے لکھا ہے

میرے خط لکھنے کی وجہ کیا؟ سالگرہ' سالگرہ' سالگرہ۔ ارے بھی شعاع کی نہیں بلکہ میری اور میری مما کی۔ 12 ستمبر کو میری اور 28 ستمبر کو میری ماما کی اور جو میرا بھائی مجھے ڈائجسٹ لاکر دیتا ہے اس کی 10 ستمبر کو ہمیں آپ سے گفٹ چاہیے۔ (اتنا حق تو بنتا ہے نا؟) کیا آپ ہماری سالگرہ کا کیک کھائیں گی؟

"سیاہ حاشیہ" مائی موسٹ فیورٹ ناولٹ آخر اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ آخر میں ایک کمی لگی۔ اگر بختاور اور ہاشم کا دوبارہ نکاح ہوجاتا۔ لیکن.... خیر چھوڑیں۔

"خواب شیشے کا" بہت اچھی طرح اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ "پیال ساز" ویری انٹرسٹنگ ناول۔ واقعی اگر شیطان کا انسانی روپ ہوتا تو وہ زیان عالم ہی ہوتا۔ نگار کے والدین پر غصہ بھی بہت آیا۔ دونوں مکمل ناول بس ٹھیک ہی تھے۔ زیادہ مزے کے نہیں تھے۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" بہت اچھا سلسلہ ہے۔ ڈیئر ممناز یوسف آپ کے دونوں افسانے مجھے بہت پسند ہیں۔ مجھے آنٹی ثمینہ اکرم' آنٹی ممناز یوسف اور آنٹی ارم کمال (آنٹی کہہ سکتی ہوں نا؟) اچھی لگتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں ان تینوں سے ایک اپنائیت سی محسوس ہوتی ہے۔

ج: پیاری رخسار! آپ کا خط شامل اشاعت ہے اسے ہماری طرف سے سالگرہ کا گفٹ سمجھ لیں۔ آپ کسی کی عمر نہیں جانتیں تو انہیں آنٹی کیوں کہنا چاہتی ہیں۔ ممکن ہے

نمناز یا ارم عمر میں آپ کے برابر ہوں یا آپ سے چھوٹی ہوں۔ اگر کوئی اچھا لگتا ہے تو اس سے دوستی کا رشتہ بھی رکھا جا سکتا ہے۔ دوستی میں عمر کی تخصیص نہیں ہوتی۔ نہ جانے کیوں آج کل یہ رواج بن گیا ہے کہ ہر ایک کو آنٹی کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ ایک بات یاد رکھیں آپ کسی کو آنٹی کہہ کر مخاطب کریں گی تو وہ فورا" آپ کی عمر کا حساب لگانا شروع کر دے گا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ نام سے مخاطب کریں اپنا نام سننا بہت سوں کو اچھا لگتا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کبریٰ عباسی نے ہری پور سے لکھا ہے

اس مہینہ کا شعاع بھی کافی پسند آیا ہمیں کیونکہ سائرہ رضا کا ناول سیدھی بات گنوا دی ہمیں حد سے زیادہ پسند آیا۔ صائمہ اکرم کی ہٹ اسٹوری سیاہ حاشیہ بھی اچھی جا رہی ہے۔ افسانوں میں صرف تین افسانے جن میں محبت رائیگاں سرفہرست تھا اور باقی میں پرانی قمیص اور ایک کتھا نہایت اچھے افسانے تھے۔ موسم کے پکوان، جب بجھ سے ناتا جوڑا اور خط آپ کے بہت اچھے سلسلے ہیں۔

ج : پیاری کبریٰ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

کراچی سے تسنیم کوثر نے لکھا ہے

”نکھر گئے گلاب سارے“ قارئین کا سروے بہت زبردست رہا آپ نے ہمیں شامل کیا جزاک اللہ۔

اور جناب نیر فہیم خان کا افسانہ ”عید تمہارے سنگ پیا“ بہت بہت بہت ہی شاندار شاہکار لکھا ہے۔ جواب نہیں بھئی۔ واقعی میں لوگوں میں عزت نفس رہی ہی نہیں۔ ایسے ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ فقیروں کو بھی شرم آجائے۔ اتنا اچھا لکھنے پر انہیں سو سلام۔ ایمل رضا کا پیال ساز نہایت عمدگی سے آگے بڑھ رہا ہے نایاب جیلانی کی آزمائش محبت اچھا ناول لکھا ہے اسٹوری میں جان تھی پسند آیا یہ ناول۔

”سیاہ حاشیہ“ کا ہیپی ہیپی اینڈ بڑا پیارا لگا۔ ناول ”خواب شیشے کا“ بہتر ہے اصل میں کبھی حال کبھی ماضی میں دوڑ لگانے والے ناول یا افسانے جو بھی ہوں اچھے نہیں لگتے۔ لگتا ہے، دماغ کی کھچڑی بن رہی ہے۔ ”رقص بسمل“ کو اب جلدی مکمل کریں۔ خط آپ کے اچھا لگتا ہے۔ قارئین کے خطوط اور آپ کے ٹھنڈے میٹھے جواب بہت مزہ دیتے ہیں۔

ج : پیاری تسنیم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی اس محفل میں شرکت کر کے اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

شگفتہ ناز نے میاں چنوں سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

آج ایک افسانے نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ نیر فہیم خان کے افسانے ”عید تمہارے سنگ پیا“ واہ کیا بات ہے۔ ٹائٹل سے ایک عام سے رومانٹک افسانے کا تاثر دینے والی تحریر نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جوں جوں پڑھتی گئی۔ نیر کا قلم میرے جذبات کو الفاظ کی زبان دیتا گیا۔

یوں تو سارا سال ہی ایسے شوز شور شرابہ کرتے رہتے ہیں مگر رمضان المبارک کے مقدس ماہ میں روزانہ کی بنیاد پر ان کی موجودگی نے حواس معطل کر دیے۔ مصنفہ نے انعامات لوٹنے والوں کو بھکاریوں کا بالکل درست لقب دیا ہے۔ ہم لوگ پنجابی ہیں اور میرے شوہر ان لوگوں کو ”بیہنے“ کہتے ہیں جس کا مطلب اردو میں بھکاری ہے۔ لگے ہاتھوں ”پیال ساز“ کا بھی ذکر ہو جائے۔ ایمل رضا نسبتاً نیا نام ہے (کم از کم میرے لیے) لیکن کیا کمال تانا بانا بنا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

ج : شگفتہ! آپ نے اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ تہ دل سے شکریہ۔

عمارہ رفیق نے فاضل پور سے لکھا ہے

خوب صورت اور مزین سرورق دل کو بھا گیا۔ سب سے پہلے صالحہ کوثر ولد اللہ رکھا کو پڑھا۔ یہ وہ فقرہ ہے جسے بار بار پڑھا ہر بار ہنستے ہی چلے گئے۔ آپ کا سلسلہ سب سے مختلف تھا۔ بہت مزہ آیا۔ میں تو قسم سے آپ کی گرویدہ ہو گئی ہوں کوثر آنٹی۔

پیال ساز سلسلہ بہت ہی خوب صورت ہے۔ سب سے الگ انداز۔ واہ ہر بار تجسس چھوڑ جاتا ہے آئی تھنک نانو ہی نگار کی مما ہے اور باسل یشار نگار کے جڑواں بیٹے ہیں۔ نایاب جیلانی اچھا ٹاپک تھا۔ سائرہ رضا کے کیا ہی کہنے چھا جاتی ہیں۔ قسم سے مجھے سجل کا کردار بہت اچھا لگا خاص کر منگیتر والا قصہ بڑے مزے کا تھا اور سجل کا شادی

کے لیے کیا گیا وظیفہ ہاہاہا اگر سجل ایک جلالی کمالی وظیفہ نہ کی کے لیے کرتی تو کہانی کا مزہ آ جاتا۔ ایسے اصل میں جس اسٹوری کے لیے خط لکھا وہ ہے سیاہ حاشیہ' صائمہ جی مبارک باد۔ بہت زبردست، قسم سے کسی بھی اسٹوری کی لاسٹ قسط نے اتنا نہیں رلایا جتنا "سیاہ حاشیہ" نے رلایا ہے۔ سب افسانے اچھے تھے لیکن صبا خان سب پہ چھا گئیں اگر سچ میں سب کی سوچ ایک جیسی ہو جائے کہ صورت سے زیادہ سیرت اہم تو کوئی کنواری لڑکی نہ رہتی باقی تمام سلسلے زبردست تھے۔

ج : پیاری عمارہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے سیاہ حاشیہ کی آخری قسط ہماری سب ہی قارئین نے پسند کی ہے لیکن یہ رونے والی بات کسی نے نہیں لکھی۔ آپ کو کس بات پر رونا آیا؟ یہ تو ہم بھی نہیں سمجھ سکے۔ ساری غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ سب ہنسی خوشی مل گئے، پھر رونے کی کیا بات تھی؟

کنجاہ سے نائلہ بتول لکھتی ہیں

شعاع خرید کر گاڑی میں بیٹھی تو خوشی سے اچھل پڑی ایک میسج لکھ کر فوراً" فرینڈز گروپ کو بھیج دیا کہ "میرا خط" اور "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" دسمبر کے شعاع میں شائع ہو گیا ہے۔ پھر کیا فوراً" ہی جوابات آنے لگے۔ نومبر کا آخر میرے لیے بہت اچھا ثابت ہوا کہ میرے دس سالہ خواب کو تعبیر ملی۔ میرے گاؤں لدھا میں جو کہ کنجاہ سے پندرہ منٹ کی مسافت پر واقع ہے (اگر راستہ ٹھیک ہو تو) 29 نومبر 2015ء کو میں نے اپنے سکول کا سنگ بنیاد رکھا جس کا خواب میں اپنی شادی والے دن سے دیکھ رہی تھی اور جو ہمارے گاؤں والوں کی ایک اہم ضرورت تھی۔ شکر ہے اس ذات باری تعالیٰ کا کہ اس نے مجھے اس قابل سمجھا اور خصوصی شکریہ میرے میاں جانی کا جنہوں نے ساتھ دیا۔ ہر دفعہ سوچتی تھی کہ کب کوثر صاحبہ اپنے مخصوص بے ساختہ انداز میں جلوہ گر ہوں گی۔ واہ کوثر جی! بڑا جگر چاہیے دوسروں کو شاباش، خود کو الزام دینے کے لیے اور یہ آپ جیسی باہمت اور فراخ دل عورت کا ہی کام ہے۔ ہم جیسے کم بخت اور تنگ دل لوگ تو بس دوسروں کو ہی مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔

مجموعی طور پر رسالہ اچھا تھا لیکن وہ مزہ کہاں جو راحت جی کے موسم بہار میں ہے۔ راحت آواز دو.... فرحت جی آیئے میدان میں.... یہ تو پھر بس صبر شکر والی بات ہے' ورنہ ہم تو راحت اور فاخرہ کے دیوانے ہیں۔ "وہ مزے کہاں جو رفتگاں میں ہے۔"

ج : پیاری نائلہ! پاکستان میں کتنی بھی خرابیاں ہوں پھر بھی یہ ہمارے لیے نعمت ہے اور جو آپ نے لکھا ہے کہ ہم آزاد نہیں ہیں۔ انڈیا میں ہندوؤں کے ساتھ ایک ہفتہ گزار کر آئیں۔ آپ سے شرط لگا کر کہتی ہوں کہ آپ پاکستان واپس آئیں گی تو سب سے پہلے اس سرزمین پر شکر کا سجدہ کریں گی۔ انڈیا تو بڑی بات ہے دنیا کے کسی بھی ملک میں چلی جائیں۔ وہاں کے لوگ آپ کو کبھی نہیں اپنائیں گے۔ پاکستان کی قدر کیجیے۔ یہ ہمارا گھر ہے۔ اگر اس میں کوئی کمی یا خرابی ہے تو اس کو سنوارنا ہمارا کام ہے۔ تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ اتنی مصروفیات میں وقت نکالنا واقعی بہت مشکل ہے۔ آپ اپنے گاؤں میں علم کی روشنی پھیلا رہی ہیں۔ یہ قابل تحسین ہے۔

طاہرہ عندلیب نے' اسلام آباد سے لکھا ہے

آپ کا پرچہ بہت خوب ہے مگر بالکل پرفیکٹ پھر بھی نہیں کہہ سکتے وجہ؟ وجہ ہیں وہ مصنفین جو ایک آدھ کہانی لکھ کر پذیرائی سمیٹتی ہیں اور پھر ایسی ایسی کہانیاں لا کر حاضر ہو جاتی ہیں کہ ہمارا خون کھول اٹھتا ہے۔ پتا نہیں آپ کا ادارہ کیا سوچ کر ان کہانیوں کو شائع کرتا ہے۔ حالانکہ وہ جلی حروف میں ناقابل اشاعت کے ساتھ رد کرنے کی مستحق ہیں۔

"پیال ساز" ایک منفرد سی کہانی لگی ہے۔ خدا کرے یہ مجھے آخر تک بور نہ کردے۔ یعنی مجھے حیرت اور غصہ تب آتا ہے جب تمام کہانیوں میں انداز گفتگو' تخیل حتیٰ کہ گالیاں بھی یک رنگی ہوتی ہیں۔ اللہ کی پناہ! ایسا لگتا ہے کہ ایک ہی شخص کے قلم سے نکلے ہوئے لفظ ہوں۔

"سیاہ حاشیہ" ایک بہت اچھی انوکھی سی لو اسٹوری تھی جسے میں بہت شوق سے پڑھتی تھی مگر ہوا وہی جس کا ڈر تھا۔ صائمہ اکرم صاحبہ نے خواہ مخواہ اس اتنی مزیدار کہانی کو برباد کر چھوڑا۔ Atheism جیسا حساس موضوع افسوس صائمہ جی آپ نے چھیڑ کر انصاف کیے بنا ہی بلاوجہ کہانی میں گھسیٹا۔ کاش آپ اس موضوع پہ ایسی سیر

حاصل کہانی لکھتیں کہ دل خوش کر دیتیں۔ مگر افسوس اس بات کا بھی ہے کہ یہ کہانی اگرچہ میڈیکل فیلڈ سے وابستہ لوگوں کے گرد گھومتی رہی مگر مجال ہے جو مصنفہ نے بھولے سے بھی کہانی میں کوئی ہسپتال کا جامع نقشہ کھینچا ہو۔ نایاب جیلانی زبردست رائٹر ہیں مگر ان کو ورسٹائل بننا ہو گا۔ مظلومیت کے باب یا عورت کی ناقابل یقین یعنی ڈرامائی بہادری کو خیرباد کہنا پڑے گا اور میں سمیرا حمید کو بہت مبارک باد دینا چاہتی ہوں ہمارے حلق کی کڑواہٹ کوئی کم کر سکتا ہے تو وہ ہیں سمیرا صاحبہ کمال کا لکھتی ہیں اور جو ان کے بے حد منفرد آئیڈیاز کو چھو نہیں پاتے وہ جو کہتے ہیں۔ بہت مشکل الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ سمیرا ہمیں تو سمجھ ہی نہیں آتا ان سے اتنی گزارش ہے کہ خدارا سمیرا حمید کو وہ ہی لکھنے دیں جو وہ لکھنا چاہتی ہیں، ان کو دوسری رائٹرز کی طرح بنتا میں نہیں دیکھ سکتی۔ ہمارے ڈراموں کا بیڑا غرق بھی ان ہی کہانیوں اور رائٹرز کے ہاتھوں ہوا ہے۔ افسانے سارے ہی بے حد یکسانیت اور بوریت لیے ہوئے ہوتے ہیں۔

سمیرا حمید بہت اچھے! تم لکھو اور بہت منفرد لکھو۔ میں ہمیشہ تمہیں پڑھوں گی اور سراہوں گی۔ سمیرا تم برا لکھو گی تو تمہیں تجھی کوئی رعایت نہیں ملے گی۔ ”تاریخ کے جھروکے سے“ شاندار سلسلہ ہے۔ کوثر خالد سلامت رہو۔ کیا بات ہے آپ کی تو! اتنا کرارا ین تحریر میں۔ بس مجھے اپنا پتا ارسال کریں میں آپ کو سلام کرنا چاہتی ہوں۔ آخر میں کہوں گی کہ میرا خط جوں کا توں شائع کیا جائے ورنہ تعصب شمار کر کے آئندہ خط لکھنے سے دستبردار ہو جاؤں گی۔ کوئی لفظ حذف نہ کریں۔

ج: پیاری عندلیب! اتنا غصہ؟ اور تعصب والی بات بھلا کیوں؟ کیا آپ نے اس سلسلہ میں تنقیدی خط نہیں پڑھے؟ ہم اپنے تمام قارئین کی رائے کا احترام کرتے ہیں خواہ تنقید ہو یا تعریف اور ہاں کہانیوں میں یکسانیت کی غالباً وجہ یہ ہے کہ بے شک یہ ایک قلم سے تو نہیں لکھی جاتیں مگر لکھنے والیاں ایک ہی معاشرے سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اس کے باوجود یکسانیت والی بات سے ہم متفق نہیں۔ ہر رائٹر کا اپنا انداز ہے۔ اپنی نظر ہے، اپنی سوچ ہے صرف اگست کے شمارے کو دیکھ لیں۔ تین مکمل ناول تھے۔ ایمل رضا کا ”پیال ساز“ نایاب جیلانی کا آزمائش محبت اور سائرہ رضا کا سیدھی بات گنوادی تینوں ناولوں میں موضوع مختلف تھے۔ انداز مختلف تھا پھر یکسانیت کہاں سے آئی؟ بہرحال آپ کی اپنی رائے ہے۔ کیا کہہ سکتے ہیں۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جا سکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہو گی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37- اردو بازار کراچی

مہندی کے ڈیزائن

ادارہ

اُمت الصبور

حضرت عیسیٰ کے غدار کا انجام

علامہ دمیری فرماتے ہیں کہ مفسرین اور اصحاب سیر نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گزر یہود کی ایک قوم کے پاس سے ہوا۔ یہودیوں نے جب آپ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ دیکھو جادو گرنی (مراد حضرت مریم) کا بیٹا جادو گر جارہا ہے۔ یعنی اس طرح انہوں نے آپ پر اور آپ کی والدہ پر تہمت لگائی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے یہ الفاظ سن کر ان پر بددعا اور لعنت فرمائی۔ اس بددعا اور لعنت کا اثر یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خنزیر کی صورتوں میں مسخ فرمادیا۔ اس واقعہ کی اطلاع جب ان کے سردار یہوذا کو ہوئی تو وہ گھبرا گیا اور اس کو گمان ہوا کہ کہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کے لیے بھی بددعا نہ فرمادیں۔

چنانچہ تمام یہودیوں نے ایک زبان ہو کر آپ کے قتل کا مشورہ دیا اور اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے یہود آپ کی گھات میں بیٹھ گئے اور آپ کو سُولی دینے کے لیے صلیب بھی گاڑ دی۔ اس کے بعد زمین پر اندھیرا چھا گیا اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے فرشتے بھیج دیے تاکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور یہود کے درمیان حائل ہوجائیں' چنانچہ اس رات حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حوارین کو جمع فرمایا اور ان کو وصیت فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ

" مرغ کی اذان سے پہلے تم میں سے ایک شخص میرے ساتھ غداری کرے گا اور چند درہم کے عوض مجھے بیچ ڈالے گا"

اس کے بعد آپ کے تمام حوارین اٹھ کر چلے گئے اور ان حوارین میں سے ایک شخص اس طرف سے گزرا جہاں یہود آپ کی گھات میں بیٹھے تھے اور وہ ان سے کہنے لگا کہ

اگر میں تم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پتا بتادوں تو تم مجھے کیا انعام دو گے؟"

چنانچہ یہودیوں نے فوراً" تیس درہم دے دیے' جنہیں لے کر وہ راضی ہو گیا اور ان کو حضرت عیسیٰ کا پتا بتادیا۔ جب وہ حواری آپ کے گھر میں داخل ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت حضرت عیسیٰ کی صورت میں بدل دی اور عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا۔

جب یہود آپ کے گھر میں داخل ہوئے تو اس حواری کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سمجھ کر گرفتار کرلیا۔ اس حواری نے کافی واویلا کیا اور ہر طریقے سے یہودیوں کو یقین دلایا کہ" میں فلاں ہوں' جس نے ابھی تم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پتا بتایا تھا اور تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے" اس لیے مجھے چھوڑ دو اور (حضرت) عیسیٰ کو تلاش کرو۔ مگر یہودیوں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے لے جاکر تختہ دار پر چڑھا کر سولی دے دی۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں بدل دیا تھا' وہ یہود میں سے ہی ایک شخص تھا اور اس کا نام ططیانوس تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے پوچھا کہ

"تم میں سے کون میرے لیے اپنی جان نثار کرے گا؟"

چنانچہ آپ علیہ السلام کے حواریوں میں سے ایک شخص اٹھا اور عرض کیا کہ "یاروح اللہ! میں جان نثار کرنے کے لیے تیار ہوں" تو بعد میں بحکم خدا یہی شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل میں بدل گیا اور

یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جگہ ان ہی کو گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا۔ جب آپ آسمان پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے پر لگا دیے اور آپ کو نورانی لباس پہنایا' کھانے پینے کی خواہش کو آپ سے منقطع فرمادیا۔ چنانچہ آپ ملائکہ مقربین کے ساتھ عرش کے اردگرد اڑتے پھرتے ہیں۔ بخاری شریف کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ شب معراج میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دوسرے آسمان پر ہوئی تھی اور آپ کے ساتھ حضرت یحییٰ علیہ السلام تھے۔

مورخین کا بیان ہے کہ حضرت مریم تیرہ سال کی عمر میں حاملہ ہوگئی تھیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بیت اللحم میں بابل پر سکندر کے حملے سے 65 سال بعد ہوئی اور پھر تیس سال کی عمر میں آپ پر وحی نازل ہونی شروع ہوئی اور ماہ رمضان کی شب قدر کو بیت المقدس سے 33 سال کی عمر میں آپ کو آسمان پر اٹھالیا گیا۔ آپ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے چھ سال بعد آپ کی والدہ حضرت مریم علیہ السلام کا انتقال ہوگیا۔

موطا کے اخیر میں یحییٰ بن سعید سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو راستے میں ایک خنزیر ملا تو آپ نے اس سے فرمایا کہ

''سلامتی کے ساتھ گزر جا تو۔''

آپ سے کہا گیا کہ کیا خنزیر کو بھی اس طرح مخاطب کیا جا سکتا ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ

''مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میری زبان بری گفتگو کی عادی نہ ہو جائے۔''

دستک دستک دستک

شاہین رشید

صنم بلوچ

"کیا حال ہیں جی؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ آپ ٹھیک ہیں۔ کافی ٹائم بعد آپ نے کال کی۔"

"جی اللہ کا کرم ہے اور تم مصروف اتنی رہتی ہو تو کیا کرتی کال کر کے مگر آج کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے.....؟"

"جی ضرور....."

"پہلے تو یہ کہ تمہارے رمضان المبارک کے سارے ہی پروگرام بہت اچھے تھے اور خاص طور پر امجد صابری کی فیملی کے ساتھ جو پروگرام کیے بہترین تھے؟"

"شکریہ..... امجد بھائی تو ہم سب کو بہت دکھی کر گئے۔ مجھے ابھی بھی ان کا خیال آتا ہے تو آنسو آجاتے ہیں۔ سچ میں بہت اچھے انسان تھے' بہت پیار' محبت کرنے والے انسان تھے۔"

"تم نے بھی اتنے اچھے پروگرام کر کے محبت کا حق ادا کر دیا؟"

"نہیں..... نہیں..... بالکل بھی حق ادا نہیں ہوا۔ ہمیں تو ان کے لیے اور بھی بہت کچھ کرنا چاہیے تھا۔ ان کا تو حق ادا ہو ہی نہیں سکتا۔"

"اور سناؤ..... کیا مصروفیات ہیں۔ کہیں پڑھا تھا کہ تم پھر سے اداکاری کی طرف آ رہی ہو؟"

"جی..... آپ نے بالکل صحیح پڑھا..... مگر ایسا نہیں ہے کہ میں مارننگ شو چھوڑ کر اداکاری کی طرف مکمل آجاؤں گی۔ ایسا نہیں ہے' اصل میں مجھے ایک ٹیلی فلم میں "فائٹر پائلٹ مریم مختار" کے کردار کی آفر ہوئی جسے میں نے فوراً" قبول کر لیا۔ اس لیے کہ میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہو گی کہ میں "مریم مختار" کا رول کروں۔ مریم مختار پاکستان کی پہلی شہید خاتون فائٹر پائلٹ تھیں اور یہ فلم ان ہی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے بنائی جا رہی ہے۔"

"اس فلم کے ڈائریکٹر اور رائٹر کون ہیں؟"

"نامور رائٹر "عمیرہ احمد" اس کی رائٹر ہیں اور نامور ڈائریکٹر "سرمد کھوسٹ" اسے ڈائریکٹ کریں گے۔"

"کردار کے حوالے سے نروس تو نہیں؟"

"تھوڑی بہت تو ہوں۔ ایک تو مریم مختار کا نام پھر میں اداکاری کی فیلڈ میں' تین سال کے بعد واپس آ رہی ہوں تو نروس ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہو گی۔"

"آخری پروجیکٹ کون سا تھا تمہارا..... اور اتنا گیپ

دینے کے پیچھے کیا وجہ ہے؟"

"جی میرا آخری پروجیکٹ "کنکر" تھا جو 2013ء میں "آن ایر" ہوا تھا اور وقفہ دینے کے پیچھے کوئی اسٹوری نہیں ہے۔ میں مسلسل ڈراموں میں کام کرنے کی قائل نہیں ہوں کیوں کہ میرے خیال میں فنکار کی صلاحیتیں اسی وقت نکھر کر سامنے آتی ہیں اور لوگ بھی اسی وقت پسند کرتے ہیں جب آپ تھوڑا گیپ دے کر آئیں۔"

"آفرز تو آتی ہوں گی؟"

"ارے آپ سوچ سکتی ہیں کہ مجھے آفرز نہیں آتی ہوں گی۔ یقین جانیے بہت آفرز آتی ہیں اور میرا دل بھی چاہتا ہے کہ سال میں ایک پروجیکٹ ضرور کروں' لیکن ان تین سالوں میں مجھے میری پسند کا کوئی کردار نہیں ملا... بس یہ بھی ایک وجہ تھی کام نہ کرنے کی۔ "مریم مختار" شہید کے لیے اس لیے ہامی بھری کہ کچھ کر کے دکھانے کو تھا۔"

"اور کیا مصروفیات ہیں؟"

"بس کچھ خاص نہیں۔"

"ازدواجی زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

"الحمد للہ بہت اچھی... ماشاء اللہ سے۔"

✡ ✡ ✡

منشا پاشا

"کیا حال ہیں؟"

"آپ کی دعا سے ٹھیک ٹھاک۔"

"دل بے قرار" "وفا" اور "جھوٹ" سے اسکرین پہ آپ کا ہی راج ہے؟"

"جی... بس اللہ کا کرم ہے۔ چونکہ تینوں تھوڑے تھوڑے وقفے سے ٹیلی کاسٹ ہوئے تو آپ کو ایسا لگ رہا ہے ورنہ گھریلو مصروفیات کی وجہ سے اس فیلڈ کو اتنا ٹائم نہیں دے پا رہی اور اب تو صرف "جھوٹ" ہی آن ایر ہے۔ "دل بے قرار" اور "وفا" تو اختتام پذیر ہو چکے ہیں۔"

"ویسے تو تواتر کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ ماڈلنگ بھی اور اداکاری بھی... بہتر کیا ہے... ماڈلنگ یا ایکٹنگ...؟"

"اس فیلڈ کا ہر شعبہ بہت اچھا اور بہت دلچسپ ہے۔ سب میں کام کر کے مزہ آتا ہے۔ ماڈلنگ کی فیلڈ اس لیے زیادہ اچھی لگتی ہے کہ اس میں آپ نت نئے تجربات کر سکتے ہیں جب کہ اداکاری میں آپ کو وہی سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔ جو ڈائریکٹر کہتا ہے اور جو رائٹر لکھتا ہے۔"

"کرداروں کے لیے کوئی خاص ترجیح؟"

"میں دنیا کی کسی عظیم خاتون کا رول کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے علاوہ ایسے کردار جس میں زیادہ رونا دھونا نہ ہو... کیوں کہ رونے دھونے والے کرداروں سے اب ناظرین بہت اکتا گئے ہیں۔"

"کیا کہانیوں میں یکسانیت نہیں آگئی؟"

"جی بالکل آگئی ہے... مگر پھر بھی ہمارا ڈرامہ بہت مقبول ہے ہر جگہ... اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے... پھر بھی ضرورت ہے اس بات کی کہ نئے اور تازہ ذہن کے رائٹرز کو موقع دیا جائے اور کہانیوں میں کوئی نیا پن تلاش کیا جائے۔"

"غیر ملکی ڈرامے دیکھتی ہیں؟"
"ارے نہیں... اتنا ٹائم نہیں اور نہ ہی مجھے غیر ملکی جیسے انڈین اور ترک ڈرامے اچھے لگتے ہیں اور ڈرامے دیکھنے کا جب بھی موڈ بنتا ہے اپنے پاکستانی ڈرامے ہی دیکھتی ہوں۔"
"فلموں سے دور کیوں ہیں؟"
"اس لیے کہ ابھی فی الحال میں فلم کرنا نہیں چاہتی۔ ابھی ڈراموں میں کچھ کر کے دکھانا چاہتی ہوں کیوں کہ مجھے اداکاری کرتے ہوئے کچھ زیادہ ٹائم نہیں ہوا اور یہ نہ سمجھیے گا کہ مجھے آفر نہیں ہوئی' آفرز ہو چکی ہیں اور منتظر ہوں کسی بہت ہی اچھے اور دھماکہ خیز پروجیکٹ کی اور جب تک ایسا کوئی پروجیکٹ نہیں ملے گا نہیں کروں گی کیوں کہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ فی الحال ابھی فلم کرنا نہیں چاہتی۔"
"آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ کھانے پینے کی بہت شوقین ہیں؟"
"آپ نے ٹھیک سنا۔ مجھے کھانے پینے کا بہت شوق ہے... مگر اسمارٹ رہنے کے لیے پیٹ بھر کے نہیں کھاتی اور وقفے وقفے سے تھوڑا تھوڑا کھاتی رہتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

ایمن خان

"ہیلو... ایمن کیسی ہو؟"
"جی ٹھیک..."
"آج کل اسکرین پہ تواتر کے ساتھ نظر آرہی ہو... کیسا لگ رہا ہے؟"
"جی بہت اچھا... اپنی اس کامیابی پہ اللہ کی بہت شکر گزار ہوں۔"
"جورو کا غلام" "اس خاموشی کا مطلب" اور "خواب سرائے" کون سا ہٹ جارہا ہے؟"
"میرے خیال سے تینوں ہی ہٹ جارہے ہیں اور اپنے رول کے حساب سے بات کروں گی کہ تینوں میں ہی میرے کردار بہت اچھے ہیں اور تھوڑے مختلف بھی۔"
"ڈائجسٹ رائٹر" سے شہرت پائی... امید تھی کہ اتنی جلدی آسمانوں کی بلندیوں کو چھولو گی؟"
"ارے ابھی کہاں بلندیوں کو چھوا ہے' ابھی تو ابتدا ہے۔ ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ بہت سے اچھے اچھے رولز کرنے باقی ہیں۔"
"اچھا... گڈ... کون سے کردار کرنے کی خواہش ہے تمہاری...؟"
"مجھے ہر طرح کے رول کرنے کی خواہش ہے' خواہ وہ نگیٹو ہوں یا پوزیٹو' کسی گاؤں دیہات کی لڑکی کے ہوں یا کوئی ماڈرن لڑکی کا رول ہو..."
"ماڈرن...؟ ابھی تک نہیں دیکھا آپ کو ماڈرن رول میں؟"
"میں ایسے ماڈرن اور بولڈ رول نہیں کرنا چاہتی جس میں میرے والدین کو اور میرے خاندان والوں کو کوئی شرمندگی ہو۔"
"پھر تو بہت دیکھ بھال کر رول لیتی ہوں گی تم...؟"
"جی... جی... بہت دیکھ بھال کے لیتی ہوں۔ باقاعدہ اسکرپٹ پڑھتی ہوں۔ اپنا کردار پڑھتی ہوں اور پھر کردار "اوکے" کرتی ہوں۔"
"اتنی مصروف رہتی ہو تو گھر والے تو ناراض ہوتے ہوں گے؟"
"مصروف رہتی ہوں... مگر گھر ٹائم سے آجاتی ہوں۔ رات دس بجے میں اپنے گھر پر ہوتی ہوں۔ بس کبھی کبھار ہی دیر ہو جاتی ہے' وہ بھی بہت مجبوری میں..."
"گھر والے خوش ہیں تمہاری اس شہرت کو دیکھ کر...؟"
"جی الحمد للہ... سب بہت خوش ہیں۔ بس تھوڑے ناراض اس لیے ہو جاتے ہیں کہ میں گھر سے سارا دن باہر رہتی ہوں تو گھر والوں کو ٹائم نہیں دے پاتی... اور... میرا بلاوا آرہا ہے۔ ان شاء اللہ پھر بات کریں گے۔"
"اوکے... اوکے... خوش رہو۔"

واصفہ سُہیل

آپ سے کیا پردہ

سیلفی

سیلفی لینے والوں کے لیے ایک بری خبر ہے کہ سیلفی لینے سے چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ (اوہ سیلفیاں یہ سیلفیاں.....؟)

ماہرین جلد کے مطابق موبائل فون سے نکلنے والی نیلی روشنی اور اس سے خارج ہونے والی برقی مقناطیسی تابکاری اگر چہرے پر مستقل پڑتی رہے تو جلد کو نقصان پہنچانے لگتی ہے اور اس پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔

لندن میں ہونے والی ایک کانفرنس میں ماہرین کا کہنا تھا کہ سیلفی لینے کا رجحان نسبتاً "نیا" ہے اس لیے ابھی تک اس کے اتنے مضر اثرات دیکھنے میں نہیں آئے۔ اس سے بچاؤ کی ابھی تک کوئی پروڈکٹ بھی مارکیٹ میں نہیں آئی ہے' جو کریمیں موجود ہیں وہ اس کے تابکاری اثرات کو روکنے کے لیے ناکافی ہیں۔ (اس لیے سیلفی لینے سے بچیں۔)

تجربہ

مہوش حیات اداکاری اور ماڈلنگ کرتے کرتے گلوکاری کی طرف آئیں تو سب نے برداشت کرلیا' لیکن کوک اسٹوڈیو جیسے پلیٹ فارم پر ان جیسی نو آموز گلوکارہ کی شمولیت آواز سے زیادہ گلیمر کی مرہون منت لگتی ہے (بات تو سچ ہے۔) سب سے پہلے کوک اسٹوڈیو میں مہوش نے بہت سارے بڑے گلوکاروں کے ساتھ "اے راہ حق کے شہیدوں" گایا اور اب مہوش حیات کو اس پروگرام میں ایک انفرادی گیت بھی دیا گیا ہے' جس پر کچھ حلقے اعتراض بھی کررہے ہیں۔ مہوش اس بارے میں کہتی ہیں کہ "میرا گیت سننے سے پہلے ہی شور مچ گیا' حالانکہ بلال مقصود' فیصل کپاڈیا اور شہزاد ریل جیسے موسیقاروں نے مجھے کچھ سوچ سمجھ کر ہی لیا ہوگا اور میں نے کسی پرانے گانے کو ری مکس نہیں کیا بلکہ ہمیشہ تجربہ کرتے رہنے کی عادت کی وجہ سے نیا اور اوریجنل ٹریک گایا ہے۔ (مہوش! تجربے کبھی کبھی فیل بھی ہوجاتے ہیں۔)

پریکٹس

علی ظفر نے کراچی میں ہونے والی فنکاروں کی ایک بڑی ایوارڈ کی تقریب میں امجد صابری کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک قوالی پیش کی جسے بہت پسند کیا گیا۔ اب سننے میں آرہا ہے کہ علی ظفر کو ایک پنجابی فلم میں قوالی گانے کی آفر ہوئی ہے جو علی ظفر نے خوشی خوشی قبول بھی کرلی۔ (بھئی آفر تو ہے نا اب وہ پنجابی کی ہو یا اردو کی) اس قوالی کے دوران علی ظفر کے کچھ ڈائیلاگز بھی ہیں جس کی وجہ سے علی

جمہوریت جو یوسف رضا گیلانی کو فارغ کرنے کے بعد راجہ پرویز اشرف کی قیادت میں بچی رہی۔

2008ء میں منتخب ہوئی اسمبلی نے اپنی آئینی مدت پوری کی' بعدازاں انتخابات ہوئے اور نواز شریف تیسری بار اس ملک کے وزیراعظم بن گئے۔

1985ء سے انہیں کسی نہ کسی صورت اقتدار کے ایوانوں میں دیکھتے ہوئے' ہمارے ہاں کئی لوگوں کا دل اب اکتا چکا ہے۔ "نئے چہرے" کی ضرورت ہے تاکہ "جمہوریت" کا دو نمبری بندوبست چلتا رہے۔ ہمیں انتظار کرنا ہوگا کہ پانامہ لیکس کی بدولت برپا ہوئے شور کے نتیجے میں نواز شریف کی بچت ہوتی ہے یا دو نمبری بندوبست جمہوری کی۔
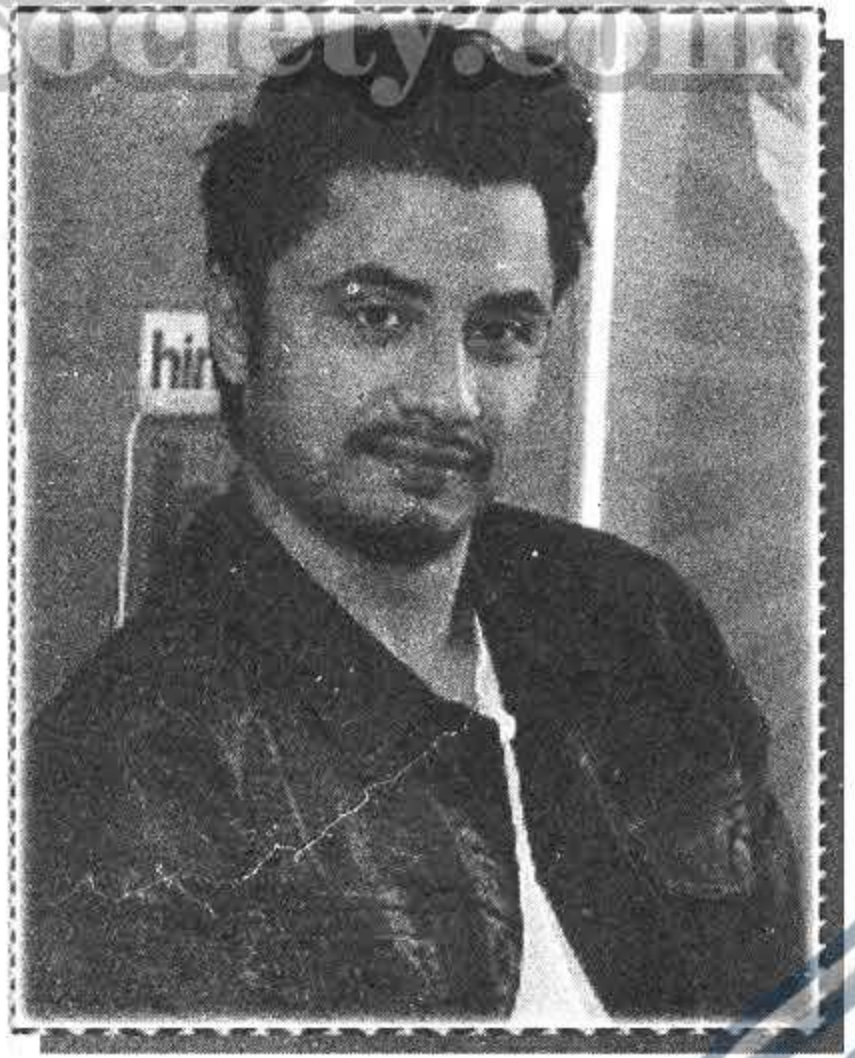
(عبداللہ طارق سہیل)

☆ مشرف نے آٹھ سال میں پاکستان کا تورا بورا بنادیا۔ مزید پانچ سال صدارت کرتے تو ان تورا بورا کے کھنڈرات میں سیاہ چیتے اور ہوائیں ماتم کرتیں اور کچھ تو باقی ہی کہاں رہتا تھا' چنانچہ یوں کہیے کہ بے نظیر نے جان کی قربانی دے کر پاکستان کو بچالیا اور اگر کچھ کمی رہ گئی تھی تو زرداری نے پانچ سال گالیاں کھا کر اور وار پہ وار سہہ کر ملک کی حفاظت کا فرض ادا کیا' جس خدا نے بے نظیر اور زرداری کے ذریعے ملک کو ایک بار پھر صدارتی نظام کے زہر قاتل و مہلک سے بچایا' وہ پھر کیوں نہ بچائے گا۔

اس لیے تسلی رکھنی چاہیے کہ "موتی" کو پاکستان واپس آنے کی توفیق ہی نہیں ملے گی۔ امریکا بہت طاقت ور سہی' لیکن اس کی طاقت افغانستان کو ختم نہ کر سکی' پاکستان بھی بچ رہے گا۔ ان شاءاللہ۔

(وغیرہ وغیرہ)

ظفران دنوں اپنا پنجابی تلفظ درست کرنے کے لیے بہت محنت کر رہے ہیں۔ پڑوسی ملک کے اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے علی ظفر نے کہا ہے کہ "موسیقی میرا جنون ہے (ہائیں "جنون" تو علی عظمت کا تھا نا۔۔۔؟) اور وہ اس فن کی ہر صنف میں طبع آزمائی کرنا چاہتے ہیں اسی لیے انہوں نے بھارتی پنجاب کی فلم میں قوالی کی آفر قبول کرلی۔ (یعنی وہ جو امجد صابری کو خراج تحسین تھا' وہ پریکٹس تھی۔۔۔ ہے نا؟)

اِدھر اُدھر سے

★ انڈونیشیا اور ملائیشیا پر کبھی اسلامی فوج نے حملہ نہیں کیا۔ اس کے باوجود وہاں اسلام پوری طرح پھیلا۔

(ڈاکٹر غلام مرتضیٰ)

★ یادرکھیے' جس معاشرے میں سب کچھ چلتا ہے وہ معاشرہ چل نہیں سکتا۔

(مولانا ظفر علی خاں)

★ پانامہ لیکس کے بعد اٹھے طوفان کا اصل ہدف صرف اور صرف "مائنس ون" ہے۔ نواز شریف کو فارغ کرو اور "جمہوریت" بچالو' وہی

گوشت کے پکوان

خالدہ جیلانی

مزے دار کلیجی

اجزا:

کلیجی	ڈیڑھ کلو
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
سفید سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
ہری مرچ	چار عدد
ادرک لہسن پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
لال مرچ کٹی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
لیموں	دو عدد
تیل	آدھی پیالی

ترکیب:

سب سے پہلے کلیجی میں چھلکے سمیت لہسن چھیل کر لگائیں اور دس منٹ کے لیے رکھ دیں' پھر ٹھنڈے پانی سے دھو کر چھلنی میں رکھ دیں تاکہ پانی اچھی طرح نکل جائے' ایک کڑاہی میں کلیجی ڈال دیں' ساتھ میں لال کٹی مرچ' ادرک لہسن اور سرکہ ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ جب پانی خشک ہونے لگے تو کالی مرچ اور زیرہ (بھون کر پیس لیں) ڈال کر ہلکا سا بھونیں اور تیل ڈال دیں پھر لیموں کا رس' ہرا مسالا (باریک کاٹ لیں) اور نمک ڈال کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ مزیدار کلیجی تیار ہے۔ سادے چاول یا نان کے ساتھ پیش کریں۔

تلا ہوا گوشت

اجزاء:

گائے کا گوشت	آدھا کلو
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ کٹی ہوئی	آدھا کھانے کا چمچ
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
نمک	حسب ذائقہ
ادرک' لہسن پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچہ
کالی مرچ پسی	آدھا چائے کا چمچ
ہری مرچ	تین عدد
لیموں	دو عدد
تیل	آدھی پیالی

ترکیب:

ایک کڑاہی میں تیل ڈال کر گوشت' (چھوٹی چھوٹی بوٹیاں) ادرک لہسن اور نمک ڈال دیں۔ ڈھکن ڈھانک کر ہلکی آنچ میں پکنے دیں ابھی پانی بالکل نہ ڈالیں۔ جب گوشت کا اپنا پانی سوکھ جائے تو حسب ضرورت گرم پانی ڈال دیں تاکہ گوشت گل جائے۔ جب پانی سوکھ جائے اور گوشت اچھی طرح گل جائے تو اس میں ...... لال کٹی مرچ اور زیرہ ڈال کر بھون لیں۔ ہری مرچ' ہرا دھنیا اور لیموں کا رس ڈال کر گرم گرم پیش کریں۔

دم کا قیمہ

اجزاء:

گائے کا قیمہ	ایک کلو
پیاز کٹی ہوئی	تین عدد
دہی	ایک پیالی
ادرک لہسن پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
خشخاش	ایک کھانے کا چمچ
کالی مرچ	چھ عدد

لونگ	چار عدد
بادام بھنے ہوئے	دس عدد
لیموں	چار عدد
ہری مرچ	تین عدد
کچا پپیتا	دو کھانے کے چمچے
لال مرچ پسی ہوئی	ایک۔ کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
سیاہ زیرہ	ایک چائے کا چمچ
چھوٹی الائچی	چار عدد
بھنے چھلے چنے	دو کھانے کا چمچے
پودینہ	ایک گٹھی
تیل / گھی	ایک پیالی

ترکیب:

سب سے پہلے سارے خشک مسالا جات ایک ساتھ باریک پیس لیں۔ ایک دیگچی میں قیمہ، دہی، ادرک، لہسن، لال مرچ، ہری مرچ، پودینہ، چھلکے سمیت پسا ہوا کچا پپیتا اور پسے ہوئے مسالے اور گھی ڈال کر اچھی طرح قیمے میں ملالیں پھر لیموں کا رس ڈال کر پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ ہلکی آنچ پر ڈھکن ڈھانک کے پکنے دیں۔ جب قیمہ گل جائے اور پانی خشک ہوجائے تو کوئلے سے اس کو دھونی دے کر دم پر رکھ دیں۔ پانچ منٹ بعد ڈش میں نکالتے وقت پیاز، پودینہ اور ہری مرچ کاٹ کر اوپر سجادیں ساتھ میں روغنی نان یا سادے نان رکھیں۔

پسندے

اجزاء:

پسندے گائے	ایک کلو
لال مرچ پسی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
خشخاش	ایک کھانے کا چمچ
لونگ	چار عدد
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
پودینہ	ایک گٹھی
پیاز	چار عدد
کچا پپیتا پسا ہوا	دو کھانے کے چمچے
تیل	ایک پیالی
پسا ہوا ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچ
ہلدی	ایک چائے کا چمچ
بھنے چھلے ہوئے چنے	دو کھانے کے چمچے
ثابت کالی مرچ	چھ عدد
سیاہ زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
چھوٹی الائچی	چھ عدد
ہری مرچ	چار عدد
لیموں	تین عدد
گھی	ایک چائے کا چمچ

ترکیب

سب سے پہلے کسی بھاری چھری کے ساتھ سارے پسندے اچھی طرح کچل کر ذرا سا پھیلا لیں۔ چنے، خشخاش، کالی مرچ، سفید، سیاہ زیرہ اور الائچی سب چیزیں ایک ساتھ ملا کر باریک پیس لیں۔ ایک بڑے پیالے میں پسندے، دہی ادرک، لہسن، پسا ہوا مسالا، مرچ، ہلدی، نمک، آدھا پودینہ (باریک کٹا ہوا) آدھی ہری مرچ لیموں کا رس اور پپیتا اچھی طرح ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں تیل ڈال کر پیاز کو سنہرا کرلیں۔ آدھی پیاز نکال کر اخبار پر پھیلادیں تاکہ خستہ ہو جائے۔ آدھی میں مسالا لگے پسندے ڈال کر ہلکی آنچ میں ڈھکن ڈھانک کر پکنے دیں جب پانی خشک ہو جائے تو گھی، پودینہ، ہری مرچ، لیموں کا رس اور تلی ہوئی پیاز ہاتھ سے کچل کر ڈال دیں۔ توے کو ہلکی آنچ پر رکھ کر دیگچی رکھ کر دم دے دیں۔ آنچ ہلکی کر دیں، دس منٹ بعد مزیدار پسندے تیار۔ گرم گرم چاول یا نان کے ساتھ پیش کریں۔

تکہ بریانی

اجزاء:

سرکہ	چار کھانے کے چمچے
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچ
زردے کا رنگ	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ایک چوتھائی کپ

مسالا بنانے کے لیے:

لال مرچ (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
دھنیا	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
ٹماٹر	چار عدد
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
پودینے کے پتے	پندرہ عدد
ہری مرچ	چار عدد
تیل	ایک کپ
چاول	ایک کلو
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچ
نمک	دو چائے کے چمچے

ترکیب:

گوشت کو سرکہ، پسی لال مرچ، پسا گرم مسالا، پسا ہوا ادرک لہسن، کالی مرچ، زردے کا رنگ اور ڈیڑھ چائے کا چمچہ نمک لگا کر تیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔

پھر فرائنگ پین میں تیل ڈال کر گوشت کو اتنا پکائیں یہاں تک کہ گوشت گل جائے۔ آخر میں کوئلے سے دم دیں۔

مسالا بنانے کے لیے:

تیل گرم کرکے اس میں پیاز ڈال کر تل لیں، یہاں تک کہ وہ سنہری ہو جائے۔ اب اس میں باریک کٹے ٹماٹر شامل کریں۔

ساتھ ہی پسی لال مرچ، ہلدی، پسا دھنیا بھی ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔

اب اس میں ایک کپ دہی ڈال کر بھونیں پھر گوشت شامل کرکے اچھی طرح ملالیں۔ پھر الگ سے چاولوں کو دو چائے کے چمچہ نمک اور ثابت گرم مسالے کے ساتھ تین چوتھائی ابال لیں۔ آخر میں مسالے پر چاولوں کی تہہ لگا کر اور دم پر رکھ دیں۔

لب شیریں

ضروری اشیاء:

دودھ	ایک لیٹر
چینی	ایک کپ
بنانا جیلی	ایک پیکٹ
اسٹرابیری جیلی	ایک پیکٹ
پائن ایپل جیلی	دو پیکٹ
بادام، پستہ	سجاوٹ کے لیے
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
کریم	ایک کپ
کیلے	چھ عدد

ترکیب:

پیکٹ پر دی گئی ہدایت کے مطابق بنانا، اسٹرابیری اور پائن ایپل جیلی کو الگ الگ تیار کرکے پیالوں میں جمادیں۔ کارن فلور کو تھوڑے سے دودھ میں حل کر لیں۔ بقیہ دودھ کو ایک ساس پین میں ڈال کر گرم کریں، اس میں چینی ڈال کر حل کریں، اب اس میں کارن فلور ڈال کر دودھ کے گاڑھا ہونے تک پکائیں۔

جب گاڑھا ہو جائے تو اس میں کریم، سیب اور آم کے ٹکڑے شامل کرکے فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کرلیں اور جیلی کے کیوبز کاٹ کر شامل کریں اور مزید فریج میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں مزیدار لب شیریں تیار ہے۔ پستے، بادام سے سجا کرکے سرو کریں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

خشکی وسکری سے نجات

خشکی وسکری کا شکار اکثر سر کی چکنی جلد کے حامل افراد ہوا کرتے ہیں۔ جس کے باعث سر میں خشکی کی پپڑیوں کے چھلکے پڑ جاتے ہیں اور بالوں سے خشکی جھڑ کر کانوں ماتھے اور کندھوں پر نظر آنے لگتی ہے۔

خشکی وسکری بالوں کی نشوونما میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے اور بال بہت زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میتھی دانہ

اس کے بیج خشکی کو کم کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس میں اینٹی بیکٹیریل اور اینٹی انفیکشن خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ جو سر میں موجود خشکی کے سفید چھلکوں کو دور کرنے میں مدد کرتی ہیں۔

میتھی دانہ بالوں کی بہترین انداز میں نشوونما و حفاظت بھی کرتا ہے اور بالوں کی لمبائی میں اضافہ کرتا ہے۔

آپ دو کھانے کے چمچے میتھی دانہ کو رات ایک کپ پانی میں بھگو کر رکھ دیں اور صبح اس کو اسی پانی میں پیس لیں اور پیسٹ بنالیں۔ اس پیسٹ میں ایک کپ سیب کا سرکہ شامل کر دیں اور پورے بالوں اور سر کی جلد پر لگائیں۔ تیس منٹ بعد کسی اچھے شیمپو سے سر دھو لیں۔ اس عمل سے خشکی کے باعث ہونے والی خارش دور ہو جائے گی اور خشکی بھی کم ہو جائے گی۔

اسپرین

خشکی کے خاتمے کے لیے اسپرین نہایت زبردست و بہترین نسخہ ثابت ہوتا ہے۔ اس میں سلیسلک ایسڈ کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔

آپ دو گولیاں ٹیبلیٹ اسپرین کی لے کر انہیں پیس لیں اور اپنے عام استعمال کے شیمپو میں ملا کر بالوں کو گیلا کر کے شیمپو پانچ منٹ تک بالوں پر لگا کر چھوڑ دیں اور اس کے بعد اچھی طرح بالوں کو دھو کر خشک کر لیں۔ اگر آپ کو سر میں اسپرین پاؤڈر محسوس ہو تو دوبارہ بغیر اسپرین والے شیمپو سے سر دھو لیں۔

ایلو ویرا جیل

ایلو ویرا جیل خشکی وسکری کا خاتمہ کرنے کے لیے نہایت پر اثر و اکسیر دوا کا کام کرتی ہے۔ اس میں موجود اینٹی فنگل خصوصیات سر میں ہونے والی کھجلی و خارش سے بھی نجات دلانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

خشکی کے علاج کے علاوہ ایلو ویرا جلد و بالوں کی صحت کو بہتر بنانے میں بھی مدد کرتا ہے۔

ایلو ویرا کے پودے میں سے اس کا گودا نکال کر بالوں کی جڑوں کا مساج کریں اور تیس منٹ کے لیے لگا کر چھوڑ دیں لیکن دھیان رہے آپ کے بال چکنے نہ ہوں بالکل صاف ہونے چاہئیں۔

موسم برسات

آپ کی جلد کی طرح آپ کے بالوں کو بھی مناسب دیکھ بھال اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ خاص طور پر مون سون کے موسم میں بالوں کی چمک دمک اور گھنیرے پن کو محفوظ و برقرار رکھنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کریں۔

مون سون کے موسم میں بال خشک اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بارش کے پانی سے سر کی جلد میں انفیکشن پیدا ہونے کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا آپ جب بھی بارش میں بھیگ کر گھر پہنچیں، سب سے پہلے اپنے بالوں کو سادے پانی سے دھو لیں۔ تاکہ کسی بھی قسم کے فنگل انفیکشن سے محفوظ رہ سکیں۔ ایک بات کا ہمیشہ دھیان رکھیں کبھی بھی گیلے بالوں کو نہ باندھیں اس سے سر میں خشکی پیدا ہو سکتی ہے۔ خشکی سے بچنے کے لیے ہفتے میں ایک دفعہ لیموں کا رس اپنے سر کی جلد پر ضرور لگائیں۔

ان چند چھوٹی چھوٹی باتوں پر عمل کر کے آپ اپنے بالوں کی خوب صورتی و چمک کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔